
گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
ستمبر 2013
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
عید نمبر 2
عنیزہ سیّد اور رفعت سراج کے دلکش سلسلے وار ناول
مکمل ناول، ناولٹ، افسانے، مضامین اور بہت کچھ

مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
انجم انصار

معاون
آمنہ حماد

ناولٹ



اداریہ

افسانے





پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

منی ناول



خصوصی مضامین

مستقل عنوانات

مکمل ناول



شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528
ماڈل: صائمہ .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا
جلد 41 • شمارہ 06 • ستمبر 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے......!

ایک پرانی کہاوت ہے۔ "قدرت نے انسان کو ایک زبان اور دو کان اس لیے دیے ہیں کہ وہ جتنا بولے اس سے دگنا سنے لیکن زیادہ تر لوگ اس بات کا کبھی احساس نہیں کرتے اور وہ اچھا تاثر دینے کی کوشش میں بہت زیادہ بولتے ہیں اور یہ بات بھول جاتے ہیں کہ گفتگو کا مقصد تبادلہ خیالات ہے ایسے لوگوں سے ملنے کے بعد دوسری دفعہ ملنے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی۔

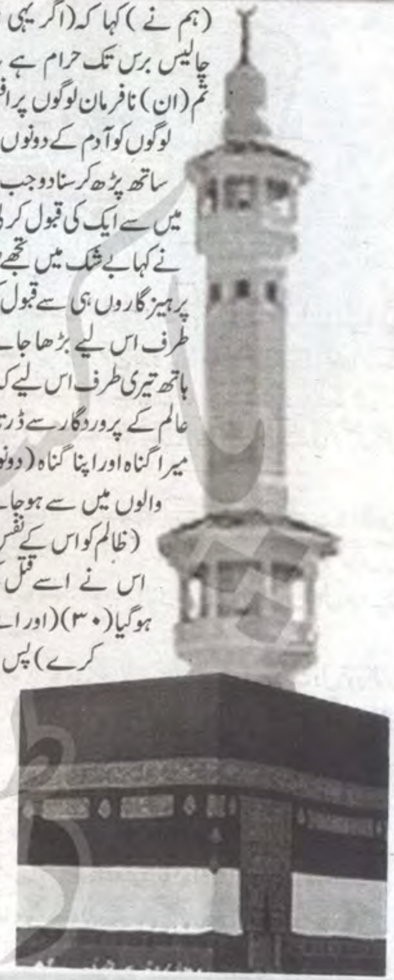
ان باتونی لوگوں کی دوسری قسم ایسے افراد کی ہے جو بات بات پر اپنی علمیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ غیر زبانوں کی کہاوتیں اور حوالے پیش کر کے خوش ہوا کرتے ہیں تا کہ ان کی علمی قابلیت کا رعب بیٹھ سکے۔ اس طرح کے لوگ دوسروں کے تلفظ کی غلطیاں نکال کر اپنے آپ کو از خود قابل سمجھنے لگتے ہیں۔

اس کے باوجود کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ ان سے مل کر ان کی جانب دل خود بخود کھنچتا ہے جبکہ دیکھا جائے تو بظاہر ان میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی...... مگر ان کی گفتگو کا تاثر خاصا مقناطیسی ہوتا ہے۔

اور آج ہمیں آپ سے یہی کہنا ہے کہ اچھا تاثر پیدا کرنے یا کسی کے ذہن پر اچھے اثرات مرتب کرنے کے لیے آپ کا کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ صرف اتنا ہے کہ آپ اپنے انداز میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ پیش کریں جو آپ کو دوسروں کی نگاہوں میں باوقار اور دلکش بنا دے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کسی نئے ملنے والے کے متعلق غلط اندازے مت لگائیں اور نہ ہی اسے کمتر سمجھیں، اپنی نیکیوں اور دوسروں کی برائیوں کو ہر گز نہ اچھالیے اور دوسروں سے ملتے وقت ہمیشہ ان کی عزت کیجیے...... یاد رکھیے کہ عزت پانے کے لیے، عزت کرنا ضروری ہے۔ گفتگو میں سادہ اور دلکش رہیے......اور وہ بات کیجیے جس سے دوسروں کو بھی دلچسپی ہو اور یہ بات آپ کو جان لینی چاہیے...... گفتگو کی محفلوں میں لوگ انہیں زیادہ پسند کرتے ہیں جو اچھے سامع ہوں...... تو باتیں بنانے سے زیادہ باتیں سن لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، کیا خیال ہے۔

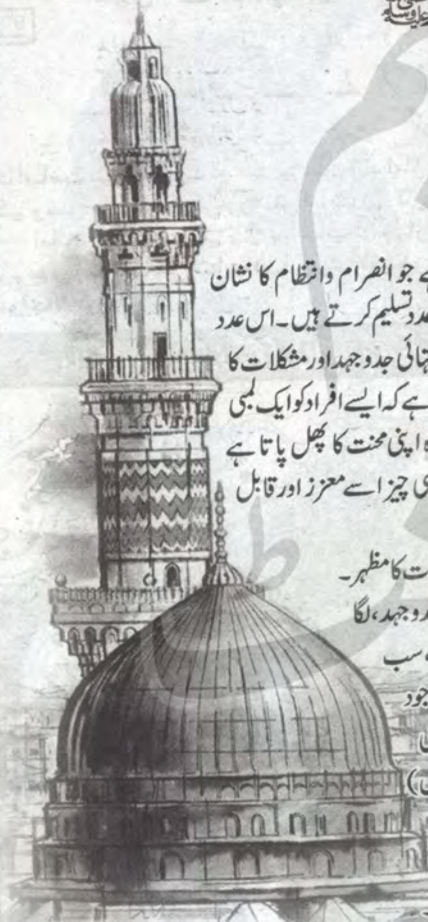
مدیرہ

انجم انصار



(ہم نے) کہا کہ (اگر یہی نافرمانی ہے) تو وہ (مقدس زمین) ان پر چالیس برس تک حرام ہے یہ لوگ زمین میں سرگردان رہیں گے پس تم (ان) نافرمان لوگوں پر افسوس نہ کرنا (۲۶) اور (اے نبی ﷺ) ان لوگوں کو آدم کے دونوں بیٹوں (قابیل اور ہابیل) کا حال سچائی کے ساتھ پڑھ کر سنا دو جب ان دونوں نے قربانی کی نذر کی اور ان دونوں میں سے ایک کی قبول کر لی گئی اور دوسرے کی نہ قبول کی گئی (تو) اس نے کہا بے شک میں تجھے ضرور مار ڈالوں گا اس نے جواب دیا کہ اللہ تو پرہیزگاروں ہی سے قبول کرتا ہے (۲۷) بے شک اگر تو اپنا ہاتھ میری طرف اس لیے بڑھا جائے گا کہ مجھے قتل کر ڈالے (تب بھی) میں اپنا ہاتھ تیری طرف اس لیے کہ تجھے قتل کر ڈالوں نہ بڑھاؤں گا میں یقیناً تمام عالم کے پروردگار سے ڈرتا ہوں (۲۸) بے شک میں یہ چاہتا ہوں کہ تو میرا گناہ اور اپنا گناہ (دونوں کا بار اپنے سر پر) لے جائے اور تو دوزخ والوں میں سے ہو جائے اور ظالموں کی یہی سزا ہے (۲۹) پھر اس (ظالم کو اس کے نفس نے اپنے بھائی کے قتل پر راغب کر دیا اور اس نے اسے قتل کر دیا اور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گیا (۳۰) (اور اسے یہ فکر ہوئی کہ اس کی نعش کو کس طرح مخفی کرے) پس اللہ نے ایک کوے کو بھیجا کہ اس کے دکھانے کے لیے زمین کو کھودے (تاکہ اسے معلوم ہو جائے) کہ اپنے بھائی کی نعش کو کس طرح چھپا دے (یہ حال دیکھ کر) کہنے لگا کہ افسوس میں اس سے بھی عاجز ہو گیا کہ اس کوے کی مثل ہوتا اور اپنے بھائی کی نعش (اس کی طرح) چھپا دیتا پس وہ پشیمانوں میں سے ہو گیا (۳۱) (سورۂ مائدہ آیت نمبر ۲۶ تا ۳۱)

سیدنا احمد ﷺ



٦۔ الاعداد:

اسم مبارک احمد: حروف: ۴

ا+ ح+ م+ د= احمد

1++۸۴+ ۴=+۱۷=۸

خصوصیات عدد ۸:

اس نمبر پر زحل کی حکومت ہے جو انصرام و انتظام کا نشان ہے۔ مشرقی ماہرین اسے ایک طاقتور عدد تسلیم کرتے ہیں۔ اس عدد کا حامل نہایت محنتی ہوتا ہے کیونکہ یہ انتہائی جدوجہد اور مشکلات کا عدد ہے اور یہ بھی خوبی اس میں موجود ہے کہ ایسے افراد کو ایک لمبی اور طویل کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ وہ اپنی محنت کا پھل پاتا ہے اور خوب اچھی طرح پاتا ہے اور پھر وہی چیز اسے معزز اور قابل تعظیم بنا سکتی ہے۔

اسم مبارک احمد عدد ۸ کی خصوصیات کا مظہر۔

اس عدد کی یہ خصوصیات انتہائی جدوجہد، لگاتار محنت، کوشش اور مشکلات کا سامنا، سب حضور ﷺ کی ذات پاک میں موجود تھیں کہ جب آپ ﷺ کو اللہ پاک کی طرف سے عبادت کا حکم ملا (۸۔ المزمل) تو آپ ﷺ ساری ساری رات اتنی عبادت (قیام، رکوع، سجود اور تلاوت) فرماتے کہ پاؤں مبارک میں ورم آ جاتا۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس



امانت

رفعت سراج

قسط 9

لہو سے سینچنے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پر سایۂ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور...... چاند کی چاندنی امانت...... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے چہار سو اجالا کردیتی ہیں۔

امانت وخیانت کو واضح کرتی ایک پُردرد مگر خوب صورت تحریر



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نیورو سرجن تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور رومانہ کے لیے ایک سخت گیر بہن اور ماں تھیں۔ وہ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں...... اصیل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور معتمد خاص تھا۔ مہر جان، رابی کی شادی سہراب خان سے طے کرتی ہیں جو عمر میں رابی سے کافی بڑا ہے۔ اس شادی پر رابی تیار نہیں ہوتی۔ کائناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے وہ اور روما بیسٹ فرینڈز ہیں لیکن مہر جان کو روما کی اتنی دوستی بھی پسند نہیں۔ سب انسپکٹر جابر علی نے آج تک کبھی رشوت نہیں لی تھی۔ رزق حلال کی کمائی سے اپنے گھر کو چلایا اس کی بیوی صابرہ، بیٹا برہان اور بیٹیاں شبینہ اور ستارہ اسی کمائی میں گزارہ کر رہے تھے لیکن کبھی کبھی ستارہ اپنے حالات سے تنگ آجاتی ہے۔ شبینہ اپنے والد جابر علی سے چھپ کر اپنی دوست فائزہ کے گھر جاتی ہے وہاں اس کی ملاقات فائزہ کے بھائی احمر سے ہوتی ہے۔ احمر کو وہ بہت اچھی لگتی ہے۔ ایس پی شیر زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریک کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے۔ جابر علی، صابرہ سے رشتے کی بات کرتا ہے تو صابرہ اسے گھر بلانے کو اور بیٹے برہان سے مشورے کا کہتی ہے۔ برہان، وارث علی کو دیکھتا ہے تو صابرہ سے کہتا ہے کہ وہ جابر علی سے کہے کہ ہمیں یہ رشتہ منظور نہیں۔ مہر جان کو کمرے میں بے ہوش دیکھ کر گل جان، اصیل خان کے ساتھ انہیں اسپتال لے کر جاتی ہے، جابر علی، برہان کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تو برہان گھر سے چلا جاتا ہے۔ رابی گھر چھوڑ کر مری چلی جاتی ہے۔ جابر علی ایس پی سے جہیز کے بارے میں بات کرتا ہے تو ایس پی کہتا ہے کہ وہ اس بارے میں پریشان نہ ہو۔ گل جان کو کائناز اور شاہ عالم سے بہت ڈھارس ہوتی ہے، مہر جان کو ڈاکٹر آپریشن بتاتے ہیں، برہان اپنے کلاس فیلو نعمان کے پاس چلا جاتا ہے اور اس کے سمجھانے پر صابرہ کو فون کرتا ہے۔ گل جان، شاہ عالم کی شکر گزار ہوتی ہے کہ انہوں نے روما کا خیال رکھا۔ رابی مری میں ایک چیزیں فروخت کرنے والی ایک عورت سے بہت متاثر ہوتی ہے کہ وہ اس بڑھاپے میں اپنا بوجھ خود اٹھائے ہوئے ہے۔ اس عورت کے پوچھنے پر رابی اسے بتاتی ہے کہ وہ ڈاک بنگلے میں رہتی ہے اور اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ صابرہ، جابر علی سے کہتی ہے کہ وہ برہان کو واپس لے آئے۔ مہر جان کا آپریشن ہو گیا لیکن انہیں ہوش نہیں آتا تو گل جان بہت پریشان ہوتی ہے لیکن نرس اسے تسلی دیتی ہے۔ روما، کائناز اور شاہ عالم کے ساتھ اسپتال آجاتی ہے۔ شبینہ، جابر علی پر خط کے ذریعے شادی کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کر دیتی ہے۔ واسطی صاحب فون پر اصیل خان کو بتاتے ہیں کہ وہ لڑکی تک پہنچ گئے ہیں اور اب کسی بھی وقت وہ پولیس کی حراست میں ہوگی۔ جابر علی کہتا ہے کہ اب شادی شبینہ کی نہیں ستارہ کی ہوگی۔ برہان اخبار میں اشتہار دیکھ کر شاہ عالم کے پاس انٹرویو کے لیے جاتا ہے اور وہ اسے کائناز کو پڑھانے کے لیے رکھ لیتے ہیں۔ رابی ہوٹل میں اپنے کمرے میں ہوتی ہے کہ دروازے پر دستک ہوتی ہے وہ دروازہ کھولتی ہے تو سامنے پولیس کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ اصیل خان ماضی کے دنوں میں اپنے اور مہر جان کے گزرے یادگار لمحات میں گم ہوتا ہے کہ گل جان اسے مہر جان کے ہوش میں آنے کی اطلاع دیتی ہے۔ صابرہ، شبینہ کو بتاتی ہے کہ اب شادی شبینہ کی نہیں ستارہ کی ہوگی اب مسئلہ یہ ہے کہ ستارہ کو یہ بات کیسے بتائی جائے۔ اصیل خان، گل جان کو بتاتا ہے کہ پولیس رابی کو کراچی لے کر آرہی ہے۔ وارث علی زیورات لے کر جابر علی کے گھر آتا ہے۔ جابر علی اتنا کچھ دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ وہ زیورات شادی کے لیے دے کر چلا جاتا ہے...... ستارہ وہ زیورات دیکھنے کے لیے بے چین ہوتی ہے۔ ستارہ زیورات دیکھ کر شبینہ کی قسمت پر رشک کرتی ہے۔ کائناز، روما سے کہتی ہے کہ اب وہ اس کے ساتھ ٹیوشن پڑھے کیونکہ وہ ٹیوٹر سے بات کر چکی ہے روما اس کی بات پر متردّد ہوتی ہے۔ پولیس اسٹیشن سے فون آتا ہے وہ اصیل خان سے کہتے ہیں کہ لڑکی کراچی پہنچ گئی ہے اب اس کو آکر لے جائیں۔ برہان اپنا موبائل شاہ عالم کے گھر بھول جاتا ہے۔ صابرہ، برہان کو فون کرتی ہے تو اس کی بات کائناز سے ہوتی ہے۔ کائناز، صابرہ کو بتاتی ہے کہ برہان اسے پڑھاتا ہے اور وہ فون ان کے گھر بھول گیا ہے۔ صابرہ فون پر بات کر رہی تھی کہ جابر علی اٹھ جاتا ہے اور وہ صابرہ پر چیختا ہے۔ گل جان، مہر جان کے پاس اسپتال میں ہوتی ہے تو اصیل خان فون پر بتاتا ہے کہ پولیس رابی کو مری سے گرفتار کر کے لے آئی ہے اب اسے گھر لاتا ہے۔ وارث علی اور ایس پی شاہ زمان اپنی فتح اور کامرانی پر خوش ہوتے ہیں۔ مہر جان فون پر اصیل خان کو کہتی ہے کہ رابی کو پہلے اسپتال لے کر آئے۔ فائزہ، احمر کے ساتھ شبینہ سے ملنے آتی ہے تو اس کے جانے سے پہلے ہی جابر علی آجاتا ہے اور وہ اس کے آنے پر اپنی ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔ مہر جان، سہراب خان کو فون کرتی ہے کہ نکاح ہر صورت میں آج ہی کرنا ہے۔

اب آگے پڑھیں

گل جان، مہر جان کی طرف ابھی تک دم بخود کیفیت میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ مہر جان نے موبائل بڑی بے دلی سے اپنے کان سے ہٹایا تھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ گل جان ان کے بولنے کی منتظر تھی۔ اس سے پہلے وہ وہاں سے جا نہیں سکتی تھی۔ سوچتے سوچتے مہر جان نے نظریں اٹھا کر گل جان کی طرف دیکھا جو گویا سانس روکے مہر جان کے کلام کرنے کی منتظر تھی۔

"گل جان میں تو یہی چاہتی تھی کہ رابی آج ہی اس گھر سے چلی جائے لیکن سہراب خان دبئی سے صبح سات بجے پہنچے گا۔ شکر ہے کہ وہ آج دبئی سے نکل رہا ہے پر ایک ایک لمحہ بھاری ہے۔ میں ایک دن کیسے انتظار کروں، سات بجے وہ پاکستان پہنچ جائے گا پھر میں تمہیں بتادوں گی کہ وہ نکاح کے لیے کس ٹائم آرہا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے گل جان کی طرف کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھا۔

"اگر تمہارا دل چاہے تو اس کے ہاتھ پر مہندی وغیرہ لگادو۔" چند لمحے توقف کے بعد مہر جان کا یہ جملہ سن کر وہ بی بی جان کو عجیب نظروں سے دیکھتی وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

شبینہ اپنے بستر پر چپ چاپ لیٹی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ ستارہ نے بہت آہستگی سے کمرے میں قدم رکھا تھا شاید اس کا خیال تھا کہ شبینہ سو چکی ہے مگر اسے جاگتا پا کر وہ اس کے قریب ہی چلی آئی اور غور سے اس کی شکل دیکھی۔ جیسے یقین کر لینا چاہتی ہو کہ وہ جاگ رہی ہے یا نہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ شبینہ کسی گہری سوچ میں ہے اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں تو وہ جلدی سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔ جیسے اسے خطرہ ہو کہ شبینہ اس سے بات کرنے سے بچنا چاہے گی اور جان بوجھ کر سوتی بن جائے گی۔

"آپا تم نے اپنی عزیز ترین دوست کو بھی نہیں بتایا کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے حیرت ہے۔" شبینہ نے کھوئی کھوئی نظریں ستارہ پر جمادیں۔ وہ ابھی تک ذہنی طور پر غیر حاضر تھی۔ اس کھوئی کھوئی کیفیت میں اس نے صرف ہاں کہنے پر اکتفا کیا۔

"آپا شادی میں چند دن رہ گئے ہیں۔ ہمارے گھر میں لگتا ہی نہیں کہ اس گھر میں شادی ہونے والی ہے۔ لوگوں کے گھروں میں تو پندرہ دن پہلے لائٹنگ ہو جاتی ہے۔ ڈھولک کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔ مہمانوں کا آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔ شاپنگ کے لیے بازاروں میں مارے مارے پھر رہے ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرا کر بہن کی طرف دیکھنے لگی۔

شبینہ نے جیسے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھا۔ ستارہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو آنکھوں سے ہٹایا۔

"آپا کچھ تو بولو، آخر آپ ابا جی کی بہت تابعدار، خدمت گزار بیٹی ہو۔ بہت خوشی، خوشی ابا جی کا فیصلہ قبول کیا ہے پھر اب راتوں کو جاگ کر کیا سوچتی ہو۔ جو کرنا تھا وہ تو تم کر چکیں اب کیا پچھتا رہی ہو؟" ستارہ اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں کہے جارہی تھی۔ شبینہ نے خفا خفا نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم فضول بولنے سے باز نہیں آسکتیں؟ بیماری ہے بولنے کی......؟" ستارہ بجائے برا ماننے کے بڑی ڈھٹائی سے مسکرا رہی تھی۔

"اس گھر میں سب سے پہلے آپ سوتی ہیں۔" شبینہ اس کی طرف گھور کر دیکھنے لگی پھر جیسے خود ہی اسے خیال آگیا۔ ایک دم نظریں چرالیں۔ ستارہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کی سگی بہن اس بے خبر کو پتا ہی نہیں تھا

کہ کچھ دنوں بعد اس پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے، کتنی مست مگن اسی طرح بے پروائی سے اپنے دل کی باتیں کرتی ہوئی اس کے دل میں ایک عجیب سا گداز اور تڑپ پیدا کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر بیٹھ جائے اور بہن کو گلے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے اور کہے۔

''میں نے تو وہ سب کچھ کرلیا تھا جو مجھے کرنا چاہیے تھا، ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیاری کرلی تھی ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے رضامند ہوگئی تھی مگر میں تمہارے مقدر کو نہیں بدل سکتی ستارہ...... جو کچھ میں نے کیا سب بیکار گیا ستارہ...... لیکن اس وقت میں تمہیں یہ سچائیاں کیسے بتاؤں۔ میرے اندر تو اتنی ہمت اور حوصلہ نہیں کہ جو کچھ ہونے جارہا ہے وہ تمہیں پہلے سے بتادوں بلکہ مجھے تو سمجھ ہی نہیں آرہی نہ امی تم سے بات کر پارہی ہیں اور نہ ہی میرے اندر ہمت ہے، تمہیں بتانا تو پڑے گا۔ جب شادی کا وقت بالکل قریب آچکا ہوگا اس وقت تو تمہیں کوئی بتائے گا کہ شادی میری نہیں تمہاری ہورہی ہے اور اس کے بعد کیا ہوگا بس یہاں پہنچ کر میری سوچ میرا ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ میرا ذہن بالکل خالی ہوجاتا ہے اور دل بیٹھنے لگتا ہے۔''

''آپا تم کیا سوچنے لگیں۔ جب میں کمرے میں آئی تو میں نے دیکھا کہ تم بہت گہری سوچ میں ہو، مجھ سے کیا چھپانا...... میں تو تمہاری بہن ہوں مجھے تو بتادو۔'' ستارہ اب اس کے بازو پر ہاتھ رکھے بہت محبت سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ شاید اسے بھی یاد آگیا تھا کہ کچھ دنوں بعد اس کی یہ بہن اس سے جدا ہونے والی ہے۔ وہ تو اپنے تئیں یہی سمجھے بیٹھی تھی۔

''میں کچھ نہیں سوچ رہی ستارہ، تم میری فکر نہیں کرو جاؤ جاکر سوجاؤ بہت رات ہوگئی ہے۔'' شبینہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بہت محبت سے بولی۔

''لیکن آپا یہ تو بتادو جب تم نے خوشی، خوشی ابا جان کا فیصلہ مان لیا ہے تو اب اتنی اداس کیوں نظر آرہی ہو؟ کیوں دل پر پتھر رکھ رہی ہو، دل نہیں مانتا تو صاف انکار کردو۔ ابا جان، جان سے تو نہیں ماردیں گے ناں۔''

''ستارہ میں خوش ہوں یا اداس تمہیں کچھ فکر کرنے کی ضرورت نہیں، جاؤ تم سوجاؤ فضول باتیں نہ کرو۔'' شبینہ نے ایک گہری سانس لی خود کو بڑی مشکل سے سنبھال کر پھر بڑی آہستگی سے گویا ہوئی۔

ستارہ اب اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی مگر طنزیہ مسکرا کر اتنا ضرور کہا تھا۔

''ہاں آپا ہر وہ بات جس کا جواب نہ دیا جاسکے فضول ہوتی ہے، چلو خیر آپ کا موڈ نہیں تو سونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب ہمیں کام ہی کیا ہے، کھانے اور سونے کے سوا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے بستر پر جاکر لیٹ گئی تھی۔

☆☆☆

روما حیران پریشان بلکہ حواس باختہ کیفیت میں گل جان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گل جان نے اسے جو خبر سنائی تھی اس نے تو گویا اس کے ہوش و حواس ہی چھین لیے تھے۔ ایک قیامت سی برپا ہوگئی تھی۔

''آپا کی شادی آج ہورہی ہے لیکن گھر میں تو لگتا ہے کہ جیسے کوئی ہے ہی نہیں۔ اتنی خاموشی...... خالہ جانی شادی والا گھر ایسا ہوتا ہے۔'' بولتے بولتے روما کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی تھی جیسے بہن کی مجبوری اور... بے بسی پر اس کا دل بھر آیا ہو۔

''مجھے تو سمجھ نہیں آرہی کہ رابی کیسے ہاں کہے گی۔ بہت خوف آرہا ہے مجھے، کہیں بی بی جان کا تماشا نہ بنادے جو لڑکی اتنا بڑا اقدم اٹھاسکتی ہے وہ کچھ بھی کرسکتی ہے۔ روما یقین کرو مجھ سے تو اب کوئی کام نہیں ہو پارہا کرنا کچھ ہوتا ہے کرتی کچھ ہوں، پاؤں کہیں رکھتی ہوں پڑتے کہیں ہیں، میرا ذہن میرے کنٹرول میں نہیں۔

خوف سے میری بری حالت ہے۔ میں رابی کے پاؤں چھو کر منت کرسکتی ہوں لیکن میری منت کا اس پر اثر بھی تو ہو۔'' بے بسی سے کہتے کہتے گل جان نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور بڑی مشکل سے گویا ہوئی۔ گل جان کی آنکھوں سے چند آنسو ٹپک ہی گئے۔ روما نے بے اختیار اس کے کندھے سے اپنا سر لگالیا تھا۔

''خالہ جانی جو ہوکر رہنا ہے وہ تو ہوکر رہے گا مگر پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب آپا کچھ نہیں کریں گی۔ انہیں اب اماں جان کی طاقت اور اثر رسوخ کا ٹھیک ٹھاک اندازہ ہوگیا ہوگا۔ وہ کوئی رسک نہیں لیں گی۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔''

روما کی باتیں سنتے ہوئے گل جان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ روما کو اپنے سینے سے لگا کر اتنا روئے اتنا روئے کہ بس حد ہوجائے۔ وہ روما کے سامنے خود کو بہت مشکل سے سنبھالے ہوئے تھی۔ اتنی خاموشی سے تو جنازے بھی نہیں اٹھتے ...... کنواری بچی...... ہر کنواری بچی کی آنکھوں میں خوب صورت خواب ہوتے ہیں اور اس بدنصیب بچی کے خواب پھول بن کر کھلنے کے بجائے...... لیکن اس بے خبر کو ابھی یہ خبر نہیں ہے کہ ایک دریا کے پار اترنے کے بعد اسے ایک اور نئے دریا کا سامنا ہے۔ اس نے روما کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹا اب خود کو سنبھالو...... اور اپنے اندر اتنا حوصلہ پیدا کرو کہ جو کچھ سامنے آجائے اس کو سہہ جاؤ۔ اس لیے کہ موت تو اپنے وقت پر آتی ہے...... روز مرنے سے کیا بہتر نہیں جو درپیش ہے اس سے سمجھوتا کرلیں۔'' وہ بڑی دلسوزی کے انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

مہر جان اپنی وارڈروب کا پٹ کھولے کھڑی تھیں وہ کسی خیال میں اتنی بری طرح کھوچکی تھیں کہ انہیں گل جان کے اندر آنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔

گل جان نے حسب عادت بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا تھا لیکن مہر جان کی کیفیت دیکھ کر اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ مہر جان کافی دیر ایک ہی زاویے سے کھڑی رہیں پھر انہوں نے جیسے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا گہری سانس لے کر وہ پھر وارڈروب میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔ تب گل جان دو قدم آگے بڑھی تھی۔

''کیا ڈھونڈ رہی ہیں بی بی جان...... میں آپ کی مدد کروں؟'' مہر جان نے پلٹ کر گل جان کی طرف دیکھا اور سپاٹ لہجے میں گویا ہوئیں۔

''نہیں...... مگر تم یہاں دو منٹ بیٹھو، تم سے کام ہے۔'' یہ کہہ کر مہر جان وارڈروب میں دوبارہ اسی انداز میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔ گل جان آگے بڑھ کر چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی اور ٹکر ٹکر مہر جان کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ مہر جان کیا ڈھونڈ رہی ہوں گی۔ اسی لیے اس کے چہرے پر الجھن کی کیفیت بہت واضح تھی۔ آخر ایسا کیا گم ہوگیا ہے جو اتنے شد و مد سے ڈھونڈنے میں مصروف ہیں۔ مہر جان وارڈروب میں کپڑے الٹ پلٹ کررہی تھیں۔ ایک دم ان کے چہرے پر جیسے چمک سی آگئی۔ ایک جوش و خروش سا ان کی آنکھوں سے جھلکنے لگا۔

گل جان نے دیکھا کہ مہر جان نے کوئی کپڑا بہت زور لگا کر کھینچ کر نکالا تھا۔ یہ ایک سیاہ رنگ کی انتہائی خوب صورت شیفون کی ساڑی تھی۔ گل جان حیران پریشان ہوکر بی بی جان کی طرف دیکھنے لگی۔ ان کے ہونٹوں پر ایک بڑی پُراسراری مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ساڑی گل جان کی طرف اچھال دی۔ جسے گل جانے بڑی مہارت سے کیچ کرلیا اور ساڑی کے نرم و ملائم کپڑے کو چھو کر محسوس کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے مہر جان کی طرف دیکھنے لگی۔

''تمہیں تو پتا ہے ناں گل جان ہماری کلاس کی مجبوری ہے ہم لوگوں کو ہر موقع پر اس کے لحاظ سے گیٹ اپ کرنا پڑتا ہے۔ اب عام سے لوگ تو کسی کی موت کا سن کر جیسے بیٹھے ہوتے ہیں ویسے ہی چل پڑتے ہیں لیکن جن لوگوں کی کلاس ہوتی ہے انہیں ہر موقع پر اپنی ڈریسنگ کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہ سیاہ رنگ کی ساڑی اسپیشلی سوگ کے لیے بنوا کر رکھ چھوڑی تھی۔ ایک آدھ دفعہ پہن بھی چکی ہوں۔'' مہر جان کے لہجے میں برف جیسی ٹھنڈک اور ناقابلِ برداشت سفاکی تھی۔ گل جان اپنی جگہ پر بیٹھی، بیٹھی تھرا کر رہ گئی۔ جانے کیوں ایک اندیشہ سا جاگا۔ جانے اب مہر جان آگے کیا کہنے والی ہیں۔'' یہ ساڑی میں نے رابی کے نکاح کے لیے نکالی ہے۔ اس لڑکی کو یہ ساڑی پہننے کے لیے دے دو کیونکہ وہ اس شادی کو اپنی موت سمجھ رہی ہے۔ تو پھر اسے اس شادی کو موت کی طرح ہی منانے دو کیونکہ آج وہ سہراب خان کے ساتھ چلی جائے گی تو میری طرف سے اس پر فاتحہ ہے۔'' یہ سن کر گل جان تڑپ کر کھڑی ہو گئی تھی اور بے اختیار آگے بڑھ کر اس نے مہر جان کے پاؤں چھو لیے تھے۔

''وہ جا رہی ہے بی بی جان اب تو رحم کر دیں۔'' مہر جان نے اسی سفاکانہ مسکراہٹ کے ساتھ گل جان کی طرف دیکھا تھا۔ اب مسکراہٹ میں سفاکی کے ساتھ ساتھ تمسخر بھی تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھیں۔

''اپنی جگہ سے اٹھو گل جان...... بس اب یہ رونا دھونا بند کرو۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنا رو رو کر مر چکا ہوتا مگر تم تو ہو ہی ڈھیٹ۔ چلو بھر پانی میں ڈوب کر مرتی ہو نہ دکھ اور صدمے تمہیں موت کے پاس لے جاتے ہیں۔ پتا نہیں کس مٹی سے بنی ہو۔ چلو جاؤ جیسے کہا ہے ویسے کرو...... جا کر یہ ساڑی اس لڑکی کو دے دو مگر اس سے کہنا مغرب سے پہلے، پہلے یہ ساڑی پہن کر تیار ہو جائے بس اب نکلو میرے کمرے سے۔''

مہر جان کا انداز اتنا حتمی، قطعی اور ہر قسم کی مروت اور مصلحت سے عاری تھا کہ گل جان کو کمرے سے جاتے ہی بنی اس کے کمرے سے باہر نکلتے ہی مہر جان طنزیہ انداز میں مسکرائیں اور بڑبڑانے لگیں۔

''پتا نہیں کس مٹی سے بنے ہیں یہ لوگ...... مر جاتے تو جان چھوٹ جاتی۔ ان کا زندہ رہنا میری روز کی موت ہے۔''

☆☆☆

''روما بیٹا میرا تو دل گھبرا رہا ہے، جب سے یہ آئی ہے کمرا بند کیے بیٹھی ہے، کتنی دفعہ بلانے گئی دس بہانے بنائے تاکہ دروازہ کھول دے مگر اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ اب تم ہی سوچو شام کو اس کا نکاح ہے، کچھ تو تیاری کرنی ہو گی۔''

روما اداس نظروں سے خالہ کی طرف دیکھتی رہی اس کے چہرے پر گہرے دکھ کی کیفیت آشکار تھی۔

''تو آپا کو کون سی اپنی شادی کی خوشی ہے جو ہم اُن سے امید کریں کہ وہ خوشی کا اظہار کریں گی۔ مہندی لگوائیں گی، دلہن بنیں گی۔ میرا تو خیال ہے وہ جیسی بیٹھی ہیں ویسے ہی اسی گھر سے رخصت ہو جائیں گی۔''

روما کی بات سن کر گل جان نے الجھی الجھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ روما کو اب بتائے یا نہیں کہ اس کی ماں نے رابی کو نکاح کے لیے اپنی سیاہ ساڑی پیش کی ہے لیکن اس نے اپنے آپ کو روک لیا کہ روما بچی ہے، اسے یہ سب سن کر بہت دکھ ہو گا۔ گھر میں کسی بہن یا بھائی کی شادی ہو تو باقی بہن بھائی خوشی سے دیوانے نظر آتے ہیں۔ کیا، کیا تیاریاں نہیں ہوتیں اور کس، کس طرح سے وہ خوشی منانے کے پروگرام ترتیب نہیں دیتے جو کچھ امکان میں نظر آتا ہے وہ کرنا چاہتے ہیں لیکن روما...... روما کیسے خوشی منائے...... جس کی شادی ہو رہی ہے وہی ماتم کر رہی ہے۔

''خالہ جانی آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ آپ بھی پریشان ہو رہی ہیں ناں...... مگر آپ پریشان نہ ہوں جب نکاح کا ٹائم آئے گا تو اماں جان دروازہ ہی توڑ ڈالیں گی۔ نکاح تو ضرور ہو گا اس بار رابی آپا کے سامنے کوئی دروازہ نہیں ہے جس سے وہ دبے پاؤں نکل بھاگیں۔'' بولتے بولتے روما کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی.. تو گل جان نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ یہ بھی ایک لاشعوری حرکت تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ روما اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو دیکھے اور اس سے زیادہ رونا شروع کر دے۔

روما گل جان کے سینے سے لگی ہوئی تھی اور گل جان چپکے چپکے اپنی آنکھوں کے کناروں پر ٹپکنے والے آنسوؤں کو صاف کر رہی تھی۔

''خالہ جانی اگر رابی آپا کی شادی اور لڑکیوں کی طرح ہوتی تو کتنا مزہ آتا۔ کتنی رونق ہوتی گھر میں، میں اور کائناز بہت خوب صورت ڈریسز بنواتے، مہندی کا مایوں کا، بارات کا، ولیمے کا لیکن ہمارے گھر میں تو شاید دیواروں کو بھی نہیں پتا کہ رابی آپا کی شادی ہو رہی ہے۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا...... شادیاں تو اس طرح ہو جاتی ہیں۔ بس اللہ سے دعا کرو کہ آگے سب خیر ہو۔'' گل جان کے سینے سے ہوک سی اٹھی مگر وہ زبردستی مسکرانے لگی۔

''اچھا تم بیٹھو میں دیکھتی ہوں رابی دروازہ کھولتی ہے یا نہیں آخر اسے نہا دھو کر تیار بھی تو ہونا ہے۔ بی بی جان تھوڑی دیر میں مجھے بلا کر پوچھیں گی کہ رابی تیار ہوئی یا نہیں تو میں انہیں کیا جواب دوں گی۔ میرا تو سوچ سوچ کر دل گھبرا رہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور لاؤنج سے باہر جانے لگی اس کی رفتار سے لگتا تھا جیسے وہ خود کو گھسیٹ رہی ہو۔ بھاری بوجھ کی طرح......

☆☆☆

برہان اپنے طے شدہ ٹائم پر شاہ عالم کے گھر پر تھا، وہ اپنے موبائل پر ایک حساب سے فاتحہ پڑھ چکا تھا۔ اس نے تو سم بھی لاک کرا دی تھی لیکن جب شاہ عالم نے اس کا موبائل اس کے سامنے رکھا تو اسے یوں لگا جیسے اس کی زندگی بھر کی جمع پونجی واپس مل گئی ہو...... وہ کچھ بے یقینی کی کیفیت میں اپنے موبائل کی طرف دیکھتا رہا۔

شاہ عالم بغور اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ اُن کے چہرے پر مخصوص مسکراہٹ کے بجائے حیرت اور سنجیدگی تھی۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ، یہ تو میرے ذہن میں ہی نہیں آیا کہ میں موبائل یہاں بھی بھول کر جا سکتا ہوں۔ کمال ہے پتا نہیں میرا ذہن کدھر تھا۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا، میں تو سب سے پہلے جیب میں اپنا موبائل ہی رکھتا ہوں۔''

شاہ عالم جیسے اس کا دل رکھنے کے لیے مسکرائے۔ اُن کا ذہن ہنوز کائناز کے جملوں میں الجھا ہوا تھا جو اس کے منہ سے بڑی بے ساختگی اور بے اختیاری کی کیفیت میں نکلے تھے اور جو کچھ اس نے برہان کی ماں کے بارے میں کہا تھا وہ الجھ کر رہ گئے تھے۔ نہ جانے کیوں انہیں برہان سے ایک عجیب سی اپنائیت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ کائناز کی باتوں سے تو لگتا تھا کہ برہان ایک بہت ڈسٹربڈ ماحول میں زندگی گزار رہا ہے لیکن وہ اپنی طرف سے پہل کر کے یہ باتیں نہیں چھیڑ سکتے تھے پھر بھی انہوں نے کہہ دیا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا ایک انسان کا ذہن جب دس جگہ کام کر رہا ہو تو بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ لوگ تو چلتے پھرتے اپنی جیب کٹوا لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر شاہ عالم قدرے رکے پھر برہان کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

''بیٹا بہت معذرت کے ساتھ کہ کائناز نے آپ کی والدہ کا فون ریسیو کر لیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ پہلی بار

اس نے اٹینڈ نہیں کیا لیکن جب دوبارہ آیا تو اس نے اٹینڈ کرلیا تا کہ بتادے کہ آپ کا موبائل ہمارے پاس ہے۔ ورنہ وہ پریشان ہوتیں۔''

برہان نے بڑی فکرمندی اور پریشانی کی کیفیت میں اُن کی طرف دیکھا تھا کہ پتا نہیں اس کی ماں نے کائناز سے کیا بات کی ہوگی اور کہیں پریشانی میں کوئی ایسی ویسی بات ان کے منہ سے نہ نکل گئی ہو۔

''جی شاہ صاحب میری امی کا فون آیا تھا؟ کائناز نے کیا بتایا کیا کہہ رہی تھیں امی؟'' وہ قدرے جھجکتے ہوئے بولا۔

''بیٹا میں نے تو تفصیل نہیں پوچھی کائناز سے، وہ یہ بتارہی تھی کہ پریشان لگ رہی تھیں۔''

برہان نے یہ سن کر بڑی گہری نظروں سے شاہ عالم کی طرف دیکھا جیسے کچھ کھوجنے کی کوشش کررہا ہو۔ آیا شاہ صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں یا اسے شرمندگی سے بچانے کے لیے بات بنارہے ہیں۔

''اور ایک بات اور بات بیٹا کائناز کو رات سے ٹمپریچر ہے، مجھے یہ کہتے ہوئے واقعی بہت شرمندگی ہورہی ہے کہ ابھی تو آپ نے آنا شروع کیا ہے اور وہ چھٹی کررہی ہے لیکن میں آپ سے بہت معذرت خواہ ہوں۔''

''کوئی بات نہیں شاہ صاحب واقعی اگر کائناز کو ٹمپریچر ہے تو وہ پڑھ تو نہیں پائیں گی۔ زبردستی بیٹھیں گی بھی تو پک نہیں کرسکیں گی۔ ٹھیک ہے آج چھٹی کرلیتے ہیں، مجھے بھی اجازت دیجیے۔ ایک بار پھر آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' برہان نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ شاہ عالم کی طرف بڑھایا۔ شاہ عالم نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''شکریہ کس بات کا بیٹا آپ کی چیز تھی، آپ کو دے دی۔ کوئی احسان تو نہیں کیا آپ پر۔''

''ٹھیک ہے شاہ صاحب میں کل حاضر ہوجاؤں گا۔ میری طرف سے آپ کائناز کی طبیعت پوچھ لیجیے گا. اللہ کرے وہ جلدی ٹھیک ہوجائیں کیونکہ ان کے ایگزام بھی بالکل قریب ہی ہیں۔''

''جی، جی! وہ بھی پریشان ہورہی تھی، میں نے اسے تسلی دی تھی بیٹا ریسٹ کرنے سے جلدی ٹھیک ہوجاؤ گی۔ آخر اب دن رات ایگزام کی تیاری بھی کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے شاہ صاحب پھر خدا حافظ۔'' برہان نے ان سے مصافحہ کرنے کے بعد واپسی کے لیے دروازے کا رخ کیا۔

شاہ صاحب اس کی پشت پر نظریں جمائے سوچ رہے تھے کہ اتنا نیک بچہ ہے پتا نہیں اس بے چارے کے ساتھ کیا مسئلے مسائل ہیں، بہت سنجیدہ اور کم گو ہے، کچھ جوانیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں بڑھاپا جھلکنے لگتا ہے۔ انہوں نے یہ سوچ کر ایک گہری سانس اپنے سینے سے آزاد کی۔

☆☆☆

گل جان اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ اس کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ جیسے جیسے رات کے سائے بڑھ رہے تھے۔ اس کا دل گھٹتا جاتا تھا۔ ابھی تک اس کی ہمت نہیں ہو پائی تھی کہ وہ جا کر رابی کو مہر جان کی دی ہوئی سیاہ ساڑی دے دے۔ اسی لمحے روما اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کی کیفیت بھی گل جان سے مختلف نہیں تھی۔

گل جان نے قدموں کی آہٹ سن کر پلٹ کر دیکھا تو روما سامنے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گل جان کی نظروں میں سوال تھا کہ وہ اسے اب کیا کہنے آئی ہے لیکن ہونٹ خاموش......

''خالہ جانی وہ میں آپ سے ایک بات کہنے آئی ہوں۔'' روما نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''بولو بیٹا کیا بات ہے، خالہ سے کیوں گھبراتی ہو کم از کم مجھ سے تو کھل کر بات کرلیا کرو، بےخوف ہوکر۔'' کہتے کہتے گل جان کے لہجے میں ایک درد سا امنڈ آیا۔

''خالہ جانی وہ...... میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ اماں جان سے پوچھ لیں۔ رابی آپا کی آج شادی ہے، وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے چلی جائیں گی تو کیا میں کائناز کو بلالوں۔''

''نہیں بیٹا تمہاری رابی آپا کی شادی نہیں ہورہی اسے تو دیس نکالا مل رہا ہے اگر شادی والا ماحول ہوتا تو میں ضرور بات کرلیتی۔'' گل جان نے یہ سن کر روما کی طرف دیکھا پھر گہری سانس لے کر بڑی اداسی سے مسکرائی اور بولی۔

''دیس نکالا...... یہ کیا ہوتا ہے خالہ جانی؟'' روما نے الجھی الجھی نظروں سے خالہ کی طرف دیکھا تھا۔

''یہ کالے پانی کی سزا ہوتی ہے۔ ایسی سزا کہ بندے کو اس کے وطن سے نکال دیا جاتا ہے۔ اسے دیس نکالا کہتے ہیں۔''

''میں نے تو آج کائناز کو فون بھی نہیں کیا اور حیرت کی بات ہے کہ اس کا بھی فون نہیں آیا۔'' روما خود کلامی کی کیفیت میں بول رہی تھی۔

''بیٹا بس اب یہ کائناز...... کائناز کہنا بند کردو، جوان ہوگئی ہو آخر کل کو تمہاری اور کائناز کی بھی شادی ہونی ہے۔ اس طرح سے کسی کو اپنی زندگی کا حصہ نہیں بناتے کہ پھر اس سے جدا ہونے کے خیال سے ہی تکلیف ہونے لگے۔'' گل جان سمجھانے کے انداز میں بولی۔

''خالہ جانی ایک کائناز ہی تو ہے جو مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے، میرا اتنا خیال کرتی ہے، اب آپ چاہتی ہیں کہ میں اسے بھی چھوڑ دوں۔ آخر آپ اور اماں کیوں چاہتی ہیں...... کائناز سے آپ کو اور اماں کو تکلیف کیا ہے؟'' روما نے خاصا برا مان کر اس کی طرف دیکھا۔

''بیٹا بات تکلیف کی نہیں ہے، بات صرف اتنی ہے کہ زندگی خوابوں کے سہارے نہیں کٹتی، حقیقت پسندی کے ساتھ گزارنا پڑتی ہے۔ ٹھیک ہے جب تم دونوں چھوٹی تھیں تو ہم یہی سوچتے تھے کہ اکیلا بچہ پریشان ہوجاتا ہے، تنہائی سے اکتا جاتا ہے، گھبرا جاتا ہے۔ دونوں بچیاں ایک ساتھ کھیلتی ہیں، خوش رہتی ہیں تو کوئی حرج نہیں لیکن اب وقت کے ساتھ ساتھ خود کو تبدیل کرو......''

''تو آپ کا مطلب ہے کہ کائناز کو نہیں بلانا چاہیے؟''

''ہرگز نہیں......'' گل جان نے تیزی سے جواب دیا تھا۔ ''کائناز کو تو ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے کہ آج کی تاریخ میں اس گھر میں کیا ہورہا ہے۔ ٹھیک ہے ہم دنیا سے منہ چھپا کر بیٹھے ہیں لیکن انسان بھی تو ہیں، کب تک تماشا بنیں۔'' بولتے بولتے گل جان کی آواز پر آنسوؤں کا تاثر غالب آگیا۔

روما کو دکھ ہوا جیسے اس نے اپنی خالہ کا دل دُکھادیا ہے، جلدی سے ان کے قریب آئی اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے بولی۔

''خالہ جانی سوری، میں نے آپ کو پریشان کردیا۔ میں تو بس ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔ آخر لوگ شادی پر مہمانوں کو بلاتے ہی ہیں۔ کوئی نہیں آرہا تو کائناز کو ہی بلالیں لیکن خیر چھوڑیں اگر آپ سمجھتی ہیں کہ نہیں بلانا چاہیے تو نہیں بلاتی۔'' وہ بہت اپنائیت بھرے انداز میں گل جان کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''بیٹا میں تم سے صرف اتنا کہوں گی کہ اس بات کو جہاں تک ہوسکے چھپا سکتی ہو تو چھپا کر رکھنا۔ کائناز کو

"بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔" روما نے حیرت سے گل جان کی طرف دیکھا۔

"لیکن کیسے بھی سہی رابی آپا کی شادی تو ہو رہی ہے ناں، کوئی غلط کام تو نہیں ہو رہا پھر اس میں چھپانے والی بات کیا ہے؟"

"خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ روما، مجھ پر رحم کرو، خدا کے لیے بیٹا بند کرو یہ سوال جواب...... خاموش ہو جاؤ۔" گل جان کی آنکھوں سے اب آنسو بہنے لگے تھے۔

"اچھا، اچھا ٹھیک ہے خالہ جانی، آپ روئیں نہیں، میں اب کوئی بات نہیں کروں گی۔ کچھ نہیں پوچھوں گی آپ سے۔" روما کو ان کے آنسو دیکھ کر ڈر ہی گئی۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گئی تھی۔

گل جان نے اندر اٹھتی ہوئی ٹیسوں کو دبانے کے لیے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچل ڈالا تھا۔

☆☆☆

کائناز بخار کی شدت سے نڈھال نظر آ رہی تھی۔ شاہ عالم تھرمامیٹر سے اس کا بخار چیک کر رہے تھے۔

"شکر ہے ٹمپریچر کچھ تو کم ہوا۔" وہ تھرمامیٹر واپس رکھتے ہوئے کائناز کی طرف بہت پیار سے دیکھ رہے تھے۔

"لیکن دادا مجھے تو لگتا ہے کہ مجھے ٹمپریچر ویسے کا ویسے ہی ہے۔ آنکھیں جل رہی ہیں میری۔"

"نہیں بیٹا ایسی بات نہیں ہے، بس یہ ہے ناں کہ ایک دو دن تیز بخار چڑھ جائے تو کمزوری بہت ہو جاتی ہے پھر سنبھلنے میں دن تو لگ جاتے ہیں ناں۔" وہ سمجھانے کے انداز میں بول رہے تھے۔

"دادا جان میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تیز مرچوں والی بریانی کھاؤں۔" وہ بچوں کی طرح منہ بسور کر بولی۔

شاہ عالم بے ساختہ ہنس دیے۔

"بیٹا انسان کی فطرت ہے جس چیز سے قدرت اسے روکتی ہے وہ اسی کی طرف تیزی سے لپکتا ہے۔ پابندی، آزادی کی تڑپ پیدا کرتی ہے روٹین میں ہم لوگ کچھ چیزیں خود سے avoid کرتے ہیں لیکن جب اُن چیزوں پر پابندی لگ جاتی ہے تو اُن میں بڑی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ میرا بیٹا ایک دو دن ریسٹ اور پرہیز کر لو، اس کے بعد روزانہ بریانی کھانا، ٹھیک ہے۔" وہ اسے بچوں کی طرح بہلا رہے تھے۔

"لیکن دادا جان روما میں تو میں نے ایسی کوئی تڑپ نہیں دیکھی، وہ تو خوشی، خوشی اپنی اماں جان کی ساری پابندیاں قبول کر لیتی ہے۔ اتنی سی خواہش نہیں ہے اس کے اندر۔"

"بیٹا بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہو... وہ ماں بیٹی کا معاملہ ہے، ماں کی پابندی، پابندی نہیں ہوتی۔ وہ تو اولاد کی دیکھ بھال کا ایک حصہ ہوتی ہے، بے وقوف۔" پوتی کی بات سن کر انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"آپ تو مجھ پر اتنی زیادہ پابندی نہیں لگاتے، اب یہ دیکھیں ناں اس نے اپنی اماں جان کی وجہ سے آج مجھے فون بھی نہیں کیا۔" وہ منہ بسور کر بولی تھی۔

"یہ کیسے کہہ سکتی ہو بیٹا کہ اس نے اماں جان کی وجہ سے فون نہیں کیا، ہو سکتا ہے وہ اپنے کام میں اتنا بزی ہو تھوڑی دیر بعد فون کرے۔"

"ایسا ہوتا تو نہیں ہے، صبح سے لے کر رات تک اگر میرا فون نہ جائے تو اس کا فون ضرور آتا ہے اور شاید اسے تو پتا بھی نہیں ہے کہ مجھے اتنا تیز بخار ہے۔"

"پتا نہیں ہے تو پتا چل جائے گا بیٹا! یہ ہر بات میں روما آ جاتی ہے، بس اب تم لوگ بڑی ہو گئی ہو، یہ بچوں والی باتیں چھوڑو۔"

"سب لوگ یہی چاہتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے دوستی ختم کر دیں۔"

"یہ بات نہیں ہے بیٹا، ہر بات میں ہر کام میں توازن، اعتدال بہت ضروری ہوتا ہے۔ زندگی میں بڑی سہولت رہتی ہے، خیر تم چھوڑو، زیادہ باتیں نہیں کرو، آرام کرو اگر روما سے بات کرنا چاہتی ہو تو فون ملا لو تمہارا دل بہل جائے گا۔" یہ سنتے ہی کائناز نے اِدھر اُدھر دیکھا اور قریب پڑا ہوا اپنا موبائل اٹھا لیا۔

"اتنی دیر سے آپ سے فالتو باتیں کیے جا رہی ہوں، اتنی دیر میں تو میری روما سے بہت ساری باتیں ہو جاتیں۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا فضول میں آپ سے لڑنے لگی، سوری دادا جان۔" روما نمبر دباتے ہوئے ان سے کہہ رہی تھی اور شاہ عالم اس کے بچپنے پر مسکرا رہے تھے۔

کائناز نے نمبر پریس کر کے موبائل کان سے لگایا اور کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگی پھر بڑا برا سا منہ بنا کر دادا سے گویا ہوئی۔

"یہ دیکھیں رنگ پاس ہو رہی ہے اور جواب آ گیا کہ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا۔" اس نے بڑے انداز سے ایک، ایک لفظ چبا کر کہا اور غصے بھرے انداز میں موبائل پٹخ دیا۔

"ایک بار پھر ٹرائی کر لو بیٹا، ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ بزی ہوں۔" یہ کہہ کر شاہ عالم اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

"اب تم آرام کرو بیٹا جتنا زیادہ آرام کرو گی اتنی جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی، شاباش میرا بیٹا۔" وہ اٹھ کر کائناز کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔

☆☆☆

گل جان بہت افسردہ کیفیت میں رابی کے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں مہر جان کی دی ہوئی سیاہ ساڑی تھی لیکن رابی دروازہ کھولنے پر تیار نہیں تھی کچھ دیر بعد اندر سے ہی بولی۔

"خالہ جانی میرے پاس بہت سارے کپڑے ہیں کوئی بھی پہن لوں گی۔ مجھے نہیں چاہیے یہ شادی کے کپڑے۔"

"بیٹا ایک نظر دیکھ تو لو، کہاں ہیں یہ شادی والے کپڑے، بس تمہاری اماں جان کا حکم ہے کہ تم نکاح کے وقت یہ کپڑے پہن لو۔" گل جان نے بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں کو کنٹرول کرتے ہوئے یہ جملہ کہا تھا۔ درد سے جیسے اس کا کلیجا پھٹا جا رہا تھا۔

"مجھے نہیں پہننا خالہ جانی! اسپیشلی اماں جان کے دیے ہوئے کپڑے تو پہننا ہی نہیں ہیں۔"

"بیٹا ضد نہ کرو، فضول میں ایک چھوٹی سی بات بڑی بن جائے گی، دیکھ تو لو ایک نظر، میں تو سمجھ رہی ہوں کہ تم یہ ساڑی دیکھو گی تو تمہیں بہت پسند آئے گی۔ یہ تمہارے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہے۔" گل جان کے منہ سے بلا ارادہ ہی بڑی بے ساختگی میں نکل گیا۔ اسی وقت جیسے رابی کی جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔

"کیا مصیبت ہے۔" اتنا کہتے ہی اس نے دروازہ کھول کر اپنا ہاتھ باہر نکال دیا تھا۔ "لائیں دے دیجیے دیکھتی ہوں ایسا کون سا شاہانہ جوڑا آیا ہے۔"

گل جان نے اپنے تڑپتے ہوئے دل کو سنبھالا اور ساڑی رابی کے ہاتھ میں تھما دی۔ ساڑی لیتے ہی رابی کا ہاتھ دوبارہ اندر گیا اور دھڑ کی آواز سے دروازہ بند ہونے کے ساتھ ساتھ لاک لگنے کی آواز بھی آئی۔

"ساڑی دیکھ کر کچھ بھی نہیں بولی رابی، کچھ تو بولتی۔" گل جان نے خود کو سنبھالا اور بڑی اداسی سے مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

☆☆☆

رابی وہ ساڑی ہاتھوں میں لیے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ تھی۔

''بہت خوب صورت انتخاب ہے اماں جان کا، جواب نہیں آپ کا میرے جذبات اور احساسات کی کیا کمال ترجمانی کی ہے آپ نے، میں کس زبان سے شکریہ ادا کروں، اتنا خوب صورت اور حسین جوڑا آج تک کسی دلہن نے نہیں پہنا ہوگا۔'' وہ بڑبڑانے والے انداز میں جیسے اپنے آپ سے باتیں کررہی ہو، چند لمحے ساڑی کو دیکھنے کے بعد جیسے وہ اپنے دھیان سے چونک پڑی اور ڈریسنگ روم کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ڈریسنگ روم سے باہر آئی تو اس نے سیاہ ساڑی زیب تن کی ہوئی تھی۔ اس کی سرخ اور سفید رنگت پر سیاہ رنگ کی یہ ساڑی گویا غضب ڈھا رہی تھی۔ رابی نے اپنے ہاتھ پر آنچل پھیلاتے ہوئے تھوڑا سا اِدھر اُدھر لہرا کر خود کو آئینے میں دیکھا۔ عجیب پُراسرار سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ اس کے خوب صورت لمبے بال کمر تک پھیلے ہوئے تھے وہ لہرا لہرا کر اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ آئینے نے بالکل سچ سچ بتادیا کہ اس وقت وہ قیامت ڈھا رہی ہے۔ چند لمحوں تک وہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی رہی پھر اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی ہوئی ایک قینچی اٹھائی اور پاگلوں کی طرح اپنے بالوں کو کاٹنا شروع کردیا، دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گھنے لمبے سیاہ بال فرش پر بکھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑی بڑی لٹیں کاٹنے کے بعد اس نے قینچی کو بالوں میں اِدھر اُدھر پھنسا کر کٹنگ کرنا شروع کی اور تھوڑی ہی دیر میں تقریباً اس کے سر کے تمام بے ترتیب بال کٹ کر فرش پر بکھر چکے تھے۔ اس نے اتنی بے ترتیبی سے قینچی چلائی تھی کہ کسی کسی جگہ سے تو باقاعدہ سر کی جلد بھی جھلکنے لگی تھی۔ سر کے تمام بال بڑے بے تُکے پن سے کٹ چکے تھے۔ چہرہ بدل گیا تھا۔ اب اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی ایک شیشی اٹھائی اس شیشی میں تیزاب تھا۔ اس نے روئی ڈبو ڈبو کر اپنے چہرے پر اس تیزاب سے لکیریں کھینچنا شروع کیں۔ جہاں جہاں تیزاب لگتا جاتا تھا وہاں وہاں سے جلد پھٹتی جاتی تھی۔ اس وقت اس کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ کوئی بھی جسمانی تکلیف اس کی روحانی تکلیف پر غالب نہیں آسکتی تھی اور اس عمل کے دوران ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ جو لوگ خود کو آگ لگا کر خودکشی کرتے ہیں ان کی ذہنی حالت کیا ہوتی ہوگی۔ وہ آگ بھی ان کو نہیں ڈرا پاتی۔ ایک ذرا سا چھالا پڑنے پر دنوں چین نہیں آتا۔ لوگ اپنے ہاتھوں سے خود کو بڑے بڑے شعلوں کے حوالے کیوں کردیتے ہیں۔ اسے اب سب سمجھ آرہی تھی۔ تیزاب کی لکیروں نے اس کے چہرے پر ایک جال سا بُن دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شکل انتہائی ڈراؤنی اور بھیانک نظر آنے لگی تھی۔ تیزاب کی جلن بہت شدید تھی لیکن غم وغصے کی آگ اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے اپنا کام مکمل کرکے اب خود کو آئینے میں سر سے پاؤں تک دیکھا اور غرّانے والے انداز میں خود کلامی کرنے لگی۔

''اماں جان اس رابی کو لے کر جائے گا آپ کا سہراب خان، تھوکے گا بھی نہیں۔ آج میں نے آپ کو ایسی مات دی ہے کہ اس کے بعد آپ کبھی شطرنج کھیلنے کا نہیں سوچیں گی۔ سارے مُہرے پٹ گئے ہیں آپ کے، آپ کو خاندانی عزت کا بہت خیال رہتا تھا۔ جنازہ نکال دیا ہے میں نے آپ کی اس عزت کا۔ جب سہراب خان اس گھر سے خالی ہاتھ جائے گا تو یقیناً آپ اپنے آپ سے ضرور ایک وعدہ کریں گی کہ آج سے اس گھر میں ظلم کا بازار بند ہوگیا ہے۔'' یہاں تک سوچتے ہی اس کی آنکھوں سے تواتر سے آنسو بہنے لگے۔ تیزاب نے اس کے چہرے کو جھلسا دیا تھا لیکن اسے تیزاب کی تپش سے زیادہ انتقام کی آگ میں شدت محسوس ہورہی تھی۔ تیزاب کی آنچ انتقام کے سامنے کچھ نہیں تھی۔ اپنا بھیانک چہرہ آئینے میں دیکھتے ہی اس نے اتنا سکون محسوس کیا جیسے کوئی مزدور دن بھر جلتی دھوپ میں محنت مشقت کرنے کے بعد ٹھنڈی چھاؤں میں میٹھی نیند سوگیا ہو۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہرجان بہت خوب صورت ساڑی پہن کر اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھیں اور بار بار دروازے کی طرف یوں دیکھتی تھیں جیسے انہیں کسی کے آنے کا انتظار ہے چند ہی لمحے بعد اصیل خان سر جھکائے اندر داخل ہوا تھا۔

مہرجان کے ہونٹوں پر ایک تمسخرانہ مسکراہٹ ابھری وہ اصیل خان کو سر سے پاؤں تک دیکھنے لگیں اور بڑی شانِ استغنا سے مخاطب ہوئیں۔

''بارات پانچ منٹ میں پہنچنے والی ہے اصیل خان اور بارات کا استقبال تم کروگے۔ سہراب خان کے گلے میں پھولوں کا ہار تو تم ڈالو گے۔ دیکھو ناں اس گھر میں مرد تو صرف تم ہی ہو۔ اب میں سہراب خان کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتی ہوئی اچھی لگوں گی۔ خود ہی سوچو۔'' مہرجان ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کررہی تھیں۔ اصیل خان کا جھکا سر مزید جھکتا چلا گیا۔

''تم نے سنا اصیل خان میں نے تم سے کیا کہا؟''

''جی بیگم صاحبہ آپ جیسے کہیں ویسے ہی ہوگا۔'' اصیل خان کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

مہرجان نے اصیل خان کی شکل دیکھی پھر ایک قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔

''آج میں بہت خوش ہوں اصیل خان، اللہ نے چاہا تو ایک بہت بڑی ذمے داری کا بوجھ میرے کندھوں سے اتر جائے گا۔ شاید برسوں بعد آج میں سکون کی نیند سوؤں گی۔ مجھے تو یاد ہی نہیں کہ سکون کی نیند کسے کہتے ہیں؟''

اصیل خان نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ جیسے اگلے حکم کا منتظر کھڑا ہوا تھا۔

''رہ گئی روما تو سوچتی ہوں ضروری تو نہیں کہ ہر لڑکی کی شادی ہو۔ آخر گل جان اور میں بغیر مرد کے جی رہے ہیں، ہمیں کیا فرق پڑا ہے بلکہ لوگ تو مجھے منہ پر کہتے ہیں کہ میں سو مردوں کے برابر ایک مرد ہوں تو روما بھی شادی کے بغیر رہ سکتی ہے، رابی کی شادی کی فکر مجھے اس لیے تھی کہ اس لڑکی سے مجھے دھڑکے بہت تھے اور وہ غلط بھی نہیں تھے۔ ایک کارنامہ تو وہ انجام دے کر ثابت کرچکی ہے کہ میرے دھڑکے اور اندیشے غلط نہیں تھے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں اصیل خان؟'' وہ بولتے بولتے اصیل خان سے پوچھنے لگیں۔

''جی بیگم صاحبہ......'' اصیل خان کی آواز بہت مشکل سے نکلی تھی۔ یوں جیسے اس نے اپنی پوری قوت اکٹھی کرکے دو لفظ بولنے کی استطاعت حاصل کی ہو۔

مہرجان شاید خود ہی بولتے بولتے تھک گئیں۔ انہوں نے چند لمحے سوچا ایک دم ہی ان کا لب ولہجہ اور انداز بدل گیا۔

''اب تم، یہاں سے اپنی شکل گم کرو، میرا خیال ہے کہ بس وہ لوگ گیٹ پر پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ اچھا سا استقبال کرنا آخر اس گھر کی پہلی بیٹی کی شادی ہے۔ ہونے والے دولہا کو احساس ہونا چاہیے کہ ہم نے اس کی بہت عزت افزائی کی، سر آنکھوں پر بٹھایا اب تم جاؤ۔'' اصیل خان بنا کچھ بولے چپ چاپ واپس پلٹ گیا۔

مہرجان کے ہونٹوں پر زہر خند ابھری۔

''کیسے جارہا ہے جیسے اس نے بوجھ اٹھا رکھے ہوں حالانکہ سارے بوجھ تو میرے کندھوں پر رکھے ہوئے ہیں۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئیں۔

☆☆☆

گل جان کے جی کو عجیب بے قراری لگی تھی۔ سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے، نہ بیٹھے چین پڑتا تھا نہ کھڑے...... رابی کو کپڑے تو دے دیے تھے۔ سیاہ ساڑی اسے دے کر اس پر ثابت کر دیا تھا کہ اب وہ تذلیل کے اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے جا رہی ہے۔ اس کے نصیب میں اندھیرے لکھے ہیں اور اسے اندھیروں سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔

اسی وقت اس نے دیکھا کہ اصیل خان سر جھکائے باہر کی طرف جا رہا ہے۔

وہ تیزی سے آگے بڑھی یونہی بات برائے بات کی... یا بے قراری کے ہاتھوں بے قرار ہو کر اس سے پوچھ لیا۔

''اصیل خان کہاں جا رہے ہو؟''

اصیل خان نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ جھکا ہوا سر جھکا ہی رہا البتہ بہت اختصار سے گویا ہوا۔

''گل جان بی بی، بارات بس پہنچنے ہی والی ہے، دولھا کے گلے میں ہار ڈالنے جا رہا ہوں۔'' اس کے لہجے میں وہ کچھ تھا جو گل جان کی بے قراری کو شعلوں کی طرح بھڑکا رہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحبہ کا حکم ہے کہ گھر میں تمہارے علاوہ کوئی مرد نہیں ہے اس لیے دولھا کو ہار مجھے ہی پہنانا ہوگا۔'' اتنا کہہ کر وہ چل پڑا تھا اور اس نے گل جان کے ردِعمل یا جواب کا انتظار نہیں کیا تھا۔

گل جان اپنی جگہ لب بستہ کھڑی تھی۔

عین اسی لمحے مین گیٹ پر یکے بعد دیگرے تیز ہارن سنائی دیے۔ پھر اس نے گیٹ کھلنے کی آواز سنی، آگے بڑھ کر جھانکنے کچھ دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اپنے دل کو تھام کر وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ آنسو بھی گویا خشک ہو چکے تھے۔ شور مچانے، ماتم کرنے کا حوصلہ و جرأت بھی نہیں تھی۔ عجیب سی بے اختیاری تھی عجیب سی بے بسی پھر اس نے دیکھا گلے میں سرخ گلابوں کا ہار پہنے سہراب خان کچھ لوگوں کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف جا رہا تھا۔ اصیل خان کی رہنمائی میں گل جان کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کھڑے کھڑے مر جائے گی مگر وہ نہیں مری.. اور اپنے آپ سے گویا ہوئی جیسے خود پر تمسخر کر رہی ہو۔

''بے غیرتی اتنی بڑی بات نہیں کہ انسان مر جائے۔ گل جان تجھے تو مرنے کے لیے کسی حشر کا انتظار کرنا چاہیے...... اتنا کچھ تو ہو گیا مگر تو کتنی سخت جان ہے، موت حملہ آور ہونے کی جرأت ہی نہیں کر پا رہی حالانکہ تو تو موت کو یوں ڈھونڈتی پھرتی ہے جیسے... کوئی قیمتی چیز گم ہو گئی ہو مگر نہیں ملتی۔''

وہ یہیں تک سوچ پائی تھی کہ اسے اپنی پشت سے مہر جان کی آواز آئی۔

''گل جان تم وہاں کھڑی کیا کر رہی ہو، جاؤ جا کر دیکھو رابی تیار ہوئی یا نہیں...... میں سہراب خان سے بات کرتی ہوں اور نکاح کے لیے قاضی کو اندر بھیجتی ہوں، تم رابی کے ساتھ ہی رہو اسے اکیلا چھوڑنے کی حماقت نہیں کرنا۔''

گل جان نے پلٹ کر مہر جان کی طرف دیکھا جو بہت اچھی طرح ڈریس اپ تھیں اور اپنا سب سے قیمتی ڈائمنڈ سیٹ بھی پہنے ہوئی تھیں جو آج گل جان نے بیس پچیس برس بعد انہیں پہنے دیکھا تھا۔

''جی بی بی جان جاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ رابی کے کمرے کی طرف جانے لگی۔ اسے مہر جان کے قریب سے گزر کر آگے بڑھنا تھا جونہی وہ مہر جان کے قریب سے گزری مہر جان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

گل جان نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں مہر جان نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بڑے پُراسرار

انداز میں مسکرائیں۔

مہر جان کی آنکھوں میں جانے ایسا کیا تھا کہ گل جان نے گھبرا کر فوراً نظریں جھکا لیں۔ مہر جان نے اس کی پشت تھپتھپائی...... اور آہستہ آواز میں بولیں۔

''ویل ڈن گل جان...... ویل ڈن......'' گل جان خود کو سنبھالتی آگے بڑھ گئی اور مہر جان ڈرائنگ روم کی طرف۔

☆☆☆

''دادا جان میں بہت بور ہو رہی ہوں دل گھبرا رہا ہے میرا...... کب تک لیٹی رہوں؟'' کائناز منہ بسور رہی تھی۔

شاہ عالم تھرمامیٹر سے اس کا ٹمپریچر دیکھ رہے تھے۔

''بیٹا ٹی وی پر کوئی اچھا سا پروگرام دیکھ لو، آخر لوگ ٹی وی بوریت دور کرنے کے لیے ہی دیکھتے ہیں۔'' شاہ عالم کو اس کی بوریت دور کرنے کا ایک یہی حل سوجھا۔

''میں نے سب پروگرام چیک کر لیے ہیں کہیں سے بھی میرے مطلب کا کوئی پروگرام نہیں آرہا۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔

''تو بیٹا...... کوئی اچھی سی کتاب پڑھ لو، کہتے ہیں ناں کتاب بہترین دوست ہوتی ہے۔'' شاہ عالم کو آخر کار بہت مناسب جواب مل گیا۔ یہ سن کر کائناز کے چہرے پر ایک چمک سی پیدا ہوئی جو اس کی روحانی مسرت کی غماز تھی۔ ایک لمحے میں ہی جیسے اس کی ساری کمزوری، اضمحلال ہوا میں اُڑ گیا۔ یوں کہ کسی بیمار کو مطلوبہ دوا مل گئی اور پہلی خوراک سے ہی افاقہ ہو گیا ہو۔

''جب اللہ نے مجھے بہترین دوست دی ہے تو میں بہترین دوست کیوں تلاش کروں؟ کیوں خود کو دھوکا دوں......؟ اپنی دوست سے کیوں نہ باتیں کروں؟''

شاہ عالم نے گویا اپنا سر ہی پیٹ لیا۔ انتہائی قیمتی آدرش کو تو اس نے کاغذ کا جہاز بنا کر اڑا دیا تھا۔

''میرے خدایا...... یہ مشینی دور کے مشینی بچے۔''

''سمجھ گئی...... مگر اب براہ کرم مرغی نہ کہہ دیجیے گا مجھے۔'' کائناز شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی تو شاہ عالم...... بڑی بے ساختگی سے ہنس دیے یہ معصوم پوتی تو اب ان کا کل جہاں تھی۔ عجائباتِ عالم ایک طرف اور یہ پوتی ایک طرف......

''تو پھر ٹھیک ہے تم اپنی بہترین، نابغۂ روزگار، اکلوتی دوست کو فون ملاؤ اور جی بھر کر باتیں کرو۔'' وہ اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اتنی مشکل اردو نہ بولا کریں دادا جان...... اتنے وزنی الفاظ یوں لگ رہا ہے جیسے میں نے ایک ساتھ تین کھجوریں کھا لیں...... اور تین گٹھلیاں میرے حلق میں پھنس گئیں۔'' کائناز اپنی گردن پر ہاتھ رکھتے ہوئے بہت مزاحیہ انداز میں بولی۔

''حالانکہ لفظ دو ہیں تو گٹھلیاں تین کیوں؟ نابغۂ روزگار...... گنتی کرو کتنے الفاظ ہیں؟'' وہ بھی مذاق کرنے لگے۔

''نہ کریں دادا جان...... ہمیں آرام سے جینے دیں...... ان دو لفظوں کے بغیر بھی گزارہ ہو سکتا ہے۔''

''مگر روما کے بغیر نہیں ہو سکتا۔'' شاہ عالم نے برجستہ کہا تو کائناز کھلکھلا کر ہنس دی اور برابر سے سیل فون

اٹھا کر روما کا لینڈ لائن نمبر ملانے لگی پھر برا سا منہ بنا کر سیل پٹخنے کے انداز میں رکھ دیا۔ شاہ عالم جاتے جاتے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا ہوا؟''

''نمبر انگیج ہے ابھی تک۔ اس کی اماں جان اسپتال کی کسی نرس کو جھاڑ پلا رہی ہوں گی۔''

''تھوڑی دیر بعد ٹرائی کر لینا۔''

''پوری جلاد ہیں روما کی اماں جان...... آج کل تو اسکول کے بچوں کے پاس سیل فون ہوتے ہیں، ماسیوں، سوئیپر کے پاس ہوتے ہیں مگر روما واحد پاکستانی ہے جسے سیل فون مل گیا تو وہ خراب ہو جائے گی... ہونہہ!''

''بری بات بیٹا دوست سے پیار کرتے ہیں تو اس کے تمام رشتوں کو اہمیت و عزت دیتے ہیں۔'' شاہ عالم نے ٹوک دیا۔

''دادا جان ایسا کریں......'' اتنا کہہ کر وہ رک گئی جیسے اسے اندیشہ ہو کہ وہ اس سے اتفاق نہیں کریں گے۔

''کیا کروں بیٹا؟''

''دادا جان تین گھر چھوڑ کر تو روما کا گھر ہے، آپ مجھے اس کے گھر چھوڑ آئیں۔ پرامس میں بس ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤں گی۔ ابھی تو مجھے اس سے لڑائی بھی کرنی ہے، صبح سے اس نے مجھے فون کر کے میری خیریت نہیں پوچھی اور نہ میرا فون اٹینڈ کیا...... اب تو آنٹی بھی اسپتال سے ڈسچارج ہو چکی ہیں۔''

''ہو سکتا ہے اس کی اپنی طبیعت خدانخواستہ خراب نہ ہو...... چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں ورنہ تم اسی طرح میرے کان کھاتی رہو گی۔'' یہ سنتے ہی کائناز کے وجود میں جیسے برق سی دوڑنے لگی تھی۔

☆☆☆

''ابھی تو آپ آئے تھے پھر یونیفارم پہن لیا ہے، خیر تو ہے۔'' صابرہ، جابر علی کو کھانا کھانے کا کہنے آئی تھی۔ دیکھا تو وہ یونیفارم پہنے ہوئے ... بالکل تیار کھڑا تھا۔

''نوکری ہے بادشاہی نہیں...... فون آ گیا ہے ریڈ کرنے جانا ہے۔'' جابر علی نے اپنے مخصوص انداز میں پتھر پھوڑے۔

''وہ...... کھانا تو لگا دیا ہے۔'' صابرہ الجھ کر رہ گئی کب سے اہتمام کر رہی تھی۔

''کھانے کا تو اب ٹائم نہیں ہے جلدی سے ایک پیالی چائے پلا دو۔'' وہ اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے عجلت بھرے انداز میں بولا۔

''جا کہاں رہے ہیں؟'' صابرہ نے باہر نکلتے نکلتے پوچھ لیا۔ کب سے پلان کر رہی تھی کہ برہان سے فون پر تفصیل سے بات کرے مگر موقع ہی نہیں مل رہا تھا اسی لیے اس نے پوچھ بھی لیا تھا جبکہ آج سے پہلے اس نے کبھی اس کے آنے جانے کا نہیں پوچھا تھا۔

''لاڑکانہ...... اب صبح ہی واپسی ہو گی۔ دروازے وغیرہ اچھی طرح بند کر کے سونا، گھر میں صرف لڑکیاں ہیں۔''

''جی...... ظاہر سی بات ہے گھر میں مرد ہو تو بڑا حوصلہ رہتا ہے۔'' صابرہ نے جانے کس خیال کے تحت بڑی اداسی سے کہا تھا گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔

''دیکھتی نہیں ہو...... ڈبل ڈیوٹیاں کر رہا ہوں۔ پھر بھی کھڑی باتیں سنا رہی ہو جتا رہی ہو کہ تمہارا بیٹا گھر

چھوڑ کر چلا گیا ہے، روتی رہو اس کو...... بیٹا بیٹا...... ہونہہ۔'' یہ کہہ کر اپنا ریوالور ہولسٹر میں پھنساتا اور صابرہ کو گھورتا ہوا اپنی الماری میں جانے کیا ڈھونڈنے لگا وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ جابر علی چائے پی کر فوراً ہی چلا گیا تھا بلکہ ابھی چائے کا کپ ہاتھ میں ہی تھا کہ گاڑی اسے لینے آ گئی تھی۔ جابر علی کے جاتے ہی صابرہ نے بڑی بے تابی سے برہان کا نمبر ملایا تھا۔ ستارہ ٹی وی دیکھنے میں مگن تھی وہ بھی غالباً یومِ نجات منا رہی تھی۔ شبینہ البتہ کچن میں بڑی ذمے داری سے کام کر رہی تھی، برہان بھی جیسے ماں کی کال کے انتظار میں ہی بیٹھا تھا۔ پہلی رِنگ پر ہی اس نے کال ریسیو کی تھی۔

''السلام علیکم امی......!'' برہان نے کال وصول کرتے ہی سلام کیا تھا گویا اسے سو فیصد یقین تھا کہ گھر سے آنے والی کال اس کی ماں کی ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی آواز سنتے ہی صابرہ یوں کھل اٹھی گویا سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا ہو۔

''جیتے رہو...... جُگ جُگ جیو...... اللہ تمہیں ہر غم ہر پریشانی سے دور رکھے، آمین۔ بیٹا کل میں تمہیں فون کرتی رہی، تمہارا نمبر تو لگ رہا تھا مگر تم نے اٹھایا نہیں، میں بہت پریشان ہو گئی تھی پھر اس بچی نے فون اٹھایا جسے آج کل تم پڑھانے جاتے ہو اس سے پتا چلا کہ تم اپنا موبائل اس کے گھر پر بھول گئے تھے۔''

''جی امی!'' پھر یوں رکا جیسے بولتے ہوئے ہچکچاہٹ ہو رہی ہو۔ بالآخر پوچھ ہی لیا۔

''وہ امی جب آپ کی بات کائناز سے ہوئی تو......''

''کائناز......؟ کائناز کون؟'' صابرہ نے اس کی بات کاٹ کر الجھ کر پوچھا۔

''امی میں اسی لڑکی کی بات کر رہا ہوں کل جس سے آپ نے بات کی اس کا نام کائناز ہے۔''

''اوہ...... ماشاء اللہ بہت پیارا نام ہے۔ اس کی تو آواز بھی بہت پیاری ہے، یقیناً صورت بھی پیاری ہو گی۔'' صابرہ بہت محبت بھرے لہجے میں بولی تھی۔

''امی وہ میری اسٹوڈنٹ ہے میں نے اسے غور سے نہیں دیکھا۔'' برہان کو سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ کائناز کی تعریف سن کر جواب میں کیا کہے جو سمجھ میں آیا کہہ دیا۔

صابرہ اپنے بیٹے کی سادگی پر قربان ہو گئی۔

''ماں قربان جائے کتنا سیدھا ہے میرا بچہ...... بیٹا کسی کو غور سے دیکھ کر تھوڑا ہی پتا چلتا ہے کہ اس کی صورت شکل کیسی ہے، یہ تو ایک نظر میں ہی پتا چل جاتا ہے...... ماشاء اللہ بہت میٹھی آواز ہے اس بچی کی۔''

''امی...... آپ نے کائناز کی تعریف کرنے کے لیے فون کیا ہے مجھے؟'' برہان اب مسکرا کر ماں سے پوچھ رہا تھا۔

''آپ نے کیا باتیں کیں اس سے... مارے محبت کے سب کچھ تو نہیں بتا دیا؟''

''کیسی باتیں کرتے ہو، تمہاری عزت مجھے اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے اور پھر پرائی بچی سے میں کیوں گھر کی باتیں کرنے لگی؟'' صابرہ نے ایک ہی جواب میں برہان کو مطمئن کر دیا تھا۔

''اور باقی سب خیریت ہے ناں امی؟'' برہان اب سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ صابرہ اس کے سوال پر الجھ سی گئی۔ جگر کے ٹکڑے کے آگے دل کھول کر رکھ دینے کو جی چاہتا تھا مگر اسے ایک نئے بڑے صدمے سے دوچار کرنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ وہ کیسے اسے یہ دل ہلا دینے والی خبر سناتی کہ جو شخص تمہارے حساب سے شبینہ کے جوڑ کا نہیں تھا، تمہارا باپ اس سے ستارہ کی شادی کر رہا ہے۔

''ہیلو...... ہیلو امی! آپ کو میری آواز آ رہی ہے؟'' صابرہ ایک دم چونک پڑی۔

''آں...... ہاں آ رہی ہے بیٹا......'' وہ جلدی سے بولی۔

''تو پھر آپ کیا سوچ رہی ہیں؟''

''کچھ نہیں...... بیٹا تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں؟ رات کو آرام سے سو جاتے ہو ناں؟'' صابرہ نے جلدی سے بات کا رخ پلٹ دیا۔

''جی امی، آپ میری بالکل فکر نہ کریں مجھے تین ٹیوشنز مل گئی ہیں، مہینے میں اتنے پیسے مل جائیں گے کہ آرام سے گزارہ ہو جائے...... بلکہ تین ٹیوشنز سے اتنے پیسے مل رہے کہ...اتنی تو دفتر میں سیلری بھی نہیں ملتی۔''

''اچھا...... بہت امیر لوگ ہوں گے......؟'' صابرہ کو یہ سب سن کر ازحد مسرت ہوئی۔

''جی امی، بہت امیر لوگ ہیں۔''

''اللہ انہیں بہت دے...... آمین، بس بیٹا اب میرے دل کو سکون مل گیا۔ اپنا خیال رکھنا۔ میں تمہاری بہنوں کو بھیجتی ہوں ذرا ان سے بھی بات کر لو، بھائی کی آواز سن کر خوش ہو جائیں گی۔ شبینہ، ستارہ کہاں ہو، یہ لو بھائی سے بات کر لو۔'' اس نے بہت پُرجوش اور چہکتے ہوئے لہجے میں بیٹیوں کو آواز دی...... دونوں دوڑی چلی آئیں۔

''ابا جان کے گھر سے جانے کے بعد پتا چلتا ہے کہ امی کی آواز کیسی ہے......؟'' ستارہ شوخی سے بولی تھی اور ماں سے ریسیور لے لیا تھا۔

''ماں کو بھی نہیں بخشتی۔'' ستارہ کی طرف گھورتے ہوئے صابرہ نے بظاہر خفگی سے کہا تھا مگر لہجہ بتا رہا تھا کہ اس وقت وہ بہت خوش ہے۔ وہ خود وہاں سے ہٹ گئی۔ ستارہ بہت جوش و خروش سے برہان سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس کی خوشی اور جذبہ دیکھ کر نہ جانے کیوں شبینہ کا دل کسی اتھاہ گہرائی میں اترنے لگا۔

''بھائی جب شبینہ خوش ہے تو پھر سب کو خوش ہونا چاہیے...... آپ نے خواہ مخواہ ہی ابا جان سے جنگ کی، کوئی فائدہ نہیں ہوا، اتنا سارا سونا لے کر آیا ہے وارث علی مگر امی نے ٹھیک سے جیولری دیکھنے ہی نہیں دی۔'' وہ بول رہی تھی اور شبینہ دکھ سے ٹوٹ رہی تھی۔

☆☆☆

شاہ عالم اور کائناز، مہر جان کی کوٹھی کے گیٹ پر کھڑے بڑی حیرت سے بڑی، بڑی لینڈ کروزز کو دیکھ رہے تھے لگتا تھا کہ خاصی تعداد میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ شاہ عالم نے سوچا مگر کائناز بول پڑی۔

''ارے روما کے گھر میں تو مہمان آئے ہوئے ہیں، تب ہی وہ آج اتنی بزی ہے جو فون بھی نہیں کیا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا...... تو ہم بعد میں آ جائیں گے۔'' شاہ عالم نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تو مجھے مہمانوں سے کیا concern ہے...... میں تو روما کے پاس جا رہی ہوں۔'' روما کے دروازے سے پلٹ جانا کائناز کے لیے جانکسل مرحلہ تھا وہ بھی اس صورت میں کہ اس نے روما کو دیکھا نہ اس سے کوئی بات کی۔

''بیٹا اچھا نہیں لگتا۔'' وہ ہچکچا رہے تھے۔

''دادا جان پلیز...... بس میں زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گی...... پرامس......'' کائناز جیسے مچل کر بولی۔

''اچھا، اچھا...... ٹھیک ہے تم اندر جاؤ...... جب آنے لگو تو مجھے فون کر دینا۔ میں خود آ جاؤں گا یا نواب کو

بھیج دوں گا۔''

''تھینک یو دادا جان۔'' کائناز سرخوشی کی کیفیت میں بولتی ہوئی اندر داخل ہو گئی اور گارڈ پر ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر آگے بڑھتی چلی گئی۔ ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی نظر اندر بیٹھے ہوئے مہمانوں پر پڑی تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ وہاں صرف مرد ہی مرد تھے اور واحد خاتون مہر جان تھیں۔ ایک اچھی عمر کا مرد گلے میں موٹے موٹے گلابوں کے ہار پہنے بیٹھا تھا۔ دیکھنے میں بہت خوب صورت لحیم شحیم دکھائی دے رہا تھا۔ وہ حیران حیران کشاں کشاں کاریڈور میں چلی آئی اس کی نظریں روما کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔

''گھر میں اتنے سارے لوگ اور اتنی خاموشی......؟ آج کوئی خاص بات ہے مگر کیا...... یہ روما کہاں چھپی بیٹھی ہے، یقیناً اپنے کمرے میں ہو گی۔'' وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ اس کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ سامنے کا منظر دیکھ کر وہ بھونچکا سی رہ گئی۔ گل جان، رابی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی اور بڑی بے بسی سے کہہ رہی تھی۔

''رابی...... بیٹا دروازہ کھولو...... بیٹا دروازہ کیوں نہیں کھولتیں؟'' روما گل جان سے بالکل چپک کر کھڑی ہوئی تھی۔

''رابی خدا کے لیے دروازہ کھولو...... نکاح کے لیے لوگ آ رہے ہیں، اتنا زیادہ تیار ہونے کی کیا ضرورت ہے، بقول تمہارے تم نے کون سا اپنی اماں جان کے ساتھ فوٹو سیشن کرانا ہے۔''

''آپا دروازہ کھولیں...... پلیز آپا......'' روما بھی گویا اب تھک کر بول پڑی اسی دوران کائناز ان دونوں کے قریب پہنچ چکی تھی اور اس نے بڑی ہی آہستگی سے روما کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ روما گویا اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ اس لیے کہ اس کا ذہن رابی کی طرف لگا ہوا تھا...... اسے آس پاس کا تو کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ گل جان کی پشت بھی کائناز کی طرف تھی اسی لیے انہیں بھی کائناز کی آمد کا پتا نہیں چل سکا تھا۔

''کائناز تم......! تم کب آئیں؟'' روما نے نہایت حیرانی سے اس کی طرف دیکھا مگر فوراً ہی نظریں چرا لیں جیسے اچانک کوئی خیال آ گیا ہو۔

''لگتا ہے آج گھر میں کوئی پارٹی ہے، کافی مہمان آئے ہوئے ہیں اور ہاں تم فون کیوں اٹینڈ نہیں کر رہیں...... کیا سو... رہی تھیں مگر لگتا تو یہ ہے کہ رابی آپا سو رہی ہیں؟''

''بیٹا...... تم کائناز کو لے کر اپنے کمرے میں جاؤ۔'' گل جان تھکی تھکی نظروں سے رابی کے بیڈروم کا دروازہ تکتے ہوئے بولی۔

''بس ٹھیک ہے...... آپ دروازہ تو کھلوائیں میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' روما نے بہت پریشانی کی کیفیت میں کہا تو کائناز کو اندازہ ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔

''میں نہیں جا رہی...... آپا کی شادی ہو رہی ہے اب تو وہ ہمیشہ کے لیے چلی جائیں گی...... مجھے ان سے بہت سی باتیں کرنی ہیں پھر پتا نہیں کب ملیں۔'' روما نے وہاں سے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ کائناز اپنی جگہ ششدر سی کھڑی تھی۔

''شادی......؟'' رابی آپا کی شادی ہو رہی ہے اور روما نے اسے بتایا تک نہیں...... اسے صدمے سے زیادہ حیرانی تھی۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ رابی آپا کی شادی ہو رہی ہے میں اُن کے لیے کوئی اچھا سا گفٹ ہی لے آتی۔" کائناز صورتِ حال سے بے خبر شکوہ کر رہی تھی عین اسی لمحے رابی نے دروازہ کھول دیا تھا مگر اس طرح سے کہ وہ سامنے دکھائی نہیں دی غالباً دروازے کی اوٹ میں تھی۔ دروازہ کھلتے ہی گل جان تیر کی طرح اندر داخل ہوئی اور ان دونوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ گل جان نے جو کچھ دیکھا بس دیکھتے ہی پتھر کی بن گئی...... البتہ روما کے حلق سے بڑی دل ہلا دینے والی چیخ نکلی تھی۔ کائناز کی تو جیسے خوف کے مارے آواز ہی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ اس کیفیت سے نجات پانے کے لیے اپنے گلے پر بڑی بے قراری سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔ وہ بھی روما کی طرح پوری قوت سے چیخنا چاہتی تھی تا کہ اس وحشت ناک صورتِ حال میں اپنے زندہ ہونے کا خود کو یقین دلائے...... مگر بے بسی کی حد نہیں تھی لگتا تھا اس کا ساؤنڈ باکس فیل ہو گیا ہو روما کی چیخ اتنی بلند اور دہلانے والی تھی کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ اپنی، اپنی جگہ اس بری طرح چونکے تھے گویا صورِ اسرافیل سنی ہو۔ ڈاکٹر مہر جان اِدھر اُدھر دیکھے بغیر ساڑی سنبھالتی تیر کی طرح وہاں سے نکل کر رابی کے بیڈ روم کی سمت تقریباً دوڑ پڑی تھیں۔

پہلا خیال جو ڈاکٹر مہر جان کو آیا وہ یہ تھا کہ رابی نے بالآخر اپنا کام تمام کر لیا کیونکہ اب آخری راستہ یہی بچا تھا۔ اکثر اندیشے انہیں ستاتے تھے کہ شاید رابی یہ انتہائی قدم اٹھا لے مگر ان کی انا اندیشوں پر کان دھرنے کی اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔ انہیں تو اپنی سوچ پر عمل کرنے کی پختہ عادت تھی لیکن رابی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی جیسے ان پر آسمان ہی ٹوٹ پڑا۔ روما، رابی سے لپٹی ہوئی چیخیں مار مار کر رو رہی تھی۔

"آپا یہ آپ نے کیا، کیا؟ آپا...... آپ نے یہ کیوں کیا؟ آپ کو خود پر رحم نہیں آیا......؟" کائناز کی سسکیاں اس کے سینے میں گھٹ رہی تھیں۔ اسے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے، کیا سن رہی ہے۔

مہر جان چند لمحے رابی کی طرف دیکھتی رہیں...... ان کی آنکھوں میں شراروں کی لپک تھی انہوں نے روما کو پوری قوت سے رابی سے علٰیحدہ کیا۔ ان کے اوسان جواب دے رہے تھے، حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے مگر وہ اپنی قوتِ ارادی کو سمیٹ کر بھرپور ردِّعمل کرنا چاہتی تھیں۔ رابی یوں کھڑی تھی جیسے پہاڑ اپنی جگہ اٹل دکھائی دیتے ہیں۔ کسی لمحے پلکیں جھپکاتی تو یقین ہوتا تھا کہ وہ کوئی بت نہیں انسان ہے۔ مہر جان کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلنے لگے۔

"تو...... تم نے اپنی سی کر ڈالی...... مہر جان کو مات دے دی...... سہراب خان آج بھی میرے دروازے سے خالی ہاتھ جائے گا اور پھر کبھی یہاں نہیں آئے گا...... یہی چاہتی تھیں ناں تم...... آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں۔ رابی...... میں تجھے مان گئی۔" ایک دم مہر جان کا طرزِ تخاطب تبدیل ہو گیا پھر انہوں نے پوری قوت سے چیخ کر گل جان کو متوجہ کیا جو سانس روکے کھڑی تھی اور ایک ٹک رابی کو تک رہی تھی۔

گل جان شاید اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی صلاحیت سے محروم ہونا قبول کر لیتی مگر مہر جان کی آواز میں تو پوری زندگی کا خلاصہ تھا۔ آج سارے امتحانوں کا نتیجہ نکل آیا تھا۔ سارا حاصل وصول اس ایک آواز میں سمٹ گیا تھا...... کیا نہیں تھا اس آواز میں، امتحان سے پہلے کی تیاریاں پھر امتحان در امتحان کے سلسلے...... اور آج امتحان کا نتیجہ...... گل جان کے مُردہ وجود میں جیسے مہر جان کی بلند آواز نے نئے سرے سے روح پھونک دی تھی۔ کچھ بولنے کا یارا نہیں تھا مگر یہ آواز تو وہ تھی جو شاید اسے قبر سے بھی کھینچ لاتی اس نے سہمی سہمی نظروں سے مہر جان کی طرف دیکھا۔

"گل جان دیکھو...... دیکھو...... آخر کار اس نے بہت بڑا کارنامہ انجام دے دیا...... آج کے بعد میں اس سے فارغ ہو گئی۔ بس اس کا میرا ساتھ یہیں تک تھا...... اب اسے کہہ دو...... کہ اب میرے کہنے سے یہ گھر ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے بلکہ اصیل خان سے کہو اس کا ہاتھ پکڑ کر میری آنکھوں کے سامنے سے لے جائے۔" رابی ان کی نظروں کی تپش سے جھلسنے لگی، تیزاب کی جلن پر ہر تپش حاوی تھی، نظر کی تپش، انتقام کی تپش، محرومیوں کی تپش، بے نشانی کی تپش...... ایک شرارہ سا رابی کے دل کی طرف لپکا...... اور اس نے مہر جان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں پھر اس کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اماں جان...... میں آپ کو اماں جان اس لیے کہہ رہی ہوں کہ آج تک آپ کو اماں جان ہی کہا ہے حالانکہ میرے دل کی گواہی تو یہ ہے کہ آپ میری ماں نہیں ہیں پھر ایک روز غصے کی انتہا پر آپ نے خود بھی تو یہ انکشاف کیا تھا کہ آپ نے مجھے کچرے کے ڈھیر سے اٹھایا تھا۔ اب بھی میرا چہرہ اتنا زیادہ بدصورت نہیں جتنے بدصورت اندر سے میرے ماں باپ تھے۔ جن کی روحیں میلی تھیں جو بددیانت انسان تھے...... کہیں کی امانت کہیں پہنچائی...... خوفِ خدا سے زیادہ جن کے اندر رسوائیوں کا خوف تھا۔ میں پوری کوشش کے باوجود اب بھی اتنی بدصورت نہیں بن سکی جتنی بدصورت میرے ماں باپ کی روحیں تھیں۔" اس سے پیشتر کہ وہ مزید کچھ کہتی...... مہر جان کے حکمیہ الفاظ فضا میں منتشر ہوئے۔

"لے جاؤ اسے یہاں سے...... اصیل خان کو بولو جدھر مرضی اسے چھوڑ آئے...... اس نے مجھے شکست دی ہے، میں اب اس سے نظر نہیں ملا سکوں گی اور نظر جھکا کر مجھے جینا نہیں آتا کیونکہ میں میر محبت خان کی بیٹی نہیں بیٹا ہوں...... فوراً اسے پیشتر اس کی شکل گم کرو۔" روما اور کائناز کی گویا روحیں قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے قریب تھیں گل جان کو سجا سجایا کمرا قبر کی طرح تاریک محسوس ہو رہا تھا۔ مہر جان کے باہر نکلتے ہی گل جان، رابی سے لپٹ گئی۔

"یہ تو نے کیا کیا رابی...... دنیا میں روز ہزاروں لاکھوں بے جوڑ شادیاں ہوتی ہیں...... کون سی نرالی بات ہو رہی تھی۔" گل جان تڑپ تڑپ کر رونے لگی روما بھی رو رہی تھی۔ کائناز نے روما کو گلے سے لگا لیا۔

"خالہ جانی...... بابا اصیل خان کو بلائیں، آپا کو اسپتال لے کر جائیں۔" یہ سن کر کائناز جیسے ایک دم اپنے حواسوں میں واپس آ گئی تھی اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اپنا بخار و خار سب بھول بیٹھی تھی اس نے روما کو خود سے الگ کیا اور اصیل خان کو بلانے باہر دوڑ گئی۔

"ایک منٹ میں بابا کو بلا کر لاتی ہوں۔" روما، رابی کے قریب آئی۔ رابی کا اپنا ذہن جیسے فریز ہو چکا تھا وہ اپنی جگہ اسی طرح ساکت و جامد کھڑی تھی۔ روما نے رابی کا بازو تھام لیا...... پھر بڑی بے بسی اور رقت سے گویا ہوئی۔

"آپا آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا...... کسی کا کچھ نہیں بگڑا......" گل جان کے سینے میں سسکیاں گھٹ رہی تھیں اس نے آگے بڑھ کر رابی کو بازو سے پکڑا اور بیڈ کے کنارے پر ٹکا دیا۔

"آپا...... جلن ہو رہی ہے ناں...... کہاں سے آ گئی آپ میں اتنی برداشت؟" روما بھی اس کے برابر میں بیٹھ کر بڑی بے قراری سے پوچھ رہی تھی۔

"جلن......؟" اب رابی کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی...... ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس نے روما کو دیکھا۔

"اصل میں تمہیں پتا ہی نہیں جلن کیا ہوتی ہے، بے وقوف صرف آگ اور کیمیکل تھوڑا ہی جلاتے ہیں جو

ان دیکھی آگ تن بدن میں لگتی ہے وہ دوزخ کی آگ ہوتی ہے، مجھے دوزخ کی آگ سے آج نجات مل گئی...... کسی نا معلوم گناہ کی سزا آج مکمل ہوگئی۔'' رابی بول رہی تھی اور گل جان سنتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''میں بھی آج تک ایسی ہی آگ میں جل رہی ہوں...... میں نجات کے لیے کیا کروں؟'' کائناز اصیل خان کو ساتھ لے کر اندر داخل ہوئی تو اصیل خان پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا وہ اتنا ہولناک اور دل ہلا دینے والا تھا کہ ضبط کے پہاڑ اپنی جگہ سے ہلنے لگے...... یوں جیسے زمین پر نہ کھڑا ہو...... پانی پر تیرتے کسی لکڑی کے تختے پر کھڑا ہو۔ رابی نے اس کی کیفیت دیکھ کر اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔ گل جان، اصیل خان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی اور اس کے ردِعمل کی منتظر تھی۔ اصیل خان پلک جھپکنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

''اصیل خان...... اسے اسپتال لے چلو...... دیکھو اس نے اپنا چہرہ کس بری طرح جھلسا لیا ہے۔'' رابی نے برہمی سے گل جان کی طرف دیکھا۔

''میں اسپتال نہیں جاؤں گی۔'' رابی کی آواز ماحول میں گونجی تو جیسے اصیل خان بھی ہوش میں آگیا۔ اس نے گل جان کی طرف دیکھا۔

''گل جان بی بی...... لگتا ہے آج سزا مکمل ہوگئی...... محبت کے نام پر دنیا میں جتنے بھی دھوکے ہوتے ہیں...... اس کے بعد بدصورتی اور اندھیرے ہی تو رہ جاتے ہیں۔''

''آپ لوگ اس کمرے سے چلے جائیں...... جس جس نے ماتم کرنا ہے وہ اس گھر کے گیٹ کے پاس جا کر دل کھول کر ماتم کرے۔ اس گھر میں رہنے والا ایک، ایک شخص dishonest ہے...... جو خاموشی سے ظلم برداشت کرتا ہے وہ سب سے بڑا ظالم ہے۔ ایسے ظالم کو تو دس بار پھانسی کی سزا ہونا چاہیے۔''

کائناز کی معصومیت و کم عمری کے سامنے تو یہ حادثہ حشر کے برابر تھا۔ اس کی تڑپ و بے قراری اوجِ کمال پر تھی۔ اس کی پیاری عزیز از جان دوست کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے...... یہ سب کچھ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

''اصیل خان، رابی کو اس گھر سے لے جانے کا آرڈر ہے...... اب یہ اس گھر میں نہیں رہ سکتی...... خدا کے لیے کچھ کرو، وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔'' گل جان اب اصیل خان کی منت کر رہی تھی۔ رابی بہت جرأت و حوصلے سے بات کر رہی تھی اور سہراب خان تو اس پر نظر پڑنے کے بعد گویا رسیاں تڑا کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ کائناز نے اس مہلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ عالم کو فون کر کے فوراً روما کے گھر آنے کا کہہ دیا تھا۔

''مہر جان...... ہمیشہ کے لیے خدا حافظ...... تم انتقام کی آگ میں یونہی جلتی رہو گی...... یہ آگ کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی...... میں نے آخری بار تم پر رحم کرنے کی کوشش کی تھی...... مگر...... میں تمہارا مقدر نہیں بدل سکتا۔'' سہراب خان نے گھور کر دم بخود کھڑی مہر جان کی طرف دیکھا تھا۔ یہ کہہ کر وہ مین گیٹ کی طرف چل پڑا تھا۔

اسی وقت شاہ عالم گیٹ سے اندر آرہے تھے دونوں کی رفتار میں تیزی تھی ایک دوسرے سے ٹکراتے ٹکراتے بچے...... سہراب خان نے تو ایک نگاہِ غلط بھی نہ ڈالی مگر شاہ عالم نے اس کی طرف ضرور دیکھا تھا۔ مہر جان نے رابی کی طرف غضب ناک نظروں سے دیکھا اور پوری قوت سے چلائیں۔

''کیوں کھڑی ہو......؟ دفع ہو جاؤ اس گھر سے۔'' یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف بڑھیں اور شاہ عالم نے اپنی پوتی سمیت سب کی طرف نگاہ کی۔

رابی کے حال نے ان کے بوڑھے کمزور دل کو دہلا کر رکھ دیا...... وہ حیرت و صدمے سے اپنی جگہ گنگ

کھڑے رہ گئے، کائناز دادا کو دیکھ کر عجیب سی تقویت محسوس کرنے لگی تھی۔ بھاگ کر اُن کے برابر آ کھڑی ہوئی۔

''دادا جان رابی آپا کو یہاں سے لے چلیں...... دیکھیں تو سہی اُن کی کیا حالت ہو رہی ہے۔''

شاہ عالم، مہر جان کی دہاڑ سن چکے تھے اگرچہ حقائق سے لاعلم تھے مگر منظر ایسا تھا کہ وہ صورتِ حال کی نزاکت کا اندازہ کر سکتے تھے۔

''چلو بیٹا!'' بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر انہوں نے بہت نرمی سے رابی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ہاں رابی...... تم شاہ صاحب کے گھر چلی جاؤ...... میں تم سے وہیں ملنے آؤں گی...... جب تک بی بی جان کا موڈ......''

''مجھے کسی کے ساتھ نہیں جانا...... کوئی مجھ پر احسان نہ کرے...... ہٹیں آپ لوگ راستہ دیں مجھے۔'' رابی اب بڑے جارحانہ انداز میں دروازے کی طرف بڑھی تھی۔

☆☆☆

مہر جان، سہراب خان کو ڈرائنگ روم سے باہر لیے کھڑی تھی۔

''سہراب خان، آج مہر جان کو ایک دو ٹکے کی لڑکی نے کھلی شکست دی ہے جو میں اپنی قبر میں اترنے تک بھول نہیں سکتی۔''

''مہر جان میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیوں کے ساتھ زبردستی نہیں کی جا سکتی مگر تم نے اصرار کیا کہ اب اس خاندان کی عزت مجھے سنبھالنا ہوگی تو میں نے تمہارا اور اصیل خان کا پردہ رکھنے کے لیے یہ سب کیا...... ورنہ تم سے زیادہ اچھی طرح کون جان سکتا ہے کہ سہراب خان کو عورتوں کی کیا کمی

ہے؟ مگر میں اتنی بڑی ذلت برداشت نہیں کرسکتا...... خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا، وہ جیسی بھی ہے جس حال میں بھی ہے اسے میری گاڑی میں بٹھادو، نکاح وکاح بعد میں ہوتا رہے گا۔'' عین اسی لمحے رابی ان دونوں کے سامنے آگئی تھی سہراب خان تو رابی پر نظر پڑتے ہی گویا سر سے پاؤں تک ہل گیا تھا۔

''یہ...... یہ میں رابی ہوں انکل جی...... وہی جس سے آپ نکاح پڑھوانے آئے ہیں۔''

''اں...... ان...... انکل......'' سہراب خان آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ مہر جان نے شدتِ جذب سے اپنی مٹھیاں یوں بھینچیں کہ اس کے ناخن کھال میں گڑ گئے۔

''لاکھوں کے زیورات بھیجے تھے آپ نے میرے لیے...... اور آج بڑے بڑے سرداروں کو نکاح کی گواہی کے لیے ساتھ لائے ہیں۔ اس خاندان میں شرم تو کسی کو آتی نہیں...... ارے کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں؟ واقعی میں رابعہ ہوں، کچرے کے ڈھیر پر پڑا ہوا ایک بدبودار پیکٹ...... یقین نہیں آتا تو ڈاکٹر صاحبہ سے پوچھ لیں۔ میری socalled خالہ سے پوچھ لیں...... اور نہیں تو ہمارے ہاں ایک غلام زادہ رہتا ہے اصیل خان اس سے پوچھ لیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کہتی ہیں ہمارے ٹکڑوں پر پلتے پلتے بوڑھا ہوگیا ہے وہ۔'' پھر رابی خالہ جانی سے مخاطب ہو کر بولی۔

''بس کریں گل جان صاحبہ...... آپ کریں اپنی بی بی جان کے موڈ کی پروا...... میں شاہ صاحب کے ساتھ جارہی ہوں، اب کوئی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرے...... دنیا دکھاوے کے آج سارے رشتے ختم ہوگئے۔ چلیے داداجان!'' رابی کے منہ سے لفظ داداجان کا نکلنا اس بات کا غماز تھا کہ وہ شاہ صاحب کی عزت کرتی ہے۔

''داداجان میں کچھ وقت آپ کے گھر گزاروں گی وہاں بیٹھ کر سوچوں گی کہ اب مجھے کیا کرنا ہے...... میں ڈاکٹر صاحبہ کے ٹکڑوں پر نہیں پل رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا تھا کہ میرے باپ نے اپنے جرم کا داغ دھونے کے لیے بہت دولت میرے نام کی تھی...... البتہ یہ نہیں بتایا تھا کہ میرا باپ کون ہے؟ شاید بابا اصیل خان کو پتا ہو...... کیونکہ یہ ہمارا بہت پرانا نوکر ہے۔'' رابی نے ایک نظر اصیل خان پر ڈالتے ہوئے خاصے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

اصیل خان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں رابی کی بات سن کر اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں...... شاید کڑی گزر گئی تھی۔

''آؤ بیٹا...... تمہیں فوری فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے، شاباش دیر نہ کرو......'' شاہ عالم نے رابی کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔ رابی نے جانے کے لیے قدم بڑھائے مگر پھر رک گئی پلٹ کر پیچھے دیکھا گل جان، اصیل خان، روما اس کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

''خدا حافظ روما...... تم نے بہن کا رول بہت اچھا ادا کیا حالانکہ تم میری بہن نہیں تھیں۔'' یہ کہہ کر وہ شاہ عالم کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھنے لگی کائناز نے روما کے گال پر پیار کیا۔

''میں تمہیں فون کروں گی، ہم رابی آپا کا خیال رکھیں گے تم پریشان مت ہونا، اوکے......؟'' روما نے کسی روبوٹ کی طرح گردن ہلائی۔ ابھی تو وہ رابی کے جملوں کو اپنی ذات پر انگاروں کی طرح برستا محسوس کررہی تھی۔ گل جان چپ چاپ اندر کی طرف پلٹ گئی۔

''آخر تو پھٹتا کیوں نہیں ہے؟'' اصیل خان نے آسمان کی طرف دیکھا۔

(جاری ہے)

انمول خزانہ

ام شمامہ

''ابا! میرا بھائی شہر میں ملازمت کی تلاش کے لیے آرہا ہے، وہ تھوڑا عرصہ یہیں رہے گا اس لیے میں نے آپ کا بستر اسٹور میں لگوادیا ہے۔''

جمال دین تنہا اداس شاموں میں سڑکوں پر بے مقصد چلتے چلتے رات کی انگلی تھامے جب گھر میں داخل ہوا تو اس کی بہو عطیہ نے اطلاع بہم پہنچائی۔ وہ اپنا صندوق اٹھا کر چپ چاپ اسٹور کی جانب چل دیا اور کہتا بھی کیا...جب اپنا گھر، اپنی اولاد اپنی نہ رہے تو فیصلہ سننے اور ماننے کے علاوہ انسان کر بھی کیا سکتا ہے۔

اکھڑے پلستر والا سیلن زدہ اسٹور جمال دین کا منتظر تھا۔ وسط میں پڑی اُدھڑے نواڑ کی ایک جھولا سی چارپائی پڑی تھی جس پر بچھی چادر کو اللہ جانے کتنا عرصہ



بیت گیا تھا۔

جمال دین کافی دیر تک چارپائی پر کروٹیں بدلتا رہا مگر نیند کا دور دور تک کوئی شائبہ نہیں تھا۔ اسٹور میں کیڑوں اور مچھروں کی بہتات تھی اور ہوا کا بھی کوئی گزر نہیں تھا۔ اسٹور کے کاٹ کباڑ، اندھیرے اور تنہائی کو تکتے تکتے کب نیند کی دیوی مہربان ہوئی پتا ہی نہیں چلا۔

☆☆☆

''جمال دین۔'' سامنے تخت سے اماں بی نے رعب سے پکارا۔ وہی تخت جو اَب اس قدر بوسیدہ ہو چکا تھا کہ اس کا ایک پایہ بھی دیمک کھا گئی تھی۔ وہ اماں بی کے قدموں میں ہمیشہ کی طرح نظریں اور سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ اب اماں جی سے نظریں کب ملا سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ اماں بی کچھ کہتیں ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھ کھل گئی وہ ہڑبڑا کر چارپائی پر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ ہر بار یہی ہوتا تھا اس سے پہلے کہ اماں اس سے کچھ کہتیں خواب کی ڈور اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی اور وہ جاگ جاتا تھا۔

اس نے تخت کی طرف چور نظروں سے دیکھا یک دم اسے لگا اماں بی وہاں بیٹھی مسکرا رہی ہیں اور اُن کے ہاتھ میں سرخ دانوں والی تسبیح ہے اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنے زانو پر سر رکھے جمال دین کے سر میں پیار سے انگلیاں پھیر رہی ہیں۔ جمال دین ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کی بیوگی کا سہارا اور بڑھاپے کی لاٹھی وہ دھیرے دھیرے اسے کچھ بتا رہی تھیں اور پھر اُن کی آواز چھوٹے سے اسٹور میں گونجنے لگی۔

''چار اپریل انیس سو چھیالیس کے دن تمہارے ابا مشرقی پنجاب کی ریاست ملیر کوٹلہ سے مختصر بارات لے کر دلی کے علاقے تہاڑ گنج پہنچے۔ نہ کرسیاں، نہ شامیانہ، نہ قمقمے نہ جھاڑ فانوس کسی قسم کی کوئی تام جھام نہیں تھی۔ بس مسجد کے کھلے صحن میں انار کے درخت کے نیچے نکاح پڑھا دیا گیا۔ تمہاری دادی مرحومہ قند (سرخ رنگ کا سوتی کپڑا) کا جمپر اور لٹھے کی شلوار سلوا کر لائی تھیں گوٹا لگا ریشمی تار کا سرخ اور سنہری دوپٹا جس کے کناروں پر کرن کی بڑی بڑی جھالر لگی تھی ایک گاڑی مستعار لی تھی جس پر بیٹھ کر ہم ملیر کوٹلہ واپس آ گئے تھے۔

یہاں کے ماحول میں ایک اپنا پن تھا۔ ساری آبادی مسلمانوں کی تھی۔ نواب پٹودی کے بھائی ریاست کے نواب تھے اور تمہارے ابا ان کے یہاں خزانچی تھے۔ بڑی کشادہ حویلی تھی، آنگن میں ایک طرف پیپل کا گھنا درخت تھا۔ ایک طرف چھپر کے نیچے بھینس بندھی ہوئی تھی۔

لوگوں کے دلوں میں رشتوں کا احترام تھا آپس کی محبت، خلوص، مروت جیسے جذبے دلوں کے اندر پنپتے تھے۔ آج کل جیسی بے مروتی اور نفسانفسی نہیں تھی۔ ایک سال کا عرصہ بہت خوش اور مطمئن گزرا کہ تم ہونے والے ہو گئے۔ تمہارے ابا، دادی، تایا سب بہت خوش تھے۔ کتنے سالوں بعد اُن کے یہاں ایک ننھا مہمان آنے والا تھا۔ ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ گلی کوچوں میں لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان کے نعرے گونجنے لگے۔ جناح صاحب کی قیادت میں سارے مسلمان ایک ہو گئے تھے۔ منزل قریب ہی معلوم ہو رہی تھی۔ تمہارے ابا پکے مسلم لیگی تھے۔ ایک بار جلسے میں کسی حاسد دشمن نے جناح صاحب کو چھڑی مارنے کی کوشش کی تو تمہارے ابا سامنے آ گئے۔ جب تک زندہ رہے اپنے زخم کے نشان کو دیکھ، دیکھ کر فخر کرتے رہے......'' اس سے آگے وہ کچھ نہ یاد کر سکا۔

☆☆☆

آج پہلی اگست تھی اگست کا مہینہ شروع ہوتے ہی جمال دین کی حالت عجیب سی ہو جاتی تھی وہ کبھی زار و زار روتا اور کبھی چپ سادھ کر بیٹھ جاتا۔ دن رات عبادت میں مشغول رہتا۔ اپنے ہی ہاتھوں لگائے گئے انسان کی زندگی میں کچھ ایسے کاری زخم ہوتے ہیں جن کا اندمال وقت بھی نہیں کر سکتا اور اگست کے مہینے میں تو ان زخموں سے خون رِسنے لگتا تھا۔ عجیب یاسیت بھرے دن تھے مگر جس گھر میں رہنا تھا دو وقت کی روکھی سوکھی کھانی تھی وہاں چاکری تو کرنی تھی۔ اس لیے وہ روتے ہوئے پوتے کو چپ کروانے کے لیے ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ جمال دین نے اپنی بوڑھی ہڈیوں میں ہمت جمع کی اور اسے اٹھا کر کندھے سے لگا کر تھپکنے لگا۔ اتنے میں کمال دین گھر سے باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف لپکا۔

''بیٹا کمال دین! اگر بازار تک جا رہے ہو تو میری کھانسی کی دوا لیتے آنا کھانس، کھانس کر پسلیاں دُکھنے لگی ہیں۔''

''ابا آپ کو پتا تو ہے آج کل مہنگائی کا کیا عالم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا غریب کیا کمائے اور کیا کھائے اور پھر اوپر سے آئے دن آپ کی فرمائشیں ...... کتنی شیشیاں پی چکے ہیں آپ...... اب کچھ گھریلو نسخہ کر لیں۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا اپنی راہ چل دیا۔

کمال دین اس کا اکلوتا بیٹا تھا جیسے جمال دین اپنی اماں بی کا تھا۔ اس نے منے کو اندر چارپائی پر ڈالا اور خود اسٹور کی طرف چل دیا۔ اس نے لوہے کے زنگ آلود صندوق پر لگا بڑا سا تالا کھولا۔ تالے کے کھلتے ہی اسٹور اماں بی کی آوازوں سے بھر گیا۔

''جب منزل قریب آنے لگی تو ہندوؤں نے اپنی کینہ توز فطرت اور تعصب پسندی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہنگامے اور قتل و غارت گری شروع کر دی پھر ملک بھر سے خوف اور درد میں لپٹی خبریں آنے لگیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ترشول اور کرپانیں بے گناہ مسلمانوں کے خون سے سرخ ہونے لگیں۔ رقصِ ابلیس شروع ہو گیا آزادی کے متوالوں کو اپنی جانیں گنوا کر آزادی کی قیمت ادا کرنی پڑی۔'' وہ حیرت زدہ ہو کر انہیں سنتا رہا۔

''امان بی ہندو تو اپنے ملک میں رہ رہے تھے پھر مسلمانوں کے لیے ان کی یہ شدت پسندی اور غصہ کس لیے تھا اور اگر سب ٹھیک ٹھاک تھا سب مل جل کر امن سے رہ رہے تھے تو الگ وطن کا مطالبہ کس لیے کیا گیا؟'' جمال دین سولہ کے سن میں لگ چکا تھا کافی باتیں جو سمجھ اور ناسمجھ کے درمیان رہ جاتیں وہ اماں بی سے پوچھ لیتا تھا۔

''ارے کہاں سب ٹھیک ٹھاک تھا بیٹا، ہندو مسلمانوں کو ایک قوم تو کیا انسان بھی نہیں سمجھتے تھے۔ کسی مسلمان کا غلطی سے ان کی سبزی ترکاری کو ہاتھ لگ جاتا تو وہ بھرشٹ یعنی ناپاک ہو جاتی۔ اگر کوئی کتا ہندوؤں کے چوکے میں چلا جاتا تو وہ ناپاک نہیں ہوتا تھا مگر کسی مسلمان کا پیر غلطی سے چوکے میں پڑ جاتا تو اسے نئے سرے سے پوتا جاتا تھا۔ وہ کہیں کسی جگہ مسلمان افسر نہیں لگنے دیتے تھے کہ ہندو ماتحت کی حیثیت سے کام کرنا انہیں اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے اور پھر ہمارا مذہب، ہماری روایات، ہماری تہذیب سب کچھ جدا تھا ایسے میں اگر ہم الگ مسلم ریاست کا مطالبہ نہ کرتے تو کیا کرتے۔'' اماں بی ...کو پاکستان اور تحریک پاکستان سے دلی محبت تھی اور ان کے پاس نظریۂ پاکستان، کے متعلق ہر سوال کا مفصل جواب موجود تھا۔

اماں بی کے پاس لوہے کا ایک صندوق بھی تھا جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ وہ اسے ہمیشہ بہت احتیاط کے ساتھ تنہائی میں کھولتیں اور اس کی چابی ہمیشہ اپنے دوپٹے کے پلو سے باندھ کر رکھتی تھیں۔ جمال دین نے ایک دو بار اسے کھول کر دیکھنے کی کوشش کی مگر انہوں نے اسے رسان سے منع کر دیا۔

''تم ابھی چھوٹے ہو وقت آنے پر یہ تمہارا ہی ہوگا۔''

''جمال دین، جمال دین......'' اسے لگا اماں بی اسے پکار رہی ہیں وہ کسی تکلیف میں ہیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ خود کہاں ہے۔ اماں بی کی آواز حقیقت تھی کہ خواب مگر روشن دان سے آتی چاند تاروں کی روشنی نے اسے

باور کرادیا کہ وہ اسی سیلن زدہ اسٹور میں ہے، رات کا شاید آخری پہر تھا آواز کا سفر ایک بار پھر شروع ہوچکا تھا۔

''بچپن سے جوانی تک ریل کے سفر کرنے کا بڑا شوق تھا۔ چھک چھک کی آواز، سیٹی کی دُھن، پٹریاں، اسٹیشن یہ سب چیزیں مجھے اپنی طرف کھینچتی تھیں مگر جب زندگی میں ریل کا پہلا سفر کیا تو ایسا تلخ تجربہ ہوا کہ آج تک نہیں بھولا۔ خون اور خاک میں ڈوبی لاشیں، عصمت کی حفاظت کے لیے واسطے دیتی کنویں میں چھلانگیں لگاتی معصوم دوشیزائیں، ننھے پھولوں کی حیرت اور درد میں ڈوبی دل خراش آہیں۔ قیامت صغریٰ کا منظر تھا...... اب تو کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ کیا عالم تھا۔ نہ کھانے کو کچھ نہ پینے کو کچھ...... ایک جگہ ریل کچھ دیر کو رکی تو ایک پیاؤ نظر آیا جو دس بارہ پانی کے گھڑے رکھ کر مسافروں کی پیاس بجھانے کے لیے بنایا گیا تھا لیکن جیسے ہی ایک بدنصیب نے پیاس کے ہاتھوں مجبور ہوکر پانی کے چند گھونٹ پیے وہیں تڑپ تڑپ کر اپنی جان سے چلا گیا بعد میں پتا چلا کہ ظالموں نے کنوؤں، پیاؤں اور ندیوں میں زہر ملادیا ہے۔'' دکھ سے اُن کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

''آج آزاد فضاؤں میں بیٹھ کر بڑی، بڑی باتیں کرنے والے کیا جانیں کہ آزادی کیسے ملی، کس کس نے کیا، کیا کھویا ہے۔ لٹے پٹے خیموں میں بیٹھے اپنا ہر اثاثہ، ہر رشتہ کھودینے والے یہ لوگ پھر بھی مطمئن تھے کہ اپنی سرزمین پر بیٹھے ہیں۔'' وہ ہر سال بڑی شدّومد سے جمال دین کو وہی تاریخ دُہراتیں۔

پھر بیس سال کی عمر میں اماں بی نے جمال دین کی شادی کردی۔ ہاجرہ مزاج کی تیز نکلی، فطرت میں خود غرضی کا عنصر بھی شامل تھا مگر اپنے شوہر کا خیال کرتی تھی اماں بی کو اور کیا چاہیے تھا۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے کی جانب گامزن تھا۔ اب اماں بی کے پاس بیٹھنے پر ہاجرہ، جمال دین پر غصہ کرتی تھی اس لیے اب وہ بہت کم کم بس سلام کرنے ہی آتا تھا۔

اماں بی نے خود کو اپنے کمرے تک ہی محدود کر تھا پھر جس دن پاکستان دو حصوں میں بٹا جمال دین اماں بی کو بے حد اداس پایا، وہ ان کے پاس جا بیٹھا۔ ا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

''تجھے پتا ہے جمال دین! پاکستان کے قیام کے پیچھے دو بڑی باتیں تھیں، ایک وہاں ہمیں جان و مال خوف نہیں ہوگا دوسرا وہاں ہمارا ایمان پھلے پھولے گا۔ بھائی چارے کی فضا قائم ہوگی مگر یہ دیکھ یہ کیا ہوا۔ تجھے پتا ہے جسم کا کوئی حصہ اگر اس سے جدا ہوجائے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے، پل پل اس کے ہونے اور ہونے کے بعد گنوادینے کا احساس کچوکے لگاتا رہتا ہے۔ آج دشمنوں کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہوگی۔ پاکستان زندہ باد کے نعروں کے عوض خون میں نہلائے گئے شہدا کیا ہم سے سوال نہیں کریں گے کہ ہم نے پاکستان کو کتنی بار زندگی بخشی؟'' وہ آنسو پونچھتے ہوئے خود کلامی کررہی تھیں۔

☆☆☆

''ارے کون سا غضب ہوگیا۔ میں تو وہاں کمال دین کی جوتیاں ڈھونڈ رہی تھی کہ اچانک میرا ہاتھ لگ گیا اور آپ مجھ پر الزام لگارہی ہیں کہ میں نے یہ نایاب صندوق کھولنے کی کوشش کی ہے۔'' اماں بی کے کمرے میں سے ہاجرہ کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آرہی تھیں اور اماں بی ہمیشہ کی طرح چپ تھیں۔ ہاجرہ کے لہجے میں واضح طور پر ہتک محسوس کی جاسکتی تھی۔ جسے محسوس کرکے اس کے چلے جانے کے بعد اماں بی کی آنکھوں سے آنسو قطرہ قطرہ گرنے لگے۔

''اللہ جانے کون سا خزانہ قید ہے اس صندوق میں کہ غلطی سے بھی کسی کا ہاتھ لگ جائے تو قیامت آجاتی ہے۔'' ہاجرہ بڑبڑاتی ہوئی باہر صحن پر بچھے پلنگ پر آکر بیٹھ گئی اور پھر تھوڑی دیر بعد اپنی ہی کہی ہوئی بات پر خود ہی چونکی۔

"ارے جمال دین کہیں سچ مچ میں بڑھیا نے اس صندوق میں کوئی خزانہ تو نہیں رکھا ہوا...... سنا ہے تقسیمِ ہند کے وقت بہت لوگوں کے ہاتھوں دوسرے لوگوں کا چھپایا ہوا کافی زیور ہاتھ لگا تھا تم نے کبھی پوچھنے کی زحمت نہیں کی؟" اس نے رازدارانہ انداز میں شوہر سے پوچھا۔

"واللہ اعلم! ویسے اماں بی بتاتی ہیں کہ ابا نواب صاحب کے خزانچی تھے اور سارے مال کا حساب کتاب انہی کے پاس ہوا کرتا تھا اور انہوں نے ان کے پاس ایک دفعہ سونے کی اینٹیں بھی دیکھی تھیں۔"... جمال دین جانے کس ٹرانس میں بولتا چلا گیا پھر اس نے سر اٹھا کر ہاجرہ کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

"جمال دین ہمارے حالات کس قدر خراب ہیں تم ایک معمولی سے کلرک ہو۔ اماں بی تو ابھی تک صندوق کو ہاتھ نہیں لگانے دیتیں۔ اللہ جانے یہ دولت کس کے لیے سنبھال کر رکھی ہے۔ اگر تم تھوڑا سا میرا ساتھ دو تو ہم بھی دنیا کی ہر آسائش سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ ہمارا کمال دین بھی اچھا پہنے گا، اچھا کھائے گا، اچھے اسکول میں پڑھے گا۔" اس نے تمہید باندھی۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو ہاجرہ؟"

"میں وہی کہنا چاہتی جس میں ہم سب کی بھلائی پوشیدہ ہے۔ اماں بی جیتے جی تو اس صندوق کو ہاتھ لگانے نہیں دیں گی اور اب تو ان کی عمر بھی اتنی ہوتی جا رہی ہے، اپنے آپ سے لاچار ہوتی جا رہی ہیں۔" ہاجرہ جانے خود کو تسلیاں دے رہی تھی کہ جمال دین کو۔

☆☆☆

اور پھر ہاجرہ کے بہکاوے اور پیسے کے لالچ میں وہ ہو گیا جس کے بارے میں جمال دین کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اماں بی دمے کی پرانی مریضہ تھیں جب انہیں کبھی کبھار دمے کا دورہ پڑتا وہ دوا والا پمپ استعمال کرتی تھیں پھر ایک دن اسی طرح انہیں دمے کا دورہ پڑا۔ ہاجرہ نے جلدی سے ان کی دوائی والا پمپ چھپا لیا اور بوڑھی جان زیادہ دیر تک سانس کی گھٹن برداشت نہیں کر سکی۔ تھوڑی دیر میں ہاجرہ نے رو پیٹ کر سارا محلہ اکٹھا کر لیا اور جمال دین کو بھی دفتر میں اطلاع دے دی گئی۔

وہ حیران پریشان گھر کی طرف بھاگا۔ طرح طرح کے خیالات دماغ میں لیے وہ گھر پہنچا۔ ہاجرہ نے موت کو طبعی ہی ظاہر کیا تھا مگر اس کے بیٹے کمال دین نے اپنی توتلی زبان میں پمپ چھپانے والی بات بتا دی مگر جمال دین مصلحتاً خاموش رہا کہ دل میں کہیں خزانہ پانے اور اسے استعمال کرنے کا نشہ ہلکورے لے رہا تھا۔

☆☆☆

آج سات اگست کا دن تھا۔ صبح ہی سے بارش ہو رہی تھی۔ اماں بی کے کفن دفن کے بعد دوپہر تک فراغت ہو چکی تھی۔ غریب کے گھر کون اتنی دیر تک بیٹھتا ہے جیسے ہی آخری محلے دار اٹھا ہاجرہ نے جلدی سے دروازے کی کنڈی لگائی۔ کمال دین کو وہ پہلے ہی سلا چکی تھی کہ کہیں صندوق میں سے خزانہ نکلتا دیکھ کر وہ محلے میں کسی کو کچھ بتا نہ دے۔ دونوں نے اماں بی کے کمرے کا رخ کیا چابی پہلے ہی ہاجرہ ان کے دوپٹے کے پلو سے کھول چکی تھی۔ جمال دین نے چابی اس کے ہاتھ سے لی اور کانپتے ہاتھوں سے اپنی قسمت کا تالا کھولنے لگا۔

ایک خون میں لتھڑا بوسیدہ کرتہ، اماں بی کا شادی کا جمپر، چند تصویریں جن میں ابا قائداعظم محمد علی جناحؒ کے ساتھ کھڑے تھے اور ان کے بازو پر پٹی باندھی تھی۔ ایک جائے نماز، تسبیح اور ٹوپی۔ صندوق کی کل کائنات یہی چند چیزیں تھیں۔ یک دم ہاجرہ کی نگاہ... صندوق کے کونے میں رکھی ایک پوٹلی پر پڑی اس نے کھوئے کھوئے جمال دین کی توجہ اس طرف دلائی جو

حیرت اور غم کے مارے بت بنا بیٹھا تھا۔ اس نے مرے مرے ہاتھوں سے پوٹلی کو کھولا جس میں صرف خاک تھی اور وہ بھی خون میں لتھڑی ہوئی۔ شاید اماں بی نے اسے اسی لیے صندوق کو ہاتھ لگانے نہیں دیا تھا کہ وہ اس خزانے کی حفاظت کہاں کر سکتا تھا، اس کی نظر میں یہ کیسے خزانہ ہو سکتا تھا یہ تو چند بے مایہ چیزیں تھیں۔

ہاجرہ اس سب پر تف بھیج کر گھر کے کاموں میں لگ گئی آخر اماں کے جنازے کی وجہ سے زیادہ بکھیڑا ہو گیا تھا اسے کسی قسم کا کوئی پچھتاوا نہیں تھا مگر جمال دین کبھی کمرے، کبھی اماں بی کے تخت، کبھی چمکتی تسبیح اور کبھی کھلے صندوق کو دیکھ رہا تھا کہ اماں بی کی آواز کمرے میں چکرانے لگی۔

"انہوں نے جب تمہارے ابا کو شہید کیا تو میں ان کے سرہانے بیٹھی رو رہی تھی، میری گود میں ڈیڑھ ماہ کے تم تھے پھر جانے کس نے مجھے پکڑ کر کھینچا، 'چلو بیٹی بلوائی آ رہے ہیں، تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے اپنا نہیں تو اپنے سہاگ کی اس نشانی کا خیال کرو جو تمہاری گود میں ہے۔ اٹھو شاباش جلدی کرو' اور پھر میں تمہارے ابا کے خون میں ڈوبی مٹی ہاتھ میں دبائے ان کی لاش کو بے گور و کفن چھوڑ کر چلی آئی۔ یہاں ایک رشتے کے بھائی کے گھر تمام عمر بیوگی کا جوگ کاٹا انہوں نے شادی پر بہت اصرار کیا مگر دل نہ مانا...... تمہارے ابا جیسا کوئی اور کیسے ہو سکتا تھا اور پھر تم تھے ناں میرے پاس میرا اکلوتا بیٹا، میرا جمال دین...... میرے بڑھاپے اور بیوگی کا سہارا۔"

☆☆☆

یوں جمال دین نے اپنے ہاتھوں سے اپنی جنت کو قبر کے گھور اندھیروں میں اتار دیا۔ تھوڑے عرصے بعد ہی ہاجرہ کو خون کا کینسر ہو گیا اور وہ جمال دین کو پچھتاوؤں اور ضمیر کی عدالت میں روز جینے اور مرنے کے لیے تنہا چھوڑ گئی پھر اکیلے ہی اس نے کمال دین کی پرورش کی۔ اماں بی کے صندوق کی حفاظت کرنا، اسے صاف ستھرا رکھنا اور اس میں موجود انمول خزانے کو نکال کر دیکھنا جمال دین کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ اماں بی کا کمرا، تخت، تسبیح سب کچھ اب اس کے زیرِ استعمال تھا مگر ان کی بتائی ہوئی باتیں جمال دین کے اندر ہی رہ گئی تھیں کہ آج کل کی نسل کے پاس پرانی باتوں کو سن کر اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں بوڑھے اور انہی غیر ضروری لوگوں کی وجہ سے ہی آزاد وطن ملا ہے اور ان لوگوں کے ہاتھوں کی دن رات کی محنت مشقت سے ہی... ترقی اور تعمیر کی وہ منزلیں طے ہوئیں جن کا نظارہ وہ آج کل دیکھ رہے ہیں۔

☆☆☆

"بہو ذرا دیکھو بچوں نے پرسوں میرے عینک کی کمانی توڑ دی تھی۔ کمال دین سے کہنا بازار کی طرف جائے تو جڑوا لائے۔ شام کے بعد کافی مشکل ہوتی ہے۔" جمال دین نے دبے لہجے میں یاددہانی کروائی۔

"ہاں، ہاں کہہ دوں گی آپ نے کون سے موتی پرونے ہوتے ہیں، آپ کی جو قلیل سی پنشن آتی ہے اس سے زیادہ تو صرف آپ کی دوائیوں پر خرچ ہو جاتے ہیں، اللہ جانے بوڑھے لوگ کیوں جان کو جونک کی طرح چمٹ جاتے ہیں۔"

عطیہ کی آواز آ رہی تھی مگر جمال دین اماں بی کی طرح خاموش تھا۔ وہ سارا دن گلیوں میں مٹرگشت کرتا رہتا یا پھر گھر آ کر اپنے صندوق میں رکھے خزانے کو چوری، چوری دیکھا کرتا۔

"اللہ جانے اس میں کیا رکھا ہے؟" اس جملے کو بولتے ہوئے عطیہ کی آنکھوں میں جو چمک تھی جمال دین اس سے ناواقف تو نہیں تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ زمین میں اگر ببول اور اوک کے بیج ڈالے جائیں تو شہتوت کا درخت کبھی نہیں اگتا۔





ناولٹ

کہیں دیپ جلے کہیں دل

قیصرہ حیات

بارھواں حصہ

شمیلہ انتہائی جنونی اور پاگل ہو رہی تھی۔ وہ بار بار ردا پر جھپٹنے کی کوشش کرتی۔ ردا خوفزدہ کھڑی بری طرح کانپ رہی تھی۔ شمیلہ کے سر پر خون سوار تھا۔

''تم سب میرے فہام کے قاتل ہو، میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' شمیلہ ان دونوں ماں بیٹی کی طرف دیکھ کر چلآئی۔ زرینہ نے اس کے بازوؤں کو پیچھے سے جکڑ رکھا تھا اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

"کیا میں اپنے بیٹے اور ردا اپنے بھائی کو قتل کرے گی؟ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔" خدیجہ بیگم نے غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں تم سب اس کے قاتل ہو۔" شمیلہ نے زرینہ کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی جان کر اپنے آپ کو جھٹکے سے چھڑایا اور خدیجہ بیگم کے گریبان کی طرف اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ انہوں نے اسے زوردار تھپڑ لگایا تو وہ بلند آواز سے رونے چلّانے لگی۔

"آپ نے مجھے مارا...... مجھے مارا...... فہام کے بعد اب آپ مجھے مارنے بھی لگی ہیں۔" وہ گلا پھاڑ کر غصے سے ...... بولی تو اس کی آواز سن کر حاتم لاؤنج سے بھاگتا ہوا اندر آیا اور ان سب کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

"یہ...... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"انہوں نے مجھے مارا ہے، یہ دیکھو تھپڑ مارا ہے۔" شمیلہ نے اپنا گال اسے دکھاتے ہوئے کہا تو حاتم کی آنکھوں سے حیرت جھلکنے لگی۔

"مما! کیا آپ اتنی ظالم ہو گئی ہیں کہ فہام بھائی کے جاتے ہی آپ بھابی پر ظلم کرنے لگی ہیں۔" حاتم نے غصے سے ماں کی طرف دیکھا۔

"یہ ...... یہ جھوٹ بول رہی ہے بیٹا......" خدیجہ بیگم نے بے خیالی میں دوسرے ہاتھ میں پکڑی چھری سے شمیلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"چھری اپنے ہاتھ میں پکڑ کر آپ شمیلہ بھابی پر الزام لگا رہی ہیں بہت خوب...... !" حاتم نے غصے سے کہا تو خدیجہ بیگم ایک دم حیرت زدہ رہ گئیں۔ پہلے بھی ایسے کتنے مواقع آئے تھے جب حاتم نے شمیلہ کی زیادتی نہ دیکھی اور ماں، بہن کو الزام دے دیا۔

"حاتم بھائی یہ تو شمیلہ بھابی خود کچن سے لائی ہیں ردا بی بی کو مارنے کے لیے۔" زرینہ آگے بڑھ کر جلدی سے بولی۔

"یہ...... یہ سب جھوٹ بول رہی ہیں، یہ سب تو مجھے مارنا چاہتی ہیں...... ہاں فہام کے بعد مجھے بھی......" وہ سسکی بھر کر بولی تو حاتم غصے سے اُن کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں اچھی طرح جان گیا ہوں، یہاں کون کس کے خلاف کیا گیم کھیل رہا ہے؟" حاتم نے غصے سے کہا اور شمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ تینوں حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

شمیلہ کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر حاتم چھوٹے بھائی عاصم کے پاس آیا۔ عاصم، فہام کو یاد کر کے بری طرح رو رہا تھا۔ وہ اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ہماری مما...... اتنی جلدی بدل جائیں گی، یقین نہیں آ رہا۔" حاتم نے افسردگی سے کہا۔

"ک...... کیا مطلب......؟" عاصم نے چونک کر پوچھا۔

"مما...... شمیلہ بھابی پر بہت ظلم کرنے لگی ہیں، آج انہوں نے بھابی کو مارا بھی ہے۔" اس نے افسردہ لہجے میں بتایا۔

"رئیلی......؟" عاصم نے انتہائی حیرت سے کہا۔

"ہاں...... اگر میں موقع پر نہ پہنچتا تو شاید یقین نہ کرتا...... مما، ردا کو defend کرنے کے لیے شمیلہ بھابی کو ٹارچر کرنے لگی ہیں۔"

"اوہ...... نو...... مما اس حد تک بھی جا سکتی ہیں، آئی ڈونٹ بلیو اٹ۔" عاصم کو افسوس ہوا۔

"عاصم...... ہمیں فہام بھائی کی خاطر شمیلہ بھابی کا خیال کرنا چاہیے۔ مجھے لگتا ہے اب ان کا یہاں رہنا مناسب نہیں...... مما اور ردا نے ان کے خلاف باقاعدہ محاذ بنا لیا ہے اوپر سے وہ نوکرانی زرینہ...... ہم کل ہی انہیں خالہ کے گھر چھوڑ آتے ہیں۔" حاتم نے رائے دی تو عاصم عجیب نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"یقین نہیں آ رہا...... مما کیسے اتنا بدل گئی ہیں۔"

"اس کی وجہ ردا ہے...... ردا کی وجہ سے انہوں نے مجھ پر بھی ہاتھ اٹھایا تھا اور اب شمیلہ بھابی پر...... اب وہ صرف ردا کی مما ہیں۔" وہ پُرتاسف لہجے میں بولا۔

"ہاں پھر تو ان حالات میں ان کا یہاں سے چلے جانا ہی ٹھیک ہے۔" عاصم نے بھی اس کی تائید کی تو حاتم خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

روحیل ماں جی کے کمرے میں آیا تو وہ بیڈ پر بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"کیا آپ مجھ سے ابھی تک خفا ہیں؟ آپ مجھے ہی قصوروار سمجھتی ہیں۔ کیا ردا آپ کی نظر میں بالکل بے قصور ہے؟" روحیل نے خفگی سے پوچھا مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

☆☆☆

رات کافی گہری ہو گئی تھی ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ردا اپنے کمرے میں جا نماز پر بیٹھی اپنے رب کے حضور ہاتھ بلند کیے دعا مانگنے میں مصروف تھی۔ وہ بری طرح بلک رہی تھی۔ گھر کے حالات اور ان کے رویّوں نے اسے خاصا توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ وہ نہایت دل برداشتہ ہو رہی تھی اور بس خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا کر رہی تھی۔

"یا اللہ......! تو جانتا ہے، میں نے روحیل کے علاوہ کسی اور سے محبت نہیں کی۔ میں گنہگار نہیں ہوں تو، تو لوگوں کے عیبوں پر پردہ ڈالنے والا ہے، مجھ بے قصور کو سب کے سامنے رسوا کیوں کر ڈالا۔ تو میرے دامن پر لگے اس دھبے کو دور کر دے اور میری مدد کر، مجھ سے میرے اپنوں کی بے رخی اور نفرت برداشت نہیں ہو رہی۔ میرے اپنوں کا غم مجھے مار ڈالے گا...... مجھے مار ڈالے گا۔" ردا دعا مانگتے مانگتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کافی دیر تو وہ اپنے رب کے حضور جھکی رہی پھر جا نماز سے اٹھی اور اپنے بستر پر تسبیح ہاتھ میں لیے آ بیٹھی۔ جبھی اس کا سیل فون بجا، اس نے دیکھا کوئی اوورسیز کال تھی اس نے بڑھ کر فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف رشنا تھی۔

"ہیلو ردا! کیسی ہو......؟ نہ جانے آج کیوں تم مجھے بہت یاد آ رہی تھیں۔ سوری اس وقت میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا، ہاں بھئی یہاں تو شام ہو رہی ہے ناں...... مجھے ابھی ٹائم ملا تو تمہیں فوراً فون کر ڈالا اور سناؤ، تمہارے فہام بھائی کیسے ہیں، مجھے بہت یاد آتے ہیں۔" رشنا تیزی سے بات کرنے لگی تو ردا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے، وہ ہچکیاں بھرنے لگی اور موبائل آف کر دیا۔ رشنا پریشان ہو گئی۔ اس نے دوبارہ ردا کا نمبر ملایا مگر اس کا فون اب بند جا رہا تھا۔ اس نے پریشان ہو کر ماں کو فون کیا۔ وہ امریکا میں تھیں اور پاکستان واپسی کی تیاری کر رہی تھیں۔ وہ واپس پاکستان جا رہی تھی اس امید پر کہ تو قیر وطن تو واپس آ سکتا ہے مگر امریکا نہیں، ان کے شوہر نے انہیں بہت سمجھایا مگر نجمہ بیٹے کی وجہ سے بہت پریشان تھیں۔

"رشنا...... تمہیں کیسے خبر ہو گئی کہ میں پاکستان جا رہی ہوں؟" انہوں نے مسکرا کر بیٹی سے پوچھا۔

"کب......؟ مگر میں نے تو یونہی فون کیا ہے...... میں ردا کے بارے میں بہت اپ سیٹ ہو رہی ہوں۔" رشنا نے پریشانی سے کہا۔

"کیوں...... سب ٹھیک تو ہے ناں، کیا ہوا اسے؟" نجمہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

"معلوم نہیں، ابھی میں نے اسے فون کیا تھا تو وہ بات کم اور رو زیادہ رہی تھی۔ مما آپ پاکستان جاتے ہی ردا کے گھر جائیں...... میرا دل اس کے لیے بہت پریشان ہو رہا ہے۔" رشنا نے کافی فکرمندی سے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں پہلی فرصت میں ہی اس کی طرف جاؤں گی، تم فکر نہ کرو۔" انہوں نے اسے تسلی دی۔

☆☆☆

ردا صبح دیر سے بیدار ہوئی تو اس کے سر میں

شدید درد ہو رہا تھا۔ رات بھر رونے سے اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ وہ بہ مشکل اٹھی تو اس کے سر میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ سر کو انگلیوں کی پوروں سے دباتی ہوئی لاؤنج میں آئی اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے زرینہ کو آوازیں دینے لگی مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ جبھی خود ہی کچن میں چلی گئی چولھا جلا کر اس پر کیتل رکھی اور آگ کی طرف بغور دیکھنے لگی۔ اسے آگ میں اپنا عکس دکھائی دیا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ بھی اسی آگ میں جل رہی ہو...... اس کا پورا وجود آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہو۔ اسی لمحے شمیلہ قدرے بلند آواز میں بولتی ہوئی کچن کی طرف آئی۔ ردا کی پشت اس کی جانب تھی۔

''زرینہ مجھے ایک کپ چائے بنا کر دو۔'' اس نے کچن میں آ کر کہا تو ردا نے مڑ کر دیکھا۔

''میں چائے بنا رہی ہوں بھابی، آپ کے لیے بھی بنا دیتی ہوں۔''

''خبردار...... جو تم نے مجھ سے کوئی بات کی، میری زندگی کو برباد کر کے اب بھی تمہیں چین نہیں آ رہا۔ منحوس کہیں کی۔'' شمیلہ ایک دم غصے سے بولی تو ردا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھے گئی۔

''خدا کے لیے مجھے فہام بھائی کی موت کا ذمّے دار مت ٹھہرائیں۔ میں بھی اتنی ہی دکھی ہوں جتنی کہ آپ......'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''تمہارا تو ایک بھائی مرا ہے مگر دو تو تمہارے پاس ہیں، میرا تو سب کچھ فہام تھا۔'' وہ غصے اور غم کی ملی جلی کیفیت میں بولی۔

''میری محبت...... میری چاہت اور میرا ہم سفر...... دنیا کا کوئی دوسرا انسان فہام کی طرح نہیں ہو سکتا ہے، اب بتاؤ کس کا زیادہ نقصان ہوا ہے، میرا یا تمہارا......؟'' شمیلہ اس دم بہت بے چارگی کے عالم میں پوچھ رہی تھی۔

''خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں...... میں بے گناہ ہوں۔'' ردا نے شمیلہ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں ہرگز معاف نہیں کروں گی۔ تم میرے سامنے آتی ہو تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔'' اس نے غصے سے ردا کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا تو اسی لمحے خدیجہ بیگم کچن میں آ گئیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' وہ کافی پریشانی سے پوچھنے لگیں۔

''ڈراما...... جو آپ دونوں کرنے میں ماہر ہیں۔'' شمیلہ نے نہایت غصے سے نتھنے پُھلا کر کہا۔

''بکواس بند کرو اور جاؤ یہاں سے۔'' خدیجہ بیگم سرتاپا کانپ رہی تھیں۔

''حاتم...... حاتم باہر آؤ...... خدا کے لیے کوئی تو مجھے بچائے۔'' شمیلہ نے کچن میں ہی کھڑے ہو کر بڑی بلند آواز میں کہا تو وہ دونوں پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

''کیوں...... جھوٹ بول رہی ہو...... کچھ تو خدا کا خوف کرو......'' خدیجہ بیگم نے شمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا تو اسی لمحے حاتم اور عاصم اپنے کمروں سے باہر نکل آئے...... شمیلہ اور بلند آواز سے رونے لگی۔

''حاتم اب تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو...... خالہ جان مجھے کس کس طرح ٹارچر کر رہی ہیں۔ یہ دونوں مجھے چائے کا ایک کپ نہیں لینے دے رہیں، اب اس گھر پر میرا اتنا حق بھی نہیں رہا۔'' شمیلہ نے نہایت چالاکی سے ان دونوں کی طرف دیکھ کر حاتم سے کہا۔

''مما...... آپ اتنی ظالم اور بے رحم بھی ہو سکتی ہیں۔ یقین نہیں آ رہا......'' وہ ماں کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یہ...... یہ جھوٹ بول رہی ہے بیٹا۔'' ماں کی بات پر وہ غصے سے آگے بڑھا۔

''میرا خیال ہے اب شمیلہ بھابی کا یہاں رہنا مناسب نہیں...... عاصم چلو ہم دونوں انہیں ابھی خالہ جان کی طرف چھوڑ کر آتے ہیں۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے...... تم جانتے ہو اس سے خاندان بھر میں ہماری کتنی بدنامی ہو گی۔'' خدیجہ بیگم نے ایک دم غصے سے بیٹے کو ڈانٹا۔

''آپ کی عزت سے زیادہ بھابی کی جان اہم ہے...... اور اب ان کی جان کو خطرہ ہے۔'' اس نے غصے سے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''حاتم...... کچھ شرم کرو، اپنی ماں کے بارے میں یہ کہہ رہے ہو۔'' وہ بلند آواز سے چلّاتے ہوئے بولیں۔

''ہاں...... آپ کا یہ روپ دیکھ کر میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔'' اس نے غصے سے جواب دیا اور شمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے باہر لے گیا۔

☆☆☆

''آنٹی...... آپ......؟'' ردا نجمہ آنٹی کو دیکھ کر چونکی تو نجمہ اسے اپنے ساتھ لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں...... ردا بھی سسکیاں بھرنے لگی۔

''میں کل ہی امریکا سے آئی ہوں، رشنا تمہارے بارے میں بہت پریشان ہو رہی تھی...... لیکن تمہیں دیکھ کر لگ رہا ہے کہ اس کا پریشان ہونا بجا تھا...... اب تمہاری مما نے فہام کی ڈیتھ کے بارے میں بتایا ہے تو یقین نہیں آ رہا۔'' انہوں نے آہ بھر کر کہا۔

''بس اللہ کی طرف سے اس کا وقت آ گیا تھا۔'' خدیجہ بیگم نے آہ بھر کر افسردگی سے جواب دیا۔

''مما! آپ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ ان کی موت کی ذمّے دار میں ہوں۔'' وہ سسکی بھر کر بولی تو نجمہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''بیٹا...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو...... فہام تو تم پر جان چھڑکتا تھا۔'' انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اور میں کتنی منحوس ہوں، جس نے اتنے پیار کرنے والے بھائی کی جان لے لی۔ خدا مجھ جیسی بہن کسی بھائی کو نہ دے۔'' ردا نے سسکی بھر کر کہا۔

''بیٹا...... ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟'' نجمہ آنٹی کافی دُکھی ہو کر پوچھنے لگیں۔

''اس لیے کہ روحیل اس دن اگر مجھے گھر سے نہ نکالتا تو فہام بھائی گھر سے نہ جاتے اور نہ ہی ان کا مرڈر ہوتا۔'' ردا نے سسکی بھر کر جواب دیا۔

''کیا...... روحیل نے تمہیں......؟'' انہوں نے انتہائی حیرت سے چیختے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... اب اس نے مجھے طلاق دے دی ہے۔'' ردا نے نجمہ کی بات کاٹ کر جواب دیا۔

''کیا...... طلاق ؟'' نجمہ انتہائی پریشانی سے بولی تھیں۔

''ہاں...... ابھی ایک طلاق ہوئی ہے۔'' خدیجہ بیگم نے جلدی سے کہا۔

''اُف میرا تو بی پی ہائی ہونے لگا ہے۔'' نجمہ نے اپنے سر کو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''ردا کو طلاق...... نہیں نہیں۔'' وہ سخت صدمے کی کیفیت سے دوچار تھیں۔

نجمہ بیگم نے گھر جا کر رشنا کو ردا کے تمام حالات بتائے، وہ بھی شدید صدمے کی کیفیت میں آ گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوراً روحیل سے بات کرے جس نے اس کی اتنی پیاری دوست کی یہ حالت کر دی تھی۔ رات بھر سوچنے کے بعد اس نے ماں کو صبح سویرے ہی فون کیا اور انہیں روحیل کے گھر جانے کو کہا۔ رشنا کے بے حد اصرار پر ہی وہ روحیل کے گھر گئیں۔

''میں ردا کی دوست رشنا کی ممی ہوں'' انہوں نے مسکرا کر روحیل اور اس کی ماں سے اپنا تعارف کرایا۔

''اوہ......'' روحیل ایک دم چونک پڑا۔

''میں آپ دونوں سے کچھ باتیں کرنے آئی ہوں۔'' نجمہ نے جلدی سے کہا۔

''کیا آپ کو ردا اور اس کی فیملی نے یہاں بھیجا ہے؟'' روحیل نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''نہیں، ان لوگوں کو تو اس کی خبر بھی نہیں کہ

میں یہاں آئی ہوں، میں نے ردا اور اس کی مما کو پریشان دیکھا تو پھر آپ سے ملنے کا از خود فیصلہ کیا۔"

"آپ ہمارے معاملے میں انٹرفیئر نہ کریں تو بہتر ہے۔" روحیل نے جلدی سے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بیٹا...... اگر بڑے نیک نیتی سے بچوں کے مسائل سلجھانے کی کوشش کریں تو ان کی بات ضرور سننی چاہیے۔"

"کوئی کسی کے لیے اچھا کرنے کی کوشش کرے تو اس کی عزت اور قدر کرنی چاہیے۔ ہاں بہن فرمائیں۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟" اب کی دفعہ ماں جی نجمہ بیگم سے مخاطب تھیں۔

"آخر آپ لوگوں کا آپس میں کیا مسئلہ ہے؟" نجمہ نے گہری سانس لے کر پوچھا۔

"بے اعتباری اور بے یقینی کا...... جو عورت اپنے شوہر کے ساتھ فیئر نہ ہو اور دوسروں کے ساتھ اس کے چکر ہوں تو کیا اس کے ساتھ زندگی گزاری جاسکتی ہے؟" ان کی بات پر روحیل غصے سے بولا۔

"نہیں، نہیں ردا ایسی نہیں ہوسکتی...... وہ تو بہت معصوم اور نیک لڑکی ہے۔" نجمہ نے ایک دم گھبرا کر کہا۔

"آپ نے وہ محبت نامہ نہیں دیکھا ناں جو توقیر نامی لڑکے نے ردا کو لکھا تھا۔" روحیل نے غصے سے کہا۔

"ک...... کِس کس نے؟" نجمہ نے ایک دم انتہائی حیرت سے چلا کر کہا۔

"میں اسے نہیں جانتا...... مگر توقیر نامی لڑکا اس سے محبت کرتا تھا اور اس نے ہی ردا کو وہ لو لیٹر لکھا تھا۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ وہ میرے سامنے آئے تو میں اسے گولی سے اُڑا دوں مگر کم بخت آسٹریلیا چلا گیا۔" روحیل نے غصے سے کہا تو نجمہ ایک دم گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آئی ایم سوری...... میرا بی پی ہائی ہو رہا ہے، میں پھر آؤں گی۔" وہ جلدی سے بولیں اور وہاں سے چلی آئیں گھر آ کر انہوں نے ساری بات رشنا کو بتائی تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"ک...... ک کیا مطلب......؟" رشنا انتہائی حیرت سے بولی۔

"توقیر کا کوئی لو لیٹر جو اس نے ردا کو لکھا تھا اسی سے سارا فساد کھڑا ہوا ہے، روحیل اس کے اس افیئر کو معاف کرنے کو تیار نہیں۔"

"اوہ...... نو۔ توقیر بھائی ایسا بھی کر سکتے ہیں، یقین نہیں آرہا۔"

"اگر توقیر...... ردا سے محبت کرتا تھا تو مجھے صرف ایک بار بتا تو دیتا...... میں خود اس کی ردا سے شادی کروا دیتی۔" وہ نہایت افسردگی کے عالم میں کہہ رہی تھیں۔

"اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا...... اب یہ سوچیں کہ ردا کا گھر کیسے بچانا ہے مما، اگر ہم کچھ نہیں کر سکے تو ہم ردا کے مجرم ہوں گے۔" رشنا پریشانی سے بولی۔

"کیا کروں...... کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" نجمہ سخت پریشان تھیں۔

"اب آپ نہیں...... میں ہی کچھ کرتی ہوں۔" رشنا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور موبائل آف کر دیا۔

☆☆☆

رشنا نے بہت سوچ سمجھ کر بھائی کو فون لگایا جو اس نے کافی دیر بعد اٹھایا۔

"کیا ہوا بھائی، کہاں تھے؟" رشنا نے ایک دم پوچھا۔

"بس کچھ طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، لگتا ہے آسٹریلیا کا موسم اور آب و ہوا شاید مجھے سوٹ نہیں کر رہے، ہر وقت ڈسٹرب رہتا ہوں۔" توقیر نے بیزاری سے کہا۔

"موسموں کے علاوہ اور بھی بہت سے

reasons ہوتے ہیں جو انسان کو ڈسٹرب رکھتے ہیں۔" رشنا نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیا مطلب......؟" توقیر نے چونک کر پوچھا۔

"کیا آپ ردا سے محبت کرتے تھے اور اسے کوئی لو لیٹر بھی لکھا تھا؟" رشنا نے بغیر کسی تمہید کے توقیر سے پوچھا۔

"ک...... ک...... کیا مطلب......؟"

"آپ کے اس لیٹر کی وجہ سے ردا اور روحیل کی میرڈ لائف ڈسٹرب ہو گئی ہے اور نوبت طلاق تک پہنچ گئی ہے۔" رشنا نے گویا انکشاف کیا۔

"اوہ...... نو...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" توقیر نے ایک دم گھبرا کر کہا۔

"اگر آپ نے اس سے محبت کی تھی تو پھر شادی بھی کر لیتے۔ خالی رومانس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" رشنا نے خفگی سے کہا۔

"ہاں...... میں نے اس سے سچی محبت کی ہے...... کھیل سمجھ کر ہرگز نہیں...... اور میں اس کے ساتھ سیریس بھی تھا۔" توقیر نے اقرار کیا۔

"تو پھر آپ نے اسے کیوں چھوڑ دیا؟" رشنا نے خفگی سے پوچھا۔

"اس نے میری محبت کو رد کر دیا تھا۔" توقیر نے صاف صاف بتایا۔

"کیوں......؟" رشنا نے چونک کر پوچھا۔

"اس کا دل میری محبت کو قبول نہیں کرتا تھا اور یہ بات مجھے اس نے خود صاف، صاف بتا دی تھی۔" توقیر نے افسردگی سے کہا۔

"مگر کیوں بھائی......؟" رشنا نے جھنجلا کر کہا۔

"معلوم نہیں...... مگر یہی حقیقت ہے۔"

"تو کیا وہ لیٹر آپ نے اس کے انکار سے پہلے لکھا تھا؟" رشنا نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں بعد میں...... جب میں...... برتھ ڈے کا گفٹ دینے گیا تھا تو شاعری کی ایک کتاب میں وہ لیٹر رکھ دیا تھا یہ سوچ کر کہ شاید اس کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ پیدا ہو جائے لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ میری اس لمحے کی خواہش اس کی زندگی پر یوں اثر انداز ہوگی۔" توقیر نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن...... اب آپ کو کچھ ایسا کرنا چاہیے کہ ردا کا گھر ٹوٹنے سے بچ جائے۔" رشنا نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تم بتاؤ...... کیا کروں؟" توقیر نے چونک کر پوچھا۔

"آپ روحیل سے بات کریں اور اسے سمجھانے کی کوشش کریں۔ مما بھی گئی تھیں مگر وہ شدید غلط فہمی کا شکار ہے۔ کچھ سننے کو تیار نہیں۔" رشنا نے تفصیل سے بتایا۔

"تو پھر وہ میری بات کیسے سنے گا؟"

"کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں اگر آپ یوں خاموش رہے اور ردا کو طلاق ہو گئی تو کیا آپ یہ برداشت کر سکیں گے؟"

"نہیں...... شاید یہ گلٹ میری جان لے لے گا۔" توقیر نے برجستہ کہا۔

"میں آپ کو روحیل بھائی کا نمبر سینڈ کرتی ہوں۔ پلیز آپ ان سے ایک مرتبہ ضرور بات کریں۔" رشنا نے بے حد اصرار سے بھائی سے کہا اور توقیر ٹھیک ہے کہہ کر رہ گیا۔

☆☆☆

کومل، آزر کے ساتھ رانا صاحب کے آفس میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ رانا صاحب آفس میں موجود نہیں تھے اور آزر چہرے سے ہی بہت گھبرایا ہوا اور پریشان لگ رہا تھا۔ کومل اس کے حلیے اور چہرے کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔

"مجھے یقین نہیں آرہا...... آزر یہ تم ہی ہو؟"

"میں بہت کرائسز سے گزر رہا ہوں کومل۔"

"تمہارا حلیہ اور تمہارا چہرہ مجھے سب کچھ بتا رہا

ہے لیکن یہ سب کیسے ہوگیا۔ تمہارا بیک گراؤنڈ تو بہت اسٹرونگ تھا۔'' کومل نے افسردگی سے پوچھا تو آزر نے ایک سرد آہ بھر کر اس کی طرف دیکھا۔

''انسان کے ساتھ کیا کچھ ہوجاتا ہے، اسے خود بھی سمجھ نہیں آتی۔ میرے ساتھ بھی جو کچھ ہوا ہے مجھے نہ اس کی سمجھ آرہی ہے اور نہ ہی یقین......آزر نے شکستہ لہجے میں کہا۔

''تمہارے پیرنٹس کہاں ہیں؟''

''دونوں کی ڈیتھ ہوچکی ہے...... اور میرا سب کچھ ختم ہوچکا ہے، یہاں جاب کے لیے آیا ہوں۔'' آزر نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

''اور تمہاری اسٹڈیز؟''

''وہ بھی incomplete رہ گئی۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''اور یمنیٰ......کہاں ہے......کیا اسے تمہارے حالات کے بارے میں کچھ پتا نہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے، وہ تو تم سے بہت محبت کرتی تھی وہ تمہیں کبھی اس سچویشن میں نہ رہنے دیتی۔'' کومل اپنی ہی لے میں بولے چلی گئی۔ آزر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا اور سر جھکا لیا۔

''آزر......کیا بات ہے، کیا یمنیٰ اور تم میں کوئی ناراضی چل رہی ہے؟'' کومل نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''ہاں......'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

''یہ، یہ......کیسے ممکن ہے، وہ تو تمہاری وجہ سے ہم سے ناراض ہوجاتی تھی، تم سے کیسے ناراض ہوگئی؟'' کومل نے نہایت حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' آزر یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

کومل اس کی طرف بغور دیکھتی رہی اور آزر کے چہرے پر آنے والے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتی رہی، وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس سے نظریں چرا رہا تھا۔

''کیا جواد سے بات ہوتی ہے؟'' کومل نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

''نہیں......کئی بار فون کیا مگر اس کا موبائل ہی آف ملتا ہے۔'' آزر نے جواب دیا۔

''کیا تم اس کا ایڈریس نہیں جانتے کہ اس کے گھر چلے جاتے ؟''

''ایڈریس تو جانتا ہوں مگر گیا نہیں۔'' اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

''اب تم کہاں رہ رہے ہو؟'' کومل نے پھر پوچھا۔

''کوئی مستقل ٹھکانا نہیں۔''

''میں نانا ابا سے کہہ کر تمہارے رہنے کا بندوبست کرتی ہوں۔ چلو اٹھو ابھی چلتے ہیں۔'' کومل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کہاں......؟'' وہ حیرت زدہ تھا۔

''جواد سے ملنے......'' کومل نے مسکرا کر کہا۔

''ن......نن نہیں۔'' آزر نے گھبرا کر جواب دیا۔

''کیوں......تم اتنا گھبرا کیوں رہے ہو؟ کیا جواد سے بھی کوئی ناراضی چل رہی ہے؟'' کومل نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''نہیں......'' آزر نے جواب دیا۔

''تو پھر چلو......میرے ساتھ۔'' کومل نے کہا تو آزر خاموش ہوگیا۔ اسی لمحے رانا صاحب آفس میں داخل ہوئے۔

''کیا آپ لوگ کہیں جا رہے ہیں؟'' رانا صاحب نے کومل کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نانا ابا......ہم دونوں اپنے ایک کلاس فیلو سے ملنے جا رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا ضرور جاؤ......مگر رات کو ڈنر پر ضرور آجانا ورنہ تمہاری نانی اماں مجھ سے ناراض ہوجائیں گی۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''رائٹ گرینڈ پا......آزر بھی میرے ساتھ ہوگا......اور ہاں آزر کے stay کے لیے بھی کوئی

ارینجمنٹ کردیں۔'' کومل نے ایک دم کہا تو آزر نے چونک کر اسے دیکھا اور بوکھلا گیا مگر خاموش رہا۔

''اوکے بیٹا......میں انیکسی میں ان کے رہنے کا بندوبست کروا دیتا ہوں۔'' رانا صاحب نے آزر کی طرف دیکھ کر کہا تو کومل مسکرا دی۔

''تھینک یو......نانا ابا......اب ہم چلتے ہیں، چلو آزر......'' کومل نے آزر سے کہا تو وہ اس کے ہمراہ خاموشی سے چلا گیا اور رانا صاحب دونوں کو جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

☆☆☆

آزر......سارا راستہ زیادہ تر خاموش رہا......کومل جو بات پوچھتی تو وہ اس کا جواب دے دیتا۔ کومل نے نوٹ کیا تھا وہ جب بھی یمنیٰ کا، حمنہ کا ذکر کرتی تو آزر مضطرب ہوجاتا۔ خاص طور پر حمنہ کے نام پر اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگتے اور وہ اس سے نظریں چرانے لگتا......کومل کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ پھر موضوع بدل کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی......سارا راستہ یونہی کٹا جب وہ جواد کے ہاں پہنچے تو وہ ان دونوں کو اکٹھے دیکھ کر انتہائی حیران ہوا۔ وہ بار بار آزر اور کومل کو ناقابلِ یقین انداز سے دیکھتا رہا۔

''آزر...... یار...... تم کہاں رہے ہو اتنا عرصہ......پورے چار سال بعد ہم مل رہے ہیں، مجھ سے کوئی کانٹیکٹ بھی نہیں رکھا۔ مجھے تو یقین ہوگیا تھا کہ تم مجھے بھول گئے ہو۔'' جواد نے آزر سے شکوہ کیا۔

''میں نے کئی بار تمہیں فون کیا مگر تمہارا نمبر ہی آف ملتا تھا۔'' آزر نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''اوہ......آئی سی......میرا وہ والا نمبر تو آف ہی رہتا ہے۔ دراصل موبائل کھو گیا تھا تو میں نے سم نکلوا کر بس ریچارج نہیں کی۔ لیکن یار تم مجھ سے میرے گھر آکر تو مل سکتے تھے جیسا کہ اب آئے ہو۔''

''اسے تو میں یہاں لائی ہوں۔'' کومل نے کہا۔

''لیکن تم اور کومل یہاں کیسے...... تمہارے ساتھ تو یمنیٰ کو ہونا چاہیے تھا ؟'' جواد نے مسکرا کر آزر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم بوکھلا گیا۔

''ویسے جواد، یمنیٰ کہاں ہے؟'' کومل نے ایک دم پوچھا۔

''میرا خیال ہے یہ تم آزر سے پوچھو تو زیادہ بہتر جواب دے سکتا ہے۔'' جواد نے مسکرا کر کومل سے کہا۔

''میرا کئی سالوں سے اس سے کوئی رابطہ نہیں۔'' آزر نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''کیا کہا...... کئی سالوں سے تمہارا کوئی رابطہ نہیں...... تم اور یمنیٰ تو ایک دوسرے کے بغیر ایک منٹ نہیں رہتے تھے اور اب کئی سالوں سے اٹس امیزنگ یار...... جب تم یو کے گئے تھے تب یمنیٰ کا فون ایک دو بار آیا تھا...... تب وہ تم سے کچھ خفا خفا لگتی تھی...... پھر اس کے بعد میں نے ایک دو بار اس کا نمبر ٹرائی کیا مگر وہ آف ملتا تھا۔'' جواد نے اسے بتایا۔

''تو تم حمنہ سے اس کے بارے میں پوچھ لیتے ؟'' کومل نے کہا۔

''اس بے چاری کے ساتھ تو کوئی مس ہیپ ہو گیا تھا۔ سننے میں آیا کہ کسی نے اس کا مرڈر کر دیا تھا یا پھر اس نے خودکشی کر لی تھی۔ مختلف افواہیں تھیں۔'' جواد نے کومل کے سامنے حیرت انگیز انکشاف کیا۔

''کیا...... کیا حمنہ کی ڈیتھ ہو چکی ہے؟'' کومل نے انتہائی حیرت سے تقریباً چلاّتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... شاید پھر ایگزامز کے بعد میں بھی آؤٹ آف کنٹری چلا گیا اور ابھی ایک سال پہلے یہاں آ کر میں نے اپنا گاڑیوں کا شوروم کھولا ہے۔ میں بزنس کو اسٹیبلش کرنے میں اتنا بزی رہا کہ کسی سے رابطہ ہی نہیں کر سکا۔'' جواد نے تفصیلاً بتایا تو آزر کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور اس نے سر جھکا لیا۔

''جواد...... میں کچھ نہیں جانتی تم یمنیٰ کو تلاش کرو...... میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ حمنہ کی ڈیتھ کا سن کر مجھے بہت شاک لگا ہے، مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ حمنہ جیسی اچھی اور نیک لڑکی کا کوئی مرڈر بھی کر سکتا ہے یا وہ خودکشی کر سکتی ہے اٹس امپاسبل'' کومل نے اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے پُرنم لہجے میں کہا تو آزر کے اندر احساسِ جرم بڑھنے لگا...... وہ ایک دم پریشان ہو کر اٹھا۔

''مجھے کچھ کام ہے، کومل تم یہیں جواد کے پاس بیٹھو...... مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔'' آزر کہہ کر وہاں سے چلا گیا اور وہ دونوں اسے حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔

''یار...... اسے کیا ہو گیا ہے...... آزر تو بالکل ہی بدل چکا ہے۔'' جواد نے حیرت سے کومل سے کہا۔

''ہاں...... اس کے حالات بھی بہت بدل چکے ہیں اور خیالات بھی...... آئی ایم شیور...... یمنیٰ اور اس میں کوئی جھگڑا ہوا ہے، جس کے بارے میں یہ ہمیں نہیں بتانا چاہتا۔ جواد کیوں نہ ہم ان دونوں کی صلح کرا دیں۔ دو محبت کرنے والوں کے درمیان اگر کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے تو اسے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' کومل نے سادگی سے کہا تو جواد بھی اثبات میں سر ہلانے لگا۔

''ہاں...... مگر اس کا کوئی کانٹیکٹ نمبر بھی تو ہو۔''

''اس کے والد اس شہر کے بہت بڑے بزنس مین ہیں، تم ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو، یوں کرتے ہیں ہم دونوں اس کے گھر چلتے ہیں اور اس کے پیرنٹس سے اس کے بارے میں پوچھتے ہیں۔'' کومل نے رائے دی۔

''ٹھیک ہے...... میں یمنیٰ کے والد کے بارے میں انفارمیشن لینے کی کوشش کرتا ہوں، میرا خیال ہے ان کا نام جمال احمد تھا۔'' جواد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... اور شاید وہ چیمبر میں کسی آؤٹ اسٹینڈنگ پوسٹ پر بھی تھے۔''

''ہاں، مجھے ان کے بارے میں انفارمیشن لینے دو پھر میں تمہیں کال کر کے بتاؤں گا۔''

''او کے...... میں اب چلتی ہوں۔'' کومل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کومل...... تم نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں...... اتنا عرصہ کہاں رہی ہو، اچانک تم غائب ہو گئیں اور اب اچانک تم آئی ہو تو تمہیں یمنیٰ کی فکر زیادہ لگی ہے۔'' جواد نے مسکرا کر پوچھا۔

''ڈیڈی کی پوسٹنگ پشاور ہو گئی تھی تو میں پشاور چلی گئی...... اس کے بعد ڈیپوٹیشن پر وہ یو کے چلے گئے، وہاں سے میں نے ایم بی اے کیا اور ابھی recently ہم پاکستان واپس آئے ہیں۔ ڈیڈی اور ممی لاہور میں ہیں اور میں نانا ابو سے ملنے یہاں آئی تھی۔ ان کی فیکٹری میں ان کے ساتھ کام کر کے کچھ بزنس experience کرنا چاہتی ہوں۔'' کومل نے اسے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے، تم ابھی یہیں رہو گی ؟'' جواد نے پوچھا۔

''لیکن تم یمنیٰ کا نمبر جلدی تلاش کرنے کی کوشش کرنا......'' کومل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

☆☆☆

یمنیٰ کے مدرسے کا کام کافی جلدی مکمل ہو چکا تھا اور اس کی اپنی تعلیم بھی تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ اب اس نے اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ گاؤں کی بچیوں کو بھی قرآن پاک پڑھانا شروع کر دیا تھا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ جمال احمد اور ایمن گاہے بہ گاہے اسے ملنے گاؤں آتے تھے مگر وہ خود بہت کم شہر جاتی تھی...... کسی عید تہوار پر اماں جی کے ساتھ جاتی اور پھر جلدی واپس آ جاتی...... اب وہاں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اور اب عرصہ دراز سے وہ شہر بھی نہیں گئی تھی۔ ایمن اسے بہت زیادہ مس کرتیں اور جمال صاحب سے ہر وقت شکوے شکایت کرتی رہتیں۔ رفتہ رفتہ وہ خود بھی نفسیاتی طور پر شدید دباؤ کا شکار رہنے لگی تھیں۔ ایک طرف انہیں یمنیٰ کے حلیے کی فکر رہتی اور دوسری طرف اس کی شادی کے بارے میں سوچ، سوچ کر پریشان رہتیں۔

کافی دنوں کی کوشش کے بعد جواد کو جمال صاحب کا کانٹیکٹ نمبر ملا تو اس نے ان سے فون کر کے ملاقات کا ٹائم لیا اور وہ فوراً ہی کومل کو بھی انفارم کر دیا...... کومل یہ جان کر بہت خوش ہوئی۔

''کیا تم آزر کو بھی ساتھ لاؤ گی ؟'' جواد نے پوچھا۔

''نہیں...... ابھی فی الحال میں اسے کچھ نہیں بتانا چاہتی...... پہلے میں یمنیٰ سے مل کر ناراضی کی وجہ جاننا چاہتی ہوں پھر آزر کو بتاؤں گی۔'' کومل نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تم کل شام پانچ بجے میرے شوروم میں آ جانا تو پھر یمنیٰ کی طرف چلیں گے۔'' جواد اسے اپنے شوروم کا ایڈریس بتانے لگا۔

☆☆☆

جمال صاحب مہمانوں کی آمد کے منتظر تھے اور بار بار اپنی گھڑی کو دیکھ رہے تھے...... انہوں نے ایمن کو خصوصی طور پر چائے اور لوازمات تیار کرنے کو کہا تھا۔ ایمن بار بار ان سے مہمانوں کے بارے میں پوچھ رہی تھیں مگر وہ ہر بار خاموش ہو جاتے...... کومل اور جواد جب ان کے گھر پہنچے تو جمال صاحب نے ان کا پُرتپاک استقبال کیا۔ کومل نے جینز کے ساتھ اسٹائلش کُرتہ پہن رکھا تھا اور انتہائی ماڈرن گیٹ اپ میں وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی اور جواد بھی پینٹ کوٹ میں ملبوس بہت ڈیسنٹ لگ رہا تھا۔ جمال صاحب نے جب ایمن کو ان سے ملوایا تو ایمن کے چہرے کے تاثرات ایک

دم مایوسی میں بدلنے لگے اور ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور ایسا ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔ جب بھی یمنیٰ کے کوئی فرینڈز اس سے ملنے آتے تو ایمن کو شدید ڈپریشن ہونے لگتا۔ انہیں ماڈرن گیٹ اپ میں دیکھ کر اُن کے اندر مایوسی بڑھنے لگتی اور انہیں اپنی بیٹی پر افسوس سا ہونے لگتا...... اسی لیے جمال صاحب نے انہیں کومل اور جواد کی آمد کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ وقت سے پہلے انہیں ڈپریس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ بار بار کومل کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

''انکل...... یمنیٰ کہاں ہے، ہم تو اس سے ملنے آئے ہیں؟'' کومل نے مسکرا کر ان سے پوچھا۔

''بیٹا وہ تو گاؤں میں رہتی ہے، اپنی گرینڈ مدر کے ساتھ۔'' جمال صاحب نے جواب دیا تو ایمن کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔

''کیوں...... کیا وہ وہاں کوئی سوشل ورک کر رہی ہے؟'' جواد نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں، یونہی سمجھو......!'' جمال صاحب نے مسکرا کر کہا۔

''واہ، یہ تو بہت اچھا ہے۔'' کومل نے تعریفی انداز میں کہا۔

''کوئی سوشل ورک نہیں...... وہ تو وہاں مُلّانی بنی بیٹھی ہے، بچوں کو قرآن پاک پڑھاتی ہے۔'' ایمن نے خفگی سے منہ بنا کر کہا۔

''کیا...... یمنیٰ اور قرآن پاک......'' کومل نے انتہائی حیرت سے کہا۔

''ہاں...... واقعی...... یہ تو بہت ہی عجیب سی بات ہے۔ یمنیٰ جیسی ماڈرن لڑکی اور قرآن پاک کی تعلیم......؟'' جواد نے انتہائی حیرت سے کہا۔

''بیٹا اس میں حیرانی کی کیا بات ہے...... کیا ماڈرن لوگ مسلمان نہیں ہوتے۔ کیا وہ قرآن نہیں پڑھتے؟'' جمال صاحب نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا تو جواد شرمندہ ہو گیا۔

''نہیں انکل...... میں تو یونہی بات کر رہا تھا۔ ایکچوئیلی یمنیٰ بہت مختلف لڑکی تھی...... آئی مین...... religion کے بارے میں وہ اتنی strict نہیں تھی کہ ہم اس سے یہ توقع کرتے...... البتہ حمنہ کے بارے میں یہ کہا جا سکتا تھا۔'' جواد نے جلدی سے کہا تو جمال صاحب ایک دم خاموش ہو گئے۔

''انکل ہم یمنیٰ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ پلیز ہمیں اس کا کانٹیکٹ نمبر دے دیں۔'' کومل نے بے حد اصرار سے کہا۔

''اوکے بیٹا۔'' جمال صاحب نے ایک کارڈ پر ایڈریس اور فون نمبر لکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔

''کیا تمہاری شادی ہو گئی ہے؟'' ایمن نے ایک دم کومل سے پوچھا تو جمال صاحب نے چونک کر بیوی کی طرف خفگی سے دیکھا۔

''نہیں...... آنٹی ابھی تو میری اسٹڈیز کمپلیٹ ہوئی ہیں اور میں اپنا بزنس اسٹیبلش کرنے جا رہی ہوں۔ اس کے بعد شادی کے بارے میں کچھ سوچوں گی۔'' کومل نے جواب دیا تو ایمن نے گہری سانس لی۔

''بیٹا...... بہت اچھا سوچا ہے، ہر ایک کو پہلے اپنا کیریئر اسٹیبلش کرنا چاہیے پھر اپنی لائف......'' جمال صاحب نے سنجیدگی سے کہا تو ایمن نے ایک ٹک ان کی جانب دیکھا اور خاموش ہو گئیں۔

''اوکے آنٹی، اب ہم چلتے ہیں۔'' کومل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹا...... آپ چائے پیے بغیر کیسے جا سکتی ہیں۔ آپ میری بیٹی یمنیٰ کے فرینڈز ہیں اور پہلی بار ہمارے گھر آئے ہیں، چائے تو ضرور ہو گی۔'' ایمن نے مسکرا کر پُر اصرار لہجے میں کہا تو سب مسکرانے لگے۔ ایمن چائے کا اہتمام کرنے چلی گئیں۔

☆☆☆

آزر انیکسی میں شفٹ ہو چکا تھا گو کہ اس نے بہت حیلے بہانے بنائے تھے لیکن کومل کے اصرار پر رانا صاحب نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے انیکسی میں شفٹ کر دیا تھا۔ وہاں ہر طرح کا سکون تھا مگر آزر وہاں شفٹ ہو کر اور زیادہ مضطرب ہو گیا...... اٹھتے بیٹھتے اسے حمنہ کی چیخیں اور یمنیٰ کی سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں اور پھر وہ خوفزدہ ہو کر در و دیوار کو دیکھتا ہوا کمرے سے باہر چلا جاتا...... اور یہی اس کے ساتھ مسلسل ہو رہا تھا۔ نہ سونے کے باعث دن بھر اس کی طبیعت بوجھل رہتی...... اور مزاج میں...... چڑچڑا پن پیدا ہونے لگا تھا۔ رانا صاحب نے اسے جاب بھی کوئی سخت قسم کی نہیں دلوائی تھی...... لیکن پھر بھی اسے جاب کرنے کا کوئی سلیقہ نہیں آ رہا تھا۔ رانا صاحب کے منیجر نے ان سے شکایت کی تو وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور سوچ میں پڑ گئے۔

''آپ ایسا کریں کہ انہیں ریسپشن کی جاب دے دیں جب ان کی لوگوں سے کمیونیکیشن بہتر ہو جائے گی تو پھر میں انہیں کوئی اور جاب دے دوں گا۔'' رانا صاحب نے قدرے توقف کے بعد کہا تھا۔ ریسپشنسٹ کی جاب آزر کے لیے ہتک آمیز تھی کچھ نہ ہونے کے باوجود بھی اس کی اکڑ ختم نہ ہوئی تو رانا صاحب نے کومل کے اصرار پر اسے اکاؤنٹس میں ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ اسے اس جاب کا بھی کچھ زیادہ تجربہ نہیں تھا مگر اسے ایک سینئر اکاؤنٹنٹ کے ساتھ ایڈجسٹ کیا گیا تھا۔ وہ اپنے اوپر ان نوازشات کی وجہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے جو کچھ بھی مل رہا تھا وہ کومل کی وجہ سے تھا مگر اس کا مسئلہ جاب سے زیادہ گمبھیر تھا۔ جس شخص کے اندر ہر وقت اضطراب سا رہتا ہو اور احساسِ گناہ کی وجہ سے شدید ڈپریشن رہتا ہو تو وہ کس طرح مطمئن ہو کر جاب کر سکتا ہے۔ یہی آزر کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ وہ ایک اچھا اور ذہین اسٹوڈنٹ رہا تھا مگر اب وہ ہر کام میں زیرو تھا۔ بعض اوقات باتیں کرتے ہوئے اس کا ذہن کہیں اور ہوتا اور وہ بات کچھ اور کر رہا ہوتا پوری فیکٹری میں اس کے بارے میں چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں کوئی بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ نہ جانے اس کے چہرے کو کیا ہو گیا تھا۔ ہر کوئی دیکھنے والا نفرت سے منہ پھیر لیتا...... اور اس سے کراہیت محسوس کرتا۔ اندر کے حالات اور باہر کے واقعات نے اسے اتنا توڑ کر رکھ دیا تھا کہ وہ اپنا کرب کسی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر گیلی لکڑی کے مانند سلگتا رہتا...... اور اس سے اٹھنے والے دھوئیں سے ہر وقت اس کی آنکھیں نم رہتیں...... عجیب سا درد اور کسک تھی جو اسے مضطرب رکھنے کے ساتھ ساتھ کچوکے بھی لگاتی رہتی تھی۔ کومل اس کے آفس میں آئی تو وہ کمپیوٹر پر کام کرنے میں مصروف تھا۔

''ہیلو...... کیسے ہو؟'' کومل نے مسکرا کر پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''کیا جاب میں دل لگ گیا......؟'' کومل نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''شروع، شروع میں ہر جاب میں پرابلم آتی ہیں پھر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔'' کومل نے اسے encourage کرتے ہوئے کہا۔

''شاید......'' وہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''کیوں...... اپ سیٹ ہو...... کیا یمنیٰ بہت یاد آتی ہے؟'' کومل نے جان بوجھ کر اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔

''stop it please ہر وقت یمنیٰ...... یمنیٰ تم مجھے بار بار اس کے بارے میں یاد دلا کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔ I hate her'' وہ انتہائی غصے سے چلّایا کہ کومل ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

کومل رات بھر مضطرب رہی اور آزر کے

بارے میں سوچتی رہی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آزر اور یمنیٰ میں کیا چل رہا تھا۔ آزر اس کا ذکر سن کر اس قدر ہائپر ہو جائے گا اس کے لیے یہ بہت حیران کُن تھا۔ کالج کے زمانے میں آزر ایک شائننگ اسٹار سمجھا جاتا تھا، اس کی بات چیت، چلنے پھرنے اور ڈریسنگ میں اِک ادا ہوتی تھی...... لڑکیاں اس پر مرتی تھیں اور وہ خود بھی آزر سے بہت متاثر تھی مگر آزر تو صرف یمنیٰ پر مرتا تھا اور اب ایسا کیا ہو گیا تھا کہ وہ یمنیٰ کا ذکر سننا بھی پسند نہیں کرتا...... اس نے اگلے روز اُٹھتے ہی جواد کو فون کیا۔

''جواد...... کیوں ناں آج یمنیٰ سے ملنے چلیں؟'' کومل نے پوچھا۔

''نہیں...... یار مجھے ایک ارجنٹ ڈیل کے سلسلے میں اسلام آباد جانا پڑ رہا ہے، چار پانچ روز کے بعد آؤں گا تو پھر چلیں گے۔'' جواد نے کہا۔

''نہیں، مجھے آج ہی اس سے ملنا ہے۔'' کومل نے کہا۔

''کیا تم چار پانچ روز نہیں رک سکتیں؟'' جواد نے پوچھا۔

''نہیں۔'' کومل نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''ایسی بھی کیا ایمرجنسی ہے؟'' جواد نے حیرت سے پوچھا۔

''بس ہے ناں...... میں آج اس سے ملنے جارہی ہوں اور جب تم فارغ ہو جاؤ تو پھر تم چلے جانا۔'' کومل نے کہہ کر فون بند کر دیا اور جواد حیرت سے سوچتا رہ گیا۔

☆☆☆

ظہر کی اذان ہو چکی تھی کچھ بچیاں حویلی کے صحن میں رکھے بڑے سے تخت پر بیٹھی قرآن پاک پڑھنے میں مصروف تھیں۔ مدرسے کی تعمیر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے یمنیٰ نے انہیں حویلی میں ہی پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ یمنیٰ نماز پڑھ کر کمرے سے باہر آئی تو ملازمہ بلقیس نے اسے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔

''کون ہے؟'' یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''نام نہیں بتایا...... مگر حلیے سے وہ شہر کی لگ رہی ہیں۔'' بلقیس نے اسے بتایا۔

''اچھا، انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ میں آتی ہوں۔''

کومل ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھی حیرت سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ انتہائی وسیع کمرے میں قدیم طرز کا قیمتی فرنیچر اور قالین بچھا تھا۔ کمرے کی آرائش گو کہ پرانی تھی مگر ہر شے میں حسن اور لطافت تھی۔ کومل بہت متاثر کُن انداز میں پینٹنگ اور ڈیکوریشن پیسز دیکھ رہی تھی جبھی یمنیٰ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''ک...... ک...... کومل...... تم؟'' یمنیٰ انتہائی حیرت سے چلاّتے ہوئے بولی۔ کومل نے اس کی طرف دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی...... کیا وہ واقعی یمنیٰ تھی...... وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔ کاٹن کے ہلکے فیروزی سوٹ کے اوپر اس نے سفید بڑی سی چادر سر سے پاؤں تک لے رکھی تھی۔ وہ اس یمنیٰ سے بالکل مختلف لگ رہی تھی جسے کومل جانتی تھی۔ اس نے تو اسے ہمیشہ جینز، سلیولیس شرٹس، میں دیکھا تھا اور دوپٹا تو اس نے کبھی اوڑھا ہی نہیں تھا اور اب یمنیٰ جس حلیے میں کھڑی تھی اسے دیکھ کر کومل حیران بھی ہو گئی تھی اور پریشان بھی۔

''تم...... یمنیٰ؟'' کومل بہ مشکل بولی۔

''ہاں...... تم کیسی ہو؟'' یمنیٰ بہ مشکل اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''ہاں...... یقیناً تمہیں حیرت ہو رہی ہوگی۔'' کومل نے کہا۔

''حیرت ہو بھی رہی ہے اور نہیں بھی۔'' یمنیٰ نے جواب دیا۔

''حیرت کیوں نہیں ہو رہی؟'' کومل نے پوچھا۔

''اس لیے کہ زندگی میں سب کچھ ممکن ہے یہ تو ہے ہی ناممکنات کا سفر۔'' یمنیٰ نے کہا تو کومل نے پھر

چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی بہت زیادہ بدل چکی تھی۔

''کیسے آنا ہوا؟'' یمنیٰ نے اسے صوفے پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''یونہی......'' کومل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے اور کس طرح بات شروع کرے...... وہ شش و پنج میں مبتلا اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔ یمنیٰ کو احساس تو تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت آئی ہے مگر کچھ کہہ نہیں پا رہی۔

''کھانا کھاؤ گی......؟'' یمنیٰ نے پوچھا۔

''نہیں......'' کومل نے جواب دیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے...... کھانے کا ٹائم ہو اور تمہیں بھوک نہیں۔'' یمنیٰ نے قدرے مسکرا کر کہا تو کومل خاموش ہو گئی۔ یمنیٰ باہر چلی گئی اور کومل حیرتوں کے جزیرے میں ڈوب گئی۔ یمنیٰ کو دیکھ کر وہ شدید حیران تھی۔

''کیا یہ یمنیٰ، آزر کے قابل ہے، لگتا ہے آزر نے اسے اس حلیے میں نہیں دیکھا ماڈرن حلیے میں تو وہ پھر بھی قابلِ قبول تھی اور اب تو عام دیہاتی عورت سے بھی کمتر محسوس ہوتی ہے اور آزر پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت اور اسمارٹ ہو گیا ہے۔ اس یمنیٰ کو دیکھ کر کیا اس کا فیصلہ پہلے والا ہی ہوگا۔ کیا وہ اس سے ویسی ہی محبت کر پائے گا جو اس سے کرتا تھا۔'' وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ یمنیٰ واپس آگئی۔

''آؤ پہلے کھانا کھاتے ہیں۔'' یمنیٰ اسے لے کر حویلی کے اندر چلی گئی۔ ٹیبل پر دو تین سالن کے ڈونگے، چاول، روٹیاں اور سلاد رکھا تھا۔

''اماں جی...... یہ میری کالج کی دوست ہے کومل رانا...... مجھ سے ملنے آئی ہے۔'' یمنیٰ نے کومل کا تعارف کرایا۔

''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ بسم اللہ بیٹی...... ہمیں تو خوشی ہوتی ہے جب ہماری بیٹی کا کوئی مہمان اس سے ملنے آتا ہے، ہمارے سر آنکھوں پر۔'' اماں جی نے کومل کو محبت سے اپنے ساتھ لگایا اور اس کا ماتھا چوما۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' کومل نے محبت سے کہا۔

''آؤ بیٹی کھانا کھالو۔ بلقیس پہلے بیٹی کے ہاتھ دھلاؤ۔'' اماں جی نے ملازمہ کو آواز دے کر بلایا۔

کھانے کے دوران اماں جی کومل سے اس کے اور اس کے گھر والوں کے بارے میں تفصیلات جانتی رہیں۔ کومل کو بھی ان سے گفتگو کرنا اچھا لگا۔ اس دوران اس نے یمنیٰ سے بہت کم باتیں کیں، کھانے سے فارغ ہو کر یمنیٰ کومل کو اپنے کمرے میں لے آئی۔

''اب آرام سے باتیں کرتے ہیں۔'' یمنیٰ نے اس سے کہا۔

''ہاں۔'' کومل نے آہستہ سے جواب دیا۔

''تم کچھ پریشان لگ رہی ہو، کیا بات ہے، کیسے آنا ہوا؟'' یمنیٰ نے اسے اضطرابی کیفیت میں ڈوبا دیکھ کر دریافت کیا۔

''حمنہ کی ڈیتھ کا سن کر مجھے بہت شاک لگا، میں انگلینڈ میں تھی تین سال بعد اب واپس آئی۔ اب دل چاہا کہ تم سے ملاقات کی جائے۔'' کومل نے گول مول انداز میں بات کی۔

''آئی سی...... حمنہ کی ڈیتھ کا سب سے زیادہ شاک مجھے لگا۔ شاید اس کے گھر والے بھی اتنے ڈسٹرب نہیں ہوئے ہوں گے جتنا کہ میں ہوئی...... وہ میرے......'' یمنیٰ کی آواز بھرّا گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور اگلے ہی لمحے وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

''تم...... نے واقعی اس کی ڈیتھ کا اب تک بہت اثر لے رکھا ہے، حمنہ تھی ہی ایسی...... بہت اچھی...... بہت محبت کرنے والی۔'' کومل افسردہ ہو کر بولی۔

''ہاں......'' یمنیٰ نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''یمنیٰ ایک بات پوچھوں......؟'' کومل نے

استفہامیہ لہجے میں اجازت طلب کی۔

''ہاں۔'' یمنیٰ نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے آزر ملا تھا۔'' کومل رک رک کر بولی تو یمنیٰ کو ایک دم جھٹکا سا لگا اور اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''پھر......؟'' یمنیٰ ایک دم تلخ ہوگئی۔

''وہ بہت ڈسٹرب تھا۔ دیوانگی کی حد تک مضطرب......'' کومل نے اسے بتایا۔

''اسے ہونا بھی چاہیے۔'' اس نے تلخی سے جواب دیا۔

''کیا تم جانتی ہو کہ وہ تم سے اب بھی پاگلوں کی حد تک محبت کرتا ہے، میں نے خود اسے تمہارے لیے روتے دیکھا ہے۔ میں نے آج تک کسی مرد کو کسی عورت کی محبت میں یوں تڑپتے نہیں دیکھا۔ وہ......وہ اس قدر جذباتی حد تک تم سے محبت کرتا ہے کہ مجھے تم پر رشک آنے لگا ہے۔'' کومل کی باتوں پر اسے انتہائی حیرت ہونے لگی۔

''کیا یہ تمہیں اس نے خود بتایا؟'' یمنیٰ نے پوچھا۔

''یونہی سمجھو......'' کومل نے کہا۔

''لیکن میں جانتی ہوں اس کے اضطراب کی حقیقت کیا ہے۔'' یمنیٰ نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

''تم شاید کچھ نہیں جانتیں......تم اس سے آخری بار کب ملی تھیں؟'' کومل نے تفصیلی انداز سے پوچھا۔

''پانچ سال پہلے......'' یمنیٰ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کاش تم ایک بار اب اس سے ملو......اور پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ تمہاری محبت میں کس قدر دیوانہ ہو رہا ہے۔ میں تم سے یہی کہنے آئی ہوں کہ پلیز اسے معاف کردو اور اس کی محبت کو مت جھٹلاؤ......زندگی میں اکثر بدگمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں مگر محض بدگمانیوں کی وجہ سے کسی محبت کرنے والے کی انتہائی چاہت اور جذباتیت کو جھٹلانا بہت نادانی ہوتی ہے۔ وہ بہت اذیت اور تکلیف میں ہے۔ پلیز اس کی اذیت کم کردو۔'' کومل نے بہت جذباتی انداز میں کہا۔

''کیا حمنہ کو بھول جاؤں......؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''حمنہ کا آزر سے کیا تعلق؟'' کومل نے حیرت سے پوچھا تو یمنیٰ ایک دم سنبھل گئی جیسے اسے بھی کچھ یاد آگیا ہو۔ اس نے لاشعوری طور پر جو کچھ کہا تھا وہ اس پر نادم ہونے لگی۔

''ہاں......اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔'' وہ خود ہی بولی۔

''یمنیٰ......زندگی میں محبت بار بار نہیں ملتی اور آزر جیسی محبت تم سے کبھی کوئی نہیں کر سکے گا۔ وہ تمہاری خاطر سب کچھ کر سکتا ہے۔ جان سے بھی جا سکتا ہے۔ یہ اس نے نہیں کہا مگر میں نے اس کی اضطراری کیفیت دیکھ کر اندازہ لگایا ہے۔'' کومل نے اپنے تئیں اسے سمجھایا۔

''کومل......تم حقیقت نہیں جانتیں......'' یمنیٰ بلاواسطہ انداز میں بولی۔

''کیسی حقیقت......؟ ٹھیک ہے میں مان لیتی ہوں کہ میں حقیقت نہیں جانتی......لیکن میں نے جب تمہارا ذکر کیا تو تمہارے نام پر اس کی جو کیفیت ہوئی وہ صرف اس شخص کی ہو سکتی ہے جو کسی سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے اور اس کے ذکر پر اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگتی ہیں۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اگر تم اسے نہ ملیں تو وہ......وہ مر جائے گا۔'' کومل نے عجیب جذباتی انداز میں کہا تو یمنیٰ کے دل میں بھی اضطراب پیدا ہونے لگا۔ اسے بھی اپنے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب محسوس ہونے لگیں۔ اس کے اندر بھی ہیجانی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ اس

کے دماغ میں سوالات کی بھرمار ہونے لگی۔

''وہ کیسے مجھ سے محبت کر سکتا ہے جبکہ اس نے خود اس بات سے انکار کیا تھا اور اس کا ذکر کس قدر تحقیرانہ انداز میں کیا تھا۔ اس کے کیا، کیا نام ڈالے تھے......اور اب وہی شخص مجھ سے محبت کرے گا اور وہ بھی دیوانگی کی حد تک......کومل کو دھوکا ہوا ہے، یہ اس بات کی حقیقت نہیں جانتی...... کہ وہ کیوں مضطرب ہے۔ اس نے اسے نہیں بتایا اور وہ اپنی زبان سے کیسے اسے اپنی حقیقت بتاتا۔ کومل نے سب کچھ خود ہی assume کیا ہے یہ اس کے فریب میں آگئی ہے، وہ بہت شاطر ہے۔ آزر نے اسے اپنی باتوں کے جال میں پھنسایا ہے اور کومل سیدھی سادی لڑکی ہے جو اس مکار انسان کے دھوکے میں آگئی ہے مگر میں اس کے فریب میں نہیں آؤں گی۔'' وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''تم اس سے کہاں ملیں؟'' یمنیٰ نے ایک دم پوچھا۔

''وہ نانا ابو کے پاس ملازمت کرتا ہے، اس کا سب کچھ ختم ہو چکا ہے اور تم سوچ بھی نہیں سکتیں وہ کہاں رہتا رہا ہے۔ کچی بستی کے ایک گندے سے کمرے میں خستہ حال چارپائی پر سوتا تھا، اب وہ فیکٹری کے ساتھ انیکسی میں شفٹ ہوا ہے۔'' کومل نے اسے بتایا۔

''کیا تم نے اسے یہ بتایا کہ تم یہاں مجھ سے ملنے آرہی ہو؟'' یمنیٰ نے پوچھا۔

''نہیں، وہ بالکل نہیں جانتا اور شاید وہ مجھ سے خفا بھی ہو جائے اگر اسے یہ معلوم ہو کہ میں اِدھر آئی تھی......میں تین چار روز قبل اس کے ساتھ جواد کے پاس گئی تو جواد نے تمہارا ذکر کیا اور اسی سے تمہارا ایڈریس لیا۔'' کومل نے صاف گوئی سے اسے بتایا۔

''کومل......میرا اور اس کا ملاپ ناممکن ہے اور جسے تم محبت سمجھ رہی ہو اس کی حقیقت کچھ اور ہے۔'' یمنیٰ نے اسے ٹالنے کے انداز میں سمجھایا۔

''نہیں یمنیٰ......وہ تم سے اور صرف تم سے محبت کرتا ہے، دیکھو میں نہ تو بے وقوف ہوں اور نہ ہی امیچور کہ محبت اور اس کی حقیقت کو نہ سمجھ پاؤں۔ جب کسی کے ذکر پر آنکھیں چمکتی ہیں تو اس کی حقیقت کچھ اور ہوتی ہے اور جب کسی کے غم میں آنکھیں چھلکتی ہیں تو ان کے پیچھے چھپا درد اور ہوتا ہے اور جب کسی اضطراب اور پچھتاووں میں آنکھیں دکھی ہوتی ہیں تو اس دکھ کے رنگ کی حقیقت بھی اور ہوتی ہے۔ اس لیے مجھ سے یہ بحث مت کرو کہ وہ تم سے محبت نہیں کرتا......میں تم سے شرط لگانے کو تیار ہوں کہ وہ آج بھی تم سے بے انتہا محبت کرتا ہے اگر تم اس کی محبت کو جھٹلاتی ہو تو یہ تمہاری خام خیالی ہے اور اس وقت تمہاری آنکھوں میں یقین اور بے یقینی کا رنگ نمایاں ہے۔ تم شک میں مبتلا ہو کہ وہ تم سے محبت نہیں کر سکتا۔'' کومل نے منطقی انداز میں کہا تو یمنیٰ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور خاموش ہوگئی۔

''اب میں چلتی ہوں مگر تم سے رابطے میں رہوں گی......لیکن پلیز تم آزر کے بارے میں پازیٹو ہو کر سوچو۔ میں نہیں جانتی کہ تم دونوں میں کس بات پر ناراضی ہوئی ہے مگر صرف اتنا کہوں گی کہ تم خوش قسمت ہو جسے آزر بہت چاہتا ہے۔ اپنی خوش قسمتی کو پچھتاووں میں نہ بدلنا ورنہ ساری زندگی مضطرب رہوگی۔'' کومل نے اسے کہا اور اس کا جواب سنے بغیر باہر نکل آئی۔ یمنیٰ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔

''آزر کیسے مجھ سے محبت کر سکتا ہے، کومل کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے، اُف خدایا! یہ کیسا انکشاف ہے جسے میں نے کبھی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہا تھا جس کے ملنے کی آرزو میں کتنا تڑپی تھی۔ اس کے لیے کیسے کیسے مضطرب رہی تھی۔ اس سے ملن کے لیے کتنی دعا گو رہتی تھی۔ کیا وہ اب میرے لیے

مضطرب ہورہا ہے، کیا وہ میری محبت میں گرفتار ہوگیا ہے۔ کیا واقعی مجھے چاہنے لگا ہے۔ اس کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ پیدا ہونے لگا۔'' لیکن اگلے ہی لمحے ذہن نے اس کی ساری جذباتیت کو جھٹلا دیا۔

''یہ محض کومل کی غلط فہمی اور قیاس آرائی ہے اسے حقیقت کا علم نہیں، آزر نے جو گناہ کیا ہے اس کا اسے احساس اتنا شدید ہوگا جو اسے کسی پل سکون نہیں لینے دے رہا اور کومل اس کے اضطراب کو غلط رنگ دے رہی ہے...... وہ اس کے اندر کے اضطراب کو محبت کا نام دے رہی ہے۔ کومل کو کیا معلوم کہ حقیقت کیا ہے...... وہ تو پچھتاوؤں کی آگ میں جل رہا ہے۔ میں نے جو اس سے کہا تھا کہ میں مرتے دم تک تمہیں ہر روز، ہر ہر لمحہ بد دعائیں دیتی رہوں گی ...... تم موت مانگو گے تو موت بھی نہیں آئے گی اور اب جو قدرت اس سے انتقام لے رہی ہے تو اس سے برداشت کرنا مشکل ہورہا ہے اور کومل اسے دیکھ کر پریشان ہوگئی۔'' وہ اپنے آپ کو یہ سارے جواز دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتی مگر اگلے ہی لمحے کومل کا دعویٰ آڑے آتا۔

''تم مجھ سے یہ بحث مت کرو کہ وہ تم سے محبت نہیں کرتا، میں اس کے لیے شرط لگانے کو تیار ہوں۔''

''کومل نے ایسا کیا دیکھا اور محسوس کیا...... کہ وہ بہت پُراعتماد ہوکر شرط لگانے کو تیار ہوگئی تھی یقیناً آزر نے اس سے کچھ نہ کچھ تو ایسا کہا ہوگا کہ وہ اتنی پُراعتماد ہوکر اس کی خاطر مجھے کنونس کرنے آگئی۔ جب تک کوئی کسی کو کچھ نہ کہے وہ کیسے خود ہی اتنی بڑی بات سوچ سکتا ہے۔ یہ مجھے کیا ہوگیا ہے، میں کس طرف جارہی ہوں میں جو اسے تباہ و برباد ہوتے دیکھنے کی تمنا دل میں لیے بیٹھی ہوں اور منتظر ہوں کہ کب اس کی کربناک موت واقع ہو اور کب میرے دل کو سکون آئے۔ کب حمنہ کی روح کو قرار آئے۔''

☆☆☆

شمیلہ جب سے میکے آئی تھی ہر وقت ریحانہ کے پاس بیٹھ کر ردا کو بد دعائیں دیتی۔ کبھی خالہ کو کوستی اور کبھی فہام کو یاد کر کے بری طرح رونے چلّانے لگتی۔ ریحانہ کبھی اسے سمجھاتیں تو کبھی اس کے ساتھ مل کر بڑی بہن کے خلاف بولنے لگتیں۔ اس کی بھاوج دونوں کے شکوے، شکایت سن کر بیزاری محسوس کرتی اور سلمان سے اس کی شکایت کرتی۔ سلمان بھی شمیلہ کے اس رویے سے تنگ آگیا تھا مگر وہ خاموش رہتا۔ جب بھی موقع ملتا تو ماں کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ شمیلہ کا سسرال میں عدت گزارنا ٹھیک تھا، وہ اس کی باتیں سن کر خاموش رہتیں مگر شمیلہ جیسے ہی کوئی بات سنتی تو ایک دم بھڑک اٹھتی اور بھائی کی خوب بے عزتی کرتی۔ وہ اس سے سخت خائف رہنے لگا تھا۔ بھائی، بھاوج اس کا سامنا کرنے سے گریز کرتے۔ وہ جیسے ہی دکھائی دیتی دونوں منہ بنا کر وہاں سے چلے جاتے اور شمیلہ ماں کو ان کے خلاف خوب بھڑکانے لگتی۔ آئے دن کے جھگڑوں سے ریحانہ خود پریشان ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

توقیر انتہائی پریشان حالت میں اپنے کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا وہ روحیل کا نمبر ملاتا پھر کال آف کر دیتا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ روحیل سے کیسے بات کرے۔ رشنا کی باتوں سے اسے روحیل کے مزاج کا اندازہ ہوگیا تھا اور اب وہ کال بھی رشنا کے اصرار پر کر رہا تھا۔

''میں...... روحیل سے کیا بات کروں اور کیسے......؟'' توقیر نے پریشانی سے سوچا۔

''اب آپ کو کچھ ایسا کرنا چاہیے کہ ردا کا گھر ٹوٹنے سے بچ جائے۔'' توقیر کے کانوں میں رشنا کے الفاظ گونجنے لگے اس نے گہری سانس لی اور پھر نمبر ملانے لگا۔

''کون......؟'' روحیل نے پوچھا۔

''میں...... ت...... توقیر...... آسٹریلیا سے۔'' توقیر نے گھبرا کر ہونٹوں پر زبان پھیر کر بہ مشکل کہا۔

''تم...... تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھے فون کرنے کی۔'' روحیل ایک دم غصے سے بولا۔

''پلیز آپ میری بات سنیں۔'' روحیل نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''شٹ اپ...... میں تمہاری کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔'' روحیل نے غصے سے جواب دیا۔

''آپ سب کچھ غلط سمجھ رہے ہیں...... ردا بالکل بے قصور ہے۔'' توقیر نے نرمی سے کہا۔

''بکواس بند کرو، کیا تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کررہے ہو۔ تمہارا ہی لکھا ہوا خط مجھے ملا ہے، کیا اس سے انکار کرتے ہو؟'' روحیل نے غصے میں جواب دیا۔

''ہاں...... وہ میں نے ہی لکھا تھا مگر......'' توقیر نے آہ بھر کر نرم لہجے میں کہا۔

''انتہائی بے غیرت انسان ہو، تم نے میری زندگی برباد کردی ہے...... تم ایک بار میرے سامنے آجاؤ پھر دیکھو میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں۔'' روحیل غصے سے چلّایا اور موبائل آف کردیا۔ توقیر سخت سپٹا گیا۔

''اتنی انسلٹ...... اتنی توہین...... کیا سچی محبت یہی صلہ دیتی ہے۔ ردا ہم دونوں suffer کررہے ہیں، کاش تم مجھ پر اور میری محبت پر اعتبار کرتیں تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔'' توقیر نے آہ بھر کر سوچا۔

☆☆☆

خدیجہ بیگم فجر کی نماز سے فارغ ہوکر لاؤنج میں بیٹھی قرآن پاک پڑھنے میں مصروف تھیں جب سلمان لاؤنج میں داخل ہوا تو وہ اسے دیکھ کر حیرت سے چونکیں۔ سلمان شاذ و نادر ہی ان کے گھر آتا تھا۔ شمیلہ کی موجودگی میں وہ ایک بار بھی نہیں آیا تھا اور اب اچانک آگیا تو وہ حیران رہ گئیں۔

''السلام علیکم...... خالہ جان......'' سلمان نے ان کے قریب بیٹھ کر ادب سے کہا تو خدیجہ نے اسے سر پر پیار دیا اور مسکرانے لگیں۔

''بیٹا...... آج تم صبح صبح کیسے آگئے۔ گھر میں سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' خدیجہ بیگم نے محبت سے پوچھا۔

''خالہ جان میں ساری رات سو نہیں سکا۔ شمیلہ رات بھر چیختی چلاتی رہی اور فہام کو یاد کرتی رہی۔'' سلمان نے خدیجہ بیگم کو بتایا۔

''ہاں...... بیٹا...... اس کا دکھ ہی اتنا گہرا ہے کہ وہ بیچاری روئے، چلائے نہ تو اور کیا کرے؟'' انہوں نے ایک دم آہ بھر کر نم آنکھوں سے کہا۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن اسے اب یہ حقیقت قبول کرلینی چاہیے اور آپ نے اسے عدت میں ہماری طرف کیوں بھیج دیا؟'' سلمان نے خالہ کی طرف بغور دیکھ کر شکایتی لہجے میں کہا۔

''بیٹا وہ خود گئی ہے...... میں نے اسے نہیں بھیجا۔'' انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

''لیکن...... مما تو یہی کہہ رہی تھیں کہ آپ نے اسے بھیجا ہے......'' سلمان نے حیرت سے کہا تو خدیجہ بیگم خاموش ہوگئیں۔

''کیا بات ہے خالہ جان؟'' آپ خاموش کیوں ہوگئی ہیں؟'' سلمان نے ان کی طرف بغور دیکھ کر پوچھا۔

''جب کہنے کو کچھ نہ رہے تو خاموشی ہی بہتر ہوتی ہے۔''

''اگر شمیلہ ایسی سچویشن میں رہی تو مجھے ڈر ہے وہ اپنا ذہنی توازن کھودے گی۔''

''اللہ...... اس پر اپنا کرم کرے۔'' خدیجہ بیگم نے جلدی سے کہا۔

''خالہ جان...... میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔'' سلمان ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"کیا......؟" خدیجہ نے پوچھا۔

"شمیلہ کو فہام اور اس گھر سے بہت محبت ہے تو کیوں ناں کچھ ایسا کیا جائے کہ شمیلہ اس گھر میں ہی رہے۔"

"کیا مطلب......؟" خدیجہ بیگم سلمان کی بات پر ایک دم چونک کر بولیں۔

"شمیلہ کی عدت کے بعد اگر حاتم سے اس کا نکاح کر دیا جائے تو......؟" سلمان نے نظریں جھکا کر بہ مشکل کہا۔ وہ بری طرح بپھر گئیں۔

"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"خالہ جان میری اس بات پر ٹھنڈے دل سے سوچیے...... اسی میں دونوں گھروں کی بھلائی ہے۔" سلمان نے نرمی سے کہا تو خدیجہ بیگم خاموش ہو گئیں۔

"کیا آپ نہیں چاہتیں کہ آپ کے بیٹے کی نشانی اسی گھر میں رہے؟" سلمان نے ان کی طرف بغور دیکھ کر پوچھا تو وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"کیا بات ہے؟ آپ خاموش کیوں ہیں، کیا آپ نہیں چاہتیں کہ شمیلہ دوبارہ اس گھر میں آئے؟" سلمان نے اپنی بات پر پھر اصرار کیا تو اسی لمحے زرینہ گھبرائی ہوئی وہاں آئی۔

"بیگم صاحبہ...... ردا بی بی کو بہت تیز بخار ہے۔ انہیں کوئی ہوش نہیں۔"

"کیا ہوا ردا کو......؟" سلمان نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے کہا تو خدیجہ بیگم گھبراتی ہوئی ردا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

خدیجہ بیگم، سلمان کی گاڑی میں ردا کو اسپتال لے کر آ گئی تھیں سلمان انہیں چھوڑ کر آفس کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ اب خدیجہ بیگم سخت پریشانی کے عالم میں تھیں۔

لیڈی ڈاکٹر نے ردا کے بارے میں بتایا تو ان کے چہرے پر خوشی اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

"کیا بات ہے، آپ یہ خوشخبری سن کر پریشان کیوں ہو گئی ہیں؟" لیڈی ڈاکٹر نے نہایت حیرت سے ان سے پوچھا۔

"اس لیے کہ میری بیٹی اور داماد میں کچھ اختلافات چل رہے ہیں اور اس صورتِ حال میں اس کا کیا ردِ عمل ہوگا...... میں کچھ نہیں جانتی۔" انہوں نے جھجکتے ہوئے اپنی دلی کیفیت بتائی۔

"تو آپ فوراً یہ گڈ نیوز اپنے داماد کو سنائیں۔ آئی ایم شیور...... تمام رنجشیں دور ہو جائیں گی۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا تو خدیجہ بیگم بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتی رہیں انہیں تسلی دے کر ڈاکٹر دوسرے مریض میں مصروف ہو گئی۔

خدیجہ بیگم، ردا کو لے کر لاؤنج میں داخل ہوئیں تو کمزوری کے باعث اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ حاتم ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ناشتا کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے انہیں دیکھا اور خفگی سے منہ پھیر لیا۔ خدیجہ اسے کمرے میں بیڈ پر لٹا کر واپس آئیں اور غصے سے حاتم کی طرف دیکھنے لگیں۔

"تم لوگ اتنے پتھر دل ہو جاؤ گے، مجھے یقین نہیں آ رہا، یہ وہی بہن ہے ناں...... جسے کانٹا چبھتا تھا تو تم لوگ تڑپ اٹھتے تھے اب وہ اتنی بری ہو گئی ہے کہ تم لوگ اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔" خدیجہ نے نہایت خفگی سے کہا۔

"کسی کے دل میں محبت اور نفرت پیدا کرنے کا ذمے دار انسان کا رویہ ہوتا ہے۔ ردا نے ہمارے بھروسے اور اعتبار کو دھوکا دیا ہے۔ اب ہم اس پر کیسے یقین کریں۔ اب وہ ہماری محبت کے قابل نہیں رہی۔" عاصم نے بڑھ کر غصے سے کہا۔

"یہ بہن، بھائی کی محبت اتنی کمزور نہیں ہوتی ہے کہ بظاہر کوئی بات سامنے آنے پر ٹوٹ جائے۔

سچی محبت کو نہ اعتبار کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی آزمائش میں جانچنے کی۔ تم لوگوں کی محبت اتنی کھوکھلی نکلی کہ لمحوں میں بدل گئی۔" وہ نہایت یاس سے بیٹوں سے کہہ رہی تھیں۔

"آپ اس سے محبت کر رہی ہیں ناں...... یہی کافی ہے۔" عاصم نے غصے سے کہا اور ناشتا چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔

"میں تو ماں ہوں، مر کر بھی اس سے محبت کروں گی اور تم سب سے بھی۔" خدیجہ بیگم نے سسکی بھر کر کہا اور چہرے پر ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

☆☆☆

شمیلہ جب سے میکے آئی تھی ہر وقت ریحانہ کے پاس بیٹھ کر روتی رہتی۔

"شمیلہ خدا کے لیے اب یہ رونا دھونا بند کرو اور فہام کی موت کو ایک تلخ حقیقت سمجھ کر قبول کرو...... تمہارے بھائی، بھابی کو تمہارا یہ ہر وقت کا رونا پسند نہیں۔" ریحانہ بیگم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کیا میں اب اپنی مرضی سے رو بھی نہیں سکتی؟"

"نہیں...... یہ زمانہ صرف ہنسنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ رونے والوں کا نہیں...... تم کوشش کیا کرو سلمان کے سامنے نہ رویا کرو۔" ماں نے اسے سمجھایا تو اس کے چہرے پر تناؤ نمایاں ہونے لگا۔ اسی لمحے سلمان لاؤنج میں داخل ہوا اور ماں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"مما! کیا آپ نے خالہ جان کو فون کیا تھا؟ صبح ردا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں صبح خالہ جان کی طرف گیا تھا۔"

"میرے اس گھر میں ہوتے ہوئے تو آپ ایک بار بھی نہیں آئے تھے۔ اب کیا لینے گئے تھے؟" شمیلہ نے غصے سے بھائی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مما دیکھ رہی ہیں آپ...... اتنا بڑا حادثہ ہو جانے پر بھی اس کی باتوں میں فرق آیا ہے اور نہ مزاج میں۔" سلمان نے غصے سے اس کی طرف دیکھ کر ماں سے شکایتی لہجے میں کہا۔

"اچھا تو اب آپ مجھ پر طنز کرنے لگے ہیں۔" شمیلہ نے غصے سے کہا۔

"تمہارے اس مزاج کی وجہ سے ہی...... خالہ جان۔" سلمان نے غصے سے جملہ ادھورا چھوڑا۔

"کیا کہا ہے خالہ جان نے...... لگتا ہے اب وہ نئی چال چلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔" شمیلہ نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

"شٹ اپ...... خالہ جان کے بارے میں خبردار کوئی فضول بات کہی تو۔" سلمان غصے سے کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

"دیکھا آپ نے...... انہیں آپ کے اور میرے خلاف بھڑکا کر خالہ جان ہم سے بدلہ لینا چاہتی ہیں۔" شمیلہ نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپا سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔" ریحانہ بیگم نہایت پریشانی سے بولیں۔

☆☆☆

ردا کی طبیعت کچھ سنبھلی تو خدیجہ بیگم اس کے پاس بیٹھ کر محبت سے باتیں کرنے لگیں۔

"بیٹا...... ڈاکٹر بتا رہی تھی کہ تم......" خدیجہ بیگم نے ایک دم ردا کی طرف دیکھتے ہوئے اتنا کہا اور خاموش ہو گئیں۔

"ک...... کیا......؟" ردا نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ تم...... ماں بننے والی ہوں۔" انہوں نے خوشی سے کہا۔

"کیا......؟" وہ انتہائی حیرت سے چلائی۔

"بیٹا...... یہ تو اللہ کے فیصلے ہیں اور اس کی رضا...... ممکن ہے روحیل یہ خبر سن کر ہی اپنا فیصلہ بدل دے۔" خدیجہ بیگم نے بڑی امید سے کہا۔

‘‘نہیں...... خدا کے لیے آپ روحیل کو یہ خبر مت سنائیں۔ وہ......’’ ردا نے گھبرا کر کہا اور خاموش ہوگئی۔
‘‘کیوں......؟ ایسی خوشی کی خبر سن کر تو پتھر دل بھی موم ہو جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے روحیل کا دل بھی بدل جائے اور وہ تمہیں اپنے گھر لے جائے۔’’
‘‘جس گھر کی دیواروں میں اتنی دراڑیں پڑ چکی ہوں کیا وہ محفوظ رہ سکتا ہے؟’’ ردا نے تاسف سے کہا۔
‘‘بیٹا...... گھر، گھر ہی ہوتا ہے، چاہے وہ تنکوں کا آشیانہ ہی کیوں نہ ہو...اور عورت شادی کے بعد اپنے گھر ہی محفوظ ہوتی ہے۔’’
‘‘کیا مطلب......؟’’
‘‘یہ گھر اب تمہاری بے بس اور کمزور ماں کا ہے۔ جو نہ تمہیں زمانے کی باتوں سے بچا سکتی ہے اور نہ ہی تمہارے بھائیوں کی نفرت سے...... میں چاہتی ہوں روحیل تمہیں اپنے ساتھ گھر لے جائے...... اس خوشخبری نے مجھے پُرامید بنا دیا ہے۔ میں ابھی اس کی ماں جی کو فون کرتی ہوں۔’’ خدیجہ بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔
‘‘نہیں...... پلیز......’’ ردا نے ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا۔
‘‘مگر...... کیوں بیٹا؟’’ انہوں نے حیرت سے پوچھا تو ردا نے کوئی جواب نہیں دیا تو خدیجہ بیگم اور پریشانی کے عالم میں اس کی طرف دیکھتی ہوئی باہر نکل آئیں۔ وہ اپنے کمرے میں آکر سوچنے لگیں کہ وہ کیا کریں اور کس سے مشورہ کریں۔ انہیں اس لمحے فہام بہت یاد آرہا تھا۔ جس کے ساتھ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اور بڑے بڑے مسئلے مسائل بھی ڈسکس کرتی تھی۔ سائڈ ٹیبل سے فہام کی تصویر ہاتھ میں لے کر وہ اسے دیکھنے لگیں اور سسکیاں بھرنے لگیں۔
‘‘تم میری بہت مضبوط ڈھال تھے اور آج میں بہت بے آسرا اور کمزور ہوگئی ہوں۔’’ تصویر کو اپنے ساتھ لگا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اسی لمحے زرینہ کمرے میں داخل ہوئی۔
‘‘یہ کیا بیگم صاحبہ، آپ فہام بھائی کو یاد کر کے رو رہی ہیں؟’’ زرینہ نے ان کے قریب بیٹھ کر نرمی سے پوچھا۔
‘‘ہاں...... اس کی کمی مجھے بہت رُلا رہی ہے۔ وہ ہر دکھ سکھ میں میرا ساتھی تھا۔ اب کس سے راز و نیاز کروں؟’’ خدیجہ بیگم نے اس کی تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
‘‘آپ مجھ سے اپنے دل کی بات کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرسکتی ہیں۔’’ زرینہ نے نرم لہجے میں کہا تو خدیجہ نے چونک کر اس کی طرف بغور دیکھا۔
‘‘ردا ماں بننے والی ہے مگر وہ اصرار کر رہی ہے کہ میں روحیل اور اس کی ماں جی کو یہ خبر نہ سناؤں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔’’ خدیجہ بیگم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
‘‘کیا واقعی......! یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے مگر ردا بی بی اسے کیوں چھپانا چاہ رہی ہیں؟’’ زرینہ نے حیرت سے پوچھا۔
‘‘شاید...... روحیل سے وہ بہت مایوس ہو چکی ہے۔’’ وہ دکھ سے بولیں۔
‘‘میرا خیال ہے کہ آپ انہیں یہ خبر سنا دیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ خوشی کی خبر سن کر وہ خود انہیں منانے آجائیں۔’’ زرینہ نے مسکرا کر کہا۔
‘‘اور اگر ردا ناراض ہوگئی تو؟’’ انہیں بھی ایک دھڑکا لگا تھا۔
‘‘ابھی آپ انہیں مت بتائیں جب روحیل بھائی انہیں لینے آجائیں گے تو خود بخود ان کی ناراضی ختم ہو جائے گی۔’’ زرینہ نے اپنے طور پر رائے دی۔
‘‘اور روحیل کو دیکھ کر اگر حاتم اور عاصم بگڑ گئے تو......؟’’
‘‘آپ فکر نہیں کریں...... بس آپ ردا بی بی کی

ساس کو فون کر کے یہ خوشخبری سنا دیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔’’ زرینہ پُرامید لہجے میں بولی تو وہ بھی مطمئن ہوگئیں۔ زرینہ کمرے سے باہر نکل گئی تو خدیجہ بیگم نے ردا کی ساس کا نمبر ملایا اور انہیں یہ خوشخبری سنائی۔
‘‘کیا واقعی......؟ آپ سچ کہہ رہی ہیں...... مجھے تو یقین نہیں آرہا...... کل ہی اسپتال سے گھر آئی ہوں، اتنی بڑی خوشخبری سنا کر آپ نے مجھے پھر سے زندہ کر دیا ہے میں اور روحیل جلد ہی ردا کو لینے آئیں گے۔’’ ماں جی خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں۔
‘‘ضرور...... ضرور آپ کی امانت ہے جب چاہیں آکر لے جائیں۔’’ خدیجہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔
‘‘انشاء اللہ ہم جلد حاضر ہوں گے۔’’ ماں جی نے مسکرا کر کہا اور فون بند کر دیا۔ جلدی سے روحیل کا نمبر ملایا اور اسے جلدی گھر پہنچنے کو کہا۔
‘‘بیٹا...... ردا کی مما کا فون آیا تھا...... اور انہوں نے یہ خوشخبری سنائی ہے کہ تم باپ اور میں دادی بننے والی ہوں۔’’ روحیل گھر لوٹا تو ماں جی انتہائی خوش ہو کر بے تابی سے بتایا۔
‘‘یہ جھوٹ ہے...... بکواس ہے...... وہ لوگ مجھے ٹریپ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں......’’ روحیل یکا یک غصے سے چلایا۔
‘‘کیا بکواس کر رہے ہو...... اولاد کی اتنی بڑی نعمت اور خوشی ملنے پر بھی خوش نہیں ہو رہے۔’’ ماں نے غصے سے کہا۔
‘‘اونہہ...... اولاد...... نہ جانے وہ کس کا گناہ میرے سر تھوپ رہی ہے۔’’ روحیل پھر طیش سے چلایا۔
‘‘خبردار...... تم نے جو اس نیک لڑکی پر الزام لگایا...... دفع ہو جاؤ یہاں سے۔’’ ماں جی نے غصے سے کہا اور روحیل پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

خدیجہ بیگم نے دونوں بیٹوں کو لاؤنج میں

میتھی سے علاج

حضرت محمد ﷺ کا فرمان ہے کہ میتھی ایک سبزی ہے اسے کھایا کرو اگر یہ سونے کے بھاؤ بھی ملے۔ اگر جوڑوں میں ٹھنڈ پڑ جائے یا بیٹھ جائے تو اس کا تیز تر علاج یہ ہے کہ ایک مٹھی بھر میتھی اور ایک مٹھی انجیر خشک لے کر دونوں کو پانی میں بھگو دو اور کسی صاف برتن میں پکا لو پھر اسے پُن (چھان) لو اور ٹھنڈا کر لو ایک دن چھوڑ کر پی لو کم از کم ایک پیالہ ان دنوں میں ضرور ختم ہو۔ اس کے فوائد لاتعداد محسوس کرو گے۔ ٹھنڈ اور درد ختم ہو جائے گا اس علاج سے قولنج، کمر کا درد اور جسم کے دوسرے درد بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ ریح کا درد بھی ختم ہو جائے گا۔

مرسلہ: جبیں ہاشمی، بھیرہ

بیٹھے دیکھا تو قریب آکر بولیں۔
‘‘ردا...... امید سے ہے۔’’ انہوں نے بتایا تو دونوں نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔
‘‘میں نے ردا کی ساس کو فون کر کے یہ خوشخبری سنا دی ہے وہ اور روحیل ردا کو لینے آئیں گے تو تم لوگ......’’ خدیجہ نے کچھ کہنا چاہا۔
‘‘اگر روحیل یہاں آیا تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔’’ حاتم نے غصے سے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
‘‘اب صورتِ حال کو سمجھو اور خبردار تم میں سے کسی نے کوئی بات کی۔’’ خدیجہ بیگم نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔
‘‘میں اس شخص کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس لیے آپ خود ہی اسے ٹریٹ کرلیں۔’’ حاتم غصے سے کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔
‘‘اور میں بھی اس بدتمیز انسان کو برداشت نہیں کرسکتا۔’’ عاصم نے غصے سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ خدیجہ پریشان ہو کر انہیں دیکھنے لگیں۔
‘‘ردا اپنے کمرے میں بیٹھی کسی سوچ میں گم تھی کہ

اس کا موبائل بجنے لگا اس نے چونک کر اسکرین دیکھی تو کوئی اجنبی نمبر تھا، ردا نے ہچکچاتے ہوئے فون ریسیو کرلیا۔

"ہیلو...... ردا...... میں توقیر بات کررہا ہوں، رشنا نے مجھے آپ کے حالات کے بارے میں بتایا۔ آئی ایم سوری، آپ میری وجہ سے اتنا suffer کررہی ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میری ایک لمحے کی خواہش اور جذباتی سوچ آپ کی زندگی کو یوں اذیت ناک بنادے گی۔" توقیر نے آہستہ آواز میں کہا۔

"آپ نے میرے ساتھ بہت برا کیا۔" ردا سسکی بھرتے ہوئے بولی۔

"آئی...... ایم سوسوری۔ میں ایسا کیا کروں کہ آپ دونوں کے درمیان یہ غلط فہمی دور ہوجائے۔ میں نے تو روحیل کو بھی فون کیا تھا...... مگر......" توقیر نے بتایا تو ردا ایک دم بھڑک اٹھی۔

"کیا آپ نے روحیل کو فون کیا تھا؟ آپ میری زندگی کو جہنم بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے۔" وہ غصے سے کہہ رہی تھی۔

"میں آپ کی وجہ سے بہت پریشان رہتا ہوں۔ ہر وقت میرے اندر ایک آگ سی بھڑکتی رہتی ہے۔" توقیر نے افسردگی سے کہا۔

"یہ آگ بھی آپ نے لگائی ہے جسے روحیل نے بھڑکا دیا ہے اور اس میں، میں جل رہی ہوں...... اب آپ دونوں میرا تماشا دیکھیں۔" ردا نے غصے سے کہہ کر فون بند کردیا اس کی آنکھیں گرم پانیوں سے بھرنے لگیں وہ ہاتھ مسل رہی تھی۔ خدیجہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں اور اسے روتا دیکھ کر محبت سے اس کے آنسو پونچھنے لگیں۔

"کیوں...... رو رہی ہو میری جان؟" وہ دکھ بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

"اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی ہوں۔" ردا نے سسکی بھر کر جواب دیا۔

"آنسو کبھی قسمت نہیں بدلتے بس دعا کر ہوسکتا ہے اس سے تمہاری تقدیر بدل جائے...... نے تمہاری ماں جی کو فون کر کے خوشخبری سنائی خدیجہ بیگم نے ایک دم بات بدلتے ہوئے کہا نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"یہ...... یہ...... آپ نے کیا کیا......؟" ایک دم بوکھلا کر بولی۔

"بیٹا اس بات کو چھپانے سے تمہارے اور بھی مسئلے پیدا ہوسکتے تھے اس لیے انہیں ضروری تھا۔ ماں جی بہت خوش ہوئیں، وہ جلد رو کے ساتھ تمہیں لینے آئیں گی۔ اپنے آپ میں ہ اور حوصلہ پیدا کرو۔ اپنا حلیہ ٹھیک کرو، اللہ سب ٹھ کرے گا۔" خدیجہ بیگم نے محبت سے اسے ا ساتھ لگا کر چومتے ہوئے کہا تو ردا بے یقینی سے کی طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

اگلے روز شام کو ماں جی نے ردا کی طرف جانے کا پروگرام بنایا۔ فضیلت نے روحیل کو سہ پ میں ہی بتا دیا تھا اور اب دونوں تیار ہو کر اس کا انتظ کررہی تھیں۔ وہ روحیل کو بار بار فون کررہی تھیں وہ فون نہیں اٹھا رہا تھا۔

اُدھر دفتر میں روحیل شش و پنج میں مبتلا تھا ماں جی کے بار بار فون کرنے پر اس نے موبائل آ کردیا تھا پھر اچانک اسے نہ جانے کیا سوجی کہ اس نے ردا کا نمبر ملالیا۔

ردا نے کافی بیلز کے بعد موبائل کان سے لگ اور قدرے گھبرائے ہوئے انداز میں ہیلو کہا تو روح انتہائی طیش کے عالم میں اس پر چلّانے لگا۔

"تم انتہائی مکار اور گھٹیا عورت ہو، مجھے ٹر کرنے کے لیے کیسی کیسی چالیں چل رہی ہو...... لیکن میں تمہاری ہر چال ناکام بناؤں گا۔"

"یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" ردا

ہکلاتے ہوئے کہا۔
"تم لوگوں نے یہ کیا نیا شوشا چھوڑا ہے کہ میں باپ بننے والا ہوں، مجھے دھوکا دینے کے لیے تمہیں نیا ہتھکنڈا سوجھا ہے۔" روحیل نے بری طرح چلاتے ہوئے کہا۔
"یہ میں نہیں...... میری میڈیکل رپورٹس کہہ رہی ہیں۔" ردا نے آہستہ سے کہا۔
"اور میری میڈیکل رپورٹس بتاتی ہیں کہ میں باپ نہیں بن سکتا۔ تم نہ جانے کس کا گناہ میرے سر تھوپنے کی کوشش کر رہی ہو...... جس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے اسی کو ٹریپ کرو تو اچھا ہے۔" وہ نہایت... بدتمیزی سے بولا۔
"شٹ اپ روحیل...... اگر آپ نے ایک لفظ بھی کہا تو......" وہ غصے سے کانپتے ہوئے چلائی۔
"یوں چلا کر تم حقیقت نہیں بدل سکتیں۔ سوچو میں جب اپنی میڈیکل رپورٹس تمہارے بھائیوں کے سامنے رکھوں گا تو تم کیا کہو گی...... پہلے تو ضرور تمہاری بے عزتی ہوئی ہے اب کی بار ایسی رسوائی ہوگی کہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔" روحیل نے غصے میں کہہ کر موبائل آف کر دیا اور ردا اس کی باتیں سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روحیل کی باتیں اس کے سینے میں نشتر چبھونے لگیں۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی سانس بند ہو رہی ہو۔ اس کا سر چکرانے لگا۔
"گھٹیا، مکار عورت......!" روحیل کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔
"میں...... میں نے کیا گناہ کیا ہے، جس کی مجھے اتنی بڑی سزا مل رہی ہے، میں کسی کے اعتبار کے قابل نہیں رہی...... نہ شوہر کے اور نہ ہی بھائیوں کے...... مجھے اتنی رسوائی اور بے عزتی کے بعد زندہ نہیں رہنا چاہیے، مجھے مر جانا چاہیے۔" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ ایک دم سے اس کے سر میں شدید درد اٹھا اسے اردگرد کی ہر شے گھومتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ اس نے قدم اٹھانا چاہا مگر وہ ایسی چکرائی کہ اوندھے منہ فرش پر گر گئی۔ اس کے گرنے سے قریب رکھی کرسی لڑکھڑائی اور اس کے اوپر گر گئی۔ گرنے کی آواز سن کر خدیجہ بیگم اور زرینہ دونوں بھاگتی ہوئی ردا کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ خدیجہ اسے اس حالت میں دیکھ کر چلّانے لگیں۔ جیسے تیسے ڈرائیور کے ساتھ دونوں اسے اٹھا کر اسپتال پہنچیں۔ آئی سی یو کے باہر چکر لگاتے ہوئے وہ بار بار بیٹوں کا نمبر ملا رہی تھیں مگر کوئی بھی ان کی کال نہیں لے رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر روم سے باہر نکلی تو خدیجہ بیگم نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔
"ڈاکٹر صاحبہ میری بیٹی......"
"ان کا مس کیرج ہو گیا ہے اور ان کا بی پی اب بھی بہت ہائی ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا تو وہ لرز کر رہ گئیں۔
"آپ دعا کریں...... انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ڈاکٹر نے انہیں تسلی دی اور وہاں سے چلی گئی۔ خدیجہ بری طرح سسکنے لگیں۔
"بیگم صاحبہ...... ہمت کریں۔" زرینہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو خدیجہ بیگم نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

☆☆☆

رات کافی گہری ہو گئی تھی جب روحیل قدرے تھکے ہوئے انداز میں ماں جی کے کمرے میں داخل ہوا تو ماں جی نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔
"ماں جی...... وہ۔" روحیل رک رک کر بولا۔
"مجھ سے بات مت کرو۔" ماں جی نے غصے سے جواب دیا۔
"پلیز...... ماں جی...... سمجھنے کی کوشش کریں، میرے لیے ردا کے گھر جانا پاسبل نہیں۔" روحیل نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"کیوں......؟" انہوں نے خفگی سے پوچھا۔
"اب میں آپ کو کیا بتاؤں؟" نادانستہ اس کے منہ سے نکلا۔
"کیا مطلب...... کیا تم مجھ سے کچھ چھپانا چاہ رہے ہو؟" ماں جی نے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ک...... ک کچھ نہیں۔" روحیل نے گھبرا کر جلدی سے جواب دیا۔
"اِدھر بیٹھو...... میرے پاس۔" ماں جی نے اسے تحکمانہ لہجے میں کہا تو روحیل خاموشی سے ان کے پاس بیٹھ گیا۔ ماں جی نے اس کا ہاتھ اپنے سر پر رکھا۔ روحیل نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔
"تمہیں میرے سر کی قسم...... تم آج مجھے صاف، صاف بتاؤ کہ تم ردا کے ساتھ یہ سب کیوں کر رہے ہو؟" ماں جی نے کہا تو روحیل نے گھبرا کر ماں جی کی طرف دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر وہاں سے جانے لگا۔
"روحیل...... آج تم نے مجھے حقیقت نہ بتائی تو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔" ماں جی نے قدرے درشت لہجے میں کہا تو روحیل نے گھبرا کر ماں جی کی طرف دیکھا اور بوجھل قدموں سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ ماں جی پریشان ہو کر اسے دیکھتی رہ گئیں۔
روحیل اپنے کمرے میں گیا اور میٹرس کے نیچے سے فائل نکال کر سوچ میں پڑ گیا۔
"آج وقت آ گیا ہے کہ مجھے ماں جی کو یہ کڑوا سچ بتانا پڑے گا۔ اس کے بعد وہ خود فیصلہ کریں گی کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا!" وہ یہی سوچ کر کمرے سے باہر چلا گیا اور ماں جی کے سامنے فائل رکھی۔
"یہ کیا ہے......؟" ماں جی نے حیرت سے پوچھا۔
"میری میڈیکل رپورٹ جس کے مطابق میں کبھی باپ نہیں بن سکتا۔" روحیل نے کہا تو ماں جی کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔
"ک...... کیا......!" وہ حیرت سے بڑبڑائیں۔

"اب یہ پڑھ کر آپ خود فیصلہ کریں کہ جھوٹ بول رہا ہے، میں یا ردا؟" روحیل نے سانس لیتے ہوئے ماں جی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"ردا کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی، وہ بہت نیک اور پاکباز بچی ہے، اس کے بارے میں کسی غلط بات کا سوچنا گناہ ہے اور ایسی بات کا کہنا اس پر تہمت ہوگی۔" ماں جی نے پروثوق لہجے میں کہا۔
"کیا آپ کے خیال میں...... میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" روحیل بپھر گیا۔
"یہ رپورٹس غلط بھی ہو سکتی ہیں بیٹا! آج کل لیب میں بھی بہت گھپلے ہو رہے ہیں، لوگوں کی رپورٹس میں...... وہ...... وہ بیماریاں سامنے آتی ہیں جو اُن میں کبھی ہوتی ہی نہیں...... تم دوبارہ اپنا ٹیسٹ کراؤ...... میری ردا جھوٹ نہیں بول سکتی۔" ماں جی نے پُریقین لہجے میں کہا تو روحیل نے چونک کر ماں جی کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔
"کیا تم نے اپنے اس عیب کو چھپانے کے لیے ردا کے ساتھ یہ رویہ اپنایا؟" ماں جی نے استفہامیہ انداز میں پوچھا تو روحیل نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔
"اگر تم نے ایسا کیا ہے تو تم بہت ہی کم ظرف انسان نکلے جس نے اپنے عیب چھپانے کے لیے ایک نیک اور معصوم لڑکی کو رسوا بھی کیا اور اسے ذہنی اذیت بھی دی۔ روحیل خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔" ماں جی نے کہا تو روحیل نے سر اٹھا کر ماں جی کی طرف دیکھا اور پریشان ہو کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ ماں جی پُرتاسف نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

میکے میں آ کر بھی شمیلہ کے رنگ ڈھنگ وہی تھے۔ جس انسان کی سرشت ہی میں شر ہو وہ کسی ماحول یا کسی بھی حالات میں نہ خود خوش رہتا ہے نہ دوسروں کو خوش دیکھ سکتا ہے۔ شادی سے پہلے بھی شمیلہ کو بھائی کا رویہ کھٹکتا تھا، شادی کے بعد سسرال

والوں سے شکایتیں تھیں اور بیوگی کے بعد میکے میں نئے ہتھکنڈے شروع کر دیے تھے۔ ماں بھی جائز ناجائز اسی کی طرف داری کرتیں۔ گھر میں موجود بھائی بھاوج کا جینا دوبھر کر دیا تھا ہر وقت اسے کوئی نہ کوئی مسئلہ ہی رہتا تھا۔ شمیلہ چونکہ اپنے آپ کو ہی حق پر سمجھتی تھی اس لیے اسے اپنی کسی زیادتی کا احساس ہی نہ ہوتا تھا...... دیوروں کا فون آتا تو ان سے ہمدردیاں بٹورنے کی بھرپور کوشش کرتی۔
"کیا بات ہے عاصم...... تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟" حاتم نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"میں نے شمیلہ بھابی کو فون کیا تھا...... وہ بہت اپ سیٹ ہیں، لگتا ہے انہیں خالہ جان کے گھر میں بھی کوئی پرابلم ہے۔" عاصم نے بھاوج کی ہمدردی میں کہا۔
"وہاں کیا پرابلم ہو سکتی ہے وہاں ان کی مما اور بھائی، بھابی ہیں۔" حاتم نے کہا۔
"ہو سکتا ہے بھائی، بھابی دونوں کے ٹرمز اچھے نہ ہوں۔" عاصم نے جواب دیا۔
"یار! یہ عورتیں بھی بہت فساد ڈالتی ہیں، اب دیکھو ردا کی وجہ سے ہماری اپنی فیملی کتنی بکھر گئی ہے، مجھے تو عورت ذات سے ہی نفرت ہونے لگی ہے۔" حاتم خفگی سے منہ بنا کر بولا۔
"میرا خیال ہے ہمیں شمیلہ بھابی کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ جس عورت کے پاس پیسہ اور پیچھے سپورٹ ہو تو لوگ خود بخود اس کی عزت کرنے لگتے ہیں۔ آج شام کو ہم ان کی طرف جائیں گے تاکہ ان کی فیملی کو اندازہ ہو کہ وہ تنہا اور بے آسرا نہیں، ہم ان کے پیچھے ہیں۔" عاصم گہری سانس لے کر بولا تو حاتم بھی اس کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گیا۔
شام کو دونوں خالہ کے گھر گئے۔ شمیلہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی، ویسے بھی وہ برائے نام عدت میں تھی۔ جب دل چاہتا کسی اجنبی کے سامنے آ جاتی اور جب مرضی نہ ہوتی تو عدت کا بہانہ بنا کر کمرے میں بند رہتی۔
"خالہ جان یہ دو لاکھ روپے ہیں، شمیلہ بھابی کے اخراجات کے لیے۔" حاتم نے ایک لفافہ خالہ کو پکڑاتے ہوئے کہا تو نفیسہ نے ایک دم چونک کر میاں کی طرف دیکھا۔
"نہیں بیٹا اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" انہوں نے لفافہ واپس کرتے ہوئے کہا۔
"مما...... شمیلہ پر ان لوگوں کا پورا حق ہے اگر یہ لوگ اس کا خیال رکھ رہے ہیں تو انہیں رکھنے دیں، وہ عدت تک ہمارے پاس ان کی امانت ہے۔ اس کے بعد یہ اس کے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں گے وہ ہمیں قبول ہوگا۔" سلمان نے معنی خیز انداز میں کہا تو حاتم اور عاصم نے چونک کر اسے دیکھا۔ ریحانہ نے خاموشی سے لفافہ پکڑ لیا۔ شمیلہ اپنے کمرے میں تھی جب ریحانہ لفافہ پکڑے کمرے میں داخل ہوئیں۔
"بیٹا...... حاتم اور عاصم آئے تھے۔ تمہارے لیے یہ دو لاکھ روپے دے کر گئے ہیں۔" ریحانہ نے وہ لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"کیوں......؟ وہ کون ہوتے ہیں میرا خیال رکھنے والے، میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں...... میں ابھی انہیں فون کر کے بتاتی ہوں۔" شمیلہ غصے سے بھڑک کر بولی۔
"یہ کیا حماقت ہے، تم ذرا ذرا سی بات پر اتنی جذباتی کیوں ہو جاتی ہو، شکر نہیں کرتیں کہ تمہارے اس مشکل وقت میں وہ تمہارا ساتھ دے رہے ہیں، ورنہ بھائی کے مرنے کے بعد بھابیوں کو کون پوچھتا ہے۔" ماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"کیا وہ مجھ پر ترس کھا رہے ہیں؟" اس نے غصے سے کہا۔
"نہیں...... خدا کے لیے غلط مت سوچو۔ سب تمہیں بہت چاہتے ہیں۔" وہ اسے سمجھانے لگیں۔
"سب میرے دشمن ہیں، میں کسی پر ٹرسٹ نہیں کر سکتی۔ ان سب نے میرے فہام کو مجھ سے چھینا ہے اور اب مجھے بے آسرا کر کے میرا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔"

”کوئی تمہارا دشمن نہیں، فہام کی زندگی ہی اتنی لکھی تھی اور انسان کی زندگی اور موت تو خدا ہی لکھتا ہے۔“ ریحانہ نے آہ بھر کر نم آنکھوں سے کہا۔

”تو کیا...... خدا میرا دشمن ہے، اس نے مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا ہے۔ آپ پوچھیں اس سے؟“ وہ انتہائی غصے سے ہائپر ہو کر چلاّنے لگی تو ریحانہ توبہ توبہ کرتے ہوئے جلدی جلدی نیند کی گولی نکال کر اسے کھلانے لگیں۔ اس پر یکا یک غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

ردا جب سے اسپتال سے گھر آئی تھی، حاتم اور عاصم ایک بار بھی اس کی خیریت پوچھنے اس کے کمرے تک بھی نہیں آئے تھے اور اسے اس بات کا بہت افسوس ہوتا۔ وہ بار بار مما اور زرینہ سے ان کے بارے میں پوچھتی تو وہ دونوں بہانے بنا کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتیں مگر وہ سب سمجھتی تھی۔ رات کو خدیجہ بیگم، ردا کے کمرے سے باہر نکلیں تو حاتم اور عاصم لاؤنج میں داخل ہوئے انہیں دیکھ کر انہوں نے منہ پھیر لیا۔

”مما کیا بات ہے، آپ کچھ ناراض لگ رہی ہیں۔“ عاصم نے خدیجہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم لوگوں کو میری کیا پروا ہے اگر پروا ہوتی تو میری خاطر ہی تم بہن کو دیکھنے اسپتال ضرور آتے لیکن تم لوگوں کے خون ہی سفید ہو گئے ہیں۔“ انہوں نے خفگی سے کہا۔

”پلیز مما......! آپ اس کا ذکر مت کیا کریں۔“ حاتم غصے سے بولا۔

”کیوں نہ کروں، ماں ہوں اس کی...... کیا خاموشی سے اس کی بے بسی اور اذیت کا تماشا دیکھتی رہوں اگر آج مجھے کچھ ہو جائے تو کیا تم لوگ اسے یونہی بے سہارا چھوڑ دو گے؟“ خدیجہ نے سسکی بھر کر کہا۔

”آپ بار بار اسے ڈسکس نہ کیا کریں تو بہتر ہے۔ اس کی وجہ سے آج ہمارے گھر کا یہ حال ہوا ہے۔“ حاتم غصے سے کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

”مما...... آپ حاتم بھائی کو زِچ نہ کیا کریں لوگ پہلے ہی شمیلہ بھابی کی وجہ سے بہت اپ سیٹ ہیں۔“ عاصم کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو خدیجہ بیگم نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیوں...... اب اسے وہاں کیا پرابلم ہے...... یہاں تو میں اسے چین سے نہیں رہنے دے رہی تھی۔ اب ماں کے گھر میں بھی اسے سکون نہیں رہا؟“ خدیجہ بیگم نے جل کر پوچھا۔

”کیا آپ ان کے دکھ کو نہیں سمجھ رہیں جو بات کہہ رہی ہیں۔“

”بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں لیکن افسوس تو ہے کہ تم لوگوں کو بھابی کا دکھ تو دکھائی دیتا ہے لیکن بہن کی تکلیف نہیں۔“

”مما...... آپ ہر بات کو گھما پھرا کر ردا تک کیوں لے آتی ہیں۔“

”کیونکہ مجھے تم لوگوں کی بے حسی اور ردا کی بے بسی بہت رُلاتی ہے۔ تم لوگوں کے رویّے کی وجہ سے میں جس اذیت میں ہوں یہ میں ہی جانتی ہوں۔“

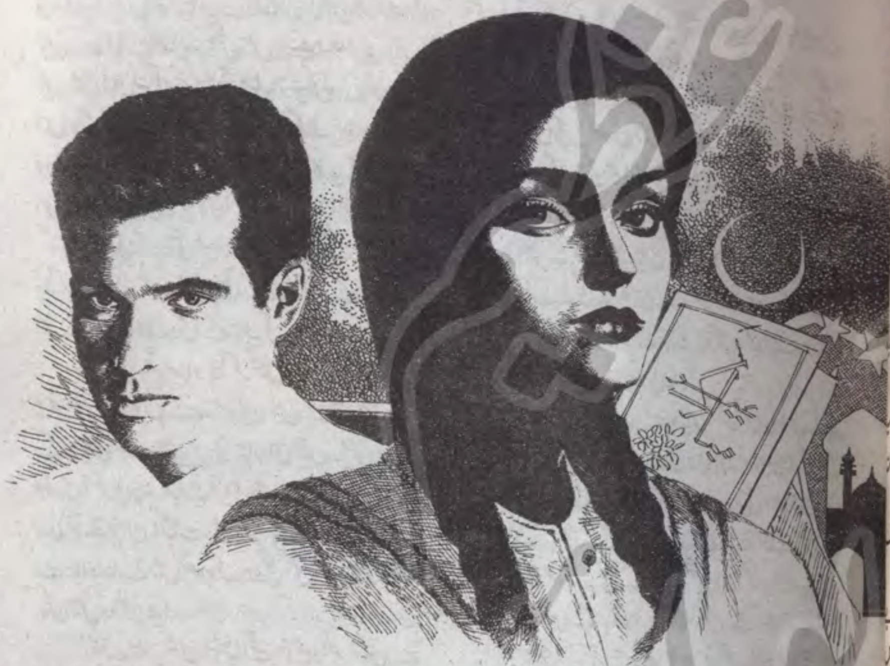
”افوہ...... آپ کے پاس تو بیٹھنا ہی فضول ہے، ہر وقت ایسی ہی باتیں کرتی رہتی ہیں۔“ عاصم غصے سے کہہ کر وہاں سے چلا گیا اور خدیجہ بیگم بیٹوں کے اس انداز پر تڑپ کر رہ گئیں۔

☆☆☆

ماں جی لاؤنج میں آہستہ آہستہ ٹہلتی ہوئی تسبیح پڑھ رہی تھیں اور تسبیح پڑھتے ہوئے وہ ایک دم چھت کی طرف دیکھ کر دعا کرنے لگتیں پھر چلنے لگتیں۔ جبھی روحیل اپنی میڈیکل رپورٹس کی فائل پکڑے لاؤنج میں داخل ہوا۔

”ماں جی...... ماں جی میری سب رپورٹس نارمل ہیں۔“ روحیل نے قدرے جذباتی انداز میں خوش ہو کر کہا۔

(باقی آئندہ)



عید سے پہلے

رضوانہ پرنس

تانیہ بہت بے دلی سے کباب تلنے میں مصروف تھی۔ ایک نا معلوم سی اداسی جیسے اس کے دل میں اترتی جا رہی تھی۔ آنکھوں میں آئی نمی کو وہ کئی بار اپنے دوپٹے میں جذب کر چکی تھی لیکن آنسو تھے کہ ضدی بچے کے مانند بار بار اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھلملانے کو بے تاب ہوئے جا رہے تھے۔ باہر لاؤنج سے آزر کی چہکتی ہوئی آواز اسے مسلسل آ رہی تھی۔ وہ دونوں بچوں کے ساتھ ہنستے کھلکھلاتے ہوئے ان کا پسندیدہ کارٹون

ٹی وی پر دیکھ رہا تھا۔ تانیہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر فرائی پین سے کباب نکال کر ڈش میں رکھے اور مزید کباب پین میں ڈالنے لگی۔ پاس کھڑی نذیراں نے غور سے اس کے مُتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ سلاد بناتے ہوئے وہ کتنی دیر سے اپنی بیگم صاحبہ کا یہ بجھا بجھا سا انداز دیکھ رہی تھی۔

''باجی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی' آپ جا کر آرام کرلیں میں باقی کباب تل لیتی ہوں۔'' اس نے بہت ہمدردی سے تانیہ کی جانب دیکھا۔

''نہیں، تم سلاد بنا کر ٹیبل سیٹ کرو، افطار کا ٹائم نزدیک آرہا ہے، مہمان بس آتے ہی ہوں گے۔ باقی سب چیزیں تو تیار ہی ہیں۔'' وہ جلدی جلدی آخری چند کباب فرائی پین میں ڈالتے ہوئے بولی تو نذیراں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تیزی سے سلاد بنانے میں مصروف ہوگئی تبھی آزر مسکراتا ہوا کچن میں داخل ہوا۔

''اُف تانیہ کیسی اشتہا انگیز خوشبو بکھر رہی ہے ان کبابوں کی سارے گھر میں...... یار اب تو جیسے وقت کٹ ہی نہیں رہا۔'' آزر کی بات پر تانیہ نے ایک نظر اس کے خوشی سے چمکتے ہوئے چہرے پر ڈالی۔

''ہاں انتظار کا وقت تو کاٹے نہیں کٹتا۔'' طنز خود بخود اس کے جملے میں سمٹ آیا تو آزر نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ارے، میں تو افطاری کی بات کررہا ہوں تم بات کو کہاں سے کہاں لے گئیں۔'' آزر نے اس کے بگڑے ہوئے موڈ کو محسوس کرتے ہوئے فوراً ہی صفائی دی اور ٹرالی پر رکھی ہوئی چاٹ کی ڈش اور دہی بڑوں کے ڈونگے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''واہ بھئی آج تو علیشا بہت امپریس ہوجائے گی ہماری بیگم سے، اسے تو یقین ہی نہیں آئے گا کہ یہ تمام چیزیں تم نے خود بنائی ہیں۔ ویسے بھی یہ تمام چیزیں اس کی بہت فیورٹ ہیں۔'' آزر نے تعریف بھی کی تو کچھ اس انداز سے جیسے کوئی گلاب کا پھول مع کانٹوں بھری ٹہنی کے ہاتھوں میں تھما دے۔ اس نے بہت شکایتی نظروں سے آزر کی جانب دیکھا لیکن وہ اس کی آنکھوں میں چھپے کرب کو محسوس کیے بنا اب بریانی کی دیگچی کا ڈھکن کھول رہا تھا۔

''پلیز آزر میں کام کررہی ہوں اور آپ مجھے بلاوجہ ڈسٹرب کررہے ہیں۔ یہ ساری تعریفیں علیشا خود آکر کرلے گی۔'' اس کے کھولتے ہوئے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے آزر نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر شرارت سے ہنس دیا۔

''اوہو تو یہ بات ہے، یار آخر تمہیں اس سے جیلسی کیوں ہورہی ہے، ساری دنیا اور خود علیشا بھی یہ بات جانتی ہے کہ میں تمہیں کتنی چاہ سے اپنی دنیا میں بیاہ لایا ہوں۔'' آزر نے بہت پیار سے اسے شانوں سے تھام کر اپنی طرف گھمانے کی کوشش کی لیکن تانیہ نے آہستگی سے اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹا دیے۔

''پلیز...... آزر مجھے کام ختم کرلینے دیجیے'' وہ بظاہر بڑی محویت سے کبابوں کو الٹنے پلٹنے میں مصروف ہوگئی۔ آزر چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر طویل سانس لے کر کچن سے نکل گیا۔ تانیہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چمک اٹھے۔ آزر کے چہرے پر بکھری خوشی جیسے ایک اداسی بن کر تانیہ کے دل میں اتری جارہی تھی۔

علیشا سے وہ اپنی شادی کے روز سے ہی غائبانہ طور پر بہت جیلس تھی۔ اُسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب وہ دلہن بنی اسٹیج پر آزر کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ چہرے پر اپنی محبت کو پالینے کی خوشی کی جھلملاہٹ جیسے لوگوں کی آنکھیں خیرہ کیے دے رہی تھی۔ تبھی آزر کے یونیورسٹی کے زمانے کے کچھ دوست جن میں لڑکیاں بھی شامل تھیں ان دونوں کو وِش کرنے اسٹیج پر آگئے اور ہنسی مذاق کا ایک سلسلہ سا چل پڑا۔

''تو آخر جناب نے اپنی محبت کو پا ہی لیا۔''

کسی شوخ سی لڑکی نے آزر کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''بالکل جناب...... بس محبت میں شدت اور جذبے میں سچائی ہونی چاہیے اور میرا عشق تو سمندر سے بھی زیادہ گہرا تھا۔'' آزر کے اس جذباتی ڈائیلاگ نے فضاؤں میں قہقہے بکھیر دیے، تانیہ بھی سر جھکائے زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔

''شکر ہے کہ اس وقت علیشا یہاں نہیں ہے ورنہ صدمے کے ساتھ ساتھ اسے ہارٹ اٹیک تو ضرور ہوجاتا، تمہارا یہ اتنا رومینٹک روپ دیکھ کر۔'' انیلا کے اس مذاق پر آزر کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کو بدلا اور دوسرے ہی لمحے وہ ہنس دیا۔

''ہاں، میں نے اسے انویٹیشن بھیجا تھا لیکن سنا ہے کہ اس کی فیملی کینیڈا شفٹ ہوگئی ہے۔'' تانیہ نے چونک کر آزر کی جانب دیکھا۔ انیلا کے مذاق پر وہ جیسے کچھ کانشس سی ہوگئی تھی اسی وقت کچھ اور مہمان بھی اسٹیج پر آگئے اور آزر اُن کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اسی شور و غل میں تانیہ کے کانوں میں اچانک ہی انیلا، فرناز کی سرگوشیاں ٹکرائیں تو جیسے اس کی پور پور سماعت بن کر اس کے کانوں میں دھڑکنے لگی اور اس کی تمام تر توجہ ان دونوں کی باتوں کی طرف مبذول ہوگئی جو وہ بہت آہستگی کے ساتھ ایک دوسرے سے کررہی تھیں۔

''میں مانتی ہوں تانیہ بھی پیاری ہے کافی کشش ہے اس میں لیکن یار علیشا سے پھر بھی اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔'' انیلا کی بات کے جواب میں فرناز نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو انیلا...... مجھے آزر کی پسند سمجھ میں نہیں آئی۔ کہاں علیشا جیسی حسین ترین لڑکی اور کہاں تانیہ۔''

''قسم سے یونیورسٹی میں دونوں ساتھ ساتھ کتنے اچھے لگتے تھے۔ میں تو سو فیصد یہ سمجھنے لگی تھی کہ آزر اپنی منگنی توڑ کر علیشا سے ہی شادی کرے گا......''

دونوں لڑکیوں کو پتا ہی نہیں چلا کہ ان کی باتوں نے ایک بہت معصوم دل کے اندر جگمگاتی خوشیوں کو بجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پتا نہیں شادی بیاہ کے موقع پر کچھ لوگوں کو اپنے اظہارِ خیال کی کیوں اتنی جلدی ہوتی ہے۔ دلہن کی صورت اس کے کپڑے، جیولری، شادی کا کھانا ہر چیز پر تنقید ضروری ہوتی ہے۔ تانیہ کی آنکھوں میں دمکتے تارے بھی ماند پڑ گئے تھے۔ ایک عجیب سی الجھن کے اندھیرے سائے جیسے اس کے نوخیز ارمانوں پر چھا کر اسے بے کل کرنے لگے تھے۔

''یہ علیشا کون ہے، آزر نے تو کبھی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔'' تبھی تانیہ کی بہت صحت مند سی چچی ہانپتی کانپتی اسٹیج پر چڑھ آئیں۔

''ارے بھئی آج تو ہماری تانیہ پر بہت روپ چڑھا ہے، کتنی خوب صورت لگ رہی ہے میری بچی۔'' وہ جیسے اس پر واری صدقے ہونے لگیں۔ آس پاس جمع ہونے والی خواتین بھی ہاں میں ہاں ملانے لگیں اور یہ فیکٹ بھی تھا کہ تانیہ پر ٹوٹ کر روپ اترا تھا۔ ہر ایک کے لبوں پر دلہن کے حُسن کی تعریف تھی لیکن اب تانیہ کا دل بجھ سا گیا تھا۔ بار بار ان دونوں لڑکیوں کے جملوں کی بازگشت جیسے ہر تعریف پر حاوی ہوجاتی۔

''کہاں علیشا جیسی حسین لڑکی اور کہاں تانیہ۔'' فرناز کی سرگوشی جیسے ایک تواتر سے اسے اپنے کانوں میں گونجتی محسوس ہورہی تھی اور ان ہی جملوں کی خلش دل میں چھپائے جب وہ حجلۂ عروسی میں آئی تو آزر سے پہلا سوال اس کا علیشا کے ہی متعلق تھا۔ آزر جو دل میں ہزاروں ارمان اور امنگیں چھپائے اپنی دلہن کے پاس آیا تھا۔ مہکتے جذبات اور مہکتی فضا میں تانیہ کا یہ سوال اسے کافی بدمزہ کرگیا۔

''دیکھو تانیہ آج کی اس حسین اور یادگار رات

میں ہمارے درمیان کسی تیسرے کا ذکر بھی نہیں آنا چاہیے پلیز......اس قسم کا فضول سوال تم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ آج میں صرف تمہیں اور تمہیں سوچنا چاہتا ہوں۔ بس اس وقت تم صرف ایک بات یاد رکھو کہ تم میری زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہو۔ میری اولین تمنا ہو، میری چاہت اور میری زندگی ہو۔'' آزر کی محبت اور جذبات سے بوجھل آواز جیسے تانیہ کو کسی بہت ہی خوب صورت خوشبوؤں سے مہکتی ہوئی دنیا میں لے جانے لگی جہاں صرف وہ تھی اور اس کا آزر اور اس کا وہ سوال دور کہیں بہت دور رہ گیا تھا لیکن یہ تو شادی کے کچھ دنوں بعد ہی اسے احساس ہوا کہ وہ سوال تو اب بھی اس کے ذہن میں ایک سانپ کے مانند کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ آزر کی محبت، اس کے والہانہ انداز میں نہ جانے کیوں اسے علیشا ہی چھپی ہوئی نظر آتی۔ آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی وہ اپنی اچھی بھلی صورت کا موازنہ علیشا سے کرنے لگتی جس سے وہ کبھی ملی ہی نہیں تھی۔ ان دونوں لڑکیوں کی باتوں کی بازگشت اسے بے کل کرنے لگتی لیکن اس دن جیسے قدرت نے خود ہی آزر کے ایک جملے سے تانیہ کو وہ سوال کرنے کا موقع فراہم کر دیا جو شادی کے پہلے روز سے ہی ایک کانٹے کے مانند اس کے دل میں چبھ رہا تھا۔ وہ اور آزر کسی دعوت میں جا رہے تھے۔ تانیہ یلو سلک کی ساڑی میں سلیقے سے کیے گئے میک اپ اور میچنگ جیولری کے ساتھ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اپنی تیاری سے فارغ ہو کر جب وہ آزر کی طرف متوجہ ہوئی تو ایک لمحے کو وہ بس اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ بلیک بہت اسٹائلش شرٹ اور گرے ٹراؤزر میں آج وہ کچھ زیادہ ہی اسمارٹ لگ رہا تھا۔

''اُفوہ آزر، آج تو آپ کچھ زیادہ ہی اچھے لگ رہے ہیں۔ سچ کہیں میری نظر نہ لگ جائے۔'' وہ بے ساختہ ہی تعریف کر بیٹھی تو آزر ہنس دیا۔

''یار کمال ہے، یہ جملے تو میں تم سے کہنے کا سوچ رہا تھا لیکن خیر کبھی کبھی بیوی کو بھی حق ملنا چاہیے۔ شوہر کی تعریف کرنے کا۔''

''نہیں آزر آج تو ساری تعریفیں بس آپ ہی کے لیے ہوں گی۔ سچ یہ شرٹ آپ پر بہت سوٹ کر رہی ہے۔'' تانیہ نے بہت پیار سے اسے دیکھا۔

''یہ شرٹ تین سال پہلے میری برتھ ڈے پر علیشا نے مجھے گفٹ کی تھی۔ اس کی چوائس کی سب ہی بہت تعریف کرتے تھے۔'' آزر کی آنکھوں میں اس بیتے ہوئے دن کی جگمگاہٹ کو تانیہ نے بہت اچھی طرح سے محسوس کیا اور جیسے وہ جگمگاہٹ ایک اندھیرا بن کر اس کے چار سو چھا گئی۔

''کیا ہوا تانیہ؟'' آزر نے فوراً ہی اس کے بدلتے ہوئے موڈ کو محسوس کر لیا کہ وہ بے اختیار اس کے پاس سے ہٹ کر بہت بیزاری سے بیڈ پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔

''اچھا تو یہ گفٹس وغیرہ کا سلسلہ بھی چلتا رہا ہے آپ دونوں کے درمیان...... پلیز آزر آج مجھے آپ سچ، سچ بتا ہی دیجیے کہ آخر آپ دونوں کی کیا کہانی ہے۔ اس دن آپ کی کلاس فیلوز بھی کچھ عجیب انداز میں علیشا کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔'' تانیہ نے بہت ضبط کیا تھا لیکن پھر بھی اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''ارے میری جان...... ایسی کوئی بات نہیں، وہ یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ مجھے بہت پسند کرتی تھی۔ میں اس کی آنکھوں میں چھپے جذبوں کو بھی اچھی طرح سے سمجھتا تھا لیکن میں نے کبھی ان جذبوں کی پزیرائی نہیں کی اور وہ بھی یہ بات اچھی طرح سے جانتی تھی کہ میری ایک پیاری سی منگیتر ہے جو میرے بچپن کی چاہت بھی ہے لیکن پھر بھی دل پر کب کسی کا زور چلا ہے۔ وہ یہ سب جانتے ہوئے بھی بس اپنی خاموش یک طرفہ محبت کو جیسے اپنے آنسوؤں سے سینچتی رہی اسے پروان چڑھاتی رہی۔''

آزر ایک جذب کے ساتھ بولتا ہی چلا گیا اور وہ ششدر سی بیٹھی اسے سن رہی تھی۔ آزر کا کھویا کھویا سا لہجہ، آنکھوں میں یادوں کے جلتے ہوئے چراغ اور جملوں میں کسی کو دکھ دینے کا پچھتاوا یہ سب تانیہ نے بہت اچھی طرح سے محسوس کیا تھا۔ آزر کے لبوں سے نکلتے ہوئے الفاظ جیسے خنجر بن کر اس کا دل چیر رہے تھے۔ کیا شادی کے محض ایک ماہ بعد ہی علیشا کو ٹھکرا دینے کا احساس ایک پچھتاوا بن کر تانیہ کی محبت پر غالب آنے لگا تھا۔ آزر نے ایک دم ہی تانیہ کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کو محسوس کیا تو اپنی اس کیفیت پر جیسے خود ہی شرمندہ ہو گیا۔

''اوہ...... سوری تانیہ میں بھی بات کو کہاں سے کہاں لے گیا۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ علیشا کا اور میرا ساتھ صرف یونیورسٹی تک تھا اور تم میری ساری زندگی کی ساتھی ہو۔ میری خوشیاں، میرا چین، میرا سکون سب تم سے وابستہ ہے۔'' آزر نے پیار سے اس کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو تانیہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ جبراً مسکرا دی لیکن آزر کے یہ پیار بھرے جملے پتا نہیں کیوں اسے انگاروں کے مانند اپنی روح کو جھلساتے ہوئے محسوس ہوئے تھے کہ ان جملوں میں بھی اسے علیشا ہی چھپی ہوئی نظر آ رہی تھی اور یہ اس کا وہم نہیں تھا۔ اس دن کے بعد سے جیسے اکثر و بیشتر ہی آزر کے منہ سے نادانستگی میں کوئی نہ کوئی علیشا کا ذکر نکل ہی جاتا اور پھر تانیہ کا موڈ آف ہوتے دیکھ کر وہ جلدی سے ٹاپک بدلنے کی کوشش کرنے لگتا لیکن تانیہ کو اپنا موڈ ٹھیک کرنے میں پھر کافی وقت لگ جاتا تھا۔ اس نے تو ہمیشہ یہی سمجھا تھا کہ وہ آزر کے دل کی، اس کی محبت کی بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ آزر اسے اس وقت سے اچھا لگتا تھا جب وہ محبت کا مطلب تک نہیں جانتی تھی۔ وہ اس کا کزن ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا بیسٹ فرینڈ بھی تھا۔ بچپن کا ساتھ اور دوستی ایک خوب صورت سے احساس میں کب ڈھلی اسے پتا بھی نہیں چلا اور محبت تو وہ آفاقی جذبہ ہے جو اگر دل میں سما جائے تو پھر کسی اور چیز کی طلب ہی نہیں رہتی۔ زندگی کی ساری خوشیاں بس ایک ہی نام سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو، لبوں پر بکھرتی ہنسی، دل میں اترتی بے کلی اور روح میں اترتی سرشاری کا سبب بس یہ ہی محبت تو ہوتی ہے۔ تانیہ کو اپنے عشق، اپنے جنون کا وہ وقت اب بھی یاد تھا۔ نماز میں اللہ سے آزر کا ساتھ مانگتے ہوئے اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا تھا۔ جس دن آزر اس کے گھر آتا تھا وہ کوئی نہ کوئی ڈش اپنے ہاتھ سے اس کے لیے ضرور بناتی تھی۔ ان دونوں کی یہ والہانہ محبت بڑوں کی جہاندیدہ نظروں سے بھلا کیسے چھپ سکتی تھی۔ سو ظالم سماج کی دیوار کو عبور کیے بنا ہی انہیں اپنی منزل منگنی کے خوب صورت روپ میں مل گئی لیکن پھر اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ انہی دنوں تانیہ کے پاپا کا ٹرانسفر لاہور ہو گیا لیکن منگنی کے اس حسین بندھن نے ان دونوں کو جدائی کا احساس بھی دھنک کے خوب صورت رنگوں میں گوندھ کر دیا۔ یہ دوری بھی اپنے اندر ایک کشش ایک حسن سمیٹے ہوئی تھی۔ اکثر چھٹیوں میں یا تو تانیہ مع اپنی فیملی کے کراچی چلی جاتی یا پھر وہ لوگ لاہور آ جاتے اور پھر جیسے دنیا بھر کی خوشیاں ان کی زندگی میں سمٹ آتیں۔ آزر اکثر تانیہ کو اپنی یونیورسٹی کی باتیں سناتا رہتا تھا لیکن اس نے کبھی اس سے علیشا کا ذکر نہیں کیا تھا بس یہی بات تانیہ کے دل میں کھٹک رہی تھی۔ جس کا اظہار جب اس نے آزر سے کیا تو وہ بات کو ٹال گیا۔

''اُفوہ...... تانیہ میں کچھ ہی دنوں کے لیے تو لاہور آتا تھا اس وقت سوائے تمہارے مجھے کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ علیشا میرے لیے اتنی اہم نہیں تھی کہ میں اس کا ذکر تم سے کرتا رہتا۔'' تب تانیہ نے گہری

سانس لے کر سوچا تھا۔

''ہاں پہلے وہ آپ کے لیے اس لیے اہم نہیں تھی کہ مجھے پانے کا چارم جو تھا۔ اب وہ چارم ختم ہوچکا ہے اور وہ جس کی محبت اِک کسک بن کر آپ کو تڑپانے لگی ہے اب خود بخود آپ کے لیے اتنی اہم بن گئی ہے کہ بہانے بہانے سے اس کا ذکر آپ کے ہونٹوں پر رہنے لگا ہے۔''

☆☆☆

اس دن وہ لوگ ٹی وی پر کوئی ڈراما دیکھ رہے تھے۔ ہیرو کی شادی کے بعد ہیروئن ہر رشتے سے انکار کررہی تھی۔ کافی جذباتی سین چل رہا تھا جب آزر نے ہنس کر تانیہ کو دیکھا۔

''یار پہلے مجھے یہ سب ڈرامے بہت فضول اور جھوٹ پر مبنی لگا کرتے تھے لیکن......'' دفعتاً وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوگیا۔

''لیکن علیشا کا شادی نہ کرنا اور آپ کی محبت میں جوگ لے کر یہ ملک ہی چھوڑ دینا آپ کے خیالات کو بالکل ہی بدل گیا، ہے ناں؟'' تانیہ کے لہجے کی تلخی پر وہ کچھ گڑبڑا سا گیا۔

''افوہ...... تانیہ تم نے تو علیشا کو اپنے حواسوں پر ہی سوار کرلیا ہے۔ ارے یار میں تو تمہیں اس کی شادی نہ کرنے والی بات بتا کر پچھتایا۔ وہ تو ارسلان کو یہ بات کسی سے پتا چلی تھی تو اس نے مجھے بھی بتادیا اور میری کم بختی کہ میں نے تم سے ذکر کردیا۔'' تانیہ کا غصہ اس کی اس وضاحت پر مزید بھڑک اٹھا۔

''یہ آپ کے دوستوں نے کیا ٹھیکا اٹھا رکھا ہے علیشا کی خبریں آپ تک پہنچانے کا...... کل کو وہ اس کا کینیڈا کا فون نمبر بھی ڈھونڈ کر آپ کو لادیں گے۔''

''ارے، ارے تانیہ یہ کون سا وہم تم نے اپنے دل میں پال لیا ہے اگر علیشا کا فون نمبر مجھے مل بھی گیا تو میں سب سے پہلے تمہاری ہی بات کرواؤں گا۔

جان خدا گواہ ہے کہ میں علیشا کی محبت سے ب... بوجھ کر انجان بنا رہا کیونکہ میرے دل میں صرف... صرف تم تھیں۔ آخر تمہیں میری بات کا یقین کی... نہیں آتا۔'' آزر نے بے حد الجھ کر اسے دیکھا۔

''آزر آپ یہ بات بار بار مجھے کیوں جتار... ہیں کہ آپ نے علیشا کی اتنی شدید محبت کو ٹھکرا کر... اپنایا ہے۔ آپ کیوں ہر دوسری بات میں علیشا... ذکر لے آتے ہیں۔ آپ کو کیوں اس بات کا صد... ہے کہ علیشا فیس بک پر کیوں نہیں ہے۔ آپ کو ک... کسک کوئی خلش ہر وقت بے چین کیے رکھتی ہے... آپ خود تو نہیں سمجھ پارہے لیکن مجھے سمجھانے... آپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔'' تانیہ کی آ... آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

''اچھا بابا اب میری سات پشتوں کی توبہ... کبھی علیشا کا نام بھی زبان پر لایا لیکن تم بھی وعدہ ک... کہ میری محبت پر کبھی شک نہیں کروگی۔ تانیہ مجھے علی... کے جذبوں کی اتنی شدت پر حیرت ہوتی ہے اس... علاوہ کوئی اور فیلنگز میرے دل میں اس کے لیے نہ... ہے۔'' آزر کے آخری جملے پر تانیہ ایک بار پھر خو... کے گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ پتا نہیں علیشا کے جذبوں... اتنی شدت وہ اب کیوں اتنا محسوس کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

میں اپنی ذات کی تنہائیوں میں زندہ ہوں
مگر یہ سچ ہے مجھے تیری ضرورت ہے بہت

تانیہ نے کارڈ پر لکھا ہوا یہ شعر کوئی سات... مرتبہ تو پڑھا ہی ہوگا اور اب پھر پڑھ رہی تھی۔ یہ کا... علیشا کی طرف سے تھا جو اس نے آزر کی شادی... آج سے پانچ سال قبل بھیجا تھا۔ آج اتفاق سے آ... اپنا بریف کیس گھر پر بھول گیا تھا۔ آفس میں ا... کچھ ضروری کاغذات کی ضرورت پڑی تو اس... فون پر تانیہ کو پورا بریف کیس ڈرائیور کے ہا... بھجوانے کے بجائے صرف ان کاغذات کو بھیجنے...

ہدایت کی۔ آزر کے بتائے ہوئے کاغذات ڈرائیور کے حوالے کردینے کے بعد نہ جانے کس تجسس کے تحت وہ اس کے بریف کیس کا جائزہ لینے لگی۔ تبھی کاغذات کے نیچے دبے ہوئے اس خوب صورت greeting card نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی اور اب اس کارڈ کی ساری خوب صورتی جیسے آنسو بن کر تانیہ کی آنکھوں میں جھلملا رہی تھی۔ علیشا نے اس کارڈ میں آزر کو شادی کی مبارک باد نہیں دی تھی بلکہ اپنے دل پر گزرنے والی قیامت کا اظہار کیا تھا۔ تانیہ کو شدید دکھ اس بات کا ہو رہا تھا کہ آزر نے پانچ سال سے یہ کارڈ سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ اسے اپنی شادی پر کتنے ہی ایسے کارڈ ملے ہوں گے لیکن اس نے صرف یہ کارڈ کیوں سنبھال کر رکھا۔ یہ اذیت بھرا سوال اس وقت تک اس کے دل کو کچوکے دیتا رہا جب تک آزر گھر واپس نہیں آگیا۔ تانیہ کی سوجی ہوئی آنکھیں اور سُتا سا چہرا دیکھ کر وہ پریشان ہوگیا۔

''کیا ہوا تانیہ سب خیریت تو ہے؟'' اور جواباً تانیہ نے بیڈ پر پڑا ہوا وہ کارڈ اٹھا کر زور سے اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ آزر نے حیرت سے اس کارڈ کو دیکھا اور پھر جیسے لمحوں میں اسے ساری سچویشن اسے سمجھ میں آگئی۔

''افوہ...... تانیہ مجھے تمہاری عقل پر حیرت ہورہی ہے۔ تمہارے جیسی عورتیں ہی ہوتی ہیں جو بلاوجہ کی جیلسی کو ایک دکھ ایک اذیت بنا کر نہ صرف خود اپنے اوپر اللہ کی دی ہوئی خوشیاں حرام کرلیتی ہیں بلکہ اپنی زندگی سے وابستہ لوگوں کو بھی ایک اذیت میں مبتلا کیے رکھتی ہیں۔'' آزر کے اتنے سخت جملوں نے جیسے جلتی پر تیل کا کام کرڈالا۔ تانیہ بری طرح سے بھڑک اٹھی۔

''آزر ہماری شادی کو پانچ سال ہورہے ہیں اور آپ نے یہ کارڈ اتنے عرصے سے اپنے پاس محفوظ رکھا ہوا ہے اگر اس طرح کے شعر کے ساتھ میں نے اپنے کسی کلاس فیلو یا کزن کا کارڈ یوں دل سے لگا کر رکھا ہوتا اور آپ کو یہ بھی پتا ہوتا کہ وہ میری محبت میں دیوانہ رہا ہے تو شاید آپ کا ری ایکشن اس سے بھی بدتر ہوتا۔'' تانیہ کی اس کڑوی بات پر آزر نے اسے بہت لاجواب ہو کر دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ کچھ بول ہی نہ پایا۔

''آزر اگر وہ آپ کو اچھی لگنے لگی تھی تو بے شک آپ مجھ سے منگنی توڑ دیتے، مجھے دکھ ضرور ہوتا لیکن کم از کم میں ایسی زندگی گزارنے سے تو بچ جاتی جس میں ہر پل میرے ساتھ رہنے والا شخص ذہنی طور پر کسی اور کے پاس رہتا ہے۔'' تانیہ کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی تب آزر نے بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

''یہ تم کیسی باتیں کررہی ہو تانیہ......! اللہ گواہ ہے میں دل و جان سے صرف تمہارا ہوں لیکن وہم کا علاج تو بڑے بڑے ڈاکٹرز کے پاس بھی نہیں ہے ورنہ میں تمہارے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا۔'' آزر نے آخر میں بات کو مزاح کا رنگ دے کر اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مزید اکھڑ گئی۔

''یہ وہم بالکل نہیں ہے آزر...... ان پانچ سالوں میں آپ نے مجھے بہت محبت دینے کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی اذیت سے بھی دوچار رکھا ہے۔ جب آپ یونیورسٹی کی باتیں بتاتے ہیں تو اس میں بھی زیادہ تر علیشا کا ہی ذکر ہوتا ہے۔ جب آپ کے یونیورسٹی کے زمانے کے دوست گھر آتے ہیں تو علیشا ہی موضوعِ گفتگو ہوتی ہے اس کے یوں اچانک ملک چھوڑ جانے سے سب سے زیادہ آپ ہی فکرمند لگتے ہیں اور......'' آواز رُندھ جانے کے باعث اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اچھا تو ان پانچ سالوں میں یہ خاموش دکھ تم اپنے دل میں چھپائے اپنی خوشیوں میں غموں کی

ملاوٹ کرتی رہی ہو۔ تبھی کبھی کبھی تم مجھ سے ایک دم سے فرنٹ ہو جاتی تھیں اور مجھے پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ میں لاشعوری طور پر علیشا کا ذکر کر بیٹھا ہوں۔"

"جی نہیں یہ خاموش، دکھ ہر گز نہیں ہے۔ ہماری کئی بار اس موضوع پر ٹھیک ٹھاک لڑائی ہو چکی ہے یہ الگ بات ہے کہ آپ ہر بار اس بات کو بھول جاتے ہیں۔" تانیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے فوراً ہی اس کی بات کی تردید کی تو آزر نے کچھ سوچتے ہوئے سامنے پڑا ہوا علیشا کا کارڈ اٹھایا اور دوسرے ہی لمحے اس کارڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے اسے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ تانیہ نے بہت حیرت سے اس کی اس حرکت کو دیکھا تو وہ اس کی حیران آنکھوں میں جھانک کر مسکرا دیا۔

"دیکھو تانیہ ایک وقت کا تقاضا ہوتا ہے کہ کسی چیز کو بہ حفاظت سے رکھا جائے اور ایک وقت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اسی چیز کو پھینک دیا جائے یعنی ایک ہی چیز کے لیے علیحدہ، علیحدہ وقت انسان کی زندگی میں آتا ہے۔ شاید آج اسی کیفیت سے میں بھی دوچار ہوں۔ علیشا کا یہ جذباتی کارڈ میں نے اس سوچ کے تحت رکھ لیا تھا کہ کوئی میرے عشق میں اتنا پاگل ہے۔ ایک احساسِ برتری موجزن رہتا تھا میرے دل کے اندر لیکن آج تمہارے ان آنسوؤں میں یہ کارڈ بہہ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس ڈسٹ بن کی زینت بن گیا ہے۔ ارے وہ لڑکی جو میری زندگی میں ہے ہی نہیں۔۔ بلاوجہ صرف اس کے ذکر کی وجہ سے ہم اپنی زندگی کا حسن کیوں تباہ کریں۔ بس آج میرا تم سے بالکل پکا وعدہ ہے کہ ہمارے درمیان اس کا ذکر کبھی نہیں آئے گا۔"

وہ کتنی محبت اور سچائی سے لبریز لہجے میں اسے یقین دلا رہا تھا وہ ایک بار پھر اپنے دل میں اس کے وعدے کی جھلملاتی لو جلا بیٹھی اور اس بار واقعی آزر نے اپنے وعدے کی اس جھلملاتی لو کو بجھنے نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ آزر کے دوستوں نے بھی علیشا کے حوالے سے کوئی بھی بات یا کسی قسم کا مذاق کرنا بالکل ترک کر دیا تھا کہ آزر نے انہیں بھی سختی سے منع کر دیا تھا۔

اور پھر آہستہ آہستہ تانیہ اپنے معمولاتِ زندگی میں حد درجہ مصروف ہو کر علیشا کو بالکل ہی بھلا بیٹھی۔ اس بات کو گزرے چھ ماہ بیت چکے تھے۔ رمضان کا مہینہ شروع ہوا تو تانیہ کو عید کی تیاریوں کی فکر ستانے لگی۔ ویسے بھی وہ شروع رمضان میں ہی اپنے، آزر اور بچوں کے کپڑے اور دوسرے لوازمات کی شاپنگ کر لیا کرتی تھی۔ اس بار ننھی ثانیہ کو لہنگا پہننے کا شوق ہو رہا تھا۔ سو وہ چاہ رہی تھی کہ کپڑا خرید کر ابھی سے ٹیلر کو دے دے ورنہ اس کے پاس رش بڑھ جائے گا۔ آزر سے اس نے وعدہ لے لیا کہ آج شام افطار کے بعد وہ لوگ شاپنگ کے لیے جائیں گے۔

کچن میں نذیراں کو افطاری کے متعلق ہدایات دینے کے بعد وہ کمرے میں آ گئی جہاں ثانیہ اور بشریٰ کھیلنے میں مصروف تھے اور آزر اس کی طرف پشت کیے موبائل پر کسی سے باتوں میں مصروف تھا وہ شرارت سے دبے پاؤں اس کی جانب بڑھی اور پھر جیسے ٹھٹک کر وہیں کھڑی رہ گئی یا شاید مارے دکھ کے ساکت رہ گئی تھی وہ۔ کاش! اس نے کچھ نہ سنا ہوتا۔ لاعلمی آگاہی کے کرب سے کتنی اچھی ہوتی ہے۔ اس بات کا احساس اسے آج ہو رہا تھا۔ آزر بہت چہکتے ہوئے لہجے میں اپنے دوست سے اپنے احساسات شیئر کر رہا تھا۔

"یار مجھے خود نہیں پتا کہ میں علیشا کے واپس پاکستان آ جانے پر اتنی خوشی کیوں محسوس کر رہا ہوں حالانکہ پانچ سال سے میرا اس سے کسی طرح کا کوئی رابطہ بھی نہیں رہا لیکن پھر بھی وہ ہمیشہ مجھے یاد رہی۔ شاید اس لیے بھی کہ میں اس کا دل توڑنے کا گناہ گار ہوں۔" دوسری طرف سے نہ جانے کیا کہا گیا کہ آزر بے ساختہ ہنس دیا۔

"جناب یہ ہماری شخصیت ہماری پرسنالٹی کا

کمال ہے کہ جس نے اسے ہماری محبت میں جوگن بنا دیا۔ سنا ہے اچھے سے اچھا رشتہ ٹھکرا دیا ہے اس نے۔" کتنا فخر تھا آزر کے لہجے میں تانیہ سے مزید کچھ اور نہیں سنا گیا وہ شکستہ قدموں واپس اپنے کمرے میں لوٹ آئی پتا نہیں آزر کتنی دیر اپنے دوست سے اپنے احساسات شیئر کرتا رہا اسے کچھ خبر نہیں تھی، یاد رہا تو بس یہ کہ علیشا واپس پاکستان آ گئی ہے۔ دل ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو رہا تھا۔ آزر کی چہکتی ہوئی آواز بار بار کانوں میں گونج رہی تھی، تانیہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملا اٹھے۔ یہ آنسو شاید انسان کے بہت ہی پُرخلوص اور قریبی ساتھی ہوتے ہیں۔ دکھ اور صدمے میں فوراً ہی اس کا ساتھ دینے آ جاتے ہیں۔ تبھی آزر مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

"ارے تانیہ تم یہاں بیٹھی ہو، افطار کا وقت اتنا نزدیک آ رہا ہے یار دیکھو تو سہی نذیراں نے ٹیبل لگا دی ہے کہ نہیں۔" وہ اس کے اترے ہوئے چہرے سے بے نیاز اپنی ہی دُھن میں مگن تھا۔ تانیہ بوجھل دل سے کچن میں چلی آئی۔ افطار کرتے وقت بھی آزر کا موڈ بہت خوشگوار تھا جبکہ وہ بہت خاموشی سے بس جیسے نوالے گن رہی تھی۔

"کیا بات ہے جان طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟" دفعتاً آزر نے اس کی خاموشی کو محسوس کیا تو غور سے اس کی جانب دیکھا۔

"چلیں شکر ہے آپ کو احساس تو ہوا۔" وہ تلخی سے کہتے ہوئے ثانیہ کی پلیٹ میں چاول ڈالنے لگی۔

"لیکن کچھ دیر پہلے تو تم اتنی خوش اور فریش نظر آ رہی تھیں یہ اچانک کیا ہو گیا تمہیں، بھئی موسم بھی اتنی جلدی نہیں بدلتے جتنی جلدی تمہارا مزاج بدلتا ہے۔" آزر نے ہنس کر اسے چھیڑا۔

"اصل میں آپ کی زندگی میں اچانک آ جانے والی بہار نے خود بخود میرے اندر کے خوشگوار موسم کو خزاں میں بدل دیا ہے۔" وہ جیسے پھٹ ہی پڑی۔

"اوہو......" آزر نے گہری نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ "شاید تم نے میری باتیں سن لی ہیں۔ ارے علیشا پاکستان ہی تو آئی ہے کوئی ہماری زندگی میں تو نہیں آئی جو تم اپ سیٹ ہو رہی ہو۔"

"پلیز آزر اب آگے وہی گھسے پٹے ڈائیلاگ مت بولنا شروع ہو جائیے گا کہ علیشا کی محبت کو ٹھکرا کر آپ نے مجھے اپنایا ہے۔ وہ آپ کے پیار میں دیوانی تھی لیکن آپ کو مجھ سے عشق تھا وغیرہ وغیرہ......" وہ بہت خفگی سے بولی تو آزر کو ہنسی آ گئی۔

"ارے بھئی تمہیں تو اپنے اتنے ہینڈسم شوہر پر فخر کرنا چاہیے جس کے لیے ایک حسین لڑکی نے اپنی خوشیاں تیاگ دی ہیں لیکن وہ صرف تمہارا ہے۔"

"آپ کے چہرے سے چھلکتی خوشی بتا رہی ہے کہ میرے ہینڈسم شوہر نے میری محبت میں سے اسے بھی کچھ شیئر دیے ہوئے ہیں۔" وہ بہت تپ کر بولی تو آزر قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

"واہ بیوی، کیا جملہ بول دیا۔" پھر اس کا غصے سے سرخ چہرہ دیکھتے ہوئے وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "دیکھو تانیہ میں نے اپنے وعدے کے مطابق اپنے اور تمہارے درمیان علیشا کا ذکر بالکل بھی نہیں آنے دیا تھا لیکن اب وہ اتفاق سے پاکستان آ گئی ہے اور اشعر سے اس کی فون پر بات ہوئی ہے وہ بتا رہا تھا کہ علیشا ہمارے گھر آنا چاہ رہی ہے۔ وہ تم سے اور بچوں سے ملنا چاہتی ہے اور اسی سلسلے میں شاید وہ ایک آدھ دن میں فون کر کے اپنے آنے کا وقت کنفرم کرے گی۔ پلیز اپنے بلاوجہ کے وہم اور جیلسی کو دل سے نکال کر اس کا کھلے دل سے استقبال کرنا۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی لڑکی ہے۔ میری وجہ سے اس نے خوشیوں سے منہ موڑا ہے پس اسی وجہ سے مجھے اس سے ہمدردی ہے اور کچھ نہیں۔ تم سارے نیگیٹو خیالات ذہن سے نکال کر اس سے بہت خلوص سے ملنا۔ کسی دکھی انسان کو خوشی دینا بھی تو ایک عبادت ہوتی

ہے۔'' وہ ایک تواتر سے بولتا جا رہا تھا اور وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

کب کیا ذکر آپ کا میں نے
سب نے چہرے سے پڑھ لیا ہوگا

اس دن کے بعد سے پھر آزر نے دوبارہ علیشا کا ذکر نہیں چھیڑا تھا لیکن اس کے چہرے پر بکھری رونق اور خوشی بِنا کہے جیسے تانیہ کو اس کے دل کا حال بتا رہی تھی۔ عید نزدیک آ رہی تھی لیکن تانیہ کو پہلی بار عید محرم کے ان دنوں کی طرح لگ رہی تھی جو صرف آنسوؤں سے لبریز ہوتے ہیں۔ اداسی نے جیسے اس کے پورے وجود کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ دل ہمہ وقت اس خوف کی لپیٹ میں رہتا کہ کب علیشا اس کے گھر آجائے گی۔ وہ گھر میں بے وجہ ہی خوب تیار ہو کر گھوما کرتی کہ شاید کبھی اچانک علیشا اس کے گھر نہ آجائے۔ وہ اس کے بے پناہ حسن کی شہرت سے خوف زدہ تھی۔ آزر کے دل میں چھپی علیشا کے لیے ہمدردی اسے ایک ایسے سانپ کے مانند محسوس ہو رہی تھی جو کسی وقت بھی اسے ڈس سکتا تھا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ آزر سے پوچھے کہ اس کے سر پر لٹکتی تلوار آخر کب گرے گی۔ علیشا ایک بار آ کر چلی کیوں نہیں جاتی لیکن ہر بار اس کی انا آڑے آجاتی۔ جب آزر خود ہی اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کر رہا تو وہ کیسے پوچھے۔ روزے عجیب بے کلی کے عالم میں گزر رہے تھے۔ عید کی بھی اس نے کوئی خاص تیاری نہیں کی تھی۔ رمضان کی وجہ سے آزر کی آفس سے جلدی چھٹی ہو جاتی تھی اور کبھی اگر اسے گھر آنے میں کچھ دیر ہو جاتی تو تانیہ کے دل میں پنکھے لگ جاتے کہ کہیں وہ علیشا سے ملنے تو نہیں چلا گیا۔ آزر کے سامنے بظاہر اپنے آپ کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش میں وہ اندر ہی اندر گھٹتی جا رہی تھی کہ اچانک اس دن علیشا کا فون آزر کے موبائل پر آ ہی گیا۔ افطار کے بعد وہ آزر اور بچے شاپنگ پر جانے کے لیے تیار ہو ہی رہے تھے کہ آزر کے موبائل کی گھنٹی گنگنا اٹھی۔ آزر کی پُرجوش آواز پر بالوں میں برش کرتے اس کے ہاتھ تھم گئے۔

''ارے علیشا کمال ہے، اتنے دنوں سے آئی ہوئی ہو اور اب کال کر رہی ہو اگر اشعر نے مجھے نہ بتایا ہوتا تو مجھے پتا بھی نہیں چلتا۔'' آزر کے اس جملے نے تانیہ کے دل میں کم از کم یہ اطمینان تو ضرور ڈال دیا کہ وہ ابھی تک علیشا سے ملا نہیں ہے۔

''ہاں، ہاں موسٹ ویلکم، ہم تو تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ ان فیکٹ تانیہ کو تو تم سے ملنے کا بہت شوق ہے۔ ٹھیک ہے تو پھر کل افطار ہمارے ساتھ ہی کرنا۔'' علیشا نے شاید اپنے آنے کا کہا تھا تبھی تو آزر نے اتنے زور شور سے اسے کل افطار پر انوائٹ کر لیا تھا۔ تانیہ کا دل جیسے ڈوب سا گیا۔ پتا نہیں کیوں علیشا سے ملنے کے تصور سے ہی اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہونے لگتی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر علیشا کے سامنے سے احساسِ کمتری کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ شاید اسے اپنے اوپر یقین اور اعتماد نہیں رہا تھا جبکہ یقین ایک روحانی پیغمبر کی طرح ہر انسان کے جسم میں ہوتا ہے اور اسے ہمت نہیں ہارنے دیتا۔ ناکام انسانوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جنہیں اپنی ذات اپنی صلاحیتوں پر بھروسا نہیں ہوتا۔ اپنے یقین کی طاقت کے بل پر ہی انسان اعلیٰ یا کمتر بن سکتا ہے لیکن تانیہ کا اعتماد اس کا یقین جیسے سب علیشا کی شخصیت کے پیچھے کہیں چھپ گئے تھے اور پھر آزر کے چہرے پر جھلکتی خوشی اسے اور بھی زود رنج بنا رہی تھی پھر اس شام شاپنگ کا پروگرام بھی کینسل ہو گیا کہ تانیہ کا موڈ ہی نہیں بن پایا تھا آج شام علیشا کو آنا تھا آزر وقت سے پہلے گھر پہنچ گیا تھا۔ کتنا ایکسائٹڈ لگ رہا تھا وہ۔ تانیہ کا دل چاہ رہا تھا کہ سب کھانوں میں زہر ملا دے حالانکہ آزر کئی بار باتوں، باتوں میں

اسے بتانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ علیشا بے چاری کو وہ خود ریجیکٹ کر چکا ہے اور اسے محض علیشا سے ہمدردی ہے لیکن تانیہ کا دل ٹھہر کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ کچن سے فارغ ہو کر وہ اپنے بیڈ روم میں آگئی جہاں آزر کپڑے بدل کر تیار ہو چکا تھا۔ سفید اسٹائلش شرٹ اور بلیو جینز میں وہ ٹھیک ٹھاک اسمارٹ لگ رہا تھا۔ تانیہ بِنا کوئی تبصرہ کیے اپنے پریس شدہ کپڑے اٹھا کر باتھ روم میں گھس گئی۔ کھلتے ہوئے فیروزی سوٹ میں سلیقے سے کیے گئے میک اپ کے ساتھ وہ کافی پیاری لگ رہی تھی۔ گیلے بالوں کو اس نے یونہی پشت پر کھلا چھوڑ دیا تھا آزر کو اس کے کھلے بال بے حد پسند تھے کہ اس طرح وہ کچھ زیادہ ہی خوب صورت لگتی ہے۔ افطار سے کچھ دیر پہلے جب کال بیل بجی تو تانیہ کا دل بری طرح سے دھڑک اٹھا جبکہ آزر تیزی سے مین ڈور کی طرف بڑھ گیا تھا۔ علیشا کے اندر داخل ہوتے ہی اس کے قیمتی پرفیوم کی مہک ہر سو بکھر گئی۔

رائل گرین ٹراؤزر سوٹ میں اس کی گوری رنگت دمک رہی تھی۔ گولڈن بالوں کی اونچی سی پونی ٹیل بنائے وہ بلاشبہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ تانیہ تو ایک لمحے کے لیے اسے دیکھتی رہ گئی۔ آزر نے تانیہ کی طرف جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھا کتنی حسین لڑکی اب تک میرے میرے عشق میں گرفتار ہے۔ تانیہ بجھے دل سے آگے بڑھ آئی۔

''اوہ تو آپ ہیں آزر کی بیوی، ماشاء اللہ بہت پیاری ہیں۔'' علیشا نے اس کے سلام کے جواب میں بڑی خوش دلی سے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا اور پھر آزر کی طرف دیکھا جو اس کے چہرے پر اپنے دیے ہوئے دکھ کو تلاش کر رہا تھا۔

''آزر پلیز باہر جا کر عبیر کو لے آؤ، وہ باہر کار پارک کر رہے ہیں۔'' علیشا کی بات پر آزر نے کچھ حیرت سے سوال کرنا چاہا ہی تھا کہ ایک بے حد ہینڈسم نوجوان مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ سرخ و سفید رنگت اور نیلی آنکھوں والا وہ نوجوان اس ملک کا تو لگ ہی نہیں رہا تھا۔

''یہ میرے شوہر ہیں عبیر، ہماری شادی دو سال قبل کینیڈا میں ہوئی تھی لیکن خدا کے لیے انہیں انگریز مت سمجھ بیٹھنا، یہ خالصتاً مسلمان ہیں۔'' تعارف کرواتے ہوئے اس کی آنکھوں اور لہجے میں پیار کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا، آزر، عبیر کے سامنے بالکل ایسے ہی لگ رہا تھا جیسے تانیہ نے خود کو علیشا کے سامنے محسوس کیا تھا۔ ایک دم سے ڈھیروں سکون اس کے دل میں اترتا چلا گیا۔ اس نے ایک مسکراتی ہوئی نظر آزر پر ڈالی جو کھسیائے ہوئے چہرے کے ساتھ عبیر سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

''ماشاء اللہ بہت خوب صورت کپل ہے آپ دونوں کا۔'' تانیہ نے جان بوجھ کر تعریف کی۔

''بس تانیہ پتا نہیں کس نیکی کے صلے میں مجھے عبیر جیسا ساتھی ملا ہے۔'' علیشا کی حسین آنکھوں میں عبیر کا عکس اس کی محبت کی چمک جیسے براہِ راست آزر کے دل پر پڑ رہی تھی۔ اپنے متعلق ساری خوش فہمیاں دم توڑ چکی تھیں۔ کتنی بڑی بڑی باتیں کرتا رہا تھا وہ تانیہ کے سامنے اور اس وقت عبیر کے دیو مالائی حسن کے سامنے کتنی دبی ہوئی شخصیت لگ رہی تھی اس کی۔

''آپ دونوں سے مل کر تو ہم لوگوں کی عید رمضان میں ہی ہو گئی، ہے ناں آزر......!'' تانیہ نے بہت چہکتے ہوئے لہجے میں آزر سے کہا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ ندامت کا اظہار لفظوں کا محتاج نہیں، یہ رویّے سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے، یہ تانیہ نے آج محسوس کیا تھا اور اب اسے اپنے محبوب شوہر کو مہمانوں کے جانے کے بعد اس ندامت سے بھی نکال کر اپنی محبت کے حسین حصار میں لینا تھا۔





شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 6

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے . . . خیر و شر، نیکی او ربدی . . . زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت . . . ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اوراسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

وہ تیسری دنیا کے ایک ایسے ترقی پزیر ملک کی سیاست کے باب پڑھ رہا تھا جس کی ترقی کو اقتصادی تنزّل، کساد بازاری اور مفاد پرستی کے کیڑے جڑوں سے کترنے میں اتنے ہی سالوں سے مصروف تھے جتنے سال اس کے قیام کو ہو چکے تھے۔ اس ملک کی جڑیں کترنے والے چوہوں میں یہاں بسنے والے چند ایسے خاندان بھی شامل تھے جن کی نسلوں کی نسلوں نے یہ فریضہ بخوبی ادا کیا تھا۔ خود اس کے پُرکھ بھی انہی چوہوں میں شامل تھے۔ نسلیں چہرے بدلتے، بدلتے اس تک آ پہنچی تھیں، وہ جو مہرزاد تھا...... جو اس خاندان کی نہ جانے کون سوئیں پیڑھی تھا۔ جسے اس کے باپ نے چیفس کالج میں داخل کروایا تھا اور جو چیفس کالج کے معیار کو اس کے لیے مناسب نہ سمجھتے ہوئے اسے اس وقت اپنے ساتھ انگلینڈ لے گیا تھا جب ابھی وہ پانچویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس ملک میں جس کی رگوں میں وہ کمزور خون دوڑتا تھا جس میں سے اپنا حصہ چوس کر اس کا باپ اپنی شان، نام اور شملے کو درجۂ اول میں شمار کراتا تھا۔ اس کی آمد کبھی کبھار کی چھٹیوں ہی میں ہوتی رہی تھی۔ ایسی ہر آمد پر اس کے باپ کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اس نظام کے پیچ وخم اور اتار چڑھاؤ سے مقدور بھر تعارف حاصل کر لے جس کا حصہ بقول اس کے باپ کے اسے ایک نہ ایک دن بننا ہی تھا۔ اس نظام جس کی اوپری سطح پر باپ اسے اپنے ساتھ کھڑا کرتا تھا، کی تہ میں بغیر کسی کے بتائے اسے نہ جانے کیوں گھٹی گھٹی آہیں، سسکیاں اور دم توڑتی سانسیں سنائی دیتی تھیں۔ ہائی اسکول میں پہنچنے تک وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے کے فن سے روشناس ہو چکا تھا اور یہ فنکاری سیکھنے میں بھی وہ اپنا استاد خود بنا تھا۔ ایک دو بار کی نسبتاً طویل چھٹیوں کے دوران اس کی بطورِ خاص تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ گھڑ سواری، نیزہ بازی، شمشیر زنی، تیراکی، فنِ تقریر، لفاظی، بیان ایسے فنون تھے جن پر مہارت حاصل کرنے کے لیے اس کے باپ نے انگلینڈ میں اس کے لیے بطورِ خاص انہی فنون کے ماہرین کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں لیکن ان سب فنون کے ذریعے اپنے ماحول میں دشمن کو کیسے چت کرنا ہے یہ اسے ان طویل تعطیلات میں سکھائے جانے کی کوشش کی جاتی رہی مگر انہی دنوں اسے محسوس ہوا کہ جتنی دلچسپی اس کا باپ اسے اس نظام کا حصہ بنانے میں لے رہا ہے اتنا ہی اس کا دل اس نظام کے قریب جانے سے بدکتا تھا۔

''تم اپنی ماں کا خون اور میری بوٹی لے کر پیدا ہوئے ہو۔'' کبھی کبھار اس کا باپ ایک ہلکا سا تبصرہ کرتے ہوئے کہہ ہی دیتا اور پھر اپنے زانو پر زوردار ہاتھ مارتا۔ ''سالی پوری ہیئت ترکیبی ہی الٹی ہو گئی۔'' مہرزاد اپنے باپ کے ان الفاظ کو خوب سمجھتا تھا، اسی لیے نگاہیں جھکائے خاموش بیٹھا رہتا۔

''لیکن کوئی نہیں۔'' پھر اس کا باپ جیسے خود کو تسلی دیتا۔ ''شکرے کی اولاد، باز کا بچہ اور عقاب کا لعل وِن، اسی کی فطرت پر جاتا ہے چاہے خون کبوتر کا ہی دوڑتا ہو اس کے اندر۔''

اسے لگتا یہ اس کے باپ کی خود کو دی جانے والی طفل تسلی ہی تھی۔ اس کے باپ کو ایسی تسلیوں کی ضرورت بھی تھی کیونکہ حویلی کے اندر موجود اس کی درجن سے اوپر نکاحی بیویوں اور اَن گنت بے نکاحی عورتوں سے لے کر دارالحکومت میں موجود اس کی بے شمار سہیلیوں اور داشتاؤں میں سے مہرزاد کی ماں کے علاوہ اس کے لیے کوئی بھی عورت اولادِ نرینہ کو جنم نہ دے سکی تھی۔ اگرچہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر وہ کسی بھی ایسی عورت کو اپنی جائز قانونی بیوی کی حیثیت دے دینے پر دل وجان سے راضی تھا جو ایک اصل خون، جیتا جاگتا بیٹا اس کے لیے پیدا کر سکتی۔ اس کی یہ کوشش اس وقت تک جاری رہی تھی جب تک وہ صرف نام کا

مردرہ جانے کی حالت تک نہیں پہنچ گیا۔ اس وقت تک پہنچ کر مہرزاد کی حد تک اس کی آواز پست، خوشامدی اور گھگیائی ہوئی تھی۔

''تمہارا نانا، تمہارے ماموں سب ایسے تخم سے اٹھے ہیں جس میں زنانہ خصوصیات بھاری ہیں لیکن تم مہرزاد خان ہو۔ خان زادہ شہاب الدین خان کے اکلوتے سپوت ایک ایسے خانوادے کے چشم وچراغ ہو تم جس کی نسلیں سپہ گری کی ماہر اور جس کے نمائندے کا گھوڑا جنگ میں بھی اور امن میں بھی ہمیشہ صفوں کے آگے تنہا کھڑا ہوتا تھا۔ we are born leaders Meharzad Khan۔''

اس کے باپ کی آواز بلغم زدہ اور بیٹھی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ بہترین میڈیکل اسپیشلسٹوں کے بتائے سپلیمنٹس اور طاقت کے کیپسول اور نامور حکما کے کُشتے بھی اس کی اس صحت کو دوبارہ پاؤں پر کھڑا کرنے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ جسے اس نے اپنے عالم شباب اور ڈھلتی عمر کے چسکوں میں گنوایا تھا مگر اس میں ابھی اتنا دم خم تھا کہ اپنی سلطنت کی رعایا کے سامنے، اسمبلی فلور پر، پریس اور میڈیا کے نمائندوں کے سامنے اتنا ٹھہر کر، ایسا جم کر بولتا تھا کہ سننے والا آپ سے آپ مرعوب ہو کر رہ جاتا۔ یہ تو صرف مہرزاد خان تھا جس پر انحصار کرنے جس پر اکتفا کرنے کے سوا اس کے پاس اس عمر میں کوئی چارہ نہیں رہا تھا اور جس کے سامنے بات کرتے ہوئے وہ آپ سے آپ گھگیانے لگتا تھا۔

''جب صحت کمزور ہونے لگے ناں تو طاقت ور سے طاقت ور انسان کو بھی تازہ اور صحت مند خون کی ضرورت پڑنے لگتی ہے۔'' وہ مِنّت بھرے انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ ''خون شون کی بو کوئی نہیں ہے۔ تم جنہیں مظلوم گردانتے ہو اور جو ہمارے بچاؤ کے لیے مرتے ہیں وہ ہم سے اس نظام سے محبت اور اس کے دفاع کے لیے مرتے ہیں۔ ان کی نسلوں کی بقا ہمارے ساتھ جُڑے رہنے میں ایک راز کی طرح پوشیدہ ہے۔ یونہی بغیر کسی لالچ کے بغیر کسی وجہ کے بنا کسی مقصد کے کون اپنی جان گنواتا ہے خان اور پھر یہ سوچو فوج کا کون سا ایسا تربیت یافتہ دستہ ہوگا جو حالتِ جنگ میں موت کو سامنے پا کر اپنے ہی جنگ جُو کو فرار کرانے لگے۔ لڑنے والے کو موت کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر تو دیکھنا ہی ہوگا، سر کاٹنا یا سر کٹانا ایک کام تو کرنا ہی پڑے گا ناں۔''

یہ بات یقیناً اس نے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد کہی تھی جسے مہرزاد نے اپنے کالج میگزین کے لیے لکھا تھا اور جس میں جنوبی ایشیا کے فیوڈل سسٹم کے ماحول میں رچ بس جانے والی مظلوم خون کی بو کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔

مہرزاد اپنے باپ کی صرف سنتا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے بحث نہ کرنے اور اس کی کسی بات کا جواب نہ دینے کا فیصلہ نوعمری ہی میں کر لیا تھا۔ جس نظام سے، جس ماحول سے اس کا دل کوسوں دور بھاگ جانے کی ترغیب دیتا تھا۔ اس سے متعلق قصے، کہانیاں اور ہدایات سن کر ان پر بحث مباحثہ کرنے اور تنقیدی نکات اٹھانے کی اسے ضرورت ہی کیا تھی۔ اپنی گریجویشن کا وقت آنے تک وہ لندن کی اونچی سوسائٹی میں ایک پاکستانی امیرزادے جو شکل وصورت میں قابلِ قبول، شخصیت میں شاندار اور اپنی ذاتی زندگی میں مغرور اور لیے دیے رہنے والا کا سا مقام حاصل کر چکا تھا۔ وہ اس معاشرے اور اس کے ادب آداب سے مانوس ہو چکا تھا اور اس کا واپس پاکستان جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے باپ کے ایک ایسے دوست جس کا اثر رسوخ قابلِ ذکر اور ناقابلِ تردید تھا نے اس کے لیے ورلڈ بینک میں ایک پُرکشش جاب کا انتظام کیا

ہی تھا کہ پیچھے علاقے میں اس کے باپ کو نامعلوم افراد نے دن دیہاڑے سینے پر فائر مار کر قتل کردیا تھا۔ ایک ایسا واقعہ جس نے نیویارک کی فلائٹ کی سیٹ کینسل کروا کر اسے راتوں رات واپس پاکستان بھجوانے کا بندوبست کردیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا ایک ایسا موڑ تھا جو اس کے پلان اے، بی حتیٰ کہ سی کا بھی حصہ نہیں تھا لیکن اس روز پاکستان آنے والی فلائٹ کے انتظار میں ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھے، بیٹھے ہی اس نے زندگی کا ایک نیا پلان ترتیب دے ڈالا تھا جس پر اس کے پہلے والے منصوبوں کا سایہ تک بھی موجود نہیں تھا۔ لندن سے پاکستان تک کی فلائٹ کے دوران اس نے اپنے نئے پلان کے تمام نکات کی ترتیب درست کرلی تھی اور پاکستان پہنچنے پر لوگوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے جو ظالمو جواب دو، خون کا حساب دو۔ رنگ لائے گا شہید کا لہو قسم کے نعرے لگا رہا تھا۔ اس نے ایک دم لائم لائٹ پر آجانے کی گھبراہٹ سے ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ بھی اپنے پلان کی ترتیب کو اوپر نیچے کرنے میں وقت گزارا تھا۔

”وہ انتہا سے زیادہ کمپوزڈ اور اپنی عمر سے زیادہ میچورڈ ہے۔“ اپنے پہلے پہل کے اِکّا دُکّا پبلک ایکسپوژر (عوام سے ملاقات کے بعد) اپنے ہی علاقے کے مخالف کیمپ سے اس کے بارے میں اوّلین رائے کا اظہار ہوا۔

”وہ شکاری کی نظر، ماہر جنگ جو کی تڑپ، چالاک چالباز کی سی چال کا مالک مگر خاموش دشمن ہے۔“ دوسری رائے آئی۔

مہرزاد خان نے اپنے مزاج کے برعکس کارزارِ سیاست میں ایک خلافِ توقع انٹری دی تھی۔ وہ ایک جذباتی باپ کا سرد مزاج بیٹا تھا۔ روایتوں سے پیار کرنے والے، صدیوں پرانے نظام کے عَلم بردار شخص کا غیرروایتی اور صدیوں پرانے نظام کا بڑا مخالف جانشین۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو وہ سر اٹھا کر فتح کا ڈنکا بجانے والا تھا یا بُری طرح پٹ کر میدانِ جنگ سے الٹے قدموں بھاگ جانے والا بھگوڑا کہلانے والا تھا۔ اس کے سلسلے میں یہی دو آرا ملکی سیاست کے ہر کونے سے ابھر رہی تھیں مگر ان آرا کا اظہار کرنے والے بھی اس کے اندر موجود شخص کو ڈھنگ سے نہیں جانتے تھے۔ جب ہی اس کا آگے بڑھنے والا ہر قدم ان کی توقع کے خلاف پڑتا تھا۔ آئے روز اس کے مخالفین اس کے بارے میں اپنی آرا بدلنے پر مجبور ہونے لگے تھے اور کئی ایک تو اسے Unpredictable (ایسا شخص جس کے بارے میں حتمی رائے نہ دی جاسکتی ہو) قرار دے چکے تھے اور ایسا اس وقت تک ہو رہا تھا جب تک اس کے بارے میں کال گرل سے تعلق کی خبر منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔ شطرنج کی جس بساط پر وہ اپنے مُہرے انتہائی مہارت سے آگے بڑھا رہا تھا۔ میڈیا پنڈتوں نے اچانک وار کرکے اس کے حفاظتی مُہرے پٹا کر اسے چیک میٹ (شہ مات) کال دے دی تھی۔

یہ ایک ایسا معاملہ تھا جو مہرزاد خان کے کسی بھی منصوبے کا حصہ نہیں تھا۔ امراؤ بیگم کی کوٹھی تک وہ اپنے جیسے ایک تازہ واردِ کوچۂ سیاست کے توسط سے پہنچا تھا اور وہاں ایک ایسی صورتِ حال کا شکار ہوگیا تھا جس پر پیچھے مڑ کر دیکھنے سے پتھر کا ہوجانے کا سا خدشہ لاحق ہوسکتا تھا۔ صنفِ نازک کا ساتھ اور سامنا اس کے لیے کوئی نیا تجربہ نہیں تھا۔ جس نظام سے اس کا تعلق تھا وہاں صنفِ نازک اگرچہ حویلیوں کی غلام گردشوں، ڈیوڑھیوں اور کوٹھریوں میں چھپا کر رکھے جانے والی جنس سمجھی جاتی تھی مگر جس پوشیدگی کے اندر وہ ظاہر ہوتی تھی اس کے تمام راز و نیاز سے وہ واقف تھا گو خود اس کے اپنے ذاتی تجربات میں اس وقت تک یہ تجربہ

شامل نہیں ہوا تھا یورپ اور امریکا کی جن فضاؤں میں وہ اس وقت تک پلا بڑھا اور سیر سپاٹے کرتا رہا تھا وہاں صنفِ نازک کے پیچ و خم ظاہر بلکہ برہنگی کی حد تک عیاں تھے۔ وہاں رہ کر منہ موڑ لینا، مجرد بن کر رہنا، ناشناسائی کا دعویٰ کرنا سفید جھوٹ کے مترادف تھا۔ اکثر اپنی شخصیت کا تجربہ کرتے ہوئے اسے خیال گزرتا کہ صنفِ نازک کے سلسلے میں وہ حُسن، ناز و ادا، لباس، تعلیم، رہن سہن، ماحول اور رنگ ڈھنگ سے زیادہ اس کی ذہانت اور فنِ گفتگو سے متاثر ہوتا تھا۔ باقی تمام اوصاف کی نسبت یہ دو خوبیاں اکثر خواتین میں کم کم ہی پائی جاتی تھیں لہٰذا اس کے قریبی حلقۂ احباب میں صنفِ نازک کی تعداد ہمیشہ بہت مختصر رہی تھی۔ پاکستان واپسی کے بعد زندگی ایک دم اتنی مصروف ہوچکی تھی کہ اسے اس حیثیت میں جو اس کے باپ کے مرنے کے بعد اسے اچانک مل چکی تھی صنفِ نازک کی جس کیٹیگری سے راہ و رسم بڑھانے کے جو مواقع ملے تھے، ان کے متعلق وہ رک کر سوچنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا کہ ان میں سے کون اپنے قریبی حلقۂ احباب میں شامل کیے جانے کے قابل تھی۔ وہ اپنے تئیں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا مگر امراؤ بیگم کی کوٹھی جس کے متعلق اس نے سنا تھا کہ یہاں کی چند گائیکائیں فنِ موسیقی پر ایسا ملکہ رکھتی تھیں جسے کلاسیکی کا درجہ دیا جاسکتا تھا۔ وہ برصغیر پاک و ہند کے ورثۂ موسیقی کا بہت بڑا مدّاح تھا اور مختلف راگوں کے بارے میں سیر حاصل ریسرچ کرچکا تھا۔ امراؤ بیگم کی کوٹھی میں اس نے اسی شوق کے تحت کسی خوش گلو مغنیہ سے راجستھانی گیت، ٹھمری یا کجری سننے کے لیے قدم رنجہ فرمایا تھا مگر یہاں اس کا پاؤں ایک ایسے چوہے دان میں پھنس کر رہ گیا تھا جو اس کے واہمے میں تھا نہ خیال میں۔

زرنگار نے اسے اپنے حسن سے نہیں حسن کے رکھ رکھاؤ سے، گفتگو سے نہیں سلیقہ گفتگو سے، عقل سے نہیں بلکہ اپنی ذہانت سے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ جو گھنٹے دو گھنٹے کی فرصت سے یہاں آواز سننے کی خاطر آیا تھا کسی کی ہزار راتوں کی قیمت ادا کرنے پر پل بھر میں تیار ہوگیا تھا۔ وہ ایسا غیر محتاط، اتھلا اور جلد باز ہرگز نہیں تھا جیسا زرنگار کے سلسلے میں ثابت ہوا تھا۔ جاننے کی جستجو اور گہرائی تک جانے کا شوق اسے بچپن سے تھا۔ اپنے اکثر قیمتی کھلونے وہ ان کے اندر موجود اس جادوئی طاقت کا نظارہ کرنے کی خاطر توڑ دیا کرتا تھا جو انہیں چلاتی تھی۔ دنیا کے اکثر ایسے تفریحی مقامات تک جن کی سیر کسی مہم جوئی سے کم نہ گردانی جاتی تھی وہ بصد شوق پہنچتا تھا اور پُراسرار غاروں، پہاڑوں کی کھوؤں، گہرے پانیوں کی تہوں، قدیم عمارتوں کے پُرپیچ تنگ راستوں تک رسائی حاصل کرلینے تک چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ اس کے اسٹڈی روم میں World's most mysterious and dangerous sites قسم کے عنوانات جیسی کتابوں کی بھرمار تھی۔ انٹرنیٹ پر بھی اس کی تلاش ایسی ہی جگہوں کے بارے تک محدود رہتی تھی۔ اسرار کو جان لینے کا یہی خبط زرنگار کے سلسلے میں اسے احتیاط، صبر اور سکون جیسے الفاظ بُھلا گیا تھا۔ جس کا نتیجہ اخباروں میں اس کے بارے میں مرچ مسالا لگے وہ اسکوپس تھے۔ الیکٹرانک میڈیا پر ٹاک شوز میں ہونے والی وہ گرما گرم بحثیں تھیں جو اس کے باپ کی سیاسی جماعت اور اس کے مخالفین کے نمائندوں کے درمیان ہورہی تھیں اور جنہوں نے اس ضمنی الیکشن کی مہم پر خاصی منفی اثر ڈالا تھا جو اپنے باپ کی خالی ہوجانے والی نشست پر وہ لڑنے جارہا تھا۔ اس کے حامی، ووٹرز، قریبی دوست، پارٹی راہ نما، الیکشن کے اسٹیک ہولڈرز، میڈیا پروموٹرز اور پریس اسٹاف سب ہی اس صورتِ حال پر پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ ان کے خیال میں قسمت کا گھوڑا اس کے ساتھ ترپ چال چل گیا تھا۔

”ہمیں بخوبی اندازہ ہے کہ غلطیاں کیسے کی جاتی ہیں اور پھر ان غلطیوں کو درست کیسے کیا جاتا

ہے۔'' اس نے اپنے پرسنل اسٹاف سے بات کرتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ سب اپنے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے ہانپنا بند کر دیں۔ میں آپ کو نہ صرف یہ الیکشن جی[ت کر] دکھاؤں گا بلکہ اس نشست پر آئندہ آنے والے کئی الیکشنز میں پارٹی کی جیت بھی یقینی بنا کر دکھاؤں گا۔'' [اس] کے لہجے میں اتنا تیقن، اتنی پختگی تھی کہ کئی ایسے اسٹاف ممبرز جن کی گھگی بندھی ہوئی تھی اس شام تک جم کر [کام] کرنے کی پوزیشن میں واپس آچکے تھے۔

☆☆☆

اسے زندگی پچھلے کئی سالوں میں اتنی ٹھہری ہوئی اور خشک نہیں لگی تھی۔ کہنے کو وہ اپنے آبائی [وطن] واپس آچکی تھی۔ جہاں اسے رنگ، نین نقش، نسل، شباہت اور زبان کے سلسلے میں کسی اجنبیت کا [سامنا] نہیں تھا۔ اس کے اردگرد سب لوگ اسی کی طرح کے ہی تھے۔ گوری رنگت، ناٹے، اور بوٹا قد، [چپٹی] ناک، چھوٹی آنکھیں وہی زبان بولتے ہوئے جس میں اس کی اپنی زبان بھی رواں تھی مگر وہ اجنب[یت] کے اس احساس کا کیا کرتی جو اس کے لیے حرزِ جاں بنا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا اس کی آنکھیں [اور] کان بلکہ جسم کا ایک، ایک عضو محوِ انتظار تھا۔ اس ملک سے آنے والی کسی ایسی اطلاع کا انتظار جس [کے] مطابق اسے اس ملک کے ایک باسی کی بیوی ہونے کی حیثیت سے وہاں کی شہریت اور قیام کا اجاز[ت] نامہ وصول ہونے والا تھا۔ اسے لگتا جیسے ہی وہ اجازت نامہ اس کے ہاتھ آنے والا تھا ویسے ہی اس [کے] پاؤں میں بندھی زنجیریں ٹوٹ جانی تھیں۔ اس کی روح کی بے چینی ختم ہو جانے کا امکان تھا۔ اس ملک کی جو اس کا اپنا تھا لگی بندھی زندگی، محنت، کام اور اپنے کام سے کام رکھنے والے مزاج، سڑکوں پر [بجلی کی] بلّیوں کی طرح رواں سائیکلیں، کشادہ اور طویل سڑکوں کے کناروں پر کھڑی بلند و بالا عمارتیں، لوگو[ں] کے چہروں پر سجی مخصوص پیشہ ورانہ مسکراہٹیں، اسے اس مخصوص لگی بندھی زندگی سے اکتاہٹ ہونے [لگی] تھی۔ اسے رہ رہ کر زندہ دلوں کا وہ شہر یاد آتا تھا جہاں کے لوگوں کی اکثریت کو کسی قانون اور قاعد[ے] کی پروا نہیں تھی۔ ٹریفک بے ہنگم اور بے ترتیب تھی۔ ٹریفک سگنلز کی پروا نہ کرنے والے، انہیں توڑ [کر] درمیان سے کہیں نکل جانے والے، دکانوں، کھوکھوں، شاپنگ سینٹرز پر مول تول، بھاؤ بحث کرکے [بھی] خریداری کیے بغیر چلے جانے والے لوگ جن کے پاس یہ سب کرنے کی فرصت ہی فرصت ہوتی۔ کھانے پینے کے اسٹالز پر کھانا کھاتے ہوئے ملکی سیاست سے لے کر گلی محلّوں تک کی سیاست ڈسک[س] کرنے والے لوگ، آفسز، کالجز اور اسکولز کے ٹرانسپورٹ پوائنٹس پر تاک لگائے کھڑے نوجوان جن میں سے کئی پریشان حال لوگوں کی مدد کو تیار نظر آتے اور کئی صرف آنکھیں سینکنے کھڑے ہوتے، شو[ر] مچاتے، موٹر بائیکس کے سائلنسرز نکال کر سڑکوں پر رواں دواں لوگ جو اپنی فرسٹریشنز، اپنے دکھ، ا[س] قسم کے ہلّوں گلّوں میں اور شور و غوغا بپا کرکے کم کرتے تھے۔ اسے وہ سب لوگ کتنی شدت سے یاد آ[تے] تھے۔ مشکل زندگی گزارنے والے آسان اور بے ضرر لوگ۔ اپنے وطن کے خاموش اور مہذب ماحو[ل] میں اکثر صبحوں اور شاموں کو اسے مسجدوں کی بلندیوں پر چمکتے سنہری کلس، سفید اونچے مینار اور سبز گ[نبد] یاد آتے۔ جن میں اٹھتی اذانوں کی آوازیں صبح کے نیم اندھیروں اور شام کے جھٹپٹوں... کا حصہ [تھیں] اور کتنی مانوس لگتی تھیں۔

''یہاں سب کچھ ہے مگر یہاں بہت کچھ کم ہے۔'' زوئی حسین اکثر بے کل ہو کر سوچتی اور پاکستان [...]

آئی ای میلز کھول کر بیٹھ جاتی۔ اس کے کولیگز، اس کی اِکّا دُکّا پاکستانی دوست اسے اکثر مختصر میلز بھیجتی تھیں اور اس کی خیریت معلوم کرنے کے ساتھ اسے دعاؤں کا تحفہ بھی بھجواتی تھیں۔ وہ ان مختصر میلز کو بار بار پڑھنے کے بعد نادر مراد کی بھیجی میلز کھولتی جو گنتی میں بہت کم تھیں بہ مشکل تین چار مگر ان میلز میں اس کے لیے امید کا پیغام ہوتا تھا۔ جلد اچھی خبر ملنے کی نوید ہوتی تھی اور عنقریب اس سے دوبارہ ملاقات کے ساتھ ساتھ اس سے بحیثیت شریکِ زندگی ملاقات کی بے چینی بھی تحریر ہوتی تھی۔ زوئی حسین کے لیے نادر کی یہ ای میلز اثاثۂ حیات ثابت ہوتی تھیں۔

طویل ہوتے انتظار اور امید و بیم میں ڈولتے انہی دنوں میں وہ ایک مختلف دن تھا۔ جب اسے اپنے موبائل فون پر نادر کا ایک ٹیکسٹ میسج وصول ہوا تھا۔

''وقت ملتے ہی فوراً اسکائپ پر آؤ۔'' اس پیغام کے اندر کیا چُھپا تھا۔ کوئی خوش خبری یا پھر مایوسی اور یا پھر مزید انتظار کا جانکاہ پیغام...... اس دوپہر جب اس کا شہر شدید برف باری کی زد میں تھا وہ ڈولتے دل کے ساتھ ایک نیٹ کیفے پہنچی تھی۔ نادر کو اسکائپ پر کال کرنے سے پہلے وہ دل میں یقین کر چکی تھی کہ نادر اس وقت اسے مل بھی سکے گا یا نہیں۔ اس کی توقع کے مطابق نادر چند سیکنڈز میں ہی اس کے سامنے ایل سی ڈی مانیٹر اسکرین پر موجود تھا۔

''السلام علیکم!'' اتنے دنوں بعد ایک مانوس شکل کو سامنے دیکھ کر یقیناً اس کے لہجے میں مسرت کی کھنک گونجی ہوگی اور اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک نظر آئی ہوگی۔

''وعلیکم...'' جواب میں اسے نادر کا لہجہ خشک، کُھردرا اور نہ جانے کیوں تحقیر آمیز سا لگا۔ اس نے اس کے سلام کا مکمل جواب کیوں نہیں دیا تھا۔ کیا اسے اس کے مسلمان ہونے پر شک ہونے لگا تھا۔ زوئی حسین نے لمحے کے ہزارویں حصے میں یہ باتیں سوچ لی تھیں۔

''تم کیسے ہو نادر؟ میں تمہیں بہت یاد کرتی ہوں۔'' لیکن پھر بھی اس نے اپنے دل میں اٹھتے وہم جھٹک کر خوش دلی سے پوچھا تھا۔

''میں نے تم پر اعتماد کیا تھا زوئی۔ اس لیے کہ میں تمہیں ایک نیک فطرت اور نیک نیّت انسان سمجھتا تھا۔'' جواب میں نادر نے اسی خشک اور کھردرے لہجے میں کہا۔ زوئی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے اسکرین کی طرف دیکھا۔ ''لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے ہاں غیر ملکیوں اور غیر مذہب کے پیروکاروں کے بارے میں جو بھی سوچا جاتا ہے بالکل ٹھیک سوچا جاتا ہے۔'' نادر کیا کہہ رہا تھا زوئی کے پلّے اب بھی کچھ نہیں پڑا تھا اگرچہ وہ اس کے الفاظ سن سکتی تھی اور سمجھ سکتی تھی۔

''پورے پاکستان میں تمہیں میں ہی ملا تھا اُلّو بنانے کے لیے؟'' اس کے لہجے میں اب غصہ اور رنج اتر آیا تھا۔ ''جبکہ تم جانتی بھی تھیں کہ میرے حالات کتنے پیچیدہ اور میری اپنے گھر میں حیثیت کتنی مشکل ہے۔''

زوئی نے حیرت اور بے یقینی کی انتہا پر پہنچتے ہوئے اپنی محسوس نہ ہونے والی سیاہ پلکیں تیزی سے جھپکائیں۔

''خود تو تم اڑ کر مزے سے اپنے ملک کی آزاد فضاؤں میں پہنچ گئیں اور یہاں تمہارے کرتوتوں کی سزا تو میں ہی بھگتوں گا ناں!'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''اپنی اس حماقت کے سبب جو تم سے ہمدردی کرنے کی خاطر میں کر بیٹھا ہوں۔''

زوئی یقیناً ششدر تھی جب ہی الفاظ اس کے منہ سے نکل ہی نہیں پا رہے تھے۔

''ہاں بھئی، تمہارا کیا جاتا ہے، چاہے میں عمر بھر پاکستانی جیلوں کی ہوا کھاتا، سڑتا رہوں۔ مجھ تک نہ کو... اپنے کی رسائی ہو نہ ہی کسی کو کچھ خبر ہو کہ میں ہوں کہاں...... زندہ بھی ہوں یا مر گیا ہوں۔'' وہ منہ بنا... نروٹھوں کی طرح بولے چلا جا رہا تھا۔

''نادر!'' زوئی نے بہ مشکل لفظ اپنے منہ سے ادا کیا تھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میں کچھ سمجھ نہیں پا رہ...'' اسے لگا جیسے قوتِ گویائی چھن جانے کے بعد وہ پہلی دفعہ بولنے کے قابل ہوئی ہو۔ اس کے الفاظ رک... رک کر منہ سے ادا ہوئے تھے اور انہیں ادا کرتے ہوئے اسے اپنا تالو کھنچا سا محسوس ہوا تھا۔

''معصوم اور انجان بننے سے کیا ہوگا زوئی جبکہ تمہارا پورے کا پورا منصوبہ مکمل طور پر عیاں ہو چکا ہے...'' نادر کا لہجہ کڑوا ہو گیا۔ زوئی کو اس کے چہرے پر اپنے لیے نفرت بلکہ شدید نفرت کا رنگ نظر آیا۔

''نادر پلیز ایسے مت دیکھو مجھے۔'' زوئی نے بے چینی سے کہا۔

''میں یہاں بیٹھا تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا زوئی۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ بھی سچ ہے کہ حماقت میری ہے۔ سزا بھی مجھے ملنی چاہیے۔ میں نے ایک بار بھی رک کر یہ کیوں نہیں سوچا کہ آج کے دور میں جبکہ پاکستانی لڑکیاں بھی مجھ ایسے ایوریج لڑکے سے شادی کرنے میں متامل ہو سکتی ہیں تم جہانِ اول کے ایک انتہائی ترقی یافتہ ملک کی اجنبی لڑکی ایک پاکستانی لڑکے اور وہ بھی مجھ ایسے ایوریج پاکستانی لڑکے سے شادی کرنے پر کیوں مُصر تھیں۔''

''ایک منٹ رکو نادر۔'' اب کے زوئی کو احساس ہوا کہ کہیں کچھ بہت زیادہ غلط ہو چکا تھا اسی لیے وہ شاک، حیرت اور بے یقینی کی کیفیت سے فوری طور پر نکلتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تفصیل سے بتاؤ ہوا کیا ہے، میرے حوالے سے ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو تم اتنا غصے میں ہو؟''

''ہونہہ۔'' وہ ایک بے بسی سے تمسخر کے ساتھ ہنسا۔ ''جیسے تم جانتی نہیں ہو کہ جو جرم تم نے کیا اے... نکاح نامے کے ایک کاغذ کے ساتھ میرے متھے لگا کر تم آزاد اور فرار ہو گئیں۔''

''تم کس جرم کی بات کر رہے ہو؟'' زوئی کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

''کس جرم؟'' جواب میں وہ بھڑک کر بولا۔ ''اب نہ جانے تم کتنے جرم کر کے یہاں سے فرار ہوئی ہو جو تمہیں یہ بھی یاد نہیں آ رہا کہ کس جرم کی بات کر رہا ہوں میں۔''

زوئی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی سیٹ پر پہلو بدلا اور اس کیفے میں موجود باقی لوگوں پر نظر ڈالی جن میں سے کئی اِدھر اُدھر کھڑے بیٹھے ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے اور کچھ اسی کی طرح مانیٹر اسکرین پر نظریں جمائے اسکرین کے اس پار بیٹھے کسی اپنے سے گفتگو میں مشغول تھے۔ اسے لگا وہاں موجود ہر چہرے پر اطمینان تھا، سکون اور بشاشت تھی۔ سب خوشگواری سے ہنس بول رہے تھے۔ سوائے اس کے جس کے چہرے پر یقیناً گھبراہٹ اور پریشانی تھی اور جس کا دل دھڑ دھڑ دھڑک رہا تھا۔

''نادر تم ایسا کرو کچھ دیر کے لیے اپنا غصہ بُھلا کر مجھے یہ بتا دو ہُوا کیا ہے۔ اس کے بعد بھلے جتنا مرضی غصہ کرتے رہنا۔'' زوئی نے بے چینی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''اگرچہ مجھے یقین ہے کہ تم سب جانتے ہوئے بھی انجان بن رہی ہو۔'' نادر نے یوں سر جھٹکنے کے بعد کہا جیسے اسے زوئی کی نرم گوئی پر مزید غصہ آ رہا ہو۔ ''لیکن پھر بھی سنو، میں اس قصے کی بات کر رہا ہوں جس

کے مطابق تم شاید سن دو ہزار پانچ کے زلزلے میں رضاکارانہ طور پر زلزلہ زدہ علاقوں میں گئیں اور وہاں سے نہ جانے کتنی معصوم، بے سہارا، لاوارث، زخمی اور خوب صورت لڑکیوں کو اغوا کرنے والے گروہ کا حصہ بن کر ایسے ایسے سیاہ کارنامے انجام دیتی رہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔''

''اوہ میرے خدا!'' زوئی نے بے اختیار اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''استغفار توبہ استغفار۔''

''مت اتنی پارسا اور بھولی بننے کی کوشش کرو زوئی۔'' نادر نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں نہیں جانتا تھا میں تو اندازہ تک نہ کر پایا کہ تمہارا تعلق کسی ایسے گروہ سے تھا۔''

''کیا تمہارے پاس وہ شخص آیا تھا جو کئی ماہ پہلے میرے پاس بھی آیا تھا جس کے بارے میں، میں نے تمہیں کہا تھا کہ نیکی کرنے کی سزا ملنا کیسا ہوتا ہے۔'' زوئی نے سر جھٹک کر خود کو سنجیدگی سے بات کرنے کے قابل بناتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو تم اس گھناؤنے جرم کو نیکی قرار دیتی ہو؟'' نادر کے لہجے میں مزید نفرت جھلکی۔

''نہیں، میں اپنی اس نیک نیتی کو نیکی قرار دیتی ہوں نادر جس کے تحت میں نے وہاں سے اغوا کیے جانے والی ایک لڑکی کو اغواکاروں کے چُنگل سے بچانے کے لیے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی تھی۔ اس لڑکی کو لے کر میں کہاں کہاں بھٹکی کدھر، کدھر چُھپی یہ ایک لمبی داستان ہے۔'' زوئی نے پہلی بار پُرسکون لہجے میں کہا۔

''واہ اور اس لمبی کوشش کے بعد تمہارے ہاتھوں ہی وہ لڑکی ایسی غائب ہوئی کہ آج تک اس کا سراغ نہیں ملا؟'' نادر نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے۔'' زوئی نے پوری سچائی سے نادر کی طرف دیکھا۔ ''ہم سیالکوٹ شہر کے قریب ایک گاؤں تک پہنچ گئے تھے کیونکہ اس لڑکی نے مجھے بتایا تھا کہ سیالکوٹ شہر میں اس کی دادی کی کوئی سہیلی رہتی تھیں۔ وہ اغواکار شکاری کُتوں کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ہم سیالکوٹ شہر کا راستہ پوچھتے، پوچھتے نہ جانے کہاں بھٹک گئے اور اسی راستہ کھونے کے دوران انہوں نے چلتی ویگن رکوا کر اسے شام کے وقت دوبارہ اٹھا لیا۔ میں ویگن سے اتر کر ان کے پیچھے بھاگی مگر انہوں نے میرے ٹخنے پر گولی مار کر مجھے زخمی کر دیا۔ میرے دائیں ٹخنے پر زخم کا نشان اس بات کا گواہ ہے۔ مجھے شوکت صاحب نام کے ایک شخص نے وہاں سے اٹھایا اور اسپتال پہنچایا انہی شوکت صاحب نے سارا قصہ سن کر مجھے مشورہ دیا کہ میں اس واقعے کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤں اور کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کروں۔''

''خوب اچھی کہانی گھڑی ہے تم نے۔'' نادر نے اس کی بات سے ذرہ برابر بھی متاثر نہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ یہ کیس کس برانچ میں ہے آج کل؟ اور جن کے پاس ہے وہ بات کی کھال کیسے اتارتے ہیں؟''

''میں سچ کہہ رہی ہوں نادر اور میں نے اس شخص کو بھی جو میرے فلیٹ پر آیا تھا یہی روداد سنائی تھی۔'' زوئی نے تیقن سے کہا۔ ''تم سوچو ان کے پاس ثبوت ہوتا تو کیا وہ مجھے اس وقت سے یہاں آنے تک آزاد چھوڑتے۔ کیا میرا نام ان لوگوں میں شامل نہ ہو جاتا جنہیں ان حالات میں پاکستان کی حدود چھوڑنے کی اجازت نہیں ہوتی؟''

''وہ سائے کی طرح ہی تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے زوئی۔ جب ہی تو انہیں اس نکاح کی بھی خبر ہے جو اپنے تئیں ہم نے خوب خفیہ انداز میں کیا تھا۔'' نادر اس کی بات کو سچ سمجھنے میں متامل تھا۔

''تو پھر مجھے ائر پورٹ پر ہی کیوں نہ آن دبوچا انہوں نے؟'' زوئی نے سوال کیا۔ ''میرا تو یہ خیال تھا کہ اگر کوئی غلط فہمی تھی بھی تو اس معمول کی کارروائی کے بعد ختم ہو چکی ہوگی۔ میں جانتی ہوتی کہ بات اتنی گمبھیر ہے تو کیا میں تم سے نکاح کرنے کی خواہش کرتی؟'' زوئی نے کہا۔

''تم یہ باتیں اتنی آسانی سے اس لیے بتا رہی ہو زوئی... کیونکہ تم ان کی پہنچ سے باہر اور محفوظ ہو۔''

''مجھے باتیں بنانے کی کیا ضرورت ہے نادر! میں تو محفوظ ہوں اور ان کی پہنچ سے باہر ہوں۔ تمہارے سامنے صفائی دینے کی بھی مجھے کیا ضرورت ہے؟ تم اتنی دور میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے ہو۔'' زوئی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''میں یہ صفائی صرف اس لیے دے رہی ہوں نادر کہ مجھے تمہاری پروا ہے اور اس وقت مجھے اتنی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے صرف یہ سوچ کر کہ میری وجہ سے تم اتنی پریشانی میں ہو۔'' پہلی بار نادر اس کی بات کے جواب میں کچھ بولنے کے بجائے خاموش رہا۔

''تم صرف اتنا کرو نادر کہ میرے پیپرز جلد از جلد بنوا کر بھیج دو۔ مجھے پاکستان آنے دو، میں اس سارے قصے کا سامنا خود کروں گی اور تمہیں اس مسئلے سے نکالنے کے لیے مجھے عمر بھر بھی وہاں کی جیل میں سڑنا پڑے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔'' زوئی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ جواب میں نادر نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا تھا اور اسے زوئی کے چہرے پر سچائی اور عزم نظر آیا تھا۔

☆☆☆

سارا دن بنیش بے چینی سے اس انتظار میں رہی کہ دانیال سے ملاقات ہونے پر وہ اسے اس لڑکی کی تصویر دکھا سکے جو اس نئے سیاست دان کی داشتہ کے طور پر سامنے آئی تھی مگر اس روز اس کی اوپر تلے کلاسز تھیں اور سب کی سب اتنی اہم تھیں کہ ان میں سے ایک بھی چھوڑی نہیں جا سکتی تھی۔ کلاسز کے بعد باہر آنے، لائبریری اور کیفے ٹیریا کے چکر لگا لینے کے بعد جب اسے دانیال کہیں نظر نہیں آیا تو وہ مایوس ہو کر بالائی منزل کی طرف جاتی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

''اس نے کہا تھا وہ کیفے ٹیریا میں میرا انتظار کر رہا ہوگا۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''لیکن وہ تو کہیں بھی نہیں ہے۔''

''ثمرین کے سب کلاس میٹس ثمرین کی طرف سے دیے گئے لنچ میں شرکت کرنے گئے ہیں۔ آج ثمرین کا برتھ ڈے ہے ناں!'' جب ہی اس کی کلاس فیلو نے گزرتے گزرتے اسے بتایا۔ ''جبھی کیفے ٹیریا خالی خالی لگ رہا ہے آج۔ یہ سینئرز، افوہ بھئی ہر طرف انہی کا قبضہ رہتا ہے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''اوہ، جبھی وہ کہیں نہیں ہے۔'' بنیش نے اپنی کلائی میں پڑے کڑے کو گھماتے ہوئے سوچا۔ ''لیکن اس نے کہا تھا کہ وہ کیفے ٹیریا میں میرا انتظار کر رہا ہوگا۔'' اس نے ایک بار پھر خود کو یاد دلایا۔ ''لیکن میرا انتظار ثمرین کے لنچ سے زیادہ اہم تو نہیں ہو سکتا ناں۔'' یہ بات اسے خود کو یاد دلانی نہیں پڑی تھی۔ یہ بات اسے خود سے یاد آگئی تھی۔ ''آخر کو وہ ہمیشہ سے اچھے دوست ہیں اور کلاس فیلوز بھی۔'' اور ایسا سوچتے ہوئے اس کے دل میں کوئی ملال نہیں تھا۔

☆☆☆

عافیہ کے انداز میں اتنی گھبراہٹ اور بے کلی تھی کہ ان کا بڑا بیٹا عاصم ان کی حالت دیکھ کر پل بھر کو بری طرح گھبرا گیا تھا۔

''ممی آپ ٹھیک تو ہیں؟'' اس نے انہیں دونوں بازوؤں سے تھامتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں اس کی

ماں نے اس کی طرف نیم مُندی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ ائر کنڈیشنڈ لابی میں اچھی خاصی خنکی ہونے کے باوجود ان کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور بال بھی پسینے کی نمی کی وجہ سے بیٹھے ہوئے تھے۔ دانیال کی حالت پہلے دن سے دیکھنے کے بعد وہ روز بروز کمزور تو ہو ہی رہی تھیں مگر جو حالت ان کی اس وقت تھی وہ عاصم کے لیے بالکل نئی تھی۔

''ممی شاید overwhelmed ہوگئی ہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''دانیال کی حالت میں غیر متوقع امپرومنٹ کی خبر سن کر وہ خوشی کے مارے حواس کھو رہی ہیں یا پھر شاید ان کا بی پی ایک دم لو ہو رہا ہے۔'' اس نے عافیہ کو ویٹنگ روم میں بٹھانے کے بعد ایمرجنسی ڈیوٹی روم کا رخ کیا۔

''کم آن مسز جہانگیر، آپ ایک بہادر خاتون ہیں۔'' ڈاکٹر نے ان کا بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد کہا تھا۔ یہاں موجود تقریباً تمام ڈاکٹرز اب تک ان سے زیادہ یا کم کسی نہ کسی حد تک واقف ہو چکے تھے۔ ''آپ میں پچویشنز کو فائٹ کرنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں پھر آپ کی یہ حالت کم از کم میرے لیے تو ناقابلِ فہم ہے۔'' ڈاکٹر نے ان کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے میڈیکل سائنس کے کرشموں کے بارے میں سنا ہوگا۔'' کچھ دیر بعد جب عاصم انہیں مزید چیک اپ کے لیے ایک سینئر ڈاکٹر کے پاس لے آیا تو اس سینئر ڈاکٹر نے شاید ان کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر بات کی۔

''آپ نے پہلے شاید سنا ہو اب آپ دیکھیں اور عمر بھر دیکھتی رہیے گا۔ دانیال میڈیکل کے کرشموں میں سے ایک کرشمے کے مانند آپ کی آنکھوں کے سامنے زندگی گزارے گا۔'' وہ کہہ رہے تھے۔

''انسان عمر بھر فزکس کے کرشمے دیکھتا رہتا ہے ڈاکٹر صاحب۔'' عافیہ نے ہاتھ میں پکڑے جوس کے ٹن سے دو گھونٹ جوس پینے کے بعد بدقّت کہا۔ ''میں نے ابھی کچھ دیر پہلے یہاں اسپتال پہنچنے سے پہلے میٹافزکس کا ایک کرشمہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو قطار باندھ کر بہنے لگے۔ ''اور اس کرشمے کو دیکھنے کے بعد مجھے آپ کی میڈیکل سائنس سے دانیال کی صحت مندی کی کوئی یقین دہانی، کوئی ضمانت نہیں چاہیے۔ اب مجھے اس بات کا قوی یقین ہے کہ دانیال نہ صرف واپس زندگی کی طرف آئے گا بلکہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر ایک بھرپور دوڑتی بھاگتی زندگی بھی گزارے گا۔''

''اچھا!'' ڈاکٹر نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم آپ کو یہ یقین نہیں دلا سکے تو پھر آپ کو یہ یقین کس نے دلایا؟''

''صوفی صاحب نے۔'' عافیہ نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''صوفی صاحب نے بیگم اکرام اللہ کے خواب میں یہ اشارہ دیا کہ دانیال ٹھیک ہو جائے گا۔ بالکل ٹھیک اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے دنیا سے چلے جانے کی پیش گوئی بھی کی۔'' عافیہ نے ڈاکٹر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا جو اُن کی طرف دیکھتے ہوئے یوں مسکرا رہا تھا جیسے کسی مجذوب کی بڑ سن رہا ہو۔

''اور آپ کو معلوم ہے ڈاکٹر صاحب، صوفی صاحب کا آج صبح فجر کی اذان کے وقت وصال ہوگیا۔'' عافیہ کو ڈاکٹر کی مسکراہٹ پر غصہ آنے لگا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا مسز جہانگیر۔'' ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے یقین نہ کرنے پر معاف کر دیجیے گا کہ میرے سامنے جدید ترین صدی کی ایک اچھی خاصی پڑھی لکھی خاتون بیٹھی ہیں اور ایک حادثاتی

صدمے سے گزرنے کے بعد وہ پیرانارمل ایکٹویٹیز اور سپر نیچرل قوتوں پر یقین کرنے لگی ہیں۔''

''آپ میری بات کو چیلنج مت کیجیے ڈاکٹر صاحب۔'' عافیہ کو ڈاکٹر کے انداز پر غصہ آنے لگا۔ ''جو میں نے دیکھا ہے، جو میں نے دانیال کے حادثے کے بعد محسوس کیا ہے، جس چیز نے مجھے اس حادثے کے بعد اس کا سامنا کرنے، اپنے بیٹے کی حالت کو برداشت کرنے اور اس وقت تک پہنچنے میں مدد دی ہے کہ میرا بیٹا ایک دن نہ صرف اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا بلکہ ایک دوڑتی بھاگتی بھرپور زندگی گزارنے لگے گا اسے پیرانارمل ایکٹویٹی کا حصہ اور سپر نیچرل مخلوقات پر یقین ہو جانا قرار دے کر اس کی توہین کر رہے ہیں آپ۔''

''پھر آپ کے اس مفروضے کو اور کیا نام دیا جائے؟'' ڈاکٹر نے اپنے شانے اچکاتے ہوئے ان کی عقل پر مزید ماتم کیا۔

''یہ سب جو میں کہہ رہی ہوں ڈاکٹر صاحب، یہ ایک سپریم طاقت پر مکمل یقین کا نتیجہ ہے۔'' عافیہ نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ ''اللہ ہے اور اللہ کے وہ بندے ہیں جن کی عمریں اس کی رضا کے حصول میں ریاضت کرتے گزر جاتی ہیں۔'' ان کی آواز جذبات میں کانپنے لگی تھی۔ ''اس حادثے نے مجھے زندگی میں ایک بار اپنے اللہ سے رجوع کرنے کا موقع دیا اور اللہ کے ان بندوں کی صحبت میں بیٹھنے کا بھی اور میرا یقین، میرا ایمان روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا اور آج کا واقعہ تو عقل کے اندھوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ میری کیا مجال جو اتنی واضح نشانی کو جھٹلاؤں۔'' وہ شدّتِ جذبات سے رونے لگیں۔

''آئی ایم سوری مسز جہانگیر۔ شاید میں آپ کے جذبات کو نادانستگی میں ہرٹ کر گیا۔'' ڈاکٹر ان کی حالت پر گھبرا کر بولا۔ ''آپ کا یقین اپنی جگہ درست سہی، میں اسے جھٹلانے کی جرأت ہرگز نہیں کر سکتا لیکن کیا دانیال کی صحت کی بحالی میں آپ ہمارے پیشے.... کو ایک فیصد نمبر بھی نہیں دیں گی؟''

''میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا۔'' عافیہ نے عاصم کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ جو اس نے ان کی حالت کے پیشِ نظر گھبرا کر تھام لیا تھا۔ ''اللہ تعالیٰ نے دانیال کی زندگی اور زندگی سے بھرپور زندگی لکھی ہے تو اس کے لیے وسیلہ یقیناً آپ لوگ اور آپ کا پیشہ ہی ہے۔ میں نے یہ دعویٰ تو نہیں کیا کہ صوفی صاحب کے ایک اشارے کے بعد مجھے اس کی زندگی اور بحالیِ صحت کا جو یقین ہو چلا ہے اس پر میں اسے آپ کے پیشنٹ بیڈ سے اٹھا کر تمام لائف سیونگ مشینز اور ادویات سے ہٹا کر گھر لے جاؤں اور وہاں بیٹھ کر اس کی زندگی کی طرف واپسی کا انتظار کروں گی۔ یقیناً دوا میں شفا ہے مگر دعا کے عنصر کو جھٹلانا آپ کی غلطی ہوگی۔'' انہوں نے خود کو کمپوزڈ کرتے ہوئے گہری سانس لی۔

''Mummy is just getting emotional۔'' عاصم نے ڈاکٹر کی طرف معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ ان کی حالت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ ایک بُرے جذباتی دورے سے گزر رہی ہیں۔''

''یقیناً۔'' ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ ''میرے اسٹاف نے انہیں سکون آور دوا کھلا دی ہے۔ مجھے امید ہے کہ چند گھنٹوں میں ان کے اعصاب سکون پزیر ہو جائیں گے۔'' عاصم، عافیہ کو ان کی چیئر سے اٹھا کر بازو کے گھیرے میں لیے دانیال کے کمرے کی طرف چلا تھا۔

''میں شاید تم سب کو کبھی یقین نہ دلا پاؤں کہ میں کس تجربے سے گزر رہی ہوں۔'' عاصم کے ساتھ

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے عافیہ سوچ رہی تھیں۔ رہ رہ کران کی نظروں کے سامنے صوفی صاحب کا ابھر رہا تھا۔ ’’کتنے پُرسکون رہتے تھے وہ، کتنے خوش امید، کتنا تحمل اور حوصلہ تھا ان میں۔‘‘ وہ سوچ رہی تھیں۔

’’میں نے شاید زندگی میں اتنا صاف، اتنا پاکیزہ اور روشن چہرہ کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔‘‘ دانیال کے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوکر انہوں نے سوچا اور دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوگئیں۔ پیشنٹ بیڈ تھا، وہی وینٹی لیٹر، وہ دل اور خون کی رفتار جانچنے والی ٹک ٹک کرتی مشین، وہی مریضوں والا سبز لباس پہنے لمبا چوڑا جوان وجود، وہی اسپتال کا مستعد اور فرض شناس عملہ جو معمول کے چیک اپ میں مصروف تھا۔ عافیہ کو دیکھ کر دماغ کے امراض کا ماہر ڈاکٹر مسکرایا اور دانیال سے قدرے فاصلے پر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

’’دیکھیے مسٹر دانیال آپ کی مدر آپ کو دیکھنے آئی ہیں۔‘‘ عافیہ تیزی سے چند قدم آگے بڑھیں۔ ڈاکٹر کی آواز کی لینتھ وصول کرتے ہوئے دانیال نے اپنی بائیں آنکھ کھول کر چھت کی طرف دیکھا تھا۔

’’آپ نے دیکھا مسز جہانگیر معجزہ ظہور پزیر ہونے کے آغاز میں ہے۔‘‘ ڈاکٹر نے عافیہ کی طرف دیکھ کر خوشگوار انداز میں کہا تھا۔

’’عافیہ بیٹی کو بھی میری طرف سے مبارک باد دے دیجیے گا اور اس سے کہیے گا میں خود اسے مبارک باد پیش کرسکوں گا کیونکہ میری فلائٹ کا وقت ہوگیا ہے۔‘‘ الفاظ ایک بار پھر عافیہ کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔

☆☆☆

’’اماں عرف امراؤ بیگم اس معمول سے بیزار ہیں۔‘‘ زرنگار نے کمرے میں جلنے والی خوابیدہ سی فینسی لائٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’کس معمول سے؟‘‘ اس کے سامنے بیٹھے مہرزاد نے جو کتنی ہی دیر سے اسے محویت سے دیکھے چلا جارہا تھا چونکتے ہوئے پوچھا۔

’’اسی معمول سے جس میں ان کے بقول میں صرف آپ کی راتوں کی ساتھی بن کر رہ گئی ہوں۔‘‘ زرنگار کو لگا راتوں کی ساتھی کی تشبیہہ سے خود کو منسوب کرنا ایک کاٹ دار عمل تھا جو اس نے انجام دیا تھا۔

’’ایک بات بتاؤ گی؟‘‘ مہرزاد نے ایک لمبی سانس لینے کے بعد اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

’’کیا؟‘‘ نرم اور آرام دہ صوفے پر چڑھے ہوئے نفیس کپڑے کے ڈیزائن پر انگلی پھیرتے ہوئے زرنگار نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

’’امراؤ بیگم جیسی خاتون کو اماں کہنا تمہیں کیسا لگتا ہے؟‘‘ سوال تیکھا اور انداز ٹٹولنے کا سا تھا۔ زرنگار نے نظر اٹھا کر مہرزاد کی طرف دیکھا۔

’’ویسا ہی جیسا ایک مشینی روبوٹ کو کوئی بھی کام کرتے ہوئے لگتا ہوگا۔‘‘

’’مشینی روبوٹ کی بات چھوڑو۔ اس کے کوئی محسوسات نہیں ہوتے۔‘‘ مہرزاد نے صوفے سے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

’’میرے اور اس کے محسوسات میں کوئی فرق نہیں۔‘‘ زرنگار نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ’’ہم دونوں ہی خود کو دی گئی کمانڈز کی تقلید کرنے کے پابند ہیں۔‘‘

’’تمہیں پتا ہے مجھے کتابی باتیں کچھ زیادہ پسند نہیں، مجھے عملی گفتگو زیادہ اچھی لگتی ہے۔‘‘ مہرزاد زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔

’’اور میرا المیہ یہ ہے کہ میں نے کتابوں کے صفحوں میں گم رہتے ہوئے ایک عمر گزار دی، جب ان صفحوں سے نکال کر باہر پھینکی گئی تو پتا چلا کتابیں تو طاق میں رکھی جاچکی ہیں اور ان کے صفحات پر لکھی باتیں کالعدم قرار دی جاچکی ہیں۔‘‘

’’چلو امراؤ بیگم کو اماں کہنے والی بات رہنے دیتے ہیں۔‘‘ مہرزاد نے بیڈ پر رکھے تکیوں کو بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹکا کر اُن سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ اب وہ اس بیڈ پر نیم دراز ہوچکا تھا۔

’’کہانیاں سننا اور کہانیاں سنانا طے ہوا تھا، سوال کرنا اور جواب لینا تو نہیں۔‘‘ زرنگار نے جتانے کے سے انداز میں کہا۔

’’یہاں تم ایک غلطی کر گئیں۔‘‘ مہرزاد محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ’’بلیک اینڈ وائٹ میں لانا چاہیے تھا اس معاہدے کو۔‘‘

’’گویا آپ اس سے روگردانی کرنے والے ہیں۔ اس کی نہ لکھی گئی شقوں کی خلاف ورزی کا ارادہ ہے؟‘‘ زرنگار نے پوری آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

’’ارادہ تو نہیں تھا، تم نے خوب دھیان دلایا۔‘‘ وہ مزید محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

’’آپ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔‘‘ زرنگار کے لہجے میں تیقّن اترا۔

’’اتنا یقین؟‘‘ مہرزاد نے اس کی طرف دیکھا۔

’’جی اتنا ہی یقین۔‘‘

’’اچھا یہ تو بتاؤ کہ بھلا میں تم سے ملاقات کے لیے اتنا تردّد کیوں کرتا ہوں؟‘‘ مہرزاد کو زرنگار کے تیقّن پر دل میں عجیب سی خوشی محسوس ہوئی اور اسی خوشی کے عالم میں اس نے اس سے یہ سوال پوچھا تھا۔

’’کیونکہ آپ کو بدصورتی میں چھپی خوب صورتی دیکھنے کا شوق ہے۔ خاموشی کی زبان سمجھنا اچھا لگتا ہے اور کیچڑ میں کھلے خاردار جھاڑیوں میں اُگے پھول تک رسائی حاصل کرنے کی خواہش ہے۔‘‘ زرنگار نے رسان سے کہا۔

’’بہت اچھے۔‘‘ مہرزاد نے داد دینے کے سے انداز میں تالی بجائی۔ ’’ذہانت تمہارے در کی لونڈی ہے غالباً۔‘‘

’’اور آپ اس لونڈی کے در کے غلام ہیں یقیناً۔‘‘ برجستہ جواب آیا۔ مہرزاد نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ سے اپنے چہرے پر سجی ڈاڑھی کے بالوں کو سہلانے لگا۔

’’اچھا مزید سوالوں کے جواب نہ سہی اتنا ہی بتادو کہ کیا تمہیں بھی امراؤ بیگم کی طرح اس معمول سے بیزاری ہونے لگی ہے؟‘‘ پھر اس نے پوچھا۔

’’کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہوگا؟‘‘

’’شاید نہیں۔‘‘ مہرزاد نے کہا۔ ’’لیکن اگر تمہیں یہ بیزاری نہیں ہے تو اس کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی؟‘‘

’’سادہ سی وجہ ہے۔‘‘ زرنگار نے ہاتھ میں پکڑے اسمارٹ فون کی اسکرین پر انگلی چلاتے ہوئے کہا۔ ’’میں اس معمول میں محفوظ ہوں۔‘‘

’’اور میں تمہیں اس سے بھی زیادہ محفوظ بنانا چاہتا ہوں۔‘‘ مہرزاد نے فوری جواب دیا۔ ’’کیا ایسا نہیں

ہوسکتا کہ ہم دونوں اپنے، اپنے پتے ایک مرتبہ میز پر رکھ دیں؟"

"آپ کے پاس تو پتے ہیں سردار صاحب، آپ رکھیے اور ضرور رکھیے۔ میں تو خالی ہوں۔" خلافِ توقع جواب آیا۔

"مت بھولو زرنگار کہ میں نے تم سے یہ کہا کہ میں تمہیں اور بھی زیادہ محفوظ بنانا چاہتا ہوں، محفوظ کہ تم کہیں بھی اس تہمت سے بھی بچ جاؤ کہ تم سردار مہرزاد خان کی داشتہ ہو۔" مہرزاد نے دیکھا کے ان الفاظ کو سن کر وہ غیر ارادی طور پر سمٹ کر پرے ہوگئی اگرچہ ان دونوں کے درمیان چند گز کا فا پہلے سے ہی تھا۔

"ایک چھت کے نیچے ایک دوسرے کے ساتھ رات کیسے گزرتی ہے۔ اس کا گواہ ہم دونوں کے عا صرف خدا ہے۔" مہرزاد نے اسے حقیقت سے روشناس کروانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے عا کوئی بھی تیسرا جو ہماری ایک چھت کے نیچے موجودگی کو جانتا ہے وہ یہ کبھی نہیں مانے گا کہ ہم اکٹھے ہیں ا حالتِ گناہ میں نہیں ہیں۔"

زرنگار نے اس کی بات سنتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔ مہرزاد نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے اشارہ کیا۔

"اور۔" اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارا اسٹیٹس نہیں ہے۔"

زرنگار نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ چلو اپنے 'اپنے کارڈز ایک دوسرے کو دکھا دیتے ہیں۔ کہانیاں کہنے ا کہانیاں سننے کے لیے تو ایک عمر پڑی ہے۔" مہرزاد نے سر ہلا کر اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس کون سے ایسے کارڈز ہیں جو میں نے چھپا کر رکھے ہوں اور انہیں ظاہر کرنے میں مجھ تامّل ہوگا۔" زرنگار کے چہرے پر دکھ نے رقص کیا۔ "میرا تو سب کچھ یہیں ایکسپوزڈ ہے، نظروں کے سامنے ہے۔ امراؤ بیگم سے میرا تعلق ہی میرا اعریاں تعارف کروانے کے لیے کافی ہے۔ ڈھکے چھپے کا کیا سوال باقی ہوسکتا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" مہرزاد نے تحمل بھرے لہجے میں کہا۔ "تم پر یہ اسٹیٹس بجتا نہیں، تم یہ تعارف ڈیزرو نہیں کرتیں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ اگر تم اکیلے ایسا نہیں کرسکتیں تو میری انگلی پکڑ لو۔ آؤ ہم دونوں مل کر تمہاری کھوج لگائیں اور جہاں بھی تمہارا کوئی سرا ملے وہاں سے پکڑ کر تمہیں ڈھونڈ کر لے آئیں۔ مجھے امراؤ بیگم کے ساتھ تمہارا نام جُڑا ایک سیکنڈ کے لیے بھی گوارا نہیں۔"

"یوں ہی باتوں سے اور صرف باتوں سے نہ تو کسی کی کھوج لگائی جاسکتی ہے نہ ہی کوئی تلاش کامیاب ہوتی ہے۔ ماضی کے دفینے جہاں ہیں وہاں رہنے دیے جائیں تو بہتر ہوتا ہے۔ اکھاڑ پچھاڑ کر کے بھی اگر مٹی میں خاک ہوئی شبیہوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

"الفاظ، الفاظ، الفاظ۔" مہرزاد نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "بڑے بڑے لفظ بولنے کے لیے بھی ایک عمر پڑی ہے۔ جی بھر کے بولتی رہنا لیکن فی الحال جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ ماضی کے دفینوں سے ہم خاک میں خاک ہوئی مورتوں کے بجائے زندہ، جیتی جاگتی اس لڑکی کو باہر نکالیں گے جو حادثاتی طور پر امراؤ بیگم کی اسٹیٹ میں آگئی۔"

"لیکن آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟" زرنگار نے چونک کر مہرزاد کی طرف دیکھا۔
"بہتر ہوتا اگر تم اس کے بجائے یہ سوال کرتیں کہ آپ ایسا کیونکر کر پائیں گے؟" مہرزاد نے پُرسکون انداز میں کہا۔
"عمل سے پہلے وجہ کا بیان ضروری ہے۔ کاوش اپنی جگہ کاوش کیوں کی جارہی ہے اس کا بھی تو پتا چلے۔" زرنگار نے کہا۔
"وجہ میں نے پہلے ہی بتادی۔ میں چاہتا ہوں تم اس اسٹیٹس کے ساتھ زندگی گزارو جو تمہیں بجتا ہے۔ امراؤ بیگم تک تم اپنے شوق سے تو پہنچی نہیں...... نہ میں اس بات پر یقین کرسکتا ہوں کہ امراؤ بیگم سے تمہارا کوئی رشتہ ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ ہم تمہاری کھوج لگائیں اور تمہیں اس پس منظر میں واپس لے جائیں جس کے پیش نظر میں کھڑی تم اجنبی نہ لگو۔"
"جانے دیں سردار صاحب۔" زرنگار نے سر ہلایا۔ "آپ کی پوزیشن بڑی نازک ہے۔ آپ کی تاک میں لوگ نہیں شکاری کُتّے لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی ایک، ایک حرکت مانیٹر کی جاتی ہے اور معمول سے ہٹ کر کسی بھی حرکت کو اخباروں کی بڑی خبر اور ٹیلی ویژن پر چلنے والی بریکنگ نیوز بننے میں کوئی وقت نہیں لگتا۔ میں نہیں چاہوں گی کہ آپ میری وجہ سے کسی ایسے جال میں پھنس جائیں جسے کترنے کے لیے دوستوں میں، اپنوں میں کوئی چوہا میسر نہ ہو۔"
"میں نے امراؤ بیگم سے ایک ہزار راتوں کا معاہدہ کیا تھا۔ ایک ہزار راتوں کے ساتھ کم و بیش اتنے ہی دن بھی جُڑے ہوں گے۔ میرا خیال تھا کہ اتنے دن واپسی کے میرا مطلب ہے تمہاری واپسی کے لیے کافی ہوں گے۔"
"اور اگر اتنے دنوں میں یہ معمّا حل نہ ہوا تو آپ مایوس ہو کر واپس لوٹ جائیں گے؟" زرنگار نے سوالیہ انداز میں مہرزاد کی طرف دیکھا۔
"دیکھو زر۔" مہرزاد اس کا نام لیتے لیتے رک گیا۔ "آئی ایم سوری، میں تمہیں کبھی بھی اس نام سے پکارنا نہیں چاہوں گا جو تمہارا ہے ہی نہیں۔ ایسا نام جو غیروں کا دیا ہوا ہے اور جس سے ایک خاص قسم کا ماحول ٹپکتا ہے۔" زرنگار نے سر جھکا لیا شاید وہ انگشت بدنداں ہو چکی تھی۔
"میں بھی انسان ہوں۔" مہرزاد نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے اس ماحول، تنہائی اور دسترس کے باوجود میں جو اتنا کمپوزڈ رہتا ہوں، تم سے صرف گفتگو کر کے رخصت ہو جاتا ہوں تو کیا میں جذباتی طور پر اس مشینی روبوٹ کے مانند ہوں جس سے تم نے خود کو تشبیہ دی۔" زرنگار نے دیکھا مہرزاد کا سر جھکا ہوا تھا۔ جیسے ان لمحوں میں وہ دانستہ اس سے نظریں چرائے رکھنا چاہتا تھا۔
"نہیں۔" زرنگار کی طرف سے جواب نہ آنے پر وہ خود ہی سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں وہ روبوٹ نہیں ہوں، میں جذباتی طور پر بھی اتنا ہی انسان ہوں جتنا جسمانی اور ذہنی طور پر ہوں۔ ابلیس، شیطان مجھے بھی ویسے ہی ورغلاتا ہے جیسے میرے جیسے دوسرے انسانوں کو لیکن پتا نہیں کیا وجہ ہے کہ میں آدمیوں کے اس ہجوم کا حصہ نہیں بننا چاہتا جس نے تم جیسی لڑکی کو امراؤ بیگم جیسی عورت کے سر پر سجے تاج کا نگینہ بنا دیا۔" اس کی آواز نیچی ہوتی ہوتی ناقابلِ سماعت ہونے لگی پھر وہ گلا کھنکھار کر دوبارہ گویا ہوا۔
"ابھی تک تو یہ ہوتا ہے کہ تمہارا سامنا کرنے سے پہلے میں اپنے محسوسات و جذبات کو تھپکنے اور سلانے

کی کوشش سرِ شام ہی شروع کر دیتا ہوں۔ تمہارے سامنے بیٹھے ہوئے میں خود کو یاد کراتا رہتا ہوں کہ میرے سامنے حُسن کا مرقع کم عمر لڑکی نہیں۔ ایک پوتر عورت بیٹھی ہے جس کے متعلق کوئی بھی شیطانی سوچ مجھے جہنم میں دھکیل دینے کے لیے کافی ہوگی اور یقین جانو مجھے جہنم کی لپلپاتی آگ سے بہت ڈر لگتا ہے کیونکہ جتنی ریسرچ میں نے اس پر کی ہے شاید ہی کسی اور موضوع پر کی ہو۔'' اپنی بات مکمل کر کے اس نے ایک نظر زرنگار پر ڈالی جو دم بخود بیٹھی اس کی بات سن رہی تھی۔

''میرے جیسی بدنصیب لڑکیاں تو بہت سی ہیں۔ یہاں وہاں ایک نہیں کتنی ہی امراؤ بیگمیں ایسی بدنصیب لڑکیوں کو اپنی شاطرانہ آغوش میں لیے بیٹھی ہیں پھر آپ کی یہ نظرِ کرم صرف مجھ پر ہی کیوں سردار صاحب؟'' مہرزاد نے سنا زرنگار کہہ رہی تھی۔

''میں ایک انسان ہوں، کُل انسانیت کا صیغۂ واحد ایک انسان اور مجھے اتنا ہی کام کرنا ہے جتنا میری قسمت میں لکھا ہے۔ میری قسمت کہ میرا واسطہ فی الحال صرف تم سے پڑا ہے اور تمہارے پیچھے مجھے وہ پس منظر نظر آتا ہے جو تم جیسی لڑکی کا ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے تمہارے ساتھ کوئی ایسی دعا ہو جو میرے دل میں آیا کہ اس لڑکی کو اس گرداب سے نکالنا ہے ورنہ میرے جیسے شخص کی بے نیازی اور سرد مہری کی تو شاید لوگ مثالیں دیتے ہوں۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ میرا خمیر کس ماحول سے اٹھا ہے۔'' مہرزاد نے وضاحت کی۔

''اسی لیے میں کہتا ہوں کہ وقت ضائع کیے بغیر میرا ساتھ دو اور اپنے کارڈز میز پر رکھ دو۔'' زرنگار کو اپنی طرف ششدر رہتے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''مجھے اپنے اندر باہر، دائیں بائیں، آگے پیچھے پھرتے ترغیب دیتے شیطان سے ڈر لگتا ہے۔ اس کا لایا کمزور لمحہ تو کسی پر بھی آسکتا ہے۔'' مہرزاد کی بات سن کر زرنگار نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

''کیا یہ وہ فرشتہ تھا جسے وہ اکثر اپنے خواب میں دیکھتی تھی۔ کیا وہ اس دعا کا جواب تھا جو وہ ہر رات سونے سے پہلے کرتی تھی۔ الم اور حرماں نصیبی سے چند گھنٹوں کے لیے دور لے جانے والا نجات دہندہ۔ کیا یہ واقعی اس اسیری سے رہائی دلانے والا مہم جُو ثابت ہونے والا تھا۔'' اس نے سوچا اور یقین کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن آپ کی پوزیشن بہت نازک ہے۔'' خیال سے حقیقت کا سفر لمحوں میں طے کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''آپ الیکشن میں جانے والے ہیں، آپ کی الیکشن کمپین اپنے عروج پر ہے۔ اس سیاسی سفر کے آغاز پر آپ کسی بھی ایسی خبر کا حصہ بننے کا رِسک مت لیجیے گا سردار صاحب جو آپ کو کارزارِ سیاست سے ہمیشہ کے لیے نکال باہر کرے۔''

''یہ تمہارا دردِ سر نہیں ہونا چاہیے۔'' مہرزاد نے ایک بار پھر اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''اتفاق سے یا شاید بدقسمتی سے ہی اس ملک کی سیاست کا حصہ دار ہوں جس کی تاریخ سیاست دانوں کے شرمناک اسکینڈلز سے بھری پڑی ہے۔ جس کی تاریخ جتنی زیادہ شرم ناک ہے اس کا سیاسی قد اتنا ہی اونچا ہے۔'' وہ تمسخر اُڑانے کے سے انداز میں ہنسا۔ ''کیا تم نے کبھی اس ملک کی ہسٹری میں جنسی اسکینڈل پر کسی سیاست داں کو سیاست سے دست بردار ہوتے سنا ہے؟'' اس نے سوالیہ انداز میں زرنگار کو دیکھا۔ ''جنسی اسکینڈل آخری حد ہوتی ہے اسکینڈلز کی۔'' اس نے جتایا۔ ''یہاں کے سیاست دانوں کا نظامِ انہضام اتنا مضبوط ہے کہ وہ اس کو بھی ہضم کر جاتے ہیں۔''

''گویا آپ بھی اپنے نظامِ انہضام کو مضبوط بنانے کی پریکٹس کر رہے ہیں۔'' زرنگار نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' اس نے فوری جواب دیا۔ ''اول تو ایسا کوئی اسکینڈل سطح پر آئے گا ہی نہیں۔ آیا بھی بالفرض تو مجھے تو......'' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''مجھے تو اس دامِ سیاست سے نجات کا کوئی بہانہ چاہیے۔ میں فوراً غلطی تسلیم کرتے ہوئے سیاست سے دست بردار ہو جاؤں گا کیونکہ میرے اندر کوئی گِلٹ نہیں ہوگا۔ اسکینڈلز تو بنتے ہی رہیں گے۔ اسکینڈلز حقائق کے خلاف بنیں تو انسان کے اندر کوئی گِلٹ تو نہیں ہوتا ناں۔''

''آپ کو اپنے الفاظ کا یقین ہے کیا؟'' زرنگار نے اس کی بات سننے کے بعد کہا۔

''خود اپنے زندہ ہونے سے بھی زیادہ۔'' جواب آیا تھا۔

''چلو آج رات تو خیر ختم ہونے والی ہے۔ باوجود نہ چاہنے کے کہانیاں اور الفاظ کہہ لیے اور خوب کہہ لیے۔ جواب میں الفاظ سن لیے اگرچہ کم سنے۔'' کھڑکی پر برابر ہوتے دبیز پردوں کے پیچھے سے آتی ہوئی سحر کی پہلی، پہلی کرن پردوں سے سر ٹکرانے لگی تھی اور اس کوشش میں کبھی کبھار اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ اس کرن کی کسی ایسی ہی کمزور کوشش کی کامیابی پر نظر پڑتے ہی مہرزاد نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''میں اب چلتا ہوں۔ تم سے جو گفتگو ہوئی اسے ایک بار ذہن میں ریوائز کرنا اور اگر دل کو لگے تو اسی نمبر سے ٹیکسٹ کر دینا جو تمہیں دیا گیا تھا۔'' آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بالوں میں انگلیاں چلا کر انہیں ٹھیک کرتے ہوئے اس نے کہا۔ زرنگار نے دیکھا ایک پوری رات گزارنے کے باوجود اس کے سفید شلوار قمیص پر صرف نیم درازی اور ایک آدھ بار پہلو بدلنے کی شکنیں تھیں۔ اس کے سیاہ سینڈلز اب بھی اس کے پاؤں میں تھے اور ان کے فیتے بند تھے۔

''کیا یہ تارک ہے یا پھر فرشتہ؟'' الفاظ اس کے ذہن کی سلیٹ پر ابھرے تھے۔

''آپ کی پریس سیکریٹری کو آپ کے کیریئر میں ایک سیاہ دھبّا دکھائی دیتی ہوں غالباً۔'' شکوے کی شکل میں الفاظ بے اختیار اس کے منہ سے پھسلے۔

''یہ اس کے خلوص کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے زرنگار کی طرف گھوما۔ ''اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ جو وہ ایک بڑی مدد ثابت ہوتی ہے اکثر۔''

''ہوسکتا ہے۔'' زرنگار کے دل میں ایک عجیب سی بے وقت ٹیس اٹھی۔ ''لیکن بہتر ہوگا آپ مجھ سے براہِ راست رابطہ کیا کریں۔ لوگوں کو واسطہ نہ ہی بنائیں تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''جیسے تم کہو۔'' مہرزاد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر احتراماً جھکتے ہوئے کہا۔ ''میں اب چلوں گا تمہارا ڈرائیور تمہیں واپس پہنچا دے گا۔'' اس نے اپنا والٹ اور فون میز پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' زرنگار نے اٹھ کر کھڑکی پر پڑے پردے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''جگہ کوئی بھی ہو تم فکر مت کرنا محفوظ ہی ہوگی۔'' اس نے یقین دلاتے ہوئے کہا اور خدا حافظ کہتا کمرے سے چلا گیا۔ زرنگار نے اس کے چلے جانے کے بعد مڑ کر کمرے پر نظر ڈالی۔

''ایسے تعلقات کے بارے میں جو دنیا کی نظر میں اس کے اور میرے درمیان ہے اور جس کی وجہ سے وہ میرے ساتھ ایک ہزار راتیں گزارنے کی قیمت پیشگی ادا کر سکتا ہے۔ انہی راتوں میں سے ایک رات گزارنے کے بعد جو حالات ان کمروں کے ادیبوں نے اپنی، اپنی تحریروں میں لکھے ہیں جو اس رات کے

گزرنے کے بعد ہوتے ہیں، کیا یہ کمرا ایسی کسی رات کی گزری داستان سنا رہا ہے؟“ اس نے سوچا اور بے اختیار مسکرا دی۔

”شاید کوئی جہاندیدہ، تجربہ کار انسان اس کمرے کو دیکھ کر کبھی یقین نہ کرے کہ اس میں کوئی ایسی رات گزری ہے۔“ اس نے ایک سرد آہ بھری اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اسے اپنے بال سنوارنے تھے جو اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں تھے اور اپنا ظاہری حسن سنوارنے کے لیے سرخی غازہ تازہ کرنا تھا۔

☆☆☆

”تم دراصل ذہنی کشمکش کا شکار ہو رہے ہو۔“ نگین نے حمزہ سے کہا جو منہ لٹکائے اس کے گھر کے لاؤنج میں بیٹھا تھا۔

”لیکن تمہیں ضرورت کیا ہے خود کو خواہ مخواہ کی خلش میں مبتلا کرنے کی۔“ اس نے حمزہ کا شانہ ہلایا۔ ”ذہن کو یکسو کر لو یا تو ماماز بوائے بن جاؤ یا گڈ اولڈ گرینیز چائلڈ۔ تم کیا دونوں انتہاؤں کے درمیان پھنسے جان ہلکان کیے دے رہے ہو۔“

”تمہارا مسئلہ یہ ہے نگین کہ تم بولتی ہو اور بہت زیادہ بولتی ہو۔“ حمزہ نے سر ہلا کر کہا۔ ”اور معاملے کی سنجیدگی کو سمجھے بغیر بولے چلی جاتی ہو۔“

”ہاں، میں تو ایسی ہی ہوں۔“ اس نے سادگی سے اعتراف کیا۔ ”میں سمجھتی ہوں کہ انسان اپنی جان ہلکان کرنے کے بجائے مسئلے کا جو آسان ترین حل ہے وہ سوچ لے...... خود کو بھی آسانی میں رکھے اور دوسروں کو بھی۔“

”تمہارے لیے ایسا کرنا آسان ہو شاید۔“ حمزہ نے کہا۔ ”جب ہی تم اپنی ایسی جلاد صفت ساس کے ساتھ بھی خوش رہتی ہو۔“

”ہاں تو میں کیا کوئی بھی اب اس عمر میں ان کی عادتیں اور مزاج تو بدلنے سے رہا اس لیے دیواروں سے سر پھوڑنے کے بجائے دل ہی دل میں ان کی ہر بات کا جواب دیتی جاتی ہوں۔ میرا ردِعمل بھی نکل جاتا ہے اور میں بری بھی نہیں بنتی۔“ نگین نے بے نیازی سے کہا۔

”لیکن میں ایسا نہیں ہوں۔“ حمزہ نے مایوسی سے کہا۔ ”جتنا میں خود سے عہد کرتا ہوں کہ ممی کو خود سے مایوس نہیں کروں گا جیسا وہ چاہتی ہیں ویسا ہی بن جاؤں گا! تنا ہی میرا دل میلوں دور بھاگ جانے کو چاہتا ہے۔ تم سمجھتی کیوں نہیں کہ میں کتنی مشکل صورتِ حال سے دوچار ہوں۔“

”ہوں۔“ نگین قدرے سنجیدہ ہوئی۔ ”اور اوپر سے تم نے اس لڑکی میرال کی گمشدگی کو سر پر سوار کر رکھا ہے۔“

”وہ ایک علیحدہ ایشو ہے، اسے اس بات سے مت ملاؤ۔“ حمزہ نے کہا۔

”کیسے نہ ملاؤں؟“ نگین نے تیزی سے کہا۔ ”تمہاری الجھن کا تعلق اسی ایشو سے ہی تو ہے۔ میرال نام کی لڑکی کے بارے میں تمہارا کنسرن بی اماں کی وجہ سے ہے اور بی اماں سے تمہاری ممی کا نظریاتی ٹکراؤ...... حمزہ تم اپنی الجھنوں کے سرے اگر خود ڈھونڈنے اور سلجھانے لگو تو تمہیں خود ہی بہت ساری باتیں سمجھ میں آنے لگیں گی لیکن تمہارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ بجائے سلجھانے کے تم ان سے نظریں چراتے ہو اور خود کو یہ سمجھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہو کہ آئندہ سے ممی کو خود سے مایوس نہیں کرنا۔“

”اُفوہ لڑکی، تم کتنے ظالمانہ تجزیے کرتی ہو چیزوں کے۔“ حمزہ نے نگین کی صاف گوئی سے گھبرا کر کہا۔

”میں حقیقت پسند ہوں۔“ وہ یکایک بے نیاز ہوتے ہوئے بولی۔ ”اور میں تو پھر ایسی ہی ہوں۔“

”اچھا بابا۔“ حمزہ کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ ”لو میں تمہارے سامنے حاضر ہوں۔ کر لو جتنے تجزیے کرنے ہیں میری شخصیت اور مسائل کے...... ایک ہی بار کر لو لیکن خدارا مجھے کوئی کلیو تو نکال دو کہ حل کیا ہے۔“

”حل تو بڑا سادہ اور آسان سا ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”جو میں نے اس گفتگو کے شروع میں تمہیں بتایا ہے۔ اپنے لیے ایک فیصلہ کر کے یکسو ہو جاؤ۔ ماماز بوائے یا گڈ اولڈ گرینیز چائلڈ......!“

”کیا تم مانو گی کہ میں ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں بن پا رہا۔“ حمزہ نے بے بسی سے کہا۔ ”بی اماں رہیں نہیں لیکن ان کی تربیت کے حصار سے میں نکل نہیں پاتا۔ ممی موجود ہیں اور میرے سامنے ہوتی ہیں لیکن جیسا وہ چاہتی ہیں میں ویسا بن نہیں پاتا۔“

”پھر کوئی درمیانی راستہ نکال لو۔“ نگین نے کہا۔ ”لیکن اس کے لیے تمہیں تھوڑی مشکل سے گزرنا ہوگا۔ صرف تھوڑے دن کی مشکل پھر تم عادی ہو جاؤ گے۔“ گویا اس نے بہترین حل پیش کیا۔

”تم جانتی ہو ممی میرا رشتہ کسی رانیہ سے طے کرنا چاہتی ہیں۔“

”اور تم بی اماں کی تربیت کے زیرِ اثر میرال نامی لڑکی کو ڈھونڈ کر اپنے نکاح میں لینا چاہتے ہو۔“ نگین کا جواب اتنا فوری اور قابلِ غور تھا کہ وہ حیران رہ گیا۔

”یہ تم سے کس...... نے کہہ دیا؟“ وہ بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکا۔

”تمہاری بے چینی اور تمہارے اضطراب نے...... تمہارے اس رویّے نے جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ تمہیں اپنی ممی کی من منشا شخصیت بن جانے کا صرف ایک بار ارادہ ہی کرنا تھا اور تم ویسے بن جاتے کیونکہ کسی کا دل نہ توڑنے کی نصیحت بھی بی اماں ہی تمہیں کر گئی ہیں۔ تم خواہ خود پر جبر کر کے ہی سہی مگر ایسا کر بھی جاتے اگر یہ میرال والا قصہ درمیان میں نہ ہوتا۔“ نگین سانس لینے کو رکی اور اس کی بات بغور سنتے سنتے حمزہ نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”تم نے میرال کی گمشدگی کو دل سے لگا کر اس کی تلاش کو اپنا فریضہ مان لیا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اس کے سلسلے میں بھی بی اماں تمہیں کوئی نصیحت کر گئی ہیں یا نہیں لیکن کچھ ایسا ہے ضرور جو تم اتنا ہاتھ دھو کر اس کی تلاش کے پیچھے پڑ چکے ہو۔“ نگین نے کہا۔ ”مجھے اشعر نے بتایا تھا کہ اس سلسلے میں تم چند خفیہ ہاتھوں کی طرف بھی مدد کے لیے رجوع کر چکے ہو گویا تمہارے لیے یہ تلاش ایک انتہائی سنجیدہ مسئلہ ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بالفرض میرال تمہاری کاوشوں کے نتیجے میں مل بھی جاتی ہے تو تم اس کا کیا کرو گے، واپس اسے کہاں سیٹل کرو گے یقیناً تمہارے ذہن میں اس صورتِ حال کا کوئی خاکہ موجود ہے اور میرے خیال میں یہ خاکہ تمہارے اور تمہاری ممی کے درمیان پانی پت کا میدان بننے کے لیے کافی ثابت ہوگا۔ دراصل یہی ایک نکتہ ہے میرے عزیز بھائی جو تمہیں آج کل الجھن میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔“ نگین نے بہت سی بڑی بڑی باتیں انتہائی آسانی سے کہہ دیں۔

”اُدھڑ گئے میری ذات کے سارے بخیے یا ابھی کوئی ٹانکا باقی ہے؟“ حمزہ نے اس تجزیے کے نشتر اپنے دل و دماغ پر چلتے محسوس کرتے ہوئے کہا۔

ڈپریشن کیا ہے؟ اور اس کا علاج

1۔ میرا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا......

2۔ دل چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ جنگل کی طرف نکل جاؤں......

3۔ دل چاہتا ہے اپنے آپ کو ختم کرلوں......

4۔ میرا بس چلے تو سامنے والے کا گلا ہی دبا دوں......

5۔ میرے ساتھ ہی یہ سب مسئلے کیوں ہوتے ہیں، دوسرے لوگ کتنے آرام سے زندگی گزار رہے ہیں۔

یہ یا اسی طرح کے اور جملے ہم اور آپ یقیناً کبھی نہ کبھی اپنی زبان سے ادا کر ہی ڈالتے ہیں اور ارد گرد سے بھی متواتر سنتے ہیں۔

ایسے ہی جملوں اور خیالات کی تکرار کسی انسان کو شدید ڈپریشن، مایوسی، قنوطیت اور غیر اطمینانی کیفیت میں بتدریج لے جاتی ہے اور لوگ اسے ذہنی و نفسیاتی بیماری کا نام دے کر اس کے علاج کی تگ و دو میں لگ جاتے ہیں۔

چند لوگ دماغی معالج کے پاس چلے جاتے ہیں اور چند نام نہاد روحانی معالج کے پاس اور اس سے بھی بڑھ کر چند ضعیف الاعتقاد جعلی پیروں، فقیروں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں...... ہم بحیثیت مسلمان قرآن پاک پر مکمل یقین رکھتے ہیں مگر صرف زبانی کلامی...... ہم اللہ تعالیٰ کے ارشادات کو تو ضرور مانتے ہیں یہی عقیدہ ہے مگر اللہ تعالیٰ کی نہیں مانتے ہم اس بات سے قطعی بے خبر ہیں یا یوں کہیے کہ مکمل غفلت کا شکار ہیں کہ گناہوں کی کثرت اور معصیت سے قربت انسان کو ذہنی مریض بنا دیتی ہے، یہی روحانی بیماری بتدریج ذہنی و جسمانی بیماری میں تبدیل ہو جاتی ہے اور انسان ڈپریشن کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے خودکشی جیسے حرام فعل کے قریب جا پہنچتا ہے۔ انسان کبھی مادی وسائل کو پانے کی انتھک جدوجہد میں ذہنی مریض بن جاتا ہے اور کبھی صرف ظاہری طور پر اچھا نظر آنے کی تگ و دو میں اصل سے دور ہو جاتا ہے۔ یہ روحانی بیماری کے ابتدائی مراحل ہیں۔ جب ہم روحانی بیماریوں میں مسلسل مبتلا رہتے ہیں ان کے علاج کی طرف توجہ نہیں دیتے تو نتیجتاً ہم جسمانی طور پر بیمار رہنے لگتے ہیں...... دروغ گوئی، چغل خوری، غیبت، حسد یہ سب روحانی بیماریاں ہیں اپنی ذرا سی تسکین کے لیے کسی کی حق تلفی کرنا اور دوسرے کی ناکامی پر دلی راحت محسوس کرنا یہ سب روحانی بیماریوں کی علامات ہیں...... اور جب ہم بدی کرتے ہیں تو ایک طرف احساسِ جرم (guilt) بڑھتا ہے اور دوسری طرف اس گلٹ پر قابو پانے کی سعی اور یہی کشمکش انسان کو ڈپریشن کی طرف لے جاتی ہے جب سب کچھ چھوڑ چھاڑ خود ترسی یعنی، خود کو مظلوم، بے چارہ، بے کس اور لاچار سمجھنا یا پھر اس قدر ہائیپر ہو جانا کہ دوسرے پر زبان و دست و پا سے حملے کرنا یعنی زیر کے سامنے زبر ہو جانا اور زبر کے سامنے خود ترسی کی کیفیت یا اپنے حقوق کی پامالی کا رونا کہ ہمارا حق چھین لیا گیا۔

ایسے مریض اختلاجِ قلب اور پھر خودکشی کا شکار ہو جاتے ہیں، ایک اچھا معالج اس کیفیت کی جڑوں کو اکھاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ڈپریشن دباتا نہیں بلکہ سرے سے مٹاتا ہے۔ ڈپریشن کی جڑیں احساسِ جرم سے جا ملتی ہیں ـــ روحانی معالج جو ایک ولی اللہ بھی ہو سکتا ہے اور ایک عالم باعمل بھی ہو سکتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کی ترغیب دلا کر قنوطیت (ڈپریشن) کے مریض کو ایک صحت مند انسان بنا سکتا ہے۔ منفی سوچیں اور خیالات کو ختم کر کے امید اور آس کی شمعیں جلا سکتا ہے مگر معالج کے اکیلے کی سعی مریض کو صحت یاب نہیں کر سکتی جب تک وہ خود اس کیفیت سے باہر آنے کی جدوجہد نہ کرے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا عقیدہ اور ایمان یہی ہونا چاہیے کہ بے شک ربِ کریم کا ذکر ہی دلوں کو اطمینان دیتا ہے۔

از: بنین عباس.... کراچی

''میں بھی بھی اتنی کھل کر بات نہ کرتی جو تم مجھے نہ کہتے۔'' اتنی بڑی بڑی باتیں سنا لینے کے بعد وہ انجان اور معصوم بن کر اپنی ہتھیلی پر آیا کبھی کا مندمل ہوا زخم سہلانے لگی۔

''چلو فرض کیا جو تم نے کہا وہی سچ ہے۔'' حمزہ کو اس کے انجان بن جانے پر غصے کے بجائے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ''پھر تم نے کسی بھی مسئلے کا کوئی ایک حل تو بتایا نہیں۔''

''پہلے تم مان تو لو کہ جو میں نے کہا وہ درست ہے۔ یہ فرض کیا، ورض کیا، کیا ہوتا ہے۔ بندے کی ٹون کو definite ہونا چاہیے... یا تو کچھ ہے یا پھر نہیں ہے۔'' وہ ساری کی ساری مروّت بالائے طاق رکھتے ہوئے بولی۔ جواب میں حمزہ نے اسے بی اماں اور میرال کی دادی کے درمیان ہونے والی خط کتابت کا قصہ سنایا۔

''اُف توبہ!'' یہ قصہ سننے کے بعد وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ''خطوط میں لکھے ایک غیر واضح اور ہلکے سے اشارے سے تم نے ایک نتیجہ فرض کر لیا اور اس فرض کی ہوئی بات کے پیچھے یوں خوار ہوئے جاتے ہو۔''

''خطوط میں نے بہت بعد میں پڑھے ہیں پاگل لڑکی۔'' حمزہ کو اس کے کانوں کو ہاتھ لگانے پر غصہ آ گیا۔ ''اس لڑکی کی تلاش میں نے صرف بی اماں کی سہیلی کی پوتی ہونے کی وجہ سے شروع کی تھی۔''

''چلو مان لیا ایسا ہی ہوا ہوگا مگر خطوط میں دیے اشارے نے کوششیں تیز کروا دیں۔ آفٹر آل وہ تمہاری غیر اعلانیہ ہی سہی بی اماں اور اس کی دادی کے درمیان ہونے والی کسی خاموش معاہدے کے تحت منگیتر ٹھہری۔'' نگین کے لہجے میں تمسخر تھا حمزہ کو یوں ہی محسوس ہوا تھا وہ مزید چڑ گیا۔

''تمہیں کچھ بتانا اور بات کرنا ہی فضول ہے۔'' وہ ناراض ہو کر بولا۔

''اس لیے کہ مجھ سے بات کر کے تم پھنس جاتے ہو۔'' وہ اس کی ناراضی سے حظ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''اچھا چلو میں سنجیدہ ہو جاتی ہوں اور سارے قصے کو کچھ یوں لائن اپ کرتے ہیں کہ میرال کی تلاش... بی اماں کی وجہ سے تم نے اپنی ذمے داری سمجھ لی پھر نیک نیتی پر مبنی تلاش شروع ہو گئی۔ اسی دوران تمہیں اتفاقاً بی اماں کے ارادے کی خبر ہو گئی اور تمہاری تلاش میں ذمے داری سے زیادہ عزت، بے عزتی کا عنصر شامل ہو گیا۔ آخر وہ ایک اَن آفیشل منگیتر تھی۔ اب مسئلہ صرف اتنا ہے کہ وہ ان آفیشل منگیتر بالفرض اگر مل بھی گئی کہیں سے اور تم سرخرو ہو گئے دونوں اولڈ لیڈیز کی روح کے سامنے تو پھر ممی کھڑا اگ کھڑا کر دیں گی۔ ایک تابعداری اور فرمانبرداری، دوسری تابعداری اور فرمانبرداری سے ٹکرا جائے گی۔ کیوں ہے ناں یہی بات؟'' نگین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تائید چاہی۔

''پتا نہیں۔'' وہ اسی الجھے ہوئے ناراض انداز میں بولا۔ ''لیکن یہ حقیقت ہے کہ کچھ ایسا ہے جو مجھے اس سوچ پر بے چین رکھتا ہے کہ وہ بے سہارا، مصیبت زدہ بلکہ آفت زدہ لڑکی آخر غائب کہاں ہو گئی؟''

''ممکن ہے وہ اپنی مرضی سے وہاں سے غائب ہوئی ہو۔'' نگین نے خیال ظاہر کیا۔

"وہ زخمی تھی اور اس بات کے تو وہاں موجود کئی لوگ گواہ ہیں اور وہ اس وقت اس حادثے اور حادثے کے بعد آپڑنے والی آفات کی وجہ سے اپنے حواسوں میں بھی نہیں تھی۔ اپنی مرضی سے فرار ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور......" حمزہ کی آواز نیچی ہوئی۔ "سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ اس اتنے بڑے انسانی المیے کے بعد ریسکیو ورک اور ری ہیبلیٹیشن کارروائیوں کے دوران کتنی ہی جوان، خوب صورت، بے آسرا، آفت زدہ لڑکیاں ان کیمپوں سے غائب ہو گئیں جن کا تا حال پتا نہیں چل سکا۔"

"آہ۔" نگین نے دکھ کے انتہائی گہرے احساس کے ساتھ کہا۔ "کیا انسان اتنا گھناؤنا اور بدکردار بھی ہوسکتا ہے؟"

"میں ان کہانیوں کو کسی کے سامنے بھی دُہرانا نہیں چاہتا جو میں نے وہاں سنیں کیونکہ وہ اتنی شرم ناک اور الم ناک ہیں کہ انہیں دُہرانے کے لیے زبان ساتھ نہیں دے پاتی مگر یہ سچ ہے کہ امدادی کارروائیوں کے دوران بہت سے ایسے گھناؤنے اور شرم ناک کام انجام دیے گئے ہیں جن کا تذکرہ تمہیں کسی اخبار، کسی کتاب، کسی رپورٹ میں نہیں ملے گا۔ امداد میں ملنے والی خوراک، دواؤں اور بستروں، کمبلوں کے خرد بُرد ہونے کی خبروں کے سوا تمہیں کوئی گھناؤنی کہانی کسی سطح پر نظر نہیں آئے گی لیکن انسانیت کی مدد کی آڑ میں چند کالی بھیڑوں نے جو کچھ کیا وہ سنو تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ سب سننے کے بعد شاید تمہیں اس لڑکی میرال کے سلسلے میں میرا کنسرن سمجھ آجائے۔ اس لڑکی کا تو اپنی دادی کے سوا کوئی دوسرا رشتہ ہی نہیں تھا دنیا میں... جو اس آفت میں موقع پر ہی ختم ہو گئیں سوچو اس کی تلاش میں اس کے پیچھے کون گیا ہوگا۔ نہ جانے کیا وجہ ہے جو خدا نے مجھے اس جستجو میں لگا دیا۔"

"میرے خدا!" نگین کی آواز دکھ اور خوف سے لرزنے لگی۔ "مجھے شاید انسانیت سے نفرت ہونے لگے مگر حمزہ۔" اس نے کوئی خیال آنے پر حمزہ کی طرف دیکھا۔ "خدا جانے وہ زندہ بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس حال میں ہے، میرا مطلب ہے......" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "وہ کسی قابلِ قبول صورت حال میں بھی ہے یا نہیں؟"

"وہ زندہ ہے، یہاں تک کہ کلیوز تو مجھے مل چکے ہیں مگر کس حال میں زندہ ہے یہ ابھی پتا لگانا ہے۔ میرے کچھ ذرائع میری پوری مدد کر رہے ہیں اور امید ہے کہ جلد یا بدیر میں اس تک پہنچ بھی جاؤں گا مگر قابلِ قبول سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" حمزہ نے کہا۔

"میرا جو مطلب ہے وہ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ تم کوئی بچے تو نہیں ہو۔" نگین نے کہا۔

"یہ سب تو بہت بعد میں کرنے اور سوچنے کی باتیں ہیں مگر ایک بات تو طے ہے کہ اگر وہ کہیں، کبھی مل گئی تو میں بی اماں اور میرال کی دادی کی بات نبھانے کو ذہنی طور پر ضرور تیار ہوں گا۔" حمزہ کے لہجے میں عجیب سی قطعیت تھی۔

"بالفرض، وہ ہی تمہاری ذہنی تیاری کو قبول کرنے سے انکار کر دے تو؟"

"تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہوگا کم از کم میں تو اس کیفیت سے نکل جاؤں گا جو مجھ پر طاری ہے۔" وہ بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔

"پھر ایشو تو وہی ہوا ناں تمہاری ممی والا۔ وہ تو تمہاری تلاش کے نتیجے کے انتظار میں چین سے نہیں

بیٹھیں گی، نہ ہی وہ تلاش کے ماحصل کو کبھی کسی صورت قبول کریں گی۔"

"یہی تو ساری الجھن ہے، بتاؤ کیا، کیا جائے؟"

"گھما پھرا کر بات وہیں آئی ناں جو میں نے شروع ہی میں کہہ دی تھی۔" نگین نے دونوں ہاتھ کمر پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ جواب میں حمزہ نے بے نیازی سے شانے اچکا دیے۔ "تم ایسا کرو اپنا ٹرانسفر کہیں اور کروا لو فی الوقت، نہ ممی کے سامنے ہو گے نہ کوئی اصرار ہوگا۔"

"نہیں کرا سکتا، یہاں سے چلا جاؤں تو اسے کیسے ڈھونڈوں گا؟" حمزہ نے کہا۔

"اچھا چلو پھر کوئی اور حل سوچتے ہیں۔" نگین نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ویسے یہ تو بتاؤ جب تم نے آخری بار اسے دیکھا تھا وہ کیسی تھی؟"

"بہت حسین اور بہت ذہین۔" حمزہ نے جواب دیا تھا۔

☆☆☆

صوفی صاحب کے وصال کی خبر برق رفتاری سے اندرون و بیرون ملک ان کے معتقدین اور ارادت مندوں تک پہنچی تھی۔ دانیال کی کھلی آنکھ میں زندگی کی چمک اور شناسائی کی رمق عافیہ کے لیے موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے والے وعدے پر بغیر کسی سوال کے مکمل ایمان لے آنے کے مترادف تھا۔ "جب اللہ پر ایک اَن دیکھے خدا پر دل سے ایمان لے آئیں تو اس کے ساتھ جُڑے تمام ارکان پر ایمان اس ایمان کا حصہ بن جاتا ہے لیکن جب معجزوں کو اپنی آنکھوں سے رونما ہوتے دیکھا جائے تو ایمان پختگی کی طرف نا قابلِ شکست اسٹیج کی طرف بڑھ جاتا ہے۔" سارا دن دانیال کے سرہانے بیٹھ کر اس کے جسم کی اگلی جنبش کے انتظار میں گزارتے ہوئے عافیہ نے بارہا یہ بات سوچی تھی۔

"شاید یہ صبر آزما اور طویل انتظار ہے۔" اس شام ان کے شوہر نے اسپتال آکر پورے دن کی روداد سننے کے بعد کہا تھا۔

"لیکن ہمیں کرنا ہوگا۔" انہوں نے اپنی بات مکمل کی۔

"جہانگیر......وہ صوفی صاحب......" عافیہ کی آواز گھٹنے لگی۔ جس بات پر صبح سے وہ نہ اپنے بیٹے عاصم نہ ہی کسی ڈاکٹر کو یقین دلا پائی تھیں وہی اپنی زندگی کے ساتھی کے سامنے بیان کرنے لگیں۔

"تم جو محسوس کر رہی ہو عافیہ وہ سو فی صد درست ہے۔" ان کے روشن خیال، لبرل، اعلیٰ تعلیم یافتہ شوہر نے ان کی توقع کے برعکس ان کی پوری بات سننے کے بعد کہا تھا۔ "ہم کل صوفی صاحب کے ہاں چلیں گے یقیناً وہ اللہ کے نیک بندے تھے، یقیناً اس کے مقربین میں سے تھے۔"

صوفی صاحب کے ہاں عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ ان کے کچھ خاص مقلدین بیرونِ ملک سے بھی فوری دستیاب پروازوں کے ذریعے پہنچ چکے تھے۔ عافیہ اور جہانگیر جس وقت صوفی صاحب کے ہاں پہنچے ان کا جنازہ قبرستان لے جانے کے لیے تیار رکھا تھا۔ عافیہ نے دیکھا اتنا بے شمار ہجوم ہونے کے باوجود وہاں موجود لوگوں میں حد سے زیادہ نظم و ضبط تھا۔ صوفی صاحب کا جنازہ ایک ہال نما کمرے کے وسط میں رکھا تھا اور عقیدت مند قطار بنائے ایک، ایک کر کے جنازے کا دیدار کرتے آگے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ نہ کوئی دھکم پیل نہ شور و غوغا۔

"کلمہ شریف پڑھتے رہیے، جن حاضرین کو سورۂ یٰسین زبانی یاد ہے وہ اس کی تلاوت زیرِ لب کرتے

رہیں۔" نہ جانے کس سمت سے لاؤڈ اسپیکر پر بار بار ایک آواز گونجتی۔ "عزیز بہنوں اور بیٹیوں سے درخواست ہے کہ بلند آواز میں رونے سے پرہیز کریں۔ انسان کی جان اللہ کی امانت ہے۔ ایک امانت اپنے مالک کو واپس پہنچی، مقامِ شکر کہ جان نے اپنے عبودیت کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔" دوسری آواز ابھری۔

"صوفی صاحب ہجوم پسند نہیں فرماتے تھے۔" عافیہ کو ڈرائیور کی بات یاد آئی۔ "اور ان کی شخصیت کا اثر ان کے بعد بھی کیسا باقی ہے۔" انہوں نے سوچا۔ "ہجوم تو ہے مگر ہجوم کی کیفیت نہیں ہے۔"

پھر کلمۂ شہادت کی آوازوں کے درمیان جنازہ اٹھایا گیا۔ جہانگیر جنازے کے ساتھ جانے والوں میں شامل ہو گئے۔ عافیہ اپنی نم آنکھوں کو ٹشو پیپر سے پونچھتی خواتین والے حصے میں پہنچ گئیں۔ یہاں بے شمار خواتین فرشی نشستوں پر یہاں وہاں بیٹھی تھیں۔ عافیہ کی نظر ایک کونے میں بیٹھی بیگم اکرام اللہ اور ان کی پوتی پر پڑی۔ وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھیں۔

"آپ کب پہنچیں؟" ان سے ملتے ہوئے عافیہ نے پوچھا۔

"ابھی پانچ بجے شام کے قریب۔" بیگم اکرام اللہ نے ان کے لیے اپنے قریب جگہ بنائی۔

"آپ نے دیکھا، آپ کو جو کچھ صوفی صاحب نے خواب میں کہا اس کا کیا مطلب تھا؟" عافیہ اپنے جذبات پر قابو نہ پاتے ہوئے بری طرح رو دیں۔

"اللہ والوں کے اسرار وہ جانیں یا اللہ جانے۔" بیگم اکرام اللہ نے آہ بھرتے ہوئے ان کی کمر تھپکی۔

"صوفی صاحب تو ہم جیسوں کے راہنما تھے آنٹی۔ اب ہم راہنمائی کہاں سے حاصل کریں گے۔" عافیہ نے کہا۔

"راہنما تو وہ عالمگیر کتاب ہے بیٹی جس میں زندگی کے ہر پہلو کے لیے راہنمائی درج ہے۔ صوفی صاحب خود کو محض وضاحت کرنے والا گردانتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے پڑھا، سمجھا اور سیکھا۔ اب مجھ پر فرض ہے کہ خلقِ خدا کو جہاں مشکل پیش آئے انہیں سمجھاؤں اور سکھاؤں۔" بیگم اکرام اللہ نے کہا۔ "تم نے دیکھا ہی تھا کہ وہ ہر اس شخص کے لیے حاضر ہوتے تھے جو اُن کی طرف رجوع کرتا تھا۔ اپنی شخصیت کی تشہیر، بلند و بانگ دعوے، اشاعتِ دین کو کاروبار بنانا انہیں سخت ناپسند تھا مگر دیکھ لو کسی تشہیر کے بغیر بھی اُن کی نیک نامی کی خوشبو کیسے چہار دانگ عالم پھیلی، کہاں کہاں سے لوگ آرہے ہیں اور ابھی مزید آتے رہیں گے۔ سب کی اپنی عقیدت ہے صوفی صاحب کے لیے۔ سب کا اپنا تعلق ہے۔"

"میں یہ سب پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔" عافیہ نے اعتراف کیا۔ "میرے لیے یہ سب نیا ہے لیکن میں بہت خوش قسمت ہوں جو صوفی صاحب جیسے بزرگ کے ساتھ میری چند نشستیں رہیں۔ میں ان کے بتائے ہوئے وظائف پڑھتی ہوں۔ ان کی گفتگو نے مجھے دانیال کے لیے ہمیشہ حوصلہ دلایا اور آج صبح والے اس خواب کے بارے میں تو آپ ہی جانتی ہیں۔ جاتے جاتے وہ مجھے کیسی خوش خبری دے گئے۔" وہ بری طرح رونے لگیں۔

"حوصلہ کرو بیٹی اور صبر و ہمت سے کام لو۔ میں نے کہا ناں اللہ والوں کے اسرار اللہ جانے یا اللہ والے جانیں۔ ہم بندے تو دیکھنے والوں، سوچنے والوں اور سمجھنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل ہیں۔" بیگم اکرام اللہ نے ایک بار پھر انہیں اپنے ساتھ لگالیا۔

"صوفی صاحب کا اشارہ بڑا واضح ہے۔ دانیال کی صحت یابی کی خوش خبری مبارک ہو عافیہ۔" کچھ دیر بعد بیگم اکرام اللہ نے جھک کر اُن کے کان میں سرگوشی کی۔ عافیہ کا دل بری طرح دھڑکا۔

"خود چلے گئے اور جاتے جاتے یہ نوید سنا گئے۔" انہوں نے نیچی آواز میں کہا۔

"صبر اور حوصلے سے انتظار کرو بس۔" بیگم اکرام اللہ نے جواب دیا۔ "یہ میری پوتی ہے اس سے بہت شفقت فرماتے تھے صوفی صاحب۔" پھر انہوں نے اپنی پوتی کی طرف اشارہ کیا۔ عافیہ نے سر اٹھا کر اس بچی کی طرف دیکھا۔ اٹھارہ، انیس سالہ وہ لڑکی شکل صورت میں انتہائی خوب صورت تھی۔ شاید نظر لگ جانے کی حد تک حسین۔ وہ سادہ کپڑوں میں ملبوس تھی۔ دیکھنے میں معصوم اور کم گو لگتی تھی۔ عافیہ کو یاد آیا پچھلی بار اس بچی سے ان کی ملاقات انتہائی پریشانی کے عالم میں ہوئی تھی لیکن اس وقت بھی وہ اس کے معصوم سے حسن کو نظر انداز نہیں کر پائی تھیں گو اس کے چلے جانے کے بعد وہ انہیں کبھی یاد نہیں آئی تھی لیکن اس روز انہیں ایسا لگ رہا تھا ایک بار اس پر نظر پڑنے کے بعد ان کی نظر اس کے چہرے سے ہٹنے سے انکاری ہو رہی تھی۔

"صوفی صاحب نے اسے بھی ایک بھرپور تسلی دی تھی ایک بار۔" بیگم اکرام اللہ نے عافیہ کو بتایا۔ "فرمانے لگے کبھی خود کو تنہا مت سمجھنا بیٹی، تمہارے ساتھ میری دعائیں ہر دم شاملِ حال رہیں گی اور یاد رکھنا دعا میں وہ ڈھال جیسی تاثیر ہے، ایک ایسی ڈھال جو سخت ترین وار سے بھی بچا لیتی ہے انسان کو اور یہ کہ ہم تو شاید یہ دیکھنے کے لیے دنیا میں نہیں ہوں گے مگر تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گی کہ یہ دعا کی ڈھال تمہیں کہاں کہاں اور کیسے، کیسے بچاتی ہے۔"

"یہ تو بہت بڑی بات ہے آنٹی۔" عافیہ نے چونک کر بیگم اکرام اللہ کو دیکھا۔

"ہاں بہت بڑی بات ہے۔" انہوں نے سر پر اپنی چادر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نے اس بات کا تذکرہ کبھی کسی سے نہیں کیا۔ تم واحد ہو اور پہلی ہو جسے یہ بات سنا رہی ہوں وہ بھی اس لیے کہ تمہیں یقین آجائے کہ صوفی صاحب کی بات میں ایسی تاثیر تھی کہ انسان خود کو رنج و فکر سے بے نیاز محسوس کرتا۔ یہ چیز اُن کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ جب سے صوفی صاحب نے اس بچی کو یہ تسلی دی ہے میں جو اس بن ماں باپ کی بچی کے بارے میں ہر دم فکر مند رہتی تھی۔ بے فکر اور بے غم ہو کر چین کی نیند سوتی ہوں۔"

"اللہ اسے ہمیشہ ہر طرح اپنی امان میں رکھے۔" عافیہ نے بیگم اکرام اللہ کی پوتی کی طرف دیکھتے ہوئے بے اختیار دعا کی۔

"لیکن عافیہ بیٹی میرا مشورہ ہے کہ خود کو ثابت قدم رکھنا۔ صوفی صاحب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن جو گداز تمہارے دل میں دانیال بیٹے کے اس حادثے نے اور صوفی صاحب کی راہنمائی نے پیدا کیا ہے کوشش کرنا وہ اپنی جگہ موجود رہے۔ دانیال بیٹے کی زندگی اور صحت یابی کی طرف سے مجھے تو کوئی شک نہیں رہا کیونکہ میں اپنی آنکھوں سے اسے اپنے پیروں پر چلتے پھرتے دیکھ چکی ہوں۔ یوں جیسے کبھی کوئی حادثہ اس کے ساتھ گزرا ہی نہ ہو۔"

"آپ کو شاید میں بتا نہ سکوں آنٹی کہ دانیال کے اس حادثے نے مجھے کیسی بے خبری سے نکالا ہے۔ آج میں یاد کرتی ہوں تو خود ہی خوف سے لرز جاتی ہوں کہ میں کیسی بے خبری میں، جہالت میں، اپنی ذات اور اسٹیٹس کے زعم میں مبتلا گناہ گاری اور غفلت کے کیچڑ میں گھٹنوں، گھٹنوں پھنسی عورت تھی۔ میرے اللہ کا مجھ پر

یہ کرم نہیں تو کیا ہے کہ اس نے مجھے اس غفلت کی نیند سے کیسا جھنجوڑ کر نکالا ہے۔ اللہ نہ کرے کہ جو میں کبھی اپنی پہلے والی حالت کی طرف لوٹوں۔'' عافیہ نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

''اللہ تمہیں ثابت قدم رکھے۔ بعض حادثے انسان کی زندگی میں آتے ہی زندگی کی جہتیں بدلنے کے لیے ہیں شاید۔'' بیگم اکرام اللہ نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

اس رات عافیہ، صوفی صاحب کے گھر سے رخصت ہوتے ہوئے بصد اصرار بیگم اکرام اللہ اور ان کی پوتی کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئی تھیں۔ صوفی صاحب کے سوئم، دسویں اور... اس کے بعد ایک اجتماعیہ دعا میں شرکت کرنے تک بیگم اکرام اللہ اور ان کی پوتی عافیہ کی مہمان رہیں اور اس دوران عافیہ اور ان کے گھر والے بیگم اکرام اللہ کے ساتھ یوں گھل مل چکے تھے جیسے ہمیشہ سے ساتھ ہی رہتے ہوں۔

☆☆☆

''ہاں اچھے لگتے ہیں جگنو، تتلیاں اور پھول، ستارے لیکن یار اس رومینٹسزم کی عمر بھی انسان کی ٹین ایج جتنی ہی ہونی چاہیے۔ ٹین ایج سے نکل کر بڑھتی عمر کی ذمے داریوں کے جگنو اور تتلیاں آنکھوں کے سامنے آکر ناچتی ہیں اور مسائل کے ستارے نظروں کو چندھیانے لگتے ہیں۔ اس عمر سے نکل کر بھی اس عمر کی فینٹسی میں رہنے والوں کو کم از کم میں تو ناقص العقل ہی کہوں گا۔'' فہد کی بات کڑوی تھی اور شاید ناقابلِ ہضم بھی۔ علینہ نے بہ مشکل اسے حلق سے اتارا۔

''بات سنو تم کچھ زیادہ ہی پریکٹیکل مائنڈڈ بلکہ materialistic (مادہ پرست) نہیں ہوگئے؟'' اس نے بہت کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''اچھا!'' وہ ہنسا۔ ''واقعی؟'' وہ اس کے تجزیے پر حیران تھا۔

''اور نہیں تو کیا۔'' علینہ کو اپنا منہ خود ہی پھولا ہوا لگ رہا تھا جبکہ اس کے سامنے کوئی آئینہ بھی نہیں تھا۔ ''یاد کرو تم ہی تو میری انگلی پکڑ کر سب سے پہلے اس فینٹسی ورلڈ میں لے کر گئے تھے۔'' اس نے جتاتے ہوئے کہا۔

''بالکل لے گیا ہوں گا مگر یہ کب کی بات ہے بھلا یاد کرو۔'' فہد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے۔'' علینہ نے اسی ناراض انداز میں جواب دیا۔ جواب میں فہد قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''پھول اور ستارے پیچھے رہ چکے ہیں۔''

''نہیں فہد۔'' علینہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ پیچھے نہیں رہے، وہ یہیں اسی دنیا میں اسی طرح موجود ہیں، ہمیشہ سے موجود تھے اور آنے والے وقتوں میں بھی موجود رہیں گے۔ صرف ہمارے مزاج، ہماری نظر بدل گئی ہے۔ بہت سارا وقت، بہت کم وقت کی ہولناک بند گلی میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ تم نے کبھی وہ نظم پڑھی ہے جس کا عنوان Leisure ہے۔

what is this life if full of love
we have no time to stand and stare
no time to stand beneath the boughs
and stare as long as sheep or cows

no time to see when woods we pass
where squirrels hide their nuts in grass"

فہد نے بھی جواب میں وہی نظم آگے بڑھائی۔

" no time to turn at beauty 's glance
and watch her feet how they can dance"

علینہ نے اگلی لائنز سنائیں

"a poor life this if full of care
we have no time to stand and stare"

فہد نے نظم کی آخری لائنیں یاد کیں۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں یاد ہے اور خوب یاد ہے۔'' علینہ بولی۔ ''اور تم جانتے ہو یہ کتنا بڑا انسانی المیہ ہے کہ حسنِ فطرت ہے اور اسے دیکھنے کے لیے انسان کے پاس وقت نہیں ہے۔''

''واہ بھئی تم تو بہت بڑی، بڑی باتیں بھی کرلیتی ہو۔'' فہد نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

''تو کیا تم میرا امتحان لے رہے تھے؟'' علینہ ایک بار پھر ناراض ہوگئی۔

''نہیں، یہ اتفاق سے ہوگیا اور اچھا ہوا کہ مجھے پتا چل گیا ورنہ تو میں تمہیں اب بھی شولڈر کٹ بالوں میں ننھی ننھی تتلیوں کی طرز پر بنی پنیں لگائے، چیک والی فراک پہنے اپنی اماں کی ہدایات پر جی جی کرنے والی بچی ہی سمجھ رہا تھا۔''

''اگر تم میرے سامنے ہوتے تو میں تمہیں قتل کردیتی یقیناً۔'' علینہ نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ میں اس وقت ماسٹرز کررہی ہوں۔''

''یاد ہے، یہ بھی یاد ہے اور اس سے بڑھ کر یہ بھی یاد ہے کہ تم یہ ماسٹرز کس کے اکسانے پر کررہی ہو۔'' فہد نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''تم مجھے ہمیشہ پوائنٹ ہی مارتے رہنا۔ شاید تمہیں یاد نہیں کہ چند ماہ پہلے تمہی تھے جس نے یہ بھی کہا تھا کہ مجھ سے محبت کرتے ہو، کتنے بے ایمان ہو تم۔ محبت کرنے کا دعویٰ کرنا تمہاری عادتِ ثانیہ لگتی ہے مجھے۔'' علینہ نے دانت پیسے۔

''ایسا کرو تم پورے آرام وسکون سے بیٹھ کر کبھی غور کرنا جو میں تم سے کرتا ہوں اسے محبت نہیں کہتے کیا؟'' فہد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی اس بات کے ساتھ ہی علینہ کا فون بند ہوگیا۔ اس نے فون کان سے ہٹا کر دیکھا فون کی بیٹری ختم ہوچکی تھی۔

''جو میں تم سے کرتا ہوں اسے محبت نہیں کہتے کیا۔'' علینہ نے فون سیٹ چارجر سے جوڑ کر میز پر رکھنے کے بعد کھلی کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فہد کی بات کو دل میں دہرایا اور آسمان پر بکھرے ستارے دیکھ کر مسکرادی۔

''سچ تو یہی ہے کہ جب سے تم واپس میری زندگی میں آئے ہو زندگی کے کئی رخ بدل سے گئے ہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''میلوں دور سے آتی تمہاری آواز اور تمہاری باتوں کا ہی تو کرشمہ ہے کہ پہلے زندگی میں جو یکسانیت تھی وہ کہیں دور جا چھپی ہے۔'' اس کے دل نے فہد کی بات کی تائید کی۔

"دنیا میں محبت کے ایک سو ایک رنگ ہیں اور ان میں سے ایک رنگ تو یقیناً ہمارا ہوتا ہے۔"اس نے کبھی کی کہیں پڑھی بات یاد کی۔

☆☆☆

وہ دور کہیں بلندیوں پر تھا۔ فضا میں سکوت تھا اور ہوا اس مشینی پرندے کو یکساں رفتار کے ساتھ اُڑائے لیے چلی جا رہی تھی۔ جس کا کنٹرول اس کے ہاتھ میں تھا۔ شوق بڑھتے...... بڑھتے جنون بن چکا تھا اور جنون وہ کر دکھانے کے عزم کو ہوا دے رہا تھا جو اسے مشینی پرندے اڑانے کی طرف لے آیا تھا۔ اس کی نظر عقاب کی سی صفت اختیار کر رہی تھی اور حسیات چیتے کی طرح برق رفتار ہو رہی تھیں۔ اس نے فضا میں اپنے اس مشینی پرندے کو ایک قلابازی سی کھلائی جس کا مکمل کنٹرول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے پیچھے دھوئیں کی لکیر نے یقیناً اس لڑکی کی سی شبیہہ پل بھر کو اختیار کی ہوگی جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

"ہا... ہا" وہ مسرت کے ایک بھرپور احساس کے تحت ہنسا تھا اور اپنے ذہن میں بیٹھی اگلی شبیہہ بنانے کی خاطر ایک لمبا چکر کاٹنے کے بعد پرندے کو ایک اور قلابازی دینے کے لیے اسے گھمایا اور اوپر کا حصہ نیچے کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش ہی میں اس کی نظر نے عقاب کی صفت گنوائی اور حسیات کو کچھوے کی رفتار سے الفت ہونے لگی۔ ابھی اسے اس مرد کی تصویر دھوئیں سے نکالنی تھی جو سگریٹ پی رہا تھا مگر پل کے پل میں وہ دھوئیں، تصویر، شوق، جنون اور عزم کی حدوں سے کہیں آگے نکل گیا تھا۔ ہر چیز پر اس کا کنٹرول ختم ہو رہا تھا، ایک بھیانک اندھیرا، ایک جامد خاموشی اسے اپنا مقدر بنتی نظر آنے لگی تھی۔ اس نے اس زمین پر شاید آخری آواز وہی سنی تھی جو اس کے مشینی پرندے کے زمین سے ٹکرانے پر پیدا ہوئی تھی اور آخری روشنی جو اس کے اردگرد آگ کی لپٹوں کی شکل میں اٹھ رہی تھی۔

وہ آخری منظر ایک منٹ کے نصف حصے کے اندر اس کے پردۂ ذہن پر ابھرا تھا اور اس نے ایک بے چین کیفیت کے تحت لرز کر اپنی دونوں آنکھیں ایک ساتھ کھولی تھیں۔ اس کی نظروں کے سامنے دھند سی چھائی ہوئی تھی اور دھند کے اس پار اُسے کچھ ایسے چہرے نظر آئے تھے جو مانوس تھے اور شاید اس کے اپنے تھے۔ دانیال جہانگیر نے کتنے مہینوں کے بعد ایک ساتھ دونوں آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد دیکھا تھا۔ اس کے سامنے کھڑی اس کی ماں عافیہ جہانگیر ان کی تعداد انگلیوں پر گن کر بتا سکتی تھی۔ دن، ہفتے، مہینے، لمحے، منٹ اور گھنٹے ایک، ایک پل ان کے سوا شاید کسی نے نہیں گنا ہوگا۔

☆☆☆

بینش یونیورسٹی ٹائم کے بعد اپنے اسٹاپ پر اپنی روٹ بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ جب ایک سیاہ چمکتی گاڑی اس کے قریب آ کر رکی تھی۔

"آئی ایم سوری بینش، میں تمہارے انتظار میں کیفے ٹیریا میں نہیں بیٹھ سکا۔ دراصل مجھے ایک لنچ میں شریک ہونا پڑ گیا تھا۔ اگر تم مائنڈ نہ کرو تو میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔ اس دوران میں ہم وہ چیز بھی دیکھ لیں گے جو تم مجھے صبح دکھانا چاہ رہی تھیں۔" گاڑی کا شیشہ نیچے کرنے کے بعد دانیال نے سر باہر نکال کر اس سے کہا تھا۔

جاری ہے

تن من ہاری

نگہت نسیم



آج کا دن بہت خوب صورت اور روشن تھا۔ سرخ اینٹوں سے بنی خاندانی محل نما کوٹھی میں گل بی بی .....کو ایک ہم نفس ملنے والی تھی۔ نوکروں کی فوج بے شک ان کے اردگرد رہتی تھی لیکن کس سے دل کی بات ہو یہ انہیں سمجھ نہیں آتا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتیں، فوجی کی بیوی ہونا دنیا کی سب سے بڑی سزا ہے۔ ہر وقت بنے سجے مقابلے کے لیے تیار رہو کہ جانے کون سی کرنل، جرنل، میجر کی بیوی اچانک گھر آنے کا کہہ

دیں یا کسی پارٹی میں اچانک پوچھ لیں..... ”گل بی بی آپ نے یہ ساڑی کس سن میں خریدی تھی ...... سنئیں آپ کس پارلر سے فیشل کرواتی ہیں.....“ بس جم سے لے کر برج کی بازیوں تک ہی ان کی دوڑ تھی۔ وہ ایسے سوالوں پر مُذبذب ہو جاتیں ...... خفا ہو جاتیں ...... خود ہی باتیں کرنے بیٹھ جاتیں ...... اب بھلا انہیں یہ جاننے سے کیا غرض کہ بازار میں آٹا کیوں نہیں مل رہا یا اُن کے ملک میں خواندگی کی شرح کیوں نہیں بڑھ رہی۔ جب وہ گھر آ کر میجر یوسف سے اس بات کا شکوہ کرتیں تو گل بی بی کی جھنجلاہٹ کو بے حسی کا پتھر گھر سے بھی پڑ جاتا تھا۔

”جو ہوتا ہے ہونے دیجیے گل بی بی آپ کیوں فکر کرتی ہیں؟“ میجر یوسف ان کی بے چینی کو محسوس کیے بغیر سکون سے کہہ دیتے۔

***

اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی گل بی بی کا اصلی نام گلریز تھا۔ میجر یوسف ہی کی طرح ان کا بھی تعلق امیر گھرانے سے تھا...... حساس، ملنسار سی گل بی بی نے انگلش میں ماسٹرز کر رکھا تھا۔ جو اُن سے ایک بار مل لیتا وہ انہیں کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ کھلتے ہوئے گندمی رنگ پر ان کی کالی بھنوراسی آنکھیں، لمبے گھنے بال، مدھم میٹھا لہجہ سب کو سوچنے پر مجبور کر دیتا کہ وہ خوب صورت زیادہ ہیں کہ خوب سیرت ...... پر میجر یوسف کے لیے یہ ساری خوبیاں کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ جبھی تو شادی کے سات برس بعد بھی وہ سات سمندر کی دوریوں پر ہی تھے۔ کبھی وہ اپنا قصور جاننے کی کوشش بھی کرتیں تو انہیں کچھ سمجھ نہ آتا کہ آخر میجر یوسف کو ان سے وابستگی کا احساس کیوں نہیں ہوتا...... اور جو کبھی اپنے اس بے رنگ بے وجہ جینے کا جواز ڈھونڈتی تو انہیں اپنی مٹھی میں بند دو پَلوں کے سوا کچھ نہ ملتا...... ایک پل وہ جس میں میجر یوسف نے اپنا نام ان کے نام کے ساتھ جوڑنے کی سب کو قانونی اجازت دی تھی ...... اور دوسرا پل وہ جس میں انہوں نے پہلی بار انہیں گلریز نہیں ”گل بی بی“ کہہ کر پکارا تھا۔ جس کے بعد وہ سب کی گل بی بی ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ جتنا سوچتیں اتنا ہی ٹوٹتی جاتیں...... ان کی بھنوراسی آنکھوں میں کالے بادل ٹھہر سے جاتے اور ان کی مدھم میٹھی آواز کئی چولے بدل لیتی۔

****

میجر یوسف کے پاس کہاں اتنا وقت تھا کہ سانولی سلونی شاموں میں کچھ دیر ان کے پاس بسیرا کرتے ...... بند کتاب جیسی گل بی بی کو ورق ورق پڑھتے ...... انسان بھی تو بند کتاب ہی کی طرح ایک دوسرے سے ملتا ہے ...... پھر وقت کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے پر باب در باب کھلتا چلا جاتا ہے لیکن گل بی بی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، وہ بند کتاب کی طرح بک شیلف میں سجی رہ گئیں ...... انہیں کسی نے بھی ورق ورق پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔

****

وقت اپنا نصاب بھی خود لکھتا ہے اور نصیب بھی خود بناتا ہے۔ اسی وقت نے گل بی بی کے نصاب میں ”سمجھوتا“ لکھا تھا اور نصیب میں تنہائی ...... کبھی انہیں اپنے ماں باپ کا اطمینان خاموش کروا دیتا...... تو کبھی میجر یوسف کی عزت ان پر پہرے لگا دیتی تو کہیں ساس سسر کی محبت وجہ ہو جاتی۔ گل بی بی کو تو جیسے لڑکی ہونے کی سزا ملی تھی، سب انہیں محاذ پر اکیلا چھوڑ کر واپس اپنی پناہ گاہوں میں جا چکے تھے اور جس کے پاس وہ چھوڑ کر گئے تھے وہ صرف اور صرف ایک فوجی تھا...... سیلوٹ اور یس سر والا روبوٹ...... جس کے اندر ہر احساس میکانکی تھا اور دنیا کی ہر چھوٹی بڑی خوشی منٹوں کے حساب سے فیڈ ہوتی تھی...... پر وہ کچھ نہ کہہ سکتی تھیں...... محاذ پر ان کی پسپائی ہو چکی تھی وہ اتنے بڑے گھر میں مصنوعی زندگی گزارنے کے

لیے اکیلی رہ گئیں۔ اب برسوں کی چپ، بیماری کی طرح انہیں دن رات گھلا رہی تھی۔

****

اس بار گل بی بی بیمار پڑیں تو صحت یاب ہی نہیں ہو پا رہی تھیں۔ کئی ڈاکٹر بدلے جا چکے تھے۔ اسی دوران میجر یوسف کو ڈیوٹی کے لیے دور دراز گاؤں میں بھی جانا ضروری تھا۔ اُدھر گاؤں میں بے جی بے حد فکر مند تھیں کہ انہیں سات برس بعد بھی پوتے پوتی کی کوئی خوشخبری نہیں ملی تھی اور اب ان کی بہو نے خوش رہنا بھی چھوڑ دیا تھا...... وہ اتنی دور تھیں کہ آتے آتے کئی ہفتے لگ جاتے۔ انہیں لگتا تھا اگر گل بی بی کے لیے کوئی کام والی لڑکی رکھ لی جائے تو گل بی بی کا دل تھوڑا سا بہل جائے گا...... میجر یوسف کے لیے بے جی کی تجویز حکم کا درجہ رکھتی تھی ...... بے جی کو اطمینان دلا کر انہوں نے فون رکھ تو دیا تھا پر اتنی جلدی اب کوئی ایسی لڑکی کہاں سے لائی جائے جو دن رات گل بی بی کے پاس رہے ...... گاڑی میں بیٹھتے وقت میجر یوسف سوچ سوچ کر جھنجلا رہے تھے ...... انہوں نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی اور دوسری نظر گاڑی سے باہر ...... لان میں مالی، بابا رحیم باغیچے میں پھولوں سے الجھے ہوئے تھے ...... انہیں یاد آیا وہ اکثر اپنی بیٹی کا ذکر کرتے تھے لیکن انہوں نے مزید پوچھنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی اس لیے انہیں اور کچھ معلوم نہیں تھا اور آج بھی اتفاق سے ان کے پاس کسی تفصیل میں جانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی ...... بس انہیں بلا کر اتنا ہی کہا کہ بیگم صاحبہ کے لیے کل سے اپنی بیٹی کو کام پر بھیج دیں ...... بابا رحیم ان سے پہلے کہ کوئی جواب دیتے میجر یوسف کی گاڑی ائرپورٹ کے لیے گیٹ سے نکل چکی تھی۔

****

گل بی بی کو جب سے پتا چلا تھا کہ بابا رحیم کی بیٹی کل سے کام پر آ رہی ہے ان کی نظریں دروازے سے الگ ہی نہیں ہو رہی تھیں...... بالکل ایسے جیسے کسان اپنے خشک کھیت کو دیکھتے ہوئے آسمان پر نظریں جما دیتا ہے۔ انہیں آج احساس ہوا کہ آس کی ڈور اتنی لمبی ہوتی ہے کہ آسمانوں تک کمند ڈال لیتی ہے...... یہ سوچ کر ہی گل بی بی مسکرا دیں۔ کوئی باہر انہی کو پوچھ رہا تھا۔

”آنے دیں میں جاگ رہی ہوں ......“ گل بی بی نے اپنے کمرے ہی سے کہلوا کر چوکیدار کو اسے اندر آنے کی اجازت دے دی تھی اور خود آنے والی کے استقبال کو اٹھ کر بیٹھ گئیں ...... ان کے زرد چہرے پر نقاہت اب بھی باقی تھی۔

”سلام بی بی جی ...... یہ ہے میری بیٹی نمو...... جی آپ کے مالی بابا رحیم کی بیٹی...... ہماری بیٹی......“ سیداں نے اپنی بیٹی کو پیار سے دیکھا۔

”نمو......“ گل بی بی نے اس کا نام دُہرایا۔

”جی نام تو نمکین ہے بی بی جی لیکن پیار سے ہم نمو کہتے ہیں۔“

”اتنا انوکھا اور خوب صورت نام ”نمکین““ گل بی بی ...کو واقعی بہت اچھا لگا تھا...... ان کی مسکراہٹ نمو اور سیداں کی گھبراہٹ کو دور کر رہی تھی ...... نمکین اب اپنی مالکن گل بی بی کو ہی دیکھ رہی تھی۔

نیلی سلک کی نائٹی میں پریشان کالے دراز بال ان کے بیمار زردی مائل گندمی چہرے کو حسین بنا رہے تھے۔ بڑی بڑی کالی آنکھوں پر کالی سایہ دار پلکیں ایک عجیب سے کشش رکھتی تھیں ...... اجنبیت مٹاتی مہربان سی مسکراہٹ ...... کچھ تو ایسا تھا ان کے چہرے پر جو بہت اپنا اپنا سا لگ رہا تھا...... سیداں کے دل میں مالکن سے مل کر چین سا اتر آیا تھا...... کل رات سے وہ سو نہیں پائی تھی کہ کیسے اپنی جوان بیٹی کو وہاں دن رات کو چھوڑ دے...... حالانکہ نمو کے بابا نے بہت سمجھایا تھا کہ مالکن بہت اچھی ہیں لیکن وہ ماں تھی تسلی چاہتی تھی ...... پر گل بی بی کو دیکھ کر اس

کے سارے ڈر دور بھاگ گئے تھے..... اسے یاد آیا اس کی ماں نے اچھے انسان کی پہچان یہی بتائی جس سے کوئی ڈر نہ لگے وہی اچھا انسان ہوتا ہے..... اس کی سمجھ میں گل بی بی جی ایک اچھا انسان ہونے کے سارے ہنر سے آراستہ تھیں۔

****

''نمو یہاں آؤ.....'' گل بی بی نے اسے پکارا تھا..... وہ جیسے ایک جادوئی زور سے ان کی طرف کھنچتی چلی گئی..... وہ اسے بیٹھے بیٹھے سارے کام سمجھا رہی تھیں..... پھر انہوں نے خانساماں کو بلوا بھیجا..... وہ ہولے سے کہہ رہی تھیں۔

''خلیل ذرا نمو اور سیداں کو پورا گھر دکھا دیجیے.....''

ان کے جاتے ہی دوبارہ آنکھیں موند لیں..... نمو اپنی ماں کی موجودگی سے بے نیاز جیسے محل میں کھو سی گئی تھی۔ جس سرخ اینٹوں کے ساتھ شان سے کھڑے سفید گیٹ والے محل نما گھر کو صرف باہر سے دیکھا کرتی تھی، آج نہ صرف اندر کھڑی تھی بلکہ گھوم پھر کر اس کا چپا، چپا بھی دیکھ رہی تھی..... نمو کی حیرانی میں ڈوبی آواز اور اس کی آنکھوں کی حیرت کا نقشہ کمرے میں لیٹی گل بی بی پر ایک عجیب سا منظر کشید کر رہے تھے۔ جو کچھ بھی تھا انہیں سب کچھ اچھا لگ رہا تھا..... پھر نمو بھی آہستہ آہستہ اس گھر کا حصہ ہوگئی۔

****

نمو اپنے نام ہی کی طرح نمکین اور چٹ پٹی سی تھی۔ نکلتا ہوا قد، سنہری شاموں جیسی رنگت۔ لاکھ دوپٹا شانوں پر پھیلاتی مگر پھسل کر زمین پر گر گر جاتا، سر سے اڑتے کالے بادلوں جیسے بالوں کو جتنا کانوں کے پیچھے اُڑستی، وہ اتنا ہی اس کے چہرے سے اور گردن سے لپٹے رہتے..... اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا نشہ رہتا تھا جس کا اسے خود بھی پتا نہیں تھا کہ جب وہ سوتی ہے تو اس کی مدھ بھری آنکھیں ادھ کھلی ہی رہ جاتی ہیں..... اس کے بیں سالہ وجود میں کشش ہی ایسی تھی کہ ہر کوئی اسے ایک بار پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتا..... نمو میں یہ کشش سیداں کو دھڑکائے رکھتی اور وہ تلوار کی طرح اس کے سر پر لٹکی ہی رہتی۔

''ارے کوئی اچھی بات سیکھ لے اپنی مالکن سے.....'' وہ نمو کو ہلا ہلا کر کہتی۔

''بی بی جی اسے کیوں اپنے ساتھ ہر جگہ لے جاتی ہیں..... اس سے کام کروایا کریں..... اسے عقل دیں، مت دیں، کل اپنے گھر جائے گی تو اس کے کام آئے گا.....'' سیداں بے چینی سے گل بی بی کو دیکھتی تو وہ مسکرا کر کہہ دیتیں۔

''سیداں کیوں فکر کرتی ہو، نمو بہت اچھی ہے..... اور جلد سیکھ جانے والی بھی.....''

''بی بی جی اسی بات کا تو غم ہے کہ یہ اتنی اچھی کیوں ہے؟'' پھر جاتے جاتے بھی سیداں اسے کوس ہی جاتی۔

''نمو کھانا پکانا ڈھنگ سے سیکھ لے ورنہ مجھے تیرا بندوبست کرنا پڑے گا.....'' نمو سہم کر اپنی ماں کو دیکھتی..... وہ جانتی تھی کہ اس بندوبست میں اسے بستر لپیٹنا پڑ جائے گا۔

سیداں کو سوائے دھمکیوں کے اور کوئی کام نہیں آتا تھا۔ جس پر نمکین ہمیشہ ہی تیز ہواؤں میں کسی پتے کی طرح ڈول جایا کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اماں نے اسے وقتی طور پر کام پر رکھوایا تھا۔ اس لیے بھی نمو خوب جی بھر کر سکھ اٹھانا چاہتی تھی..... صبح سویرے سارے کام نبٹا لیتی..... کام بھلا تھے ہی کیا جو وہ تھکتی رہتی..... کمرے کی جھاڑ پونچھ..... باورچی خانے میں خانساماں کا ہاتھ بٹانا..... یا پھر کسی آئے گئے مہمان کی خاطر داری..... وہ تو اپنے گھر میں اس سے بھی زیادہ کام کیا کرتی تھی..... اب بھی جب ہفتے میں ایک دن گھر جاتی تو وہ اگلے پورے ہفتے کا کام نبٹا کر آتی کہ اماں بابا کو اس کے بعد کوئی تکلیف نہ ہو

..... وہ ان کی ایک ہی تو اولاد تھی، وہ بھی تو نمو کے بنا رہنا نہیں سیکھ پائے تھے دونوں اکثر اسے دیکھنے کے بہانے گھر کے اندر باہر ڈولتے رہتے..... انہی کے سامنے ان کی بیٹی نمو بھی گل بی بی کے ساتھ شاپنگ کو نکل جاتی تو کبھی کھانے پینے کسی ہوٹل چلی جاتی۔

نمو تو جیسے جنت میں رہنے آگئی تھی۔ کہاں اماں کی صلواتیں اور کہاں گل بی بی کی میٹھی ٹھنڈی آواز..... خدا کتنا مہربان ہے..... جو کبھی کسی کو اکیلا نہیں چھوڑتا..... اس نے ہر کسی کا کسی نہ کسی کو سہارا بنا رکھا تھا۔ جہاں نمو نے گل بی بی کی زخمی روح پر اپنی موجودگی کا مرہم رکھا تھا وہاں نمو کی وہ سوچیں جو سیداں کو باؤلی لگا کرتی تھیں گل بی بی کی توجہ نے انمول کر دی تھیں..... نمو اکثر سوچتی کہ گل بی بی کے بعد اس کی باتیں کون سمجھ پائے گا..... کبھی کبھی تو وہ سویا ہی نہ کرتی کہ کہیں اس کا یہ خواب ٹوٹ ہی نہ جائے۔

****

نمو لاکھ سیداں سے بچتی پر اس کا دھڑکا ہی الگ تھا..... اس کی اٹھلاتی جوانی اسے ہراساں رکھتی تھی..... کہنے کو وہ اپنے گھر ہوتی لیکن اپنی آنکھیں نمو کے پاس ہی چھوڑ جاتی..... کبھی بے چین ہو جاتی تو کبھی مطمئن پھر خود ہی سوچ کر خود کو بہلا لیتی کہ نمو اکیلی نہیں ہے بلکہ اپنی مالکن کے ساتھ۔ جب وہ گھر پر ہوا کرتی تھی تو سیداں کام کے دوران کئی بار اسے دیکھنے گھر جایا کرتی اور نکلتے وقت اتنے کام بتا جاتی کہ اسے ہوش نہ رہتا کہ شام کب ہوئی۔ سیداں جانتی تھی کہ یہ چشم آہو اس کے اس رویے پر ہر وقت کلی رہتی ہیں۔ اسے دکھ تھا کہ اس کی نمو بھی ہنستے ہوئے رو پڑتی ہے تو کبھی روتے ہوئے بے قرار ہو جاتی ہے۔ پر سیداں کو سمجھ نہ آتا کہ وہ اپنی ست رنگی نمو کو کہاں چھپا دے کہ کوئی اسے دیکھ نہ پائے۔ ایسے میں اس کا گل بی بی کے گھر ہونا کچھ پل تو سکون دیتا تھا لیکن بے قراری ختم نہیں کرتا تھا۔

عید

کیا پیش کروں بجز تہنیتِ عید
دائم نصیب رہے خوشیوں کی نوید
مسرتوں کی ضامن ہر ساعتِ سعید
پھولے پھلے شاداب رہے نخلِ امید

مرسلہ: مسز فرح امجد، لاہور

****

نمو نے صرف میٹرک پاس کیا ہوا تھا پر گل بی بی..... کو اس کی ذہانت بہت متاثر کرتی تھی، اس کا ہر موضوع پر دلائل سے باتیں کرنا..... پھر باتوں کی وضاحتیں کرنا اور ہر بات کے پیچھے کسی نہ کسی منطق کو نکال لانا انہیں حیران رکھتا۔ ایک بات جو نمو کی انہیں سب سے پیاری لگتی تھی وہ اس کی معصوم سی بے خبری تھی، خاص طور پر جب وہ ٹی وی دیکھ رہی ہوتی یا سو رہی ہوتی تو کسی بچے کی طرح ہر فکر سے آزاد لگتی۔

آج بھی یہی ہوا تھا دوپہر کو دونوں ہی وڈیو پر کوئی فلم دیکھ رہی تھیں..... گل بی بی کو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر یقین ہو رہا تھا کہ اب نمو ہر بات سے بے خبر خود کو اس فلم کی ہیروئن سمجھ رہی ہوگی۔ گل بی بی نے مسکرا کر اپنی آنکھیں بند کرلیں..... نمو نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھ دیے، وہ بکھرے بکھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''ہائے بی بی جی دیکھیں تو..... کتنی پیاری لڑکی ہے..... اور اس کے ساتھ یہ لڑکا تو بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا۔''

''کیوں، کیا ہوا ہیرو کو.....؟'' گل بی بی نے پیار سے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے..... اس کی نمکین آنکھیں کھارا پانی اگلنے کو بے تاب ہو رہی تھیں۔

''باؤلی ہوئی ہو تم تو.....'' گل بی بی نے اس کے موتیوں جیسے آنسوؤں کو ٹوٹنے سے پہلے ہی اپنے ہاتھوں

میں سمیٹ لیا...... نمو اسی صوفے سے جُڑی قالین پر بیٹھی ہوئی تھی جس پر گل بی بی بیٹھی ہوئی تھیں...... وہ ان کے گھٹنوں سے لپٹ گئی۔

''نہ بی بی جی، یہ ٹھیک نہیں ہے کسی کو اپنا کہہ کر چھوڑ جانا...... بھلا کوئی محبت بھی بار بار کرسکتا ہے......؟''

''ہاں کیوں نہیں کرسکتا......؟'' گل بی بی نے حیران ہوکر نمو کی طرف دیکھا۔

''نہیں بی بی جی، محبت انسان کو دل سے صرف ایک بار ہوتی ہے...... اور اسی محبت کی عمر اس کی اپنی عمر جتنی ہوتی ہے اور اسی محبت میں برکت زمین آسمان جیسی ہوتی ہے...... تا حدِ نظر...... ہر طرف صرف محبت...... نہ شروع کا پتا نہ انتہا کی خبر...... انسان اپنی ساری عمر بھی اپنی محبت کو تبرک کی طرح سب میں بانٹتا رہے تو کسی کے لیے کم نہ پڑے۔''

گل بی بی نے پیار سے اسے دیکھا جو اُن کی زندگی میں اسی محبت کی تفسیر بن کر آئی تھی...... وہ کہہ رہی تھی۔

''بی بی جی آپ نے کبھی مزاروں کو غور سے دیکھا ہے...... وہاں تبرک میں محبت...... امید اور خوشی ہی بٹتی ہے۔ یہی وہ محبت ہے جو ہوتی تو ایک بار ہے لیکن سب کی وارث ہوجاتی ہے......''

''نمو......؟'' گل بی بی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا پر وہ تو اپنی آنکھیں بند کیے جیسے کسی اور ہی سفر پر تھی۔

''بس یہی سننا باقی رہ گیا تھا...... ناس ماری ٹی وی سے اور کیا سیکھے گی......'' جانے کہاں سے سیداں وہاں آ گئی تھی اور ان دونوں کی باتیں سن کر جیسے اسے جلال سا آ گیا تھا۔ نمو گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی...... ایسے میں اس کا گلابی سوتی دوپٹا زمین پر ہی پڑا رہ گیا...... نمو کا بھرا بھرا لشکارے مارتا ہوا بدن سیداں کو مزید بھڑکا گیا۔

''ناس ماری......'' اماں نے جلدی سے زمین پر گرا ہوا دوپٹا اٹھایا اور اس کے گرد لپیٹ دیا اور اب صلواتوں کا نیا دور شروع ہوچکا تھا سیداں دھمکیوں کی صورت دونوں کی سماعتوں پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔

''سن نمو! اگر تُو نے آئندہ بے اوقات ہونے کی کوشش کی تو گلا دبا دوں گی۔'' اس نے گھور کر اپنی بیٹی کو دیکھا۔

''پر اماں......'' نمو کی وضاحت پر اس کا زنّاٹے دار تھپڑ اس کے نرم گالوں پر انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا اور وہ تیز آندھیوں میں گھرے درخت کی طرح کانپ گئی۔

''سیداں کیا قیامت آ گئی آخر...... نمو فلم ہی تو دیکھ رہی تھی اور وہ بھی میرے ساتھ...... کوئی غلط کام تو نہیں کر رہی تھی۔'' گل بی بی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا جو نمو پر دوبارہ اٹھنے والا تھا...... نمو نے اپنی ماں کو شاکی نظروں سے دیکھا۔

''بی بی جی یہ امیروں کے شوق ہیں۔ ہم غریب لوگ ہیں...... کل یہ اپنے شوق کہاں سے پورے کرے گی...... چھوٹی سی اس کمی کی وجہ ہی سے یہ مر جائے گی بی بی جی...... سوچیں، باقی اس سے کیا سہن ہوگا......'' سیداں آنکھوں میں آنسو لیے اپنے گھر واپس جا چکی تھی...... اور نمو ساری رات بے خواب رہی...... صبح جب اٹھی تو وہ چپ بھی تھی اور اس کی آنکھیں بھی سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

''ارے کوئی بھلا اپنی ماں کی باتوں کا بھی برا مانتا ہے......'' گل بی بی نے اسے بہلانا چاہا۔

''پر اماں صحیح ہی تو کہتی ہیں بی بی جی...... میں تو جیسے بھول ہی گئی تھی کہ مجھے یہاں ہمیشہ ہی تھوڑی رہنا ہے۔'' نمو کی گیلی آنکھوں میں کڑوی باتوں کی ایک عجیب سے چبھن تھی جسے گل بی بی محسوس کرسکتی تھیں۔ وہ بھی تو کئی بار ایسے ہی مرحلوں سے گزری تھیں جب انہیں یونہی گھرک دیا گیا تھا...... انہیں ایسے ہی بے

توقیر اور بیکار سمجھ لیا گیا تھا۔ تنہا کو اور تنہا کر دینا کیسا ہوتا ہے شاید وہی سمجھ سکتی تھیں...... کبھی وہ اپنے خالی گھر کو دیکھتیں تو کبھی اپنی خالی جھولی کو اور پھر آنکھیں بند کر کے سارے برسوں کو جوڑتی بھی تو کچھ نہ ملتا، وہ اکثر سوچتی تھیں کہ اس طرح وہ اور کتنا جی سکیں گی۔

****

گل بی بی اور نمو کے درمیان ایک پُل ایسا آ کر رک گیا تھا جس میں وہ دونوں خاموش تھیں اور ایک دوسرے کی ہمراز بھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تنہائی سے بچایا تھا...... خاموش شکر گزاری کے اس رشتے میں کوئی اسٹیٹس اور پوزیشن کا رعب نہیں تھا۔ حساس دل اپنی ہی سوچوں سے سہم سہم کر دھڑک رہے تھے۔ گل بی بی کی مسلسل یقین دہانی اور نمو کی لاکھ معافی تلافی بھی اسے سیداں کی روک ٹوک اور بے جا زیادتیوں سے نہیں بچا پائی۔ اس کی سوگوار آنکھوں میں شکوؤں کی گیلی ریت جیسے جم کر رہ گئی تھی جسے وہ اپنے آنچل سے جھاڑنے کی بہت کوشش کرتی پر وہ تو جیسے پلکوں سے چپک ہی گئی تھی۔ دوسرے دن نمو کو سیداں کچھ دنوں کا کہہ کر گھر لے جا چکی تھی...... اتنے بڑے سے گھر میں گل بی بی کے لیے جیسے در و دیوار ویران ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک، ایک پل ایسے کاٹا تھا جیسے کوئی عزیز اچانک ہی بچھڑ جائے۔ یہ پاگل پن ہی تو تھا کہ گل بی بی اب نمو کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنے کے طریقے سوچنے لگی تھیں...... پھر خود ہی سوچ کر ہنس بھی پڑتیں، انہیں لگا جیسے غمگساری کے لیے کسی رشتے کی ضرورت نہیں ہوتی اور غمگساری سے بڑھ کر کوئی دلداری بھی نہ تھی۔ وہ ایک، ایک دن اپنے غمگسار، دلدار کا انتظار کر رہی تھیں۔ نمو نے ان کی زندگی کے کئی خلاؤں کو ایک ساتھ پُر کر دیا تھا...... جب وہ پورے ایک ہفتہ کے بعد کام پر واپس آئی تو وہ پہلے کی طرح چہک نہیں رہی تھی...... بس

ہم انسان

ہاتھ کی انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، اگر سب انگلیاں برابر ہوتیں تب بھی شاید کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا مگر چھوٹی بڑی انگلیاں بنانے میں یقیناً اللہ تعالیٰ کی ایسی حکمت ضرور ہوگی جن سے ہم آشنا تک نہیں، اسی طرح انسان بھی ایک جیسے نہیں ہوتے، جس طرح اللہ کے نزدیک انسان کی برتری اس کے تقویٰ پر منحصر ہے، اسی طرح ہم انسان بھی اچھے اخلاق اور اچھی عادات اور کردار کے حامل افراد کی عزت زیادہ کرتے ہیں، بُرے لوگ بری حرکتیں کرتے ہیں اور ظالموں کی رسی اکثر دراز بھی ہوجایا کرتی ہے مگر وہ اللہ کی پکڑ سے کبھی بچ نہیں سکتے۔ برے لوگوں کی مثال ایک سیاہ رات کی طرح ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا مگر وہ رات ہمیشہ ختم ہوجاتی ہے، صبح کی کرن رات کی سیاہی کو نگل جاتی ہے تو دن میں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ چند گھنٹے پہلے آسمان پر سیاہ چادر تنی ہوئی تھی۔

باجی انجم انصار کے ناول ''کانچ سی لڑکی'' سے اقتباس

مرسلہ: نور افشاں شیخ، شکار پور

ہوں...... ہاں میں جواب دے کر چپ ہوجاتی۔

''کیا ہوا نمو...... کیا اماں نے بہت ڈانٹا......؟'' گل بی جی کو اس کی خاموشی کھل رہی تھی۔

''اچھا یہاں بیٹھو میرے پاس...... اور بتاؤ کہ کیا ہوا......؟'' انہوں نے اس کے ہاتھ سے سبزی اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔

نمو کی بڑی بڑی آنکھوں سے لگاتار آنسو گر رہے تھے...... گل بی بی پریشان ہوگئیں۔

"سیداں نے کچھ کہا کیا...... کچھ بتاؤ تو......"
اب گل بی بی سچ مچ اسی کے ساتھ مل کر رو دینے کو تھیں۔

"بی بی جی اماں نے کہا ہے کہ مجھے رشید سے شادی کرنی ہوگی۔" وہ رک رک کے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"کون رشید؟" گل بی بی نے حیرانی سے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا رشید کون ہے...... بس اماں نے کہا ہے کہ بابا کے دور پرے رشتے دار کا بیٹا ہے۔"

"کیا کرتا ہے وہ؟" انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ تفصیل کہاں سے شروع کریں۔

"پتا نہیں بی بی جی، کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ سرد آہ بھر کر بولی۔

"ارے چھوڑو تم بیکار پریشان ہو رہی ہو...... میں سیداں سے بات کروں گی ویسے۔ نمو تم ایسا کرو کہ آگے اور پڑھ لو یعنی کالج جوائن کر لو...... تم دیکھنا تمہیں مصروف دیکھ کر سیداں خود ہی تمہاری شادی کی بات بھول جائے گی۔" گل بی بی نے شاید اسے بہلانا چاہا تھا پر نمو پر جیسے کوئی سحر سا تھا...... ان کی بات پر نمو نے کچھ نہیں کہا بس ایک نظر اُن کی طرف دیکھا۔ آنسو اس کے رخساروں پر ایسے گر رہے تھے جیسے تازہ گلاب پر شبنم...... گل بی بی نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔

"نہیں بی بی جی، میں آگے نہیں پڑھ سکتی...... اماں مجھے مار ڈالے گی۔" اس کے آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے...... وہ اٹک اٹک کر کہہ رہی تھی۔

"میٹرک بھی تو کیا ہی ہے ناں...... یہ بھی ہو جائے گا...... انشا اللہ۔"

"میٹرک تو بابا کی وجہ سے کیا تھا۔" وہ پھر ہچکیاں لینے لگی۔

"بی بی جی بس آپ اسے اتنا سر نہ چڑھائیں...... لڑکی بیگانہ مال ہوتی ہے...... ماں باپ تو بس رکھوالی کرتے ہیں کسی کے مال کی...... آخر تو ہر امیر غریب اپنی بیٹی مالکوں کے پاس بھیجتی ہی ہوتی ہے۔" سیداں جانے کہاں سے پھر نمو کے سر پر پہنچ گئی تھی...... اس نے ایک نظر بھی ماں پر نہیں ڈالی اور روتے روتے باورچی خانے کی طرف چل پڑی۔

"سیداں...... نمو سے پوچھا تو ہوتا......" گل بی بی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس طرح بات چھیڑیں۔

"بی بی جی کیا پوچھنے سے تقدیر بدل جاتی ہے......؟" سیداں نیلے سوتی دوپٹے سے اپنی آنکھوں کو رگڑتی ہوئی چپ چاپ دروازے سے باہر نکل گئی۔

گل بی بی بے چینی سے سوچ رہی تھیں کہ کیسے نمو کے آنسو خشک کریں...... کیسے اسے تسلی دیں...... کیسے سیداں کو سمجھائیں کہ نمو کے ساتھ یہ ظلم نہ کرے...... اور جب انہوں نے سیداں کو بہت سمجھایا تو وہ رشید کو ان سے ملوانے ایک دن کوٹھی لے آئی...... نمو اس دن چھپی پھری۔

رشید صبح ہی صبح گل بی بی کے سامنے مؤدب کھڑا تھا...... درمیانہ قد، چوڑا کسرتی بدن، سانولا رنگ، چوڑی پیشانی، بڑی، بڑی مسکراتی آنکھوں میں جیت جانے کا ہلکورے مارتا نشہ...... رسمی سی بات چیت کے بعد گل بی بی کو لگا جیسے نمو سے عمر میں دس برس بڑا رشید کہیں سے بھی اس کی نازک اور ذہین طبیعت سے میل نہیں کھاتا۔

"ہائے کیسے رہے گی نمو......؟" گل بی بی نے دکھ سے سوچا وہ سمجھوتوں کے سارے دکھ جانتی جو تھیں۔

"سیداں کتنا پڑھا ہے رشید نے اور کیا کام کرتا ہے؟" انہوں نے دھیمے لہجے میں اس سے پوچھا۔

"پڑھ لکھ کر کیا کرنا بی بی جی......! ہاں رشید ایک ورک شاپ پر کام کرتا ہے۔ اچھا کما لاتا ہے...... اپنی نمو کو اور کیا چاہیے۔" اس کے کہنے پر رشید کی آنکھوں

کا نشہ اور بھی گہرا ہونے لگا۔

"جی بی بی جی آپ فکر نہ کریں...... زبان دی ہے ہم نے سیداں خالہ کو، ہم ان کی بیٹی کو خوش رکھوں گا۔" رشید نے سیداں کی بات خوشی، خوشی مکمل کر دی۔

گل بی بی چپ ہو گئی تھیں...... خوش رہنا، خوش رکھنا، خوشی دینا، خوشی بانٹنا کتنا فرق تھا ان سب میں...... اس فرق کو محسوس کرنے کے لیے اگر سیداں کو دوسرا جنم بھی لینا پڑتا تو شاید نہ سمجھ پاتی...... اس رشتے سے انکار کرنے کے لیے نمو کے پاس ہمت بہت ہی کم تھی اور اقرار میں جواب دینے کے لیے سیداں کے پاس کئی جواز تھے...... سو رشتہ پکا ہونے کی صورت میں نمو کے گھر والے بہل گئے تھے۔ جو نہیں بہلی تو نمو ہی نہیں بہلی تھی...... مرجھائی سی زرد پڑتی نمو وہ نمو رہی ہی نہیں جس کے دم سے خزاؤں میں بھی بہاروں کا موسم آ جاتا تھا۔ جوں جوں شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے ویسے ویسے نمو بکھرتی جا رہی تھی۔

****

"نمو اپنے بابا سے بات کی......؟" گل بی بی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ نمو کو کیسے اس مسئلے سے باہر نکالیں۔ نمو نے چونک کر پہلے تو گل بی بی کو دیکھا پھر اپنی کالی پلکیں اپنی آنکھوں پر گرا لیں...... کاسنی دوپٹے کو شانوں سے لے کر دامن تک پھیلا لیا اور خود کو سکیڑ کر سرخ قالین پر ہی صوفے کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

"نمو......!" گل بی بی نے اسے دوبارہ پکارا۔

"جی بی بی جی......" اس کی بھیگی ہوئی آواز ہواؤں کو نم کر رہی تھی۔

"نمو اپنے بابا سے بات کی......؟" گل بی بی نے ایک بار پھر اس سے پوچھا۔

"نہیں بی بی جی......" نمو کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔

"کیوں نمو......؟" گل بی بی اس کے پاس ہی قالین پر بیٹھ گئی تھیں۔

"بی بی جی بابا میرے بابا نہیں ہیں......" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی سی لگ گئی۔

"نمو کیا کہہ رہی ہو...... ہوش کرو......" گل بی بی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے ہلایا۔

"ہوش میں ہی ہوں بی بی جی...... سچ کہہ رہی ہوں بابا رحیم میرے بابا نہیں ہیں۔"

"پھر کون ہیں تیرے بابا......؟" گل بی بی نے اپنے سرد ہاتھ اس کے گیلے ہاتھوں پر رکھ دیے...... جس کی پشت پر اس کے آنسو ہولے ہولے گر رہے تھے۔

"نہیں جانتی بی بی جی...... مجھے نہیں پتا میرے بابا کون ہیں......؟"

"کیا......؟" گل بی بی ایسے پیچھے ہٹی جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

"اپنی اماں سے پوچھا نمو......؟"

"نہیں بی بی جی......" اس کی رُندھی ہوئی آواز فضا کو سوگوار کر رہی تھی...... وہ اب بھی اسی حالت میں تھی...... آنکھیں موندھے، لرزتے ہونٹ، کاسنی دوپٹے سے ڈھکا کانپتا جسم، سہمی ہوئی آواز...... نمو کہہ رہی تھی۔

"میری اماں بہت اچھی ہے بی بی جی...... بہت، بہت پیار کرنے والی نرم گرم ماں...... جلیبیوں کی طرح...... رنگدار...... رسدار اور میٹھی ماں۔"

"نمو......" گل بی بی نے بے تابی سے نمو کی بات کاٹ دی۔

"بی بی جی ایک دن اماں سو رہی تھی اور سوتے سوتے رو رہی تھی...... وہ زور زور سے اپنی ماں سے کچھ کہہ رہی تھی...... میں سننے کے لیے آگے بڑھی تو وہ کہہ رہی تھی۔" ماں میں یہ شادی نہیں کروں گی...... میرے پاس رحیم کو دینے کے

لیے کچھ نہیں بچا......نہ دل......نہ پیار......نہ جسم...... ماں مجھے میری مٹی سے جدا نہ کرو......اللہ کے واسطے مجھے اپنی مٹی کے ساتھ رہنے دو...... ورنہ میں مر جاؤں گی ماں......

”بی بی جی میری ماں کا خواب اتنا پیارا تھا کہ میں اسے دیکھتی رہ گئی......وہ رو رہی تھی......فریاد کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنا پیٹ بھی چھپا رہی تھی......بی بی جی! میں اماں کو جگا ہی نہیں سکی...... ہلا ہی نہیں سکی......بس اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ پیار سے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تب اس کی آنکھ کھل گئی......اس نے مجھے ایسے گلے لگایا جیسے مجھے ابھی کوئی چھین کر لے جائے گا۔ وہ میرا سر ماتھا چومتی جاتی اور کہتی جاتی۔

”تو میری اچھی بیٹی ہے......تو میری مٹی ہے، میری زندگی ہے۔“ اماں میرے گلے سے لگی ہچکیوں سے رو رہی تھی بی بی جی......! مجھے میری ماں نے بتایا میں وہی مٹی ہوں جس میں اس نے اپنا پیار بویا... تھا...“ گل بی بی حیرت کا جہاں بنیں نمو کو دیکھے جا رہی تھیں......وہ کہہ رہی تھی۔

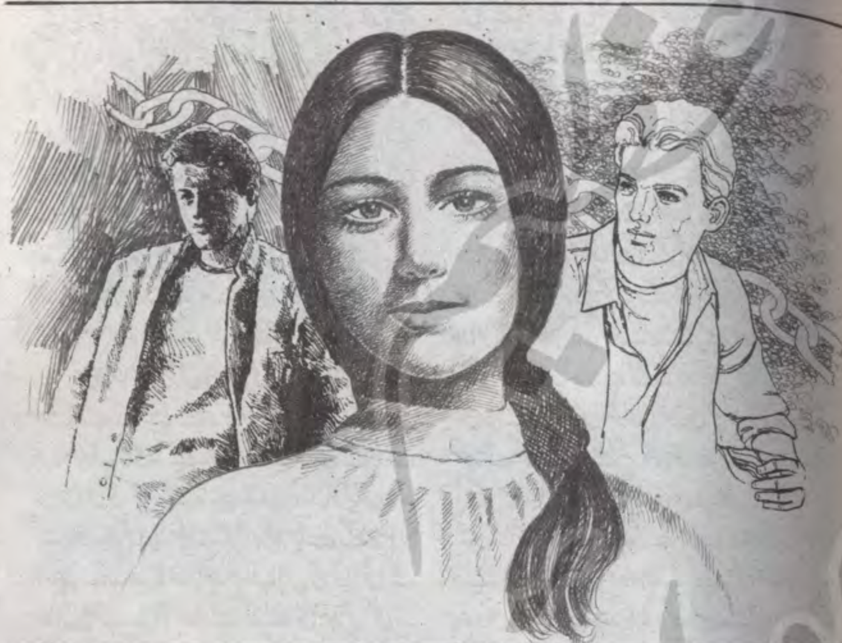
”بی بی جی خودرو پودوں کو کہاں معلوم ہوتا ہے کہ کس زمین پر اگنا ہے اور کس موسم میں پھول دینے ہیں......میں بھی بے موسمی پودا تھی جو آپے آپ اگتا چلا گیا......بڑھتا چلا گیا۔“ گل بی بی نے آہستگی سے اپنے دوپٹے سے نمو کے آنسو پونچھ دیے۔

”بی بی جی میری ماں کا کوئی قصور نہیں......وہ ظالم نہیں ہے......بس اس کا اپنا ہجر مجھے عمر بھر کے روگ سے بچانا چاہتا ہے۔ اس کی ممتا مجھے اسی آزاد پل کے جادو سے بچانا چاہتی ہے............ بی بی جی...“ نمو کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

”پر کیا نمو......؟“ گل بی بی نے بے چینی سے اسے پکارا۔

”پر بی بی جی ہر انسان کی زندگی میں...... کبھی نہ کبھی......ایک پل ایسا آتا ہے ناں......جب ہار دینا ہی جیت لگتی ہے......اور میری زندگی میں بھی ایک ایسا ہی آزاد پل آ گیا جب زرخیز زمینوں پر محبت کھل کر برستی ہے اور مٹی سے مٹی جنم لیتی ہے......اس جادوئی سے پل میں کوئی وہم، کوئی دھڑکا......کوئی ڈر نہیں ہوتا بس سب کچھ ہار کر جیت لیا جاتا ہے......سو میں نے بھی ہار دیا......اختیار، صحیح، غلط......اچھا، برا، دین، دنیا کا سارا فلسفہ، رشتے، حال، مستقبل سب کچھ بی بی... جی، سبھی کچھ میں نے ہار دیا۔“ نمو نڈھال ہو رہی تھی۔

”گل بی بی جی میری ماں مجھے نہیں بچا سکی......نہیں بچا سکی۔“ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ ”اب میرے پاس رشید کو دینے کے لیے کچھ نہیں بچا، نہ دل، نہ پیار، نہ جسم۔“ وہ نڈھال ہو رہی تھی......ٹوٹے لہجے میں رک رک کر کہہ رہی تھی۔ ”اماں مجھے میری مٹی سے جدا نہ کرو......اللہ کے واسطے مجھے اپنی مٹی کے ساتھ رہنے دو......ورنہ میں مر جاؤں گی......“ پھر اس کی فریاد مدھم ہوتے ہوتے کہیں گم ہو گئی اور اس کے صندلی ہاتھ کاسنی دوپٹے سے اپنا پیٹ چھپانے کی کوشش میں وہیں پڑے رہ گئے......گل بی بی کے سامنے سرخ قالین پر نمو بے ہوش پڑی تھی......اس کے لمبے کالے بال اس کے صبیح چہرے کو اور بھی حسین بنا رہے تھے......شفق گھلی رنگت میں ہجر کی شام آن بسی تھی......فضاؤں میں اب بھی اس کی سسکیاں سانس لے رہی تھیں...... پر گل بی بی وہاں تھیں ہی کہاں جو اس کی فغاں سنتیں......وہ تو بس اسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں......آخر نمو کو کس نے ورق ورق پڑھ لیا تھا؟ آخر کس نے......!



اجے نئیں بنیا پاکستان

سدرہ عدن

رات کے دو بج رہے تھے، سڑک بالکل ویران اور اردگرد کا ماحول وحشت زدہ دکھائی دیتا تھا۔ حلیمہ چلتے چلتے اتنی تھک چکی تھی کہ مزید چلنا محال تھا مگر زخمی پاؤں اور ان کی سوجن بھی اسے بیٹھنے پر مجبور نہ کر سکی۔ وہ پاکستان کی گلیوں میں چلتے پھرتے بھی پاکستان کو تلاش کر رہی تھی...... مزید دو کلومیٹر چلنے کے بعد وہ چلتے چلتے اونگھنے لگی اس نے نظر اٹھا کر یہ تک نہیں دیکھا کہ وہ کہاں ہے، وہ جہاں تھی وہیں بیٹھ گئی۔ بند ہوتی آنکھیں ہلکے سے شور سے کھل

گئیں۔ قریب ہی اِک نالہ بہہ رہا تھا، وہ بہتے پانی کو دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی۔ آنکھوں میں غنودگی کی جگہ خوف نے لے لی تھی۔ اس کے ہونٹ کھلے ضرور مگر آواز نہ نکلی۔ وہ بھاگتی ہوئی سڑک کی طرف گئی۔ سڑک کراس کی اور کپاس کے کھیت میں گھس کر لیٹ گئی۔ اس کے یوں لیٹنے سے کپاس کے دو پودے ٹوٹ کر اس کی کمر سے ٹکرائے...... لیکن اس کے لیے یہ درد کچھ معنی نہیں رکھتا تھا۔ اس کی آنکھیں پہلے خوف سے پھر نیند سے بند ہونے لگیں۔

☆☆☆

حلیمہ سات بیٹوں کی ماں تھی۔ اس کی زندگی کا محور صرف اس کے بیٹے تھے۔ وہ ہر وقت ان کے کاموں میں مصروف رہتی۔ بیٹے جوان ہوئے تو اس نے بڑے تین بیٹوں کی شادی کے لیے خاندان میں لڑکیاں پسند کیں اور بیاہ کر دیا۔ حلیمہ کے شوہر کو دنیا سے گئے برسوں ہوچکے تھے۔ گھر کا سارا نظام اب اس کی خواہش کے مطابق چلتا۔ بیٹے تو سعادت مند تھے ہی بہوئیں بھی... فرمانبردار ثابت ہوئیں۔ حلیمہ کی زندگی اس وقت مشکل کا شکار ہوئی جب ہندوستان کے حالات مسلمانوں کے حق میں سختی سے دوچار ہوئے...... جوں جوں مسلمانوں کے الگ ملک پاکستان بننے کی کوششیں کامیاب ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ہندو، سکھ...... مسلمانوں کی کسی بھی بات کا بتنگڑ بنا کر لڑنے جھگڑنے لگتے اور مسلمانوں کا قتلِ عام ہونے لگا۔ ان سرگرمیوں کی اطلاع حلیمہ کے بیٹے اور رشتے دار دیتے رہتے تھے۔ وہ اس لحاظ سے خوش تو تھی کہ مسلمانوں کا ایک الگ ملک ہوگا جہاں کوئی روک ٹوک نہ ہوگی لیکن اس کی ممتا پریشان رہنے لگی تھی۔ اس کا دل اندر سے بجھ چکا تھا۔ وہ بیٹوں کو بار بار دیکھتی لیکن اس کی سوچیں جیسے محدود ہو چکی تھیں...... جلد ہی اسے پاکستان بننے کی نوید ملی اور پھر اس کے دونوں چھوٹے بیٹے شمریز اور الطاف کو مسجد سے نکلتے ہی قتل کر دیا گیا...... محلے میں گھروں سے باہر کئی مسلمانوں کو قتل کیا جا چکا تھا۔ بڑا بھائی اسحاق دونوں بھائیوں کے قتل کے بارے میں جان چکا تھا۔ اس نے دن بھر کے حالات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ پاکستان زندہ سلامت پہنچ جانا کسی معجزے سے کم نہ ہوگا۔ اس نے ماں کو یہی بتایا کہ شمریز اور الطاف پاکستان جانے کو نکل گئے ہیں۔

☆☆☆

شام سے ہی محلے میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر قتل و غارت شروع کر دی تھی۔ محلے میں چیخ و پکار تھی۔ حلیمہ اور اس کا خاندان تین گروپ بنائے چھپتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ وہ دعائیں کیے جا رہی تھی۔ اسے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ سارے لوگ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چل رہے تھے۔ سب سے آگے چلنے والے گروپ میں دو بیٹے اور تینوں بہوئیں تھیں۔ انہیں سامنے سے آتے ہوئے چند لوگ دکھائی دیے۔ اس رات سرِعام دھڑلے سے چلنے والے صرف ہندو ہی تھے۔ صرف چند سیکنڈ لگے۔ حلیمہ کے دو اور جوان بیٹے خون سے لت پت زمین پر گرے۔ حلیمہ چیخ رہی تھی، اسحاق آگے بڑھا تھا اس نے چاقو سے دشمن پر وار ضرور کیے مگر وہ اکیلا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دو سکھوں نے تینوں عورتوں کو تھام رکھا تھا۔ اس نے ایک ہی جھٹکے سے انہیں چھڑایا اور انہیں لے کر بھاگنے لگا۔ دشمن کی نظر اندھیرے میں کھڑے لوگوں پر نہیں پڑی تھی اس لیے وہ اسحاق اور خواتین کا پیچھا کرنے لگے تھے۔ حلیمہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے چھوٹے دونوں بچے اسے سختی سے تھامے ہوئے تھے۔

''اماں ہم بھی......'' چھوٹے بیٹے نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ وہ دونوں کے بازوؤں کو تھام کر تیز تیز چلنے لگی۔ وہ خون میں لت پت بیٹوں کے پاس رکی ہاتھ پھیرتے ہوئے سسک رہی تھی پھر کسی خیال سے مڑ کر دیکھا دونوں چھوٹے بیٹوں کے ہاتھوں کو تھاما اور تیز چلنے لگی تھی۔ اس کی سوچ تھی کہ تین بیٹے اور بہوئیں تو پاکستان میں مل ہی جائیں گے ان دونوں کو کسی طرح

یہاں سے لے جاؤں۔ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک وہ ایک کھیت میں چھپ کر ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ دل کو کرب سے دھڑکتے جیسے صدیاں گزر چکی تھیں۔ وہ تھوڑا سا سر اٹھا کر ریلوے اسٹیشن کی طرف دیکھتی کہ کہیں دوسرے بچے بھی نظر آجائیں۔ ساری امیدیں ٹوٹ رہی تھیں۔ جیسے ہی ٹرین آئی وہ دونوں بچوں سمیت اس میں سوار ہوگئی۔ جیسے ہی ٹرین چلنے لگی تو اسے قہقہوں کی آوازیں آئی تھیں۔ اس کی بچوں پر گرفت اور سخت ہوگئی۔ ایک ہندو نے چھوٹے لڑکے کو اس سے چھین کر ٹرین سے باہر پھینک دیا۔ اب حلیمہ اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھی۔ آخری بیٹا اس سے لپٹا ہوا تھا۔

''چل رہن دے۔'' ہندو نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ حلیمہ دنیا سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ نہ جانے کتنے کٹھن مراحل طے کر کے وہ اس سرزمین پر پہنچی تھی جو اس کے خوابوں کی جنت تھی۔ ٹرین رکی اور اس کا آخری بیٹا ہاتھ چھوٹ جانے پر بچھڑ گیا۔

رات کی سیاہی تیز ہو چکی تھی اس نے چپل اتاری اور ننگے پاؤں چلنے لگی۔

☆☆☆

یہ قانونِ فطرت ہے ماں خود قید ہو تو بھی اسے آزادی میں رہنے والے بچوں کی بھی فکر رہتی ہے۔ وہ اپنے لیے کم اور بچوں کے لیے زیادہ دعا گو رہتی ہے۔ حلیمہ کی ممتا اس کی اولاد سب کچھ ہندوستان میں رہ گیا تھا۔ وہ سارا دن ساری رات ننگے پاؤں چلتی رہتی۔ اس کی نیندیں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ جب بھوک زور پکڑتی تو چلنا محال ہو جاتا۔ وہ بیٹھ جاتی اسے کوئی اپنے گھر لے جاتا، کھانا کھلاتا، اسے کبھی گرمی، سردی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کی چپ اور پاکستان کی عمر دو سال ہونے کو تھے۔ خاموش لب اور ویران آنکھیں اس دن غضبناک ہوگئیں۔

☆☆☆

پاکستان بھر میں آزادی کا دن منایا جا رہا تھا۔ حلیمہ جس گاؤں سے گزر رہی تھی اس گاؤں کے چند... جوشیلے جوانوں نے اِک مقابلے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اسے بھوک کے باعث چلنا مشکل ہوا تو وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ نوجوانوں نے اپنے تئیں شعر کہنے شروع کیے ایک نوجوان نے یہ شعر پڑھا۔

چھوٹی سی کرسی اوپر محمد علی جناح بیٹھے
لگا کے نعرہ پاکستان بنا بیٹھے

بالکل اچانک ہی حلیمہ کا دھیان شعر کی طرف مڑ چکا تھا اسے سانس لینے میں دقت ہونے لگی تو وہ منہ کھول کھول کر زور زور سے سانس لینے لگی۔ اس نے اشتعال انگیز نظروں سے لڑکوں کو دیکھا وہ چلّانے لگی۔

اِک مائی دے سُت جوان
اجے نہیں بنیا پاکستان

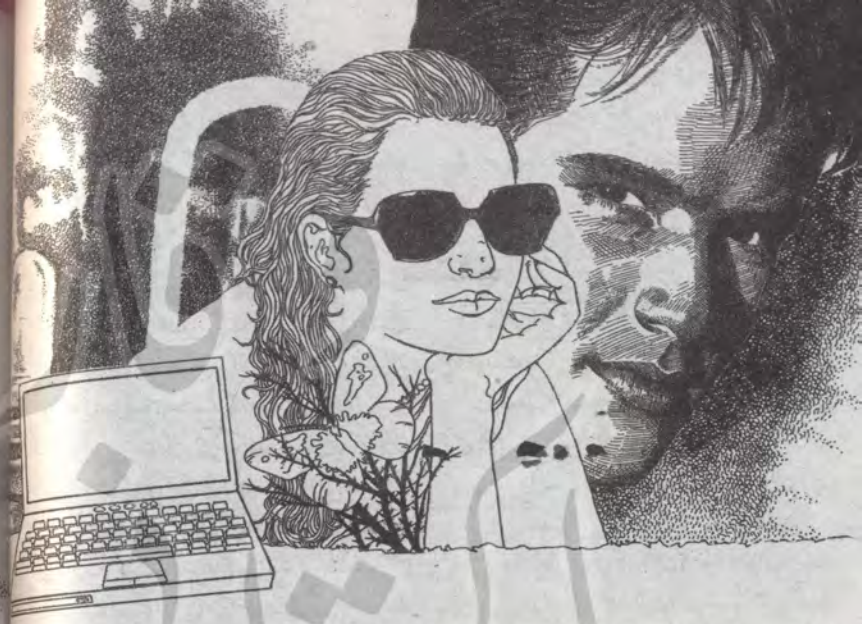
وہ احتجاج کر رہی تھی۔ اس کا سارا خاندان، سات جوان قربان ہو چکے تھے۔ اسے ابھی تک پاکستان نہیں ملا تھا۔ اس کی ممتا رو رہی تھی۔ لفظ ٹوٹ کر نکل رہے تھے نہ جانے کتنے ماہ وہ سب کو یہ ہی کہتی رہی۔

اِک مائی دے ست جوان
اجے نہیں بنیا پاکستان

اور پھر اس کے جسم کی طرح آواز بھی تھک گئی۔ سوجن سے زخمی پاؤں چلنے سے قاصر ہوگئے۔ وہ یکایک سڑک کے درمیان لیٹ گئی۔ تیز رفتار ٹرک اسے کچلتا ہوا گزر گیا۔ اس کا جسم اک دم اوپر کو اٹھا درد سے آہیں نکلنے لگیں۔ اندرونی اور بیرونی تکلیف سے آنکھیں برسنے لگیں۔ چند سیکنڈ میں چہرہ اور گردن آنسوؤں سے تر ہوگئے۔ اس کی آخری بار زبان لڑکھڑائی سات...... جو...... پاک پھر اس کا جسم بے جان ہوگیا سڑک پر ویسا ہی خون تھا جیسا وہ ہندوستان میں بیٹوں کا چھوڑ کر آئی تھی مر جانے کے بعد بھی اس کی نظریں خون پر جمی تھیں۔

حلیمہ کا شمار ان سیکڑوں ماؤں میں ہوتا ہے جنہوں نے کروڑوں ماؤں کی ممتا کو آزادی اور سکون کا تحفہ دیا تھا۔





مکمل ناول

تتلی

شیریں حیدر

دوستوں سے بہ مشکل جان چھڑا کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا، دل ارمانوں سے بھرا ہوا تھا، وہی ارمان جو اس دن ہر دولھا کے دل میں بیدار ہوتے ہیں۔ بابا اور خالہ جان کو سلام کر کے میں نے اپنی بہنوں کو بھی خدا حافظ کہا اور جواب میں اُن کی طرف سے دلچسپ تبصرے سن کر مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا۔

''ذرا سنبھل کر بھائی......'' دروازے سے

نکلتے ہوئے جوذرا پاؤں لڑکھڑایا تو ایک بہن کی آواز آئی، میں پلٹ کر مسکرایا اور کہا۔

"آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے......"

کمرے میں داخل ہوتے وقت دھڑکنوں کی رفتار کسی بھی رفتار ماپنے والے پیمانے کی حد سے کہیں زیادہ تھی۔ کمرے میں داخل ہوا تو وہ صوفے پر بیٹھی تھی، اسے روایتی گھونگٹ کاڑھے بیٹھا دیکھ کر مجھے حیرت سی ہوئی...... میں نے تو سن رکھا تھا کہ وہ بہت مختلف سی لڑکی تھی اور میں توقع کر رہا تھا کہ وہ پیاری سی لڑکی شاید مختلف انداز سے میرا انتظار کر رہی ہوگی مگر یوں سر جھکائے اور گھونگٹ گرائے بیٹھے دیکھ کر دل ہی دل میں ہنسی بھی آئی اور کئی فلمی مناظر میری نظروں کے سامنے گھوم گئے...... میں ہولے سے چلتا ہوا اس کے قریب ہی رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا، اسے سلام کیا، ہلکی سی آواز میں جواب ملا۔ کمرے میں کم روشنی اور ہلکی ہلکی موسیقی نے کافی خوابناک سا ماحول بنا رکھا تھا۔

"میں اپنے گھر میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں نتالیہ...... اور بتانا چاہتا ہوں کہ آج سے یہ گھر اور اس گھر کے مکیں اور ان کے دل...... سب تمہارے ہوئے......" گھونگٹ کی آڑ میں ہلکی سی حرکت ہوئی۔

"تمہارا حق مہر، پانچ لاکھ روپے ہے، جسے میں نے نقد کے بجائے اس انگوٹھی کی شکل میں تمہیں ادا کرنے کا سوچا، یہ تمہاری منہ دکھائی بھی ہے اور حق مہر بھی، اس کی قیمت تمہارے حق مہر سے دُگنی ہے...... جب تم اس انگوٹھی کو دیکھو گی تو تمہیں احساس ہوگا کہ تم میری ہو، میرا سب کچھ تمہارا ہی ہے نتالیہ......" میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما اور انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنانے ہی لگا تھا کہ اس نے ہاتھ یوں کھینچا کہ جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔ "کیا ہوا نتالیہ؟"

"ک...ک کچھ نہیں......" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" میں نے سوال کیا۔ "تمہاری طبیعت......"

"ہوں......ٹھیک ہوں میں......" پھر اس نے اپنا ہاتھ خود ہی آگے بڑھا دیا، میں نے انگوٹھی پہنائی اور اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا...... گھونگٹ کے پیچھے سے ایک سسکی سنائی دی...... سسکی، جس نے میرے سارے جذبات سرد کر دیے...... ایسی ہی سسکی کبھی کسی اور عورت نے لی ہوگی، میرا چہرہ دیکھ کر...... یا میرا ہاتھ دیکھ کر ہی سسک اٹھی تھی...... وہ دوسری عورت میری ماں تھی۔

☆☆☆

میرا نام سرمد ہے...... میری پرورش کبریٰ خالہ کی گود میں ہوئی جو ہمارے ہاں ملازم تھیں اور انہوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ میں پانچ بیٹیوں کے بعد منتوں مرادوں سے پیدا ہوا مگر جانے کیا ہوا کہ ایک بے داغ خاندان میں میری ولادت ایک دھبا ثابت ہوئی...... مجھے نہلا کر جب ماں کی آغوش میں دیا گیا تو میری ماں سسکی نہیں، چیخ اٹھی تھی۔

"یہ میرا بچہ نہیں ہوسکتا، اسپتال والوں نے میرا بچہ تبدیل کر دیا ہے۔"

"میں یہیں تھی ساجدہ......" میری سگی خالہ نادرہ نے میری ماں کو تسلی دی۔ "بچہ ہمارا ہی ہے، تم پریشان نہ ہو، اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں بیٹا دیا۔"

"ایسے بیٹے سے تو میں چھٹی بیٹی پیدا کر لیتی......" ماں نے کہا تو خالہ نے تڑپ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ "میرا بیٹا ایسا سیاہ رنگت کا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اللہ کی بنائی ہوئی چیز ہے ساجدہ...... تم نے منتوں مرادوں سے اس سے بیٹا مانگا تھا، کبھی گورے کالے کی شرط بھی کوئی رکھتا ہے اللہ کے سامنے۔"

"مگر ہمارے خاندان میں کوئی ایسا بچہ کئی نسلوں میں نہ ہوا ہوگا نادرہ......" ماں نے خالہ سے

کہا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ ہُوا ہو...... ہمیں کیا معلوم کہ ہماری پچھلی نسلیں کیسی تھیں، ہم نے تو اپنے دادا تک کو نہیں دیکھا ساجدہ۔"

"ہماری نسل میں یہ کھوٹ اس کے باپ کی طرف سے آیا ہے نادرہ...... انہی کے خاندان میں کوئی اس طرح سیاہ رنگت کا ہوگا۔"

"اچھا ان فضول اور بیکار کی باتوں کو چھوڑو اور دودھ پلاؤ بچے کو......" نادرہ خالہ نے جب مجھے ماں کی طرف بڑھایا ہوگا تو اسے بھی اسی طرح کرنٹ لگا ہوگا جس طرح آج نتالیہ کو لگا تھا...... اس نے مجھے دودھ پلانا تو کجا...... گود میں لینے سے بھی انکار کر دیا تھا، کیسی ماں تھی وہ، موت اور حیات کی جنگ لڑ کر جو کچھ اس نے جیتا تھا، اسے چھونے تک کی تمنا اس میں نہیں جاگی تھی۔ بابا نے ماں سے اختلاف کیا اور انہیں مجبور کیا کہ وہ مجھے دودھ پلائیں...... اختلاف اس حد تک بڑھا کہ اماں ابا کا گھر چھوڑ کر اپنی بیٹیوں کو لے کر چلی گئیں۔

سب نے یہی سوچا ہوگا کہ چند دن کا بخار ہے، اتر جائے گا، خاموشی اختیار کی مگر یہ بخار تو کیا اترتا اماں کی طرف سے طلاق اور بیٹیوں کے اخراجات مقرر کرنے کا مطالبہ آن پہنچا، میں اسپتال میں ہی کبریٰ خالہ کی گود میں پہنچ گیا تھا جو بابا کے ہاں کب سے ملازمہ تھیں، انہیں مکمل طور پر میری پرورش کی ذمے داری سونپ دی گئی۔ بابا نے اماں کا مطالبہ تو مان لیا مگر بیٹیوں کے حصول کے لیے لڑی گئی طویل قانونی جنگ ہار گئے...... کیونکہ سب بہنوں نے ماں کی تحویل میں رہنے کے آپشن کو چُنا تھا...... ان کا ماہانہ خرچ بندھ گیا اور اماں نے تھوڑے عرصے کے بعد دوسری شادی کر کے بیٹیوں کو بھی داغ جدائی دے دیا، وہ ننھیال میں پلنے لگیں اور میں کبریٰ خالہ کی گود میں......

تیرا نام

دوستی کا جب بھی احترام لکھا جائے گا
تیرا نام اے جاناں! اعلیٰ مقام لکھا جائے گا

تمناؤں کی آرزو ہے میری
چاہتوں کا بے حاصل مقام لکھا جائے گا

تو جس سمت کو موڑے میں بھی چل دوں
کہ ہر راہ پہ کہاں قیام لکھا جائے گا

شاعرہ: ثمر احمد، کراچی

نادرہ خالہ بیوہ اور بے اولاد تھیں...... انہوں نے میری بہنوں کی پرورش کا ذمہ اٹھا لیا، بابا نے ان کے لیے اپنا رشتہ بھیجا، یہ سوچ کر کہ اسی بہانے ان کی بیٹیاں بھی ان کو مل جائیں گی مگر اماں کی مخالفت اور میرے ماموؤں کی انا نے ایسا نہ ہونے دیا اور یوں ہر چیز اسی طرح اپنے، اپنے مقام پر رہی۔ کبریٰ خالہ نے مجھے یہ سارے واقعات تفصیل کے ساتھ اتنی بار بتائے تھے کہ مجھے ازبر ہو گئے تھے اور ماں سے نفرت کی جڑیں میرے اندر گہری سے گہری ہوتی چلی گئیں...... بابا نے میری پرورش بہت مثبت انداز میں کی۔

اسکول میں جاتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں ugly duckling تھا، اسی نام سے سب مجھے پکارتے تھے، کوئی میرا دوست نہیں تھا، کلاس میں، میں اپنے بنچ پر تنہا بیٹھتا تھا، استاد بہت شفیق تھے اور بچوں کو سرزنش بھی کرتے مگر اس سے مجھے اور بھی ہتک محسوس ہوتی۔ میں نے کتابوں میں گھس کر اپنی ایک الگ دنیا بسا لی، کتابوں سے محبت نے مجھے ایک ایسا طالب علم بنا دیا کہ جس پر استاد اور اسکول سب فخر کرتے تھے، بڑی جماعتوں میں پہنچا تو نسبتاً ایسے کلاس فیلوز سے پالا پڑ گیا جو میرے پہلے دوست

بنے، میری رنگت نے انہیں ''متاثر'' نہ کیا اور وہ سب میری قابلیت کے گرویدہ تھے، جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ انہیں کیا لالچ تھا، میرے نوٹس...... مگر کچھ دے کر اگر مجھے دوست مل گئے تھے تو سودا برا نہ تھا۔

انٹر اسکول کے بعد انٹر کالجیٹ مقابلوں، یونیورسٹی لیول ہو یا بین الصوبائی تقریری مقابلوں کا کوئی ایوارڈ اس پنڈال سے کوئی اور نہ لے جا سکا جس میں، میں موجود ہوتا...... سرمد جلال...... کامیابی اور ذہانت کا دوسرا نام تھا۔

صرف تعلیمی ہی نہیں...... مالی لحاظ سے بھی میں ان سب سے بہتر تھا اس لیے دوستیاں بڑھنے اور پھیلنے لگیں۔ یہاں کی تعلیم سے فارغ ہوا تو بابا نے مجھے پردیس جانے کا سندیسہ سنایا، بابا سے دوری کسی طور گوارا نہ تھی مگر انہی کے اصرار پر مجھے انگلینڈ جانا پڑا، جہاں ایک اور ہی جہاں آباد تھا، میری رنگت کسی کو نظر ہی نہ آتی تھی، سب میری قابلیت کے گن گاتے...... حالانکہ وہاں کسی کو میرے نوٹس کا لالچ بھی نہ ہوتا۔

لڑکیاں بھی تھیں میرے ساتھ اور وہ بھی مجھے کبھی حقارت سے نہ دیکھتیں، میں سوچتا کہ کاش میری ماں بھی انہی جیسی سوچ کی ہوتی تو میری زندگی میں یہ کمی نہ ہوتی۔ بابا نے مجھے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی، میری خاطر انہوں نے نادرہ خالہ کا رشتہ نا منظور ہونے کے بعد کسی سے شادی کرنے کا پھر کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ ماں کا خانہ خالی تھا میری زندگی میں، کبریٰ خالہ بھلا کہاں پُر کر سکتی تھیں اس خلا کو؟ میں کب ان سے ایسی محبت کر سکتا تھا جو میں اس ماں سے کرتا جو مجھے اپنے دودھ پر پالتی، اپنی گود میں کھلاتی، میری خاطر راتوں کو جاگتی، اپنا آرام اور سکون تج دیتی۔

کئی لڑکیوں نے میری طرف دوستی کی حد پار کرنے کو ہاتھ بڑھایا مگر میری رگوں میں ایک شریف باپ کا خون اور ذہن میں اس کی کی گئی نصیحتیں ہمیشہ تازہ رہتیں...... لڑکیاں میرے اس اجتناب کی وجہ سے مجھ میں اور بھی کشش محسوس کرتیں انہیں کب کسی نے یوں رد کیا ہوگا بھلا۔ میں وہاں تعلیم کے حصول کے لیے گیا تھا اور اپنی قابلیت اور بابا کی دعاؤں کے طفیل وہاں میں نے اپنی کامیابی کے خوب جھنڈے گاڑے تھے۔ گوروں کے دیس کی ہواؤں نے مجھ پر بھی اثرات مرتب کیے تھے، میری سیاہ رنگت شاید ایسی سیاہ نہ رہی تھی اور عمر کے ساتھ میں ایک نوعمر لڑکے سے بھرپور جوان میں تبدیل ہو چکا تھا، کسرتی جسم اور لباس پہننے کا سلیقہ میری بھدی شخصیت کو ایک پُرکشش شخصیت میں بدل چکا تھا۔ کئی ہاتھ میری طرف بڑھے مگر میں نے کسی کی حوصلہ افزائی تک نہ کی۔

☆☆☆

وطن واپس لوٹا تو لگا کہ ملک میں لوگوں کی سوچ بدل چکی ہے...... مگر جلد ہی اندازہ ہوا کہ لوگوں کی سوچ نہیں بلکہ میری شخصیت، میرا مقام اور میری اہمیت بدل چکی ہے۔ بابا نے اپنا سارا کاروبار میرے حوالے کر کے خود کو ریٹائر کر لیا تھا، میرے ساتھ ہر روز شام کو ایک سیشن ہوتا جس میں وہ مجھ سے دن بھر کی کارکردگی کا پوچھتے اور مجھے بتاتے کہ کہاں کیا اس سے بہتر ہو سکتا تھا...... وہ میرے لیے باپ کے علاوہ بہترین دوست بھی تھے، استاد اور میرے رہنما بھی، میں نے زندگی کے سارے درس انہی سے سیکھے تھے...... میں نے حالات سے لڑنا انہی سے سیکھا تھا۔ اب میں انہیں دیکھتا تو دکھ ہوتا کہ انہوں نے میرے بغیر کئی سال کیسے تنہا گزارے ہوں گے...... کاش انہوں نے اس وقت شادی کر لی ہوتی جب میں چھوٹا تھا، یوں تو وہ اب بھی ایسے اسمارٹ تھے کہ انہیں کوئی نہ کوئی رشتہ مل جاتا اور میں باتوں، باتوں میں ان سے کہتا تو وہ ہنس پڑتے اور

کہتے کہ اب ان کا نہیں بلکہ میری شادی کا وقت ہے......

جس طرح بابا نے میرے لیے اپنی زندگی تج دی تھی اسی طرح مجھے بھی ان کی محبت کا بدلہ دینا تھا...... مجھے ان کی تنہائی بانٹنا تھی...... شادی کے نام سے یوں بھی ڈرتا تھا کہ میری بیوی اگر میری ماں کی طرح نکلی تو میں مزید ٹوٹ جاؤں گا۔ میں شادی کر لیتا تو بابا مزید تنہا ہو جاتے، حالانکہ وہ کہتے تھے کہ انہیں تنہائی کی عادت ہو گئی تھی مگر جوں جوں ان کی عمر بڑھے گی ان کی صحت بھی متاثر ہو گی اور انہیں میری ضرورت اس سے بھی زیادہ ہو گی۔

''ہم ایک دوسرے کے سہارے زیادہ بہتر زندگی گزار سکتے ہیں بابا۔''

''ارے نہیں پگلے...... مجھے اب زندگی تمہاری خوشیوں کے ساتھ گزارنی ہے، تمہاری بیوی سے خدمت کروا کے، تمہارے بچوں کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر ٹہلتے ہوئے......'' بابا کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا تھا۔

''پاگل ہو گئے ہیں بابا......'' میں نے ہنس کر کہا تھا۔ ''اس دور میں اس طرح کی بہویں ناپید ہو چکی ہیں۔''

''ارے کیوں......'' بابا نے منہ بسورا۔ ''میں ڈھونڈ کر لاؤں گا ایسی ہی پیاری بہو اپنے بیٹے کے لیے۔''

''بابا...... آپ میری بات مانیں، نادرہ خالہ کو اب بھی یہاں لے آئیں......'' میں نے ان سے درخواست کی۔ ''میں گیا تھا ان سے ملنے...... بہنوں کی شادیوں کے بعد وہ بالکل تنہا ہو گئی ہیں، اپنی بھابیوں کے رحم و کرم پر پڑی ہیں، اکیلی رہ گئی ہیں وہ۔''

''کہاں ملے تھے تم انہیں؟'' بابا نے حیرت سے پوچھا، وہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنی ننھیال جاؤں، جہاں میری ایک دن بھی پذیرائی نہیں ہوئی تھی، مجھے اپنی بیٹی کی اولاد ہی نہ سمجھا تھا انہوں نے...... مگر وہ سمجھتے بھی کیسے جب ان کی بیٹی نے نہیں سمجھا تھا تو وہ کیونکر میری قدر کرتے۔

بابا نے سب بہنوں کی شادیوں میں کسی مہمان کی طرح شرکت کی تھی، وہ بھی شاید اس لیے کہ انہوں نے سارے اخراجات برداشت کیے تھے، بہنوں کو قدر آئی مگر بہت بعد میں...... اماں نے کسی کی شادی میں شرکت کی اور کسی میں وہ اپنی مجبوریوں کے باعث نہ آ سکی تھیں، اب باپ کی قدر کر کے وہ کیا کر لیتیں کہ اب تو ان کی اپنی سسرالیں ہی ان کے گھر تھے، ان سب کے رشتے نادرہ خالہ نے طے کیے تھے اور اچھی جگہوں پر کیے تھے...... یہ سب باتیں خالہ نے مجھے اس ملاقات میں بتائی تھیں جو ہماری ایک شاپنگ مال کے فوڈ کورٹ میں ہوئی تھی۔

میری نظریں انہیں تلاش رہی تھیں کہ وہ مجھ سے آ کر لپٹ گئیں۔

''آپ نے کیسے پہچانا مجھے خالہ؟'' میں نے سوال کیا تھا۔ ''میری رنگت سے ناں؟''

''فضول باتیں نہ کر، میری جان...... تم تو میرے لیے دنیا کے سب سے پیارے بیٹے ہو، سب سے انوکھے۔''

''انوکھا تو میں ہوں البتہ پہلے جملے سے مجھے انکار ہے......'' میں نے ہنس کر کہا تو انہوں نے میرے کاندھے پر چپت لگائی، میری روح کی گہرائی تک اس چپت میں چھپا ہوا پیار اتر گیا۔

''ایسی باتیں کر کے میرا دل نہ دکھایا کرو......''

''جس کی ماں......'' میرے حلق میں پھندے پڑنے لگے۔ ''اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟''

''جس کی ماں دنیا کی سب سے بڑی بے وقوف عورت ہو......'' خالہ نے اپنے آنسو پونچھے۔ ''اس سے بڑی بد قسمتی کیا ہو سکتی ہے اس عورت کی کہ وہ اس کے بعد ماں ہی نہیں بن سکی......''

''ماں تو وہ کبھی نہیں بنی تھیں خالہ...... انہوں نے تو

صرف بچے پیدا کیے تھے، وہ تو جانور بھی پیدا کر لیتے ہیں مگر...... جانوروں کو بھی تو اپنے بچوں سے محبت ہوتی ہے چاہے وہ جیسے بھی ہوں۔'' میرا دل کرب سے بھر گیا، آئس کریم کھاتے ہوئے خالہ سے باتیں ہوئیں، بار بار سوچتا تھا کہ میری اماں خالہ جیسی کیوں نہ تھیں۔ خالہ نے اپنے کئی دکھ میرے سامنے کھولے تھے۔

☆☆☆

بابا کو منانا بہت مشکل کام تھا مگر میں نے انہیں منا کر ہی دم لیا، نادرہ خالہ ہمارے گھر منتقل ہو گئیں مگر اس کے لیے انہیں بابا کے ساتھ شرعی رشتے میں بندھنا پڑا اور یوں ان دونوں کو عمر کے اس حصے میں ایک دوسرے کی رفاقت مل گئی جس نے ان دونوں کا مسئلہ حل کر دیا اور مجھے بھی خوشی محسوس ہوئی، میں تنگ نظر کبھی نہ تھا، بابا جب بھی شادی کر لیتے، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

پہلے بابا اکیلے میری شادی کے خواہاں تھے اب خالہ ان کے ساتھ تھیں، مہم تیز ہو گئی تھی تو میں نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔

''چاند سی دلہن لاؤں گی میں اپنے لعل کے لیے۔''

''پلیز خالہ...... چاند جیسی ہی لائیے گا......'' میں نے بے ساختگی سے کہا۔ ''کوئی نہ کوئی داغ ہو اس میں، بالکل چاند کی طرح۔''

''داغ کیوں ہو اس میں اللہ نہ کرے......''

''تا کہ اسے میرے تن کے داغ اور میری کمزوریاں بری نہ لگیں...... اس کا ظرف کتنا بھی بڑا ہو خالہ مگر جسے اس کی ماں نے دھتکار دیا ہو اسے کوئی اور لڑکی تب تک قبول نہ کرے گی جب تک اس لڑکی میں خود کوئی کمزوری نہ ہو...... چاہے کوئی بیوہ ہو یا مطلقہ خالہ...... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''اب تم بے وقوفی کی باتیں بند کرو گے یا مار کھاؤ گے مجھ سے......'' خالہ کوشش کے باوجود اپنے آنسو نہ چھپا سکیں۔ ''اللہ نے تمہارے لیے کوئی اتنی اچھی لڑکی رکھی ہو گی کہ تم اپنے سارے دکھ بھول جاؤ گے۔''

''بابا اور آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی غم نہیں ہے خالہ......'' میں نے انہیں ساتھ لپٹا لیا، ان کے وجود سے میرے لیے ممتا ہی ممتا جھلکتی تھی۔

اس کے بعد خالہ نے اپنی زندگی کا مقصد ہی میرے لیے لڑکیوں کو تلاشنا کر لیا تھا، اٹھتے بیٹھتے وہ میرے سامنے اپنے اس روز کی مصروفیات بیان کرتیں، کہاں کہاں وہ رشتے دیکھنے گئیں اور انہیں کس رشتے پر کیا اعتراض ہوا، کس لڑکی میں انہیں کیا پسند نہ آیا...... میں اس تفصیل کو سنتا اور ہنس دیتا، باتیں سنتے سنتے نیند آنے لگتی تو میں انہیں شب بخیر کہتے ہوئے بس اتنا ہی کہتا کہ وہ اپنا مشغلہ جاری رکھیں۔

☆☆☆

میرا نام نتالیہ ہے...... میں چھ بہنوں میں آخری تھی اور اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ سب حسن میں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، میں عام شکل صورت کی حامل تھی۔ بچپن سے ہی مجھے خود پر پڑتی نظریں محسوس ہوتیں جن میں ترس اور ہمدردی ہوتی، کوئی میرے منہ پر کہہ بھی دیتا اور میں کڑھ کر رہ جاتی۔ بچپن سے جوانی کی حدود میں قدم رکھا تب تک میری تین بہنیں بیاہ چکی تھیں، میں نے اپنی کمزوریوں کو اپنی تعلیمی کارکردگی کے پردے میں چھپا لیا تھا، کامیابیوں پر کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ رہی تھی...... بہنیں میٹرک پاس کرتیں تو رشتوں کی لائنیں لگ جاتیں، کسی نہ کسی کے نام قرعہ نکل آتا اور اپنے حسن کے بل بوتے پر انہوں نے عمر کے اس حصے میں ہی اپنی زندگیوں میں وہ مقام اور مرتبے حاصل کر لیے تھے جن کے لیے عام لڑکیاں سالوں جدوجہد کرتی ہیں۔

کالج میں پہنچی تو باقی دو بھی بیاہی جا چکی تھیں، میری ماں اتنی خوش قسمت عورت تھیں کہ ان کے سب داماد

عہدوں، مرتبوں اور سیاسی مقام میں ایک دوسرے کی ٹکر کے تھے، بڑے بڑے خاندانوں میں ان کے سمدھیانے تھے، ابا کی سرکاری ملازمت... معقول تو تھی مگر ایسی نہ تھی کہ انہیں ایسے عالی شان رشتے اپنی بیٹیوں کے لیے بے ڈھونڈے مل جاتے۔ میری فکر میں اماں مری جاتی تھیں۔ ''اسے کون پوچھے گا؟'' یہ وہ فقرہ تھا جس کی تسبیح وہ بلاناغہ دن میں دس بیس دفعہ کرتی تھیں...... میں اس گھر کا واحد نمونہ تھی جو کسی کو بھاتا ہی نہ تھا، واحد لڑکی جس کے توسط سے اس چھ بیٹیوں کے گھر میں پہلی بار رشتے کروانے والیوں کو آمدورفت کا موقع ملا تھا۔

اماں مجھ سے محبت تو کرتی تھیں مگر دل سے یہ احساس نہ جاتا کہ میری کم صورتی جانے مجھے کیا، کیا دکھ دکھائے گی۔ میں بظاہر اماں کی باتوں کو نظر انداز کرتی مگر ان کا کہا ہوا ایک، ایک حرف میرے دل پر نقش ہو جاتا تھا، کم صورتی نے مجھے بدمزاج بھی بنا دیا تھا...... بہنوں میں سے جو کوئی مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کرتی کہ میں اپنی شخصیت کو خوب صورت نہ ہونے کے باوجود بھی کس طرح بہتر بنا سکتی ہوں تو میں انہیں سنا ان سنا کر دیتی اور کہتی کہ وہ اپنے حال میں خوش رہیں اور میری فکر میں نہ مریں۔

تنہائی میں اپنا جائزہ لیتی تو اندازہ ہوتا کہ اگر میرے مزاج کا چڑچڑا پن کم ہو جاتا، میرے ماتھے کی تیوریاں ختم ہو جاتیں، خود ترسی سے نکل آتی تو شاید واقعی کچھ فرق پڑ جاتا...... یہ سب وہ نکات تھے جو بہنیں مجھے بتاتیں اور میں ان پر توجہ نہ دیتی مگر ان کی باتیں دل میں تو اترتی تھیں ناں۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں، میں نے اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑ دیے...... بڑے بڑے قابل طالب علموں کی دال میرے آگے نہ گلتی تھی، میں نے اپنی کمزوریوں کو جان لیا اور اپنی طاقت کے بوتے پر انہیں نظروں کے سامنے سے ہٹا دیا، کوئی میری کم صورتی کا نام بھی نہ لیتا تھا، ہر کوئی میرے گریڈز کی بات کرتا، میری ذہانت کی مثالیں دیتا، میری قوتِ گفتار اور فطانت کا ذکر کرتا۔ نتالیہ نام...... ذہانت کی علامت بن چکا تھا۔ یونیورسٹی میں ایک دو لڑکوں نے لائن مارنے کی کوشش کی تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کھلنڈرے اور عیاش تھے اور ان کا مقصد مجھ سے دوستی کر کے فقط امتحان کے دنوں میں میرے نوٹس سے فائدہ اٹھانا تھا، ایسی لڑکی میں ہرگز نہ تھی کہ خود کو کھلونا بننے دیتی، ایک عزتِ نفس ہی تو تھی میرے پاس۔

☆☆☆

سب سے اچھا دور وہ تھا جب ہم سب چھوٹے

چھوٹے تھے اور سب کزنز ہمارے ہاں آیا کرتے تھے، ہم چھٹیاں اکٹھے گزارتے اور وہ تین ماہ ہماری زندگیوں کے یادگار مہینے بن جاتے۔ پیڑوں کی چھاؤں میں دوپہریں بتانا، کھیل کھیلنا، آنکھ مچولی، للن میٹی، گڑیوں کی شادیاں، کسوٹی۔

نمک مرچیں لگا کر کچے آم، کچے امرود اور کچے پکے جامن کھانا...... اس عمر میں سب کزنز میں گروپ بن جاتے، کچھ دوستی کی بنا پر اور کچھ پسندیدگی کی بنا پر۔ فقط میں ہی تھی جس سے نہ کوئی دوستی کرنا چاہتا تھا نہ محبت۔

ہر کھیل میں، میں دونوں ٹیموں کا سانجھا کھلاڑی ہوتی کیونکہ کوئی مجھے مکمل اپنی ٹیم میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ بچپن کی یہ دوستیاں اور معصوم محبتیں کہیں کہیں ہی پنپ سکیں، زیادہ تر عمر کے ساتھ ختم ہو گئیں، میری بہنیں اپنی ان معصوم محبتوں کو تیاگ کر اپنے حسن کے بوتے پر دولت اور امارت کے پلڑے میں تل گئیں۔

بچپن میں ہم نے ایک دوسرے کے کھیل کے نام رکھے ہوئے تھے، جو کسی نہ کسی پس منظر کے ساتھ تھے، اچھا ہوا کہ یہ نام عمر کے اسی حصے میں رہ گئے اور ہم نے انہیں بھلا دیا، کبھی کبھار ان ناموں اور ان کے پس منظر کی یاد آتی ہے تو ہنسی نکل جاتی ...... بھنڈی، کھٹی، تتلی، چڑیا، بدلی، چونا، کچالو، شامی، کوئل، دھوپ، سرہانہ، مرچی، کاجل اور ایسے ہی نام! یہ سہانا دور کیسے بیت گیا، اس دور میں دوسروں کی کج ادائیاں تو محسوس ہی نہ ہوتی تھیں، اتنا ہی کافی تھا کہ ہر کھیل میں ہر کوئی شریک ہوتا، ہر چوری اور شرارت مل کر کی جاتی اور سب ایک دوسرے کے ہم خیال ہونے کے ساتھ ساتھ رازداں بھی ہوتے۔

معصوم محبتوں کا پنپنا بھی ممکن ہوتا کہ ہر کوئی اس راز کو بڑوں کے کانوں تک پہنچنے سے روکتا، میں دوسروں کی رازدار تو رہی مگر میرا کوئی رازدار نہ تھا، میں کبھی کسی کی اور کبھی کسی کی یک طرفہ محبت کے حصار بنا کر بیٹھ جاتی اور اپنے محبوب کی اداؤں پر قربان ہوتی رہتی، کبھی ہمت ہی نہ ہوئی کہ اظہار کرتی، بچپن بیت گیا اور ساری صحبتیں تتلی کے رنگوں کی طرح چھوٹ گئیں۔

سب لوگ اپنی، اپنی زندگیوں میں مصروف ہو گئے، خاندان کی کسی تقریب میں ملاقات ہوتی تو بچپن کو یاد کیا جاتا، ایک دوسرے کی بے وقوفیوں کے قصے دہرائے جاتے، بڑی بوڑھیوں کو فکر ہوتی کہ میری عمر نکلتی جا رہی تھی اور میرے ساتھ کی لڑکیاں کئی کئی بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔

"اس لیے خالہ کہ ان کی زندگیوں کا مقصد ہی بیاہ کرنا اور بچے پیدا کرنا تھا......" میں چڑ کر گستاخی سے کہتی۔ میں اس معاملے میں بہت حساس ہو جاتی تھی، ایسا نہیں کہ میرے لیے کبھی کوئی رشتہ نہیں آیا تھا، نہ ہی یہ کہ مجھے کوئی پسند ہی نہ آتا تھا بلکہ کسی کو میں پسند نہ آتی تھی، زیادہ تر معاملات میں ایسا ہی تھا۔

☆☆☆

شبینہ ماسی اس روز ہمارے ہاں آئیں تو اُن کی سانس خوشی سے پھول رہی تھی۔ "بس اب سمجھو کہ یہ میرا آخری پھیرا ہے...... نتالیہ کے جوڑ کا رشتہ میں نے ڈھونڈ لیا ہے...... لڑکے کی اماں تو مجھے عمرہ کروا رہی ہے...... تم بتاؤ کیا دو گی؟" اپنے منہ میں سموسہ ٹھونستے ہوئے انہوں نے کہا تو اماں سوالیہ نظروں سے ان کا منہ دیکھنے لگیں۔

"خالہ کوئی بہرہ، لولا، لنگڑا یا اندھا تو نہیں......؟" میں نے صوفے پر لیٹ کر ٹی وی دیکھتے ہوئے ان سے سوال کیا۔

"اسے کہو کہ اپنی زبان سنبھال کر بات کیا کرے، کنواری لڑکیوں کو یوں اپنے رشتوں کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔" خالہ کو برا لگا تھا۔

"دراصل میں خالہ...... ابا کی وفات کے بعد اب میں ہی تو ہوں اس گھر میں جس سے اماں مشورہ کرتی ہیں، چاہے وہ میری ہی شادی کا معاملہ ہو...... ویسے خالہ کیا شادی شدہ لڑکیاں بھی اپنی شادی کی باتیں کرتی ہیں؟" میں نے ہنسی دبا کر کہا۔ "اس لیے لڑکے کے بارے میں جو بھی سوال ذہن میں آئے گا وہ تو پوچھنا ہی پڑے گا، ابا ہوتے تو ان معاملات کی تفتیش وہ کر لیتے۔"

"تم تو منہ بند ہی رکھو بیٹا، جانتی نہیں ہو کہ کس گھر سے رشتہ لائی ہوں......" خالہ نے دوسرا سموسہ اٹھایا۔ "کیا ہی تمہاری بہنوں کے خاندان امیر ہوں گے جواں کا ہے...... کاروباری گھرانا ہے اور اکلوتا لڑکا......" میرا دل ایک بار تو ضرور دھڑکا۔

"تو انہیں کیا مجبوری ہو گئی خالہ...... ایسی جگہ رشتہ کرنے کی؟ بتیس سالہ لڑکی، جس کے ساتھ کی لڑکیاں اب جوان بچوں کی مائیں ہیں......" میں نے خاندان کی عورتوں کی کہی ہوئی بات دہرائی۔

"یوں تو نہ کہو بیٹا، اللہ نے تمہارے لیے مناسب وقت اور مناسب بر ضرور رکھا ہو گا...... انشاءاللہ" اماں نے فوراً کہا۔ "تم لے کر آؤ ان لوگوں کو شبینہ...... دینے دلانے میں کوئی کسر نہیں رکھوں گی انشاءاللہ۔"

☆☆☆

ایک خوب صورت سے ادھیڑ عمر جوڑے کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک تصویر ابھری...... کیسا بانکا سجیلا بیٹا ہو گا ان کا...... میں منتظر تھی کہ وہ کوئی تصویر وغیرہ ساتھ لائے ہوں گے یا کہیں گے کہ لڑکا لڑکی سے ملنا چاہتا ہے...... مگر...... کہا بھی تو کیا۔

"لڑکا ہماری خواہش پر سر جھکا کر، جہاں ہم کہیں گے وہیں شادی کرنے کو تیار ہے اسے لڑکی کو دیکھنے کی بھی خواہش نہیں ہے، البتہ آپ چاہیں تو لڑکی کو لڑکا دکھا دیں، اس کی تصویر چاہیے تو وہ ہم بھجوا دیتے ہیں۔"

اب وہ اتنے پُراعتماد تھے تو اماں کیا کرتیں، ان سے کوئی بات نہ بن پڑی، نہ ہی وہ کہہ سکیں کہ لڑکے کی تصویر بھجوا دیں۔

"آپ آئیں کسی وقت ہماری طرف...... ہمیں تو بچی پسند آئی ہے، آپ بھی آ کر ہمارا بیٹا دیکھ لیں۔" انہوں نے اماں کو دعوت دی اور میں لوٹ کر رہ گئی...... وہاں کون سا اماں مجھے ساتھ لے کر جائیں گی جو میں لڑکے کو دیکھ پاؤں گی۔

☆☆☆

بہنوں اور بہنوئیوں کی مجلسِ شوریٰ طلب کی گئی اور اس مسئلے کو ہنگامی بنیادوں پر غور کے لیے پیش کیا گیا، چند سالوں سے آنے والے رشتوں میں سے یہ واحد رشتہ تھا کہ جس پر میں نے چوں چرا نہ کی تھی۔

"آپ نے چیک کروایا اماں، سب ٹھیک تو ہے ناں......؟" عائشہ نے تشویش سے پوچھا۔ وہ مجھ سے ایک برس بڑی تھی مگر پندرہ سال پہلے اس کی شادی ہو گئی تھی۔ "کوئی عیبی شرابی نہ ہو، کوئی لولا لنگڑا۔"

"اور کچھ ہو نہ ہو...... اندھا تو ضرور ہو گا۔" اس کے شوہر ذاکر نے کہا۔

نظم

ہمدم میرے
جا کے پردیس
آنکھوں میں نہ کوئی
ملال رکھنا
تم زندگی ہو ہماری
جتنا ہو سکے
اپنا خیال رکھنا

شاعرہ: صاعقہ ریاض، حیدرآباد

"کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے......؟" میں نے تپ کر کہا، ذاکر سے میری خوب لگتی تھی۔

"بھئی کوئی اندھا ہی ہو گا ناں جسے تم پسند آئی ہو گی......" وہ منہ پھاڑ کر ہنسا تو تقریباً سب نے اس کی تائید کی۔

"تم آنکھوں والوں نے جن کو پسند کیا تھا...... اب وہ ساری پریاں بھی آٹے کی بوریاں بن چکی ہیں......" میں نے غصے سے کہا۔

"ہم نے کیا کہا ہے تم سے ثنا لیہ جو تم اتنا چڑ رہی ہو......" سلمٰی آپی نے منہ بسور کر کہا۔

"اس نے بات ہی ایسی کی ہے......" میں نے کہا تو اماں نے بیچ بچاؤ کروایا۔

"میرا خیال ہے کہ اسی ہفتے کسی دن چل کر لڑکا دیکھ آتے ہیں......" نعمان بھائی نے کہا تھا۔ اماں اور بہنوں نے تائید کی اور تین دن کے بعد ہی یہ قافلہ وہاں جانے کو تیار تھا۔ میں اس روز عجیب سی کیفیت میں تھی، میری میچورٹی اس وقت جانے کہاں چلی گئی تھی اور میں ایک الہڑ سی لڑکی کی طرح سوچ رہی تھی۔

"عائشہ لڑکے کی تصویر ضرور لانا...... ہو سکے تو اپنے فون سے تازہ کھینچ کر لانا، مانگنے پر کوئی اچھی تصویر ہی دیں گے ناں......" میں نے اپنے پرس میں سے ایک تصویر نکال کر عائشہ کو دی۔ "اگر وہ تصویر کا کہے تو اسے میری یہ تصویر دے دینا......"

"تم نے بھی تو یہی کیا ہے ناں......" عائشہ نے ہنس کر کہا۔ "عفت کی شادی کو دس برس ہونے کو ہیں اور تم اس وقت کی تصویر مجھے دے رہی ہو......" اس نے تصویر مجھ سے لے کر بہر حال اپنے پرس میں رکھ لی۔

"مگر تم لڑکے کی آج کی تصویر ہی کھینچ کر لانا......" میں نے اصرار کیا۔

"کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے؟" عائشہ نے ہنس کر کہا تو میں مسکرا کر رہ گئی۔ "ویسے مجھ سے پوچھو ناں ثنا لیہ...... ہم سب بہنوں میں سے تم سب سے اچھی ہو...... خوب صورتی سب کچھ نہیں ہوتی...... تمہارے پاس تعلیم ہے، ہنر ہے، ایک فرم میں اتنی اچھی جاب ہے کہ ماہانہ لاکھوں کماتی ہو، ہم ایک، ایک پائی اپنے شوہروں سے مانگتی ہیں اور ان سے پوچھ کر خرچ کرتی ہیں، تمہارا معاشرے میں مقام ہے......" اس نے میرا ہاتھ پیار سے تھام کر کہا۔ میں جانتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اس میں اس کے دلی جذبات شامل تھے...... وہ مجھ سے سب بہنوں سے قریب تھی اور پورے خلوص سے بات کرتی تھی۔ اماں بھی کبھی کبھار کہتی تھیں کہ دنیا کو میرے اندر کا حسن نظر نہیں آتا...... کوئی نہ کوئی صاحب نظر ہو گا تو اسے میرا حسن نظر آ جائے گا۔

"نہ لانا تصویر عائشہ......" میں نے اپنی تصویر بھی اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"کیوں بھئی کیا ہوا، ناراض کیوں ہو گئیں......؟" اس نے تصویر لینے کو ہاتھ بڑھایا۔

"ہرگز ناراض نہیں ہوں عائشہ......" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "اگر وہ بلائنڈ کھیل رہا ہے تو میں بھی بلائنڈ کھیلوں گی......" میں نے اسے اپنا فیصلہ سنایا۔

سب لوگ چلے گئے اور میں جانے کیسے سو گئی، خواب میں اور خیال میں کئی بت تراشے......

☆☆☆

"اس کے گھر والوں نے بھی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے سرمد۔"

"خالہ...... آپ نے انہیں میری تصویر دی کہ نہیں، میں لڑکی کو نہیں دیکھنا چاہتا مگر آپ اسے تو میری شکل دکھا دیں......"

"بیٹا اس کے سب گھر والے آئے تھے، میں نے اس کی بہن سے پوچھا کہ اگر اسے تصویر چاہیے تو لے جائے مگر اس نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں......"

"یقین نہیں آ رہا خالہ...... جس طرح آپ کہہ رہی ہیں کہ بولڈ سی لڑکی ہے اور کمپیوٹر کی اتنی بڑی فرم

میں اتنے اہم عہدے پر فائز...... ایسے کیسے بغیر دیکھے شادی کرنے کو تیار ہو گئی ہے؟"

"تم نے بھی تو میرے انتخاب پر اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی لڑکی کو دیکھنا چاہا ہے...... اسی طرح اسے بھی اپنے گھر والوں کے انتخاب پر اعتماد ہے بیٹا، تم خود ترسی چھوڑو، خوش قسمت ہو تم دونوں۔" خالہ کے تسلی دینے کے باوجود میرے اندر ایک کھٹک سی تھی کہ کہیں وہ لڑکی مجھے شادی کے بعد دیکھ کر نہ دھتکار دے مگر یہ سوچ کر خود کو تسلی دیتا کہ اگر اللہ نے اسے میرے لیے بنایا ہے تو مجھے ہی ملے گی اور اگر وہ میری صورت کو ناپسند کرے گی تو میں اپنی محبت سے اس کا دل جیت لوں گا...... میں نے معاملہ کلی طور پر اللہ پر چھوڑ دیا اور اپنے روشن مستقبل کی دعائیں کرنے لگا۔

☆☆☆

"میرے خیال میں ایک دفعہ لڑکے اور لڑکی کی ملاقات کروانا ضروری ہے اماں......" یہ ناعمہ کی آواز تھی۔

"ہوں......" اماں نے سینے کی گہرائی سے ہنکارا ابھرا۔

"ایسا نہ ہو کہ بعد میں وہ ہمیں الزام دے......" سلمٰی کچھ سوچ کر بولی۔

"مجھے تو لڑکا اچھا لگا ہے ویسے...... تمہارا کیا خیال ہے شہزاد بیٹا؟" اماں نے سب سے بڑے داماد سے پوچھا۔

"اچھا ہے لڑکا اماں، قابل ہے، ذہین ہے، اسمارٹ ہے، اچھا کاروباری ہے اور تعلیمی ریکارڈ بھی ثنا لیہ کی ٹکر کا ہے......" وہ ذرا رک کر بولے۔ "دیکھ لیں...... اگر آپ کو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی اور آپ مطمئن ہیں تو......" انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ویسے جیسی وہ ہے، اس لحاظ سے یہ رشتہ بہت اچھا ہے، اس سے اچھے کی توقع کرنا فضول ہے......" ذاکر نے کہا۔ "عمر بھی نکلتی جا رہی ہے اس کی اور کوئی گلفام تو اترنے سے رہا اس کے لیے......"

"اب اتنی بُری بھی نہیں ہے ہماری بہن......" سلمٰی لاکھ مجھ سے پُرخاش رکھتی تھی مگر ذاکر کے منہ سے میرے بارے میں ایسے الفاظ سن کر وہ رہ نہ سکی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی یہ ساری گفتگو سن رہی تھی۔

"تم اپنا دل چھوٹا نہ کرو......" عائشہ میرے پاس چلی آئی تھی۔ "اتنا بڑا گھر ہے کہ مجھے اپنا گھر چھوٹا لگنے لگا، لڑکا انگلینڈ سے پڑھا ہوا، کئی قسم کی ڈگریاں حاصل کر رکھی ہیں اس نے...... تمہاری ٹکر کا لڑکا ہے پیاری......"

"پیاری...... ہونہہ!" میں نے طنزیہ کہا۔ "اب یہ بھی بتا دو کہ اس لڑکے میں عیب کیا ہے جس کی وجہ سے وہ مجھ جیسی عام سی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

"تم عام نہیں ہو ثنا لیہ......" عائشہ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "تم میں وہ خاص بات ہے جو ہم باقی بہنوں میں سے کسی میں نہیں......"

"اشتہاروں کی زبان نہ بولو عائشہ...... مجھے حقیقت بتا دو، جیسی بھی ہے......" میں نے دل کڑا کر کے کہا۔

"یقین کرو، کوئی بڑی بات نہیں ہے...... بس ذرا لڑکے کا رنگ دبتا ہوا ہے...... ہمیں اس لیے لگا شاید کیونکہ ہم سب گورے ہیں اور وہاں بیٹھے ہوئے ہم زیادہ ہی گورے لگ رہے تھے......"

"مگر اس کے ماں باپ تو اتنے صاف رنگ کے تھے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"اس کے سوا کوئی اور بات نہیں جو ہم لوگ اعتراض کر سکیں......" عائشہ نے کہا۔ "اور تم چاہو تو میں تمہیں کسی نہ کسی طرح اس لڑکے سے ملوا بھی سکتی ہوں۔"

"نہیں ٹھیک ہے...... اگر تم اتنی تسلی دے رہی ہو تو ٹھیک ہی ہو گا......" میں نے ہولے سے کہا۔ "کوئی تصویر بھی تو نہیں کھینچ کر لائیں تم۔"

"کوئی موقع ہی نہیں ملا...... سب لوگ وہاں تھے اور صاف لڑکے کو علم ہو جاتا کہ میں اس کی تصویر کھینچ رہی ہوں...... اگلی دفعہ کوشش کروں گی، پکا وعدہ......"

☆☆☆

وہ تو وعدہ کر گئی مگر وہ اگلی بار آئی ہی نہیں اور میں ایک بڑی سی تقریب میں نکاح کے دو بولوں میں بندھ کر سرمد کی ہو گئی، تمام تقریب کے دوران سرمد کو دیکھنے کا موقع ہی نہ ملا کہ وہ میرے ساتھ بیٹھ ہی نہ سکے تھے، تمام وقت وہ حاضرینِ محفل کے ساتھ مصروف رہے۔ ہماری شادی کی تقریب شہر کی یادگار اور اہم تقریبات میں سے ایک تقریب تھی...... نہ صرف میرا بلکہ سرمد کا بھی حلقۂ احباب وسیع تھا، کاروباری دنیا کے لاتعداد شرکا تھے۔ مہمان رخصت ہونا شروع ہوئے تو مجھے اسی فائیو اسٹار ہوٹل کے ایک سوئٹ میں پہنچا دیا گیا جو خاص ہماری شبِ عروسی کے لیے بک کروایا گیا تھا اور اس کی سجاوٹ دیدنی تھی۔

میں نے اچھی طرح کمرے کا جائزہ لیا، سرمد یقیناً لوگوں کو رخصت کر کے آتے، سو میرے پاس کافی وقت تھا، میں نے خود کو آئینے میں دیکھا، مجھے خود یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی پیاری لگ رہی تھی۔ میں نے اپنا لباس اور زیورات وغیرہ درست کیے...... اور جب کافی دیر گزر گئی تو اس دبیز صوفے کے ایک طرف گھونگٹ کاڑھ کر بیٹھ گئی، یہ میرے مزاج کے بھی خلاف تھا اور آج کل کی روایات کے بھی مگر سوچا کہ جس نے شادی سے پہلے نہ دیکھنے کی شرط رکھ دی تھی، اسے اب بھی ترسا ترسا کر شکل دکھاؤں گی۔

"کیا میری شکل ایسی ہے کہ میں کسی کو ترسا ترسا کر دکھاؤں......؟ وہ میری شکل دیکھ کر بھاگ تو نہیں جائے گا؟" اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں ایک اہم مقام پر پہنچ کر بھی اپنی کم صورتی کے کمپلیکس کا عفریت مجھے سر اٹھا کر جینے نہیں دیتا تھا...... میں جانتی تھی کہ لوگ مجھ سے ڈرتے بھی تھے اور احترام بھی کرتے تھے اور اس کی وجہ تھی میری اپنے مقام کی اہمیت اور میرے اختیارات...... مگر ایسا نہیں ہوا کہ کوئی مجھے دیکھتا تو اس کے دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہوتیں۔ جس عمر میں میری باقی بہنیں بیاہی گئی تھیں، میری اس عمر کو بیتے بھی پندرہ سولہ برس بیت چکے تھے، اب ان کے بچے میرے کاندھوں کو چھوتے تھے اور مجھے اب تک کوئی اظہارِ محبت سننے کو نہیں ملا تھا۔

"چلو...... آج سن ہی لیں گے۔" میں نے دھڑ دھڑاتے دل کو تسلی دی۔

☆☆☆

اپنا آپ، اپنا گھر اور اپنے گھر کے مکین...... سب کچھ دان کر دیا تھا اس نے مجھے، میں ہواؤں میں اڑ رہی تھی، دل کی دھڑکنیں قابو سے باہر ہو رہی تھیں، اس نے اپنی جیب سے ہیرے کی قیمتی انگوٹھی نکالی تھی، مجھے گھونگٹ کی اوٹ سے اس ڈبیا کے کھلنے پر اس ہیرے کی خیرہ کن چمک دکھائی دی، کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی اور پس منظر میں ہلکی موسیقی، میں نے انگوٹھی پہننے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور نظر اٹھا کر اس ہاتھ کو دیکھا جو مجھے انگوٹھی پہنانے کو بڑھا تھا، مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا...... میرا ہاتھ ان ہاتھوں میں بادلوں میں چھپے چاند جیسا لگ رہا تھا۔ مجھے کرنٹ لگا، اور میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، اس سے زیادہ کی میری سکت نہ تھی، میرا وجود کپکپانے لگا...... چند لمحوں میں، میں نے خود کو سنبھالا اور اپنا ہاتھ آگے کر دیا، اس نے جلدی سے انگوٹھی پہنائی۔

پھر وہ یوں صوفے سے اٹھا جیسے اسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو اور میری سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی...... کیا ہوا تھا میرے ساتھ، اتنا بڑا جھوٹ...... اتنا بڑا دھوکا...... کیوں چھپایا تھا سب لوگوں نے مجھ سے اس حقیقت کو؟ میں رات بھر نزع کے عالم میں

صوفے پر بیٹھی رہی اور وہ بیڈ پر اوندھے منہ...... اس نے مجھے دیکھ کر کیا سراہنا یا جھٹلانا تھا، میں ہی اس کے نظارے کی تاب نہ لا سکی تھی۔ کاش میں اسی وقت اماں کو کال کر کے بلاتی اور ان سے پوچھتی کہ کیا قصور تھا میرا کم شکل ہونے میں کہ انہوں نے مجھ سے اتنا بڑا انتقام لیا تھا۔

وہ شاید سو رہا تھا...... میں رو رہی تھی اور ایک کمرے میں ہم دو نفوس، ایک شرعی رشتے کی ڈور میں بندھے ہوئے...... دنیا کی گویا دو انتہاؤں پر تھے، ہم نے ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھا تک نہیں تھا، مجھ میں تاب نہ تھی اور اس میں طلب...... میں نے بہت دکھی کر دیا تھا اسے مگر اس میں میرا کیا قصور تھا، دھوکا ہی ایسا ہوا تھا میرے ساتھ......

☆☆☆

میں سر جھکائے ناشتے کی پلیٹ سے کھیل رہی تھی اور نظر بار بار اس گہری رنگت والے ہاتھ کی طرف جاتی تھی جس میں تھامے ہوئے سفید کپ اور پلیٹ ان کی سیاہی کو اور بھی نمایاں کر رہے تھے...... ایک توس پر مکھن اور جیم لگا کر اس نے میری پلیٹ میں رکھا اور میری طرف بڑھایا۔

"اگر تم کھیل چکی ہو تو اب کچھ کھالو......" مجھے اتنی گھن آئی، ان ہاتھوں سے تھامے ہوئے سلائس کو میں کیونکر کھا سکتی تھی۔

"میرے ہاتھ سیاہ ضرور ہیں مگر گندے نہیں ہیں نتالیہ......"

"کیا ہم گھر جا سکتے ہیں؟" مجھے اس کمرے میں اس کے ساتھ تنہا وحشت محسوس ہو رہی تھی۔

"چلیں گے......" اس نے چائے کا کپ بنا کر میری طرف بڑھایا، غالباً یہ سب کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا مگر اس طرح کے شخص کے لیے؟ ہرگز نہیں۔

"مجھے بالکل بھوک نہیں ہے...... میرے لیے زحمت نہ کریں۔"

کون

راستہ نہیں ملتا
منجمد اندھیرا ہے
پھر بھی باوقار انساں
اس یقیں پر زندہ ہے
برف کے پگھلنے میں
پو پھوٹنے کا وقفہ ہے
اس کے بعد سورج کو
کون روک سکتا ہے

شاعر: احمد ندیم قاسمی، پسند: ڈاکٹر کومل ستار
لیاقت میڈیکل یونیورسٹی جامشورو

"کچھ کھالو، گھر جانے سے پہلے مجھے تم سے کچھ اہم باتیں کرنی ہیں نتالیہ......" اس نے کپ ہاتھ میں تھام کر میری طرف بڑھایا، طلب تو ہو رہی تھی چائے کی اور پھر کون سا اس چائے کو اس کے ہاتھوں نے چھوا تھا۔ "میری طرف دیکھو......" میں نے نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر نظر جھکا لی۔ "میں اس سب کی توقع کر رہا تھا نتالیہ اور یقین کرو کہ بغیر دیکھے شادی کرنے کا خیال نادرہ خالہ کا تھا میرا نہیں...... وہ جانتی تھیں کہ کوئی کسی کے اندر کی خوب صورتی کو نہیں ڈھونڈتا، سب ظاہر کے پجاری ہوتے ہیں، تم نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ تم عام لوگوں سے مختلف نہیں ہو، حالانکہ میں نے سنا تھا کہ تم بہت پڑھی لکھی اور میچور لڑکی ہو......"

"آئی ایم سوری......" اگرچہ میرا ارادہ یہی تھا کہ گھر پہنچ کر اس کے ماں باپ سے بات کروں گی کہ انہوں نے مجھ سے اتنا بڑا دھوکا کیوں کیا...... پھر اپنے گھر والوں کو کال کر کے بلاؤں گی اور اسی روز واپس چلی جاؤں گی، بھلے نہ ہو میری شادی عمر بھر مگر مجھے ایسی شادی سے کنوارا رہنا ہی بھلا...... مگر دھوکا

تو صرف مجھے ہی دیا گیا ہے، چائے کا کپ حلق میں اترتے ہی دماغ کام کرنے لگا، گھر والوں نے تو اسے دیکھ رکھا تھا، انہیں بلا کر کیا کہوں گی۔

''کس بات پر سوری کہا تم نے؟''

''میں نے آپ کو ہرٹ کیا......'' میں نے بہ مشکل معذرت کی، چاہے مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا تھا مگر اس کا دل تو دُکھایا تھا میں نے۔

''کوئی نئی بات نہیں...... اسی لیے تو میں نے اپنی عمر کے اتنے برس شادی نہیں کی، مجھے علم تھا کہ آنکھوں دیکھی مکھی کوئی نہیں نگلتا...... اور تم تو پھر ایک ایسی عورت ہو جس سے میرا کوئی جسمانی، قلبی اور ذہنی تعلق قائم ہی نہیں ہوا...... مجھے تو میری اماں نے رد کر دیا تھا نتالیہ...... اس کے بعد کسی عورت کا رد کرنا برا نہیں لگتا......'' اچانک میری نظر اٹھی اور مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملاتے ہوئے نظر آئے...... فقط چند لمحے میں نے ان آنکھوں میں دیکھا۔ ''یہ نہ سمجھنا کہ تمہاری ہمدردی حاصل کرنے یا تمہارا دل جیتنے کو ایسا کہہ رہا ہوں، صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم میری بیوی ہو......'' اس کا یوں کہنا مجھے کیسا عجیب سا لگا تھا۔ خود کو اس کی بیوی کہنا شاید میرے لیے کبھی باعثِ فخر نہ ہوتا۔

''آج کا دن میرے ساتھ گزار لو یہاں، شام کو ولیمہ ہے یہیں پر اور ہمیں یہیں قیام کرنا تھا۔ پروگرام میں کوئی تبدیلی ہوئی تو بابا کو کھٹک جائے گا اور وہ پریشان ہو جائیں گے...... چاہو تو میں دوسرا کمرا بک کروا لیتا ہوں یا باہر چلا جاتا ہوں، گھوم پھر آتا ہوں مگر وہ بھی شاید اچھا نہ لگے...... بہت سے لوگ جانتے ہیں مجھے اور ہوٹل کا اسٹاف ہی کئی کہانیاں بنا کر نشر کر دے گا...... صرف آج برداشت کر لو، اس کے بعد کسی بات پر مجبور نہیں کروں گا، بے شک تم اپنی اس سوچ پر بھی عمل کر لینا......''

''کون سی سوچ؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''کہ تم میرے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتیں......'' میں نے چونک کر اسے دیکھا، کس قدر گہری نظر تھی اس کی۔ ''میں نے عمر بھر کسی لڑکی کو چھوا تک نہیں نتالیہ...... کئی کی میں نے خواہش کی ہوگی اور کئی کے دلوں نے میری مگر میں جانتا تھا کہ ہر لڑکی اس عمر میں خوبرو شہزادوں کے سپنے بُنتی ہے، میں کسی کے سپنوں کا شہزادہ نہیں ہو سکتا مگر ہر ماں باپ کی طرح میرے ماں باپ نے بھی اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے تمہیں تلاشا اور اتنا منفرد پایا کہ مجھے اس بات کی ضمانت تک دے ڈالی کہ تم ہی میرے لیے بہترین ساتھی ہو سکتی ہو......'' وہ رکا۔ ''کاش نادرہ خالہ اتنا بڑا جوا نہ کھیلتیں تو دو زندگیاں برباد نہ ہوتیں۔''

''آپ اپنی اماں کو خالہ کیوں کہتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''کیونکہ وہ میری اماں نہیں ہیں، خالہ ہیں، بابا کی میں نے زبردستی ان سے شادی کروائی ہے چند برس پہلے......''

''اوہو...... آپ کی اماں کا کب انتقال ہوا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''عین اس وقت جب میں پیدا ہوا تھا......'' اس نے بتایا۔ ''ماں مر گئی، مامتا مر گئی، میری ماں نے مجھے اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ میں ان کی طرح خوب صورت نہیں تھا، اپنی بہنوں کی طرح حسین نہ تھا، میں ugly duckling تھا......'' میرے دل میں واقعی کچھ ٹوٹا۔

''مجھے دکھ ہوا......'' میں نے فقط اتنا کہا۔

''مجھے بہت دکھ ہوگا نتالیہ تمہیں داغدار کرتے ہوئے، کاش نادرہ خالہ تمہیں میری تصویر بھجوا دیتیں تو اس طرح کے حالات میں تمہیں چھوڑنا نہ پڑتا......'' وہ سسکا۔ ''اس عمر میں تمہاری شادی ہوئی ہے اور ساتھ ہی اگر تمہیں طلاق کا داغ لگ گیا تو لوگ

تمہارے بارے میں جانے کیا، کیا باتیں کریں گے...... مجھے واقعی دکھ ہوگا، آئی ایم سو سوری!''

طلاق؟ میں نے خود ہی سوچا کہ کب میں نے اس سے طلاق کا مطالبہ کیا تھا، کہہ کر چاہے نہ سہی مگر میرے عمل نے تو اسی بات کو ثابت کیا تھا ناں...... فون کی گھنٹی بج رہی تھی، میں نے دیکھا، عائشہ کا نمبر تھا، میں نے فون آن کیا۔

''کیسی ہو؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ہوں......'' میں نے گہری سانس لی۔

''کوئی بے وقوفی والی سوچ تو نہیں سوچ رہیں؟'' عائشہ نے اگلا سوال کیا۔

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے......'' میں نے گول مول بات کی، سرمد اٹھ کر باہر نکل گیا اور بالکونی میں کھڑا ہو گیا...... ''شرم بھی نہیں آئی تمہیں میرے ساتھ یوں کرتے ہوئے، تم سب لوگوں کو......'' میں سسکنے لگی۔

''حوصلہ کرو نتالیہ...... کوئی بے وقوفی والی بات سرمد بھائی کے سامنے نہ کرنا، ان کا دل نہ دُکھانا۔''

''کسی کو میرے دل کی پروا ہے......؟ میں نہیں رہ سکتی اس آدمی کے ساتھ ایک دن بھی نہیں، ایک لمحہ بھی نہیں...... اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے دل نے اسے قبول ہی نہیں کیا، میرے اور اس کے درمیان اجنبیت کی دیوار اسی طرح کھڑی ہے جس طرح نکاح سے پہلے تھی اور میرے اندر اتنی کراہت اور نفرت بھری ہے کہ میں اسے قبول ہی نہیں کر سکتی، جو کچھ تم لوگوں نے کیا ہے وہ کسی دشمنی سے کم نہیں...... اماں کو بھی پوچھوں گی میں عائشہ کہ کس جنم کا بدلہ لیا ہے انہوں نے مجھ سے...... اگر میں کم صورت یا بد صورت تھی تو میں نے تو خود کو نہیں بنایا تھا ناں...... اماں نے ہی جنم دیا تھا مجھے، اسی وقت مار دیتیں مجھے، اتنے بد صورت آدمی سے بیاہ کر مجھ سے کس جرم کا بدلہ لیا ہے تم سب نے......؟'' میں ہچکیوں سے رونے لگی۔

''وہ بد صورت نہیں ہے میری جان اور اسے بھی اللہ نے ہی بنایا ہے...... کسی کو کسی پر رنگت کی بنا پر کوئی فوقیت نہیں ہے نتالیہ جان......''

''اپنی کتابی باتیں اپنے پاس ہی رکھو......'' میں نے فون کان سے ہٹایا...... فون بند کرنے سے پہلے اس کی آواز آ رہی تھی۔ ''میرے آنے تک کوئی بے وقوفی نہ کرنا نتالیہ......'' اور وہ میں کر چکی تھی، فون بند کر کے میں نے صوفے سے ٹیک لگا کر اپنے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا۔

''خود کو پریشان نہ کرو...... جو کچھ تم چاہو گی ویسا ہی ہوگا......'' وہ میرے پاس ہی کھڑا مجھے ٹشو پیپر پیش کر رہا تھا۔ ''تم اٹھ کر کپڑے بدل لو، تیار ہو جاؤ، میرا خیال ہے کہ ہم گھر چلتے ہیں، دن بھر مجھے دیکھتی رہو گی تو رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لو گی، شام کو ولیمہ ہے اور میک اپ سوجی ہوئی آنکھوں پر اچھا نہیں لگے گا......'' میں نے خاموشی سے اٹھ کر غسل خانے کا رخ کیا، رات کا میک اپ منہ دھونے سے بھی نہ اترا تھا، دوبارہ منہ دھویا اور لوشن لگایا تو میری اصلی شکل نکل آئی، وہی عام سی معمولی شکل...... کاجل لگا کر، پرفیوم اسپرے کر کے میں باہر نکلی، سرمد تو پہلے سے ہی تیار تھا۔ ''سامان یہیں رہنے دو، تین دن کی بکنگ ہے ہماری...... گھر پر ساری بہنیں آئی ہوئی ہیں...... میری زندگی میں پہلی بار اور بابا کا خیال تھا کہ ان سب کے لیے گھر پر قیام کا انتظام ہونا چاہیے...... اب کے آئی ہیں پھر شاید کبھی نہ آئیں۔''

''اچھا، ایسی کیا بات ہے؟''

''پھر کبھی بتاؤں گا......'' کہہ کر وہ باہر کی طرف نکلا اور میں نے اس کی تقلید کی پھر کبھی، ہونہہ...... جیسے میں اس کے ساتھ ہی رہوں گی ہمیشہ......

☆☆☆

اس کے والدین اور بہنوں نے ہمارا ئیر تپاک

استقبال کیا، اس کی بہنیں بھینچ بھینچ کر مجھے گلے مل رہی تھیں اور ہماری پیاری بھابی...... جانو بھابی کے القاب مجھے کیسی منافقت لگ رہے تھے، پیاری تو میں تھی نہیں، جانو میں کیسے ہوگئی تھی ایک ہی دن میں ...... میں بھی مسکرانے کی کوشش کررہی تھی جو کامیاب ہی نہیں ہو پارہی تھی۔

''سدا سہاگن رہو...... سکھی رہو، خوش رہو، پھلو پھولو......'' نادرہ خالہ کے انداز میں محبت، خلوص تو تھا مگر مجھے اس سے وحشت ہو رہی تھی، وہ بھی اس دھوکا دہی کا حصہ تھیں...... بابا نے بھی مجھے اپنے کندھے کے ساتھ لگایا، ان کے وجود سے مجھے اپنے باپ جیسی خوشبو آئی اور میرا دل ان کے کندھے سے لگے رہنے کو ہمکنے لگا۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں بیٹا......؟'' بابا نے سوال کیا، کتنی گہری نظر تھی ان کی، ان کے بیٹے نے تو میرے دل کی سوچ تک پڑھ لی تھی اور وہ تو اس کے باپ تھے۔

''جی......'' میں نے مختصراً کہا۔

''یہ سب بہنیں ہیں سرمد کی...... اور اب تمہاری بھی، سب شادی شدہ ہیں اور پہلی بار باپ کے گھر آئی ہیں......'' وہ رکے۔ ''ماں کے جانے کے بعد یہ سب ننھیال میں اپنی خالہ نادرہ کے پاس ہی رہ کر پلی ہیں جو اب تم سب لوگوں کی ماں ہے...... سرمد نے سب کچھ بتا دیا ہوگا تمہیں۔''

''جی......'' میں نے پھر ہولے سے کہا۔

''خالہ کچھ اور بھی بولتی ہیں ہماری بھابی؟'' ایک بہن نے شوخی سے کہا تو باقی ہنس دیں۔

''تنگ نہ کرو میری بیٹی کو......'' خالہ نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''پہلا دن ہے اس کا اس گھر میں اور پہلی بار ہی تم سب لوگوں سے مل رہی ہے......''

''چلو اب تم لوگ جاؤ اپنے، اپنے کمروں میں اور اپنی، اپنی تیاری دیکھو لو ولیمے کی......'' خالہ نے سب کو بھگا دیا۔

''تم کچھ ٹھیک نہیں لگ رہیں بیٹا؟'' ان کے جانے کے بعد خالہ نے میری طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ جانتی ہیں خالہ سب کچھ......'' سرمد نے فوراً کہا۔ ''اس وقت اس سے سوال نہ کریں، خواہ مخواہ دوبارہ رونا شروع کردے گی، شام کو ولیمہ ہے، اس کے بعد بیٹھ کر بات ہوسکتی ہے کہ اس کا کیا فیصلہ ہے۔''

''کس بات کا فیصلہ؟'' خالہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' بابا نے بھی سوال کیا۔

''کہا تھا آپ لوگوں سے کہ دو زندگیوں کو خراب نہ کریں......'' سرمد کی آواز ذرا بلند ہوئی تو خالہ نے لپک کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور اسے کاندھوں سے تھام لیا۔ ''کہا تھا میں نے خالہ...... کوئی لڑکی اتنا ظرف نہیں رکھتی، کیوں کوئی مجھے اپنا کر خوش ہوگی جب میری اپنی ماں نے ہی......''

''بس کرو سرمد......'' خالہ نے غصے سے کہا۔

''بند کرو اس کو یاد کرنا، میں ہوں ناں تمہاری ماں، کیوں یاد کرتے ہو اس ناقدری کو بار بار......''

''خالہ، آپ نے جان بوجھ کر ثنالیہ کو اس حال میں پھنسا دیا ہے جس میں رہ نہیں سکتی وہ، رہے گی تو اس کا دم گھٹے گا اور رہائی پائے گی تو ایک داغدار کہلائی جائے گی......''

''تم خاموش رہو فی الحال...... ولیمہ ہو جانے دو پھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں......'' خالہ نے سرمد کی کمر سہلائی، بابا بالکل خاموش تھے، ان کے چہرے پر تکلیف ہی بول رہی تھی کہ وہ یہ سب سن کر کتنے دکھی ہوئے تھے۔ میں جتنا بھی ان کی تکلیف کو دل سے محسوس کرتی، اس پر یہ دکھ غالب آرہا تھا کہ ان سب لوگوں نے مل کر میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔

''سرمد بہت پیارا انسان ہے ثنالیہ...... اس کی

خوب صورتی صرف ان لوگوں کو نظر آتی ہے جو ظاہری خوب صورتی کو اتنا اہم نہیں سمجھتے بیٹا، مجھے تم ایسی ہی لگیں پہلی ملاقات میں...... سمجھدار، خود بھی اس تلخ تجربے سے گزر چکی تھیں تم، جہاں تمہاری باطنی خوب صورتی کو سب نظر انداز کرتے تھے سوائے تمہاری اپنی ماں کے......'' وہ رکیں۔ ''تاہم بیٹا کوئی بھی فیصلہ جلد بازی میں نہ کرو، اللہ تعالیٰ جب انسانوں کے جوڑے مقرر کرتا ہے تو اس میں اس کی وہ خاص مصلحت ہوتی ہے، جسے ہم نہ سمجھتے ہیں نہ جانتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے خالہ...... جس طرح آپ کہیں اور ثنالیہ...... تم پر کوئی جبر ہے نہ زور...... کوئی حق ہی نہیں مجھے تمہیں باندھ کر رکھنے کا اگر تم نہیں چاہو گی تو...... اس لیے جب اور جس طرح تم کہو گی، ویسا ہی ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا اور مجھے اس کے بابا کی آنکھ کے گوشے پر روشن وہ جگنو نظر آیا جسے چھپانے کی کوشش بھی انہوں نے نہ کی تھی۔

''پیارا انسان...... ہونہہ!'' میں نے دل ہی دل میں خالہ کے الفاظ کو طنز سے سوچا۔ ''اگر ایسا ہی گلفام تھا تو کیوں اتنے برس انتظار کرتا رہا، وقت پر شادی کرلیتا ناں......'' اس وقت مجھے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میری شادی کی عمر پر بھی کئی فالتو سالوں کی تہیں لگ چکی تھیں۔

☆☆☆

شادی کے لال جوڑے نے مجھ پر روپ چڑھایا تھا تو ولیمے کے گلابی جوڑے میں، میں اس سے کہیں خوب صورت لگ رہی تھی، میرے چہرے پر ہلکے سے حزن نے میری عام سی صورت میں بھی نکھار پیدا کر دیا تھا۔ ہر کوئی مجھے دیکھ کر سراہ رہا تھا، مجھے اندازہ ہوگیا کہ کیوں کل بھی سرمد تمام وقت میرے ساتھ نہیں بیٹھا تھا، لوگ موازنہ کرتے اور کوئی کچھ نہ کچھ کہہ دیتا جو اس کے لیے شرمندگی کا باعث بنتا۔ ولیمے کے دن بھی وہ لوگوں کے ہجوم میں گھلا ملا ہوا تھا، اس روز چونکہ میں نے گھونگٹ نہیں کاڑھ رکھا تھا اس لیے ہر بار جب وہ کسی گروپ کے ساتھ اسٹیج پر تصویر بنوانے کو آتا اور ان سے میرا تعارف کرواتا تو میں دل ہی دل میں لوٹ جاتی۔

اس کے دفتر کے لوگوں کا گروپ اسٹیج پر آیا، ان لوگوں کے چہروں پر مجھے وہ احترام نظر آیا جو مجھے اپنے ماتحتوں سے ملتا تھا...... ان میں کئی لڑکیاں بھی تھیں جو بہت خوب صورت اور مجھ سے کہیں کم عمر...... اگر وہ خوب صورت ہوتا تو ان میں سے کوئی نہ کوئی اسے پسند کرلیتی۔

''بہت ہی خوش قسمت ہیں آپ بھابی...... اتنا نیک اور شریف انسان آپ کو زندگی کے رفیق کے طور پر ملا ہے......'' کسی لڑکی نے کہا تھا، میں نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ کافی خوب صورت تھی، اگر اسے موقع ملتا تو کیا وہ اس سے شادی کرلیتی؟ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''ان کے کردار کی تو میں بھی قسم کھانے کو تیار ہوں......'' ایک اور لڑکی نے کہا۔ ''ہم جیسے لوگوں کے کہاں ایسے نصیب بھابی!''

غرض ہر کوئی سرمد کی تعریفوں کے پل باندھ رہا تھا، میری کیفیت کو جانے بغیر...... میرے دل کا حال پوچھے بغیر...... میری بدقسمتی کو خوش قسمتی کہتے ہوئے وہ سب مجھے اپنا ٹھٹھا اُڑاتے ہوئے لگ رہے تھے۔

میکے والے آئے تو ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے کہ جانے کیا معرکہ سر کرلیا ہو انہوں نے...... تمام وقت موقع ڈھونڈتی رہی، جب موقع ملا تو اماں نہ ملیں اور جب اماں پاس آئیں تو کوئی نہ کوئی اور ایسا موجود ہوتا کہ بات ہی نہ ہو پاتی۔ ولیمے کی تقریب کے تمام ہوتے ہی جب اماں لوگوں نے اجازت چاہی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ مجھے

ساتھ نہیں لے جا رہے تھے۔
"مجھے بھی آپ کے ساتھ جانا ہے اماں......" میں نے بچوں کی طرح ضد کی۔
"بیٹا میں نے بہن جی سے بات کی ہے کہ سرمد کی سب بہنیں صرف دو ایک روز کے لیے یہاں ہیں اور وہ سب مل کر تم دونوں کے لیے ایک چھوٹی سی تقریب اپنی خوشی کے لیے کرنا چاہتی ہیں...... وہ چلی جائیں تو اس کے بعد جب، جب چاہے تم چلی جایا کرنا...... یہ چند میل کے فاصلے پر ہی تو میکا ہے تمہارا...... اگر آج جانا چاہو تو بھی ذرا ٹھہر کر لباس وغیرہ تبدیل کر کے سرمد کے ساتھ جا کر چکر لگا آنا بیٹا۔"
"ہاں، ہاں یہ ٹھیک ہے نتالیہ......" اماں نے فوراً ان کی تائید کی۔
"مجھے ابھی اسی وقت آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے اماں اور اگر آپ اسی طرح اداکاری کرتی رہیں گی تو میں شور مچانا شروع کر دوں گی...... مجھے معلوم ہے کہ عائشہ نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔"
"بے وقوف نہ بنو......" اماں نے میری کلائی کو غصے سے تھام کر کہا۔ "نہ ہی یہاں تماشا کھڑا کرو، دو ایک دن میں تم یا میں کہیں بھاگ نہیں رہے...... صبر کر لو! کوئی قیامت نہیں آ رہی ہے کہ تم انتظار نہ کر سکو اور یہاں کیا بات ہو گی، گھر جا کر لباس وغیرہ تبدیل کرو، زیور اتارو اور پھر ڈرائیور کو ساتھ لے کر اکیلے آ جانا یا میں ذاکر کو بھیج دوں گی۔"
"ٹھیک ہے...... آپ ذاکر کو بھجیں......" میں نے اپنی کلائی چھڑائی، اچھا ہے کہ گھر پہنچنے تک ذاکر کو سارا پس منظر بتا دوں گی۔ ظاہر میں وہ میری جتنی بھی مخالفت کرتا ہو مگر اصل میں ہم دونوں میں بہت دوستی تھی اور میں اس سے ہر بات اسی طرح کہہ سکتی تھی جیسے ہم اپنے دوستوں سے کہہ سکتے ہیں۔

☆☆☆

"میں تو اسے تمہاری بے وقوفی ہی کہوں گا نتالیہ......" گاڑی چلاتے ہوئے اس نے میری "مظلومیت" کی داستان سن کر بڑے تحمل سے کہا۔
"کیا؟ میری بے وقوفی یا تم لوگوں کی مجھ سے دھوکا دہی؟"
"کیا دھوکا دیا گیا ہے تمہیں...... تم نے خود ہی عائشہ سے کہا تھا کہ اگر لڑکا تمہیں دیکھے بغیر شادی کرنا چاہتا ہے تو تم بھی اسے دیکھے بغیر شادی کرو گی۔" اس نے زور سے کہا۔ "کہا تھا یا نہیں؟"
"کہا تھا مگر......" میں ہکلائی۔ "میں تو نہیں جانتی تھی کہ اگر وہ کسی طرح سے بھی معذور نہیں تو...... کم از کم آپ سب لوگوں نے دیکھا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ اپنے ساتھی کے انتخاب میں، میں کس، کس پہلو کو سوچ سکتی تھی، میں کم صورت سہی ذاکر مگر میری رنگت تو صاف ہے ناں..."
"خدا کے لیے نتالیہ...... رنگت کو اتنا اہم مسئلہ نہ بناؤ کہ اس کو لے کر تم اپنی اور سرمد کی زندگی اجیرن کر لو...... اس میں کوئی جسمانی نقص ہے نہ شرعی عیب...... وہ اپنا دامن بچا کر زندگی گزارنے والا مرد ہے نتالیہ اور یہ مرد کی بہت اہم خوبی ہوتی ہے...... ہم لوگ بھی اس جیسے باکردار نہیں ہیں، میں بھی نہیں...... میری زندگی میں بھی کئی گوشے ہیں، کئی پہلو ہیں جو میری بیوی کے علم میں نہیں، اگرچہ اس سے اسے کوئی فرق نہیں پڑنے والا مگر اسے مجھ پر بداعتمادی تو ہو سکتی ہے ناں۔"
"آپ یہ سب اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ کو ایک بدصورت جیون ساتھی نہیں ملا...... میں سمجھتی تھی کہ آپ مجھے جانتے ہیں اور آپ سے بڑھ کر کسی کو میرے اس مسئلے کا احساس نہیں ہوگا، مگر آپ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں......" وہ بہت کچھ کہتا رہا اور میں نہ سننے کی اداکاری کرتی رہی، گھر پہنچی تو میرا منہ سُوجا ہوا تھا، میں نے اپنا بیگ صوفے پر پھینکا اور

دہاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ سب لوگ وہیں تھے، بہنیں اور ان کے شوہر...... اماں نے مجھے کندھوں سے تھام کر صوفے پر بٹھا دیا اور مجھے رونے دیا، کوئی مجھے تسلی نہیں دے رہا تھا اور مجھے تو یوں لگا کہ وہ سب بہرے تھے، کوئی مجھے سن ہی نہ رہا ہو جیسے...... میں سب سے چھوٹی اور سب کی لاڈلی اس وقت یوں تھی جیسے دیارِ غیر میں، میں کسی میلے میں کھو گئی تھی، کوئی مجھے پہچان بھی نہیں رہا تھا۔
آنسوؤں کی بھی ایک حد ہوتی ہے، میری دہاڑیں پہلے ہچکیوں میں اور پھر سسکیوں میں بدلیں اور ایک وقت آیا کہ میں سسکیاں لے کر بھی تھک گئی...... میرے روتے روتے ہی بہنیں اپنے، اپنے کمروں میں چلی گئی تھیں، صرف اماں، ذاکر اور عائشہ بیٹھے رہ گئے۔
"تھک گئی ہوگی رو رو کر......" ذاکر نے جوس کا گلاس میری طرف بڑھایا۔ "یہ پی لو تا کہ تمہیں رونے کے لیے ہمت مل جائے......" میں نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں کچھ نہ تھا، میں شرارت ڈھونڈ رہی تھی۔
"میرے ساتھ کیوں کیا ایسا اماں آپ سب نے؟" میں نے جوس کا گلاس ہاتھ سے ہٹایا۔
"تمہارے بھلے کے لیے...... تمہیں اچھا مستقبل دینے کے لیے......" اماں نے کہا۔
"اسے اچھا مستقبل کہتی ہیں آپ...... اتنے تاریک مستقبل کو اچھا کہتی ہیں آپ......؟" میں نے غصے سے کہا تو ذاکر کی ہنسی نکل گئی۔
"اچھا اگر کافی رو لیا ہے تو اٹھ کر منہ دھو لو پہلے......" عائشہ نے کہا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے میک اپ بھی نہیں اتارا تھا جو کہ اب جانے کس طرح میرے منہ پر پھیل چکا ہوگا۔ خاموشی سے اٹھ کر میں اپنے کمرے کی طرف چلی جہاں ساری بہنوں کے بچے سو رہے تھے، غسل خانے کے آئینے پر نظر پڑتے

ہی مجھے اپنی شکل نظر آئی تو میں بھوت لگ رہی تھی...... کوئی مجھے اس حال میں دیکھتا تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ میں خود اس وقت کتنی بدصورت لگ رہی تھی، وہ میں جاننا نہیں چاہتی تھی، کاجل کی سیاہ لکیریں میرے گالوں پر چل رہی تھیں جیسے میں نے کسی جوکر کا میک اپ کر رکھا ہو۔

پانی میں بھی بڑی طاقت ہے...... واپس آئی تو میرے وجود کی جلن بھی آنکھوں کی جلن کے ساتھ کم ہو چکی تھی۔ میں اسی صوفے پر ٹک گئی، اماں نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا، میں خاموشی سے لیٹ گئی۔

''تمہیں وقت بتائے گا کہ میرا انتخاب تمہارے لیے اچھا تھا یا نہیں، ممکن ہے کہ میں نہ ہوں وہ وقت دیکھنے کے لیے مگر تم خود اعتراف کرو گی...... اس کی اچھائی دیکھنے کے لیے جس دیدۂ بینا کی ضرورت ہے وہ ابھی تمہارے پاس نہیں ہے......''

''اس سے اچھا تھا اماں کہ میں نابینا ہوتی، مجھے اس کو دیکھنا ہی نہ پڑتا......'' میں سسکی۔ ''مجھے اس سے کراہت محسوس نہ ہوتی......''

''یوں نہیں کہتے بیٹا...... کالے رنگ سے نفرت کرنا، اللہ کی بنائی ہوئی چیز سے اتنی کراہت کرنا، گناہ ہوتا ہے نتالیہ......'' اماں نے فوراً میرے منہ پر ہاتھ رکھا...... ''دنیا کی ہر عورت اپنا گھر بسانے کو نابینا بن کر رہتی ہے بیٹا، ہر مرد میں کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ جسے نہ دیکھا جانا، نہ جاننا ہی عورت کے حق میں بہتر ہوتا ہے...... نظر انداز کرتی ہے تو گھر بستے ہیں بیٹا...... تم ہو نہیں تو خود کو نابینا سمجھنا شروع کر دو......''

اماں کی یہ دلیل میرے اوپر سے ہی گزر گئی۔

''میں خوش نہیں ہوں اماں اور ناخوشی میں جینا نہیں چاہتی......''

''خوشی تو ایسی تتلی ہے بیٹا کہ ہم لاکھ اس کے پیچھے بھاگیں، ہاتھ نہیں آتی اور آ جائے تو اس کے رنگ چھوٹ جاتے ہیں اور وہ ہمیں بری لگنا شروع ہو جاتی ہے...... خوشی دسترس میں نہ ہونے والی چیز کا تصور ہی تو ہے اس سے زائد کچھ نہیں......'' ذاکر چلا گیا تو اماں اور عائشہ دیر تک مجھے سمجھاتی رہیں جب تک کہ باہر سرمد کی گاڑی کے ہارن کی آواز نہ آئی، گھر میں اتنے ڈرائیور ہوتے ہوئے اور اپنی بہنوں کے مہمان ہونے کے باوجود وہ خود مجھے لینے آیا تھا، میں خاموشی سے ان لوگوں سے ملی جو اب تک جاگ رہے تھے اور میرے جانے کا سن کر اپنے، اپنے کمروں سے نکل آئے تھے۔

سرمد نے آگے بڑھ کر میرے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا، میں خاموشی سے بیٹھ گئی، منہ سے شکریے کا لفظ بھی نہ نکلا، سر جھکا کر اس نے اماں کو تعظیم دی اور گھوم کر آ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

''آئس کریم کھاؤ گی؟'' سرمد نے پوچھا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''ناراض ہو مجھ سے؟''

''نہیں......'' میں نے مختصراً کہہ کر نگاہیں کھڑکی سے باہر جما دیں، نظر کو کسی اور طرف مرکوز کر کے ہی زندگی گزر سکتی ہے، میں باہر کے نظاروں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

بہنوں کی طرف سے دعوت ایک پوری تقریب تھی، اماں کے ساتھ میری سب بہنوں کو مع اہل و عیال بلایا گیا تھا اور دونوں طرف آبادی کافی تھی اس لیے حاضرین کی تعداد بلا مبالغہ سیکڑوں میں تھی۔ خالہ نے اس روز بھی اصرار کر کے مجھے پارلر بھجوایا تھا جہاں سے تیار ہو کر میں سیدھی اسی ہوٹل میں پہنچی جہاں پر دعوت کا بندوبست تھا۔ ہال میں تیز موسیقی کے ساتھ بچے رقص کر رہے تھے، ہنسی تھی، مسکراہٹیں تھیں اور قہقہے تھے...... ایک میں ہی تھی جو اندر تک مغموم تھی اور کسی چیز سے لطف اندوز نہیں ہو رہی تھی۔ خود کو مہمانِ خصوصی کہلوا کر بھی میں کوئی خصوصی سلوک

نہیں روا رکھ پا رہی تھی ان سب کے ساتھ...... وہ اپنی محبت کا اظہار لفظوں اور بوسوں سے کر رہی تھیں، فخر سے اپنے سسرالیوں سے میرا تعارف کروا رہی تھیں...... ہماری اکلوتی بھابی...... اتنی لائق ہیں، اتنی ذہین اور میں...... شاید میرا منہ سوجا ہوا تھا جو ذاکر نے مجھے ملتے ہوئے کہا کہ کسی اور کی نہیں تو اپنی خاطر ہی مسکرا دوں کہ کوئی ایک آدھ اچھی تصویر بن جائے...... میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ اماں کی اتنی طویل تقریر اور سمجھانے کا اثر فقط اتنا ہی ہوا تھا کہ میں نے سرمد کو فی الفور چھوڑنے کا ارادہ چند دنوں تک کے لیے مؤخر کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ نہیں رہنا تھا...... یہ میرا حتمی فیصلہ تھا۔

کون رہ سکتا ہے کسی کے ساتھ یوں ساری زندگی کہ جس کو دیکھنے کو جی نہ چاہے، آنکھ دیکھی مکھی کون نگل سکتا ہے بھلا...... سرمد کی بہنیں اس تقریب کے بعد واپس چلی گئیں۔ اماں نے فون کیا کہ وہ مجھے لینے آ رہی ہیں تو میں نے منع کر دیا، مجھے جا کر ان کی نصیحتیں نہیں سننا تھیں، اپنی حکمتِ عملی وضع کرنا تھی اور اس کے لیے مجھے تنہائی چاہیے تھی جو سرمد کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے میسر تھی، ہم تین دن سے ساتھ ہونے کے باوجود کوسوں میلوں کی دوری پر تھے۔

☆☆☆

''یہ تمہارا اور سرمد کا کمرا ہے بیٹا......'' خالہ نے میرا سامان پہلے ہی رکھوا دیا تھا، کھانے کے بعد انہوں نے مجھے آرام کرنے کو کہا اور میری رہنمائی اس کمرے تک کی۔ ''تم آرام کرو، شام میں بات ہو گی، مجھے تم سے کچھ اہم باتیں کرنا ہیں بیٹا......''

''جی اچھا......'' کہہ کر میں نے ان سے جان چھڑائی، میرے اندر کا ابال انہیں دیکھتے ہی ٹھنڈا پڑ جاتا تھا، اتنی بارعب اور نفیس سی شخصیت تھی ان کی۔

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو اپنی بیڈ سائڈ کی میز پر نصب گھنٹی کے بٹن کو دبا دینا، کوئی نہ کوئی آ جائے گا اور انٹرکام بھی رکھا ہے جو سیدھا باورچی خانے میں ہے، بٹن دبا کر جو بھی بنوانا ہو، باورچی کو بتا دینا...... وہ بنا دے گا، ہر طرح کے کھانے وغیرہ بنا دیتا ہے......'' انہوں نے وضاحت کی اور باہر نکلیں تو میں نے گہری سانس لی۔

اب مجھے بہت کچھ سوچنا تھا، اس سے پہلے میں نے کمرے کا جائزہ لیا، وسیع کمرا، ہلکے رنگ کے دبیز قالین، کھڑکیوں پر پڑے بھاری پردے، جن کے عقب میں جالی کے پردے تھے، بیڈ پر بچھا ہوا مخملیں بیڈ کور...... بہترین انتخاب کی عکاسی کرتا تھا، غالباً سب کچھ سرمد نے خود چنا ہوگا...... انتخاب تو اس کا اچھا ہے ہی...... میں نے بیڈ کے کراؤن پر لگے ہوئے بڑے سے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔

سائڈ ٹیبل پر ایک قیمتی سا فون پڑا تھا اور ایک ٹیب...... میں نے انہیں دیکھا، بالکل نیا نکور...... اپنی طرف سے اٹھا کر میں نے انہیں درمیانی میز پر رکھ دیا، کمر ٹکا کر بیڈ پر لیٹی ہی تھی کہ سرمد کمرے میں آ گیا۔

''خالہ کا خیال ہے کہ مجھے بھی آرام کرنا چاہیے، پچھلے چار دنوں نے بہت تھکا دیا ہے......'' اپنی ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا...... ہوتا جو وہ کوئی پیکرِ جمال تو اپنی پوروں سے اس کی تھکن چن لیتی مگر اسے دیکھ کر ہی اس تصور سے کراہت آئی، لاکھ چاہتی مگر خود کو اس سے باز نہ رکھ پاتی۔ یہ سوچ کر کہ اب وہ اس بیڈ پر لیٹے گا، جہازی سائز کا ہونے کے باوجود مجھے لگا کہ میں اس کے بہت قریب ہو جاؤں گی۔ میں اٹھ بیٹھی، کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ میرے گریز کو محسوس نہ کرتا۔

''لیٹی رہو تم......'' اس نے فوراً کہا۔ ''میں اس بیڈ پر نہیں سوؤں گا......'' اس نے ایک دیوار کا پردہ ہٹایا جو میں نے ہٹا کر نہیں دیکھا تھا، میں سمجھی کہ کھڑکی ہو گی مگر وہ متصل کمرا نظر آیا۔ ''میرا زیادہ تر وقت

ویسے بھی لائبریری میں ہی گزرتا ہے...... میں وہیں لیٹ جایا کروں گا تا کہ تمہیں تکلیف نہ ہو......"

"میں وہاں سو جاتی ہوں......"

"یہ گھر اور یہ کمرا اب تمہارا پہلے ہے اور میرا بعد میں......" وہ اس کمرے کی طرف بڑھ گیا اور میں آرام سے لیٹ گئی، کھانے کا خمار چڑھا اور جانے کتنی ہی دیر سوتی رہی تھی میں، جاگی تو شام ڈھل رہی تھی، سرمد کمرے میں نہ تھا۔ میں نے اٹھ کر شاور لیا اور عام سے کپڑے پہن کر باہر نکلی، اندازے سے لاؤنج کا رخ کیا، جہاں گھر کے باقی لوگ چائے پر میرا انتظار کر رہے تھے۔

"تھکاوٹ اتری ہماری بیٹی کی یا نہیں......؟" بابا نے شفقت سے پوچھا۔

"جی......" میں نے مختصراً کہا اور کپوں میں چائے انڈیلنے لگی۔

"بھئی میری اور سرمد کی بحث ہو رہی تھی کہ اب تمہیں ملازمت جاری رکھنی چاہیے یا چھوڑ دینی چاہیے......" بابا نے مسکرا کر کہا۔ میں خاموش رہی۔

"بابا کہتے ہیں کہ تمہیں ملازمت کی ضرورت نہیں...... جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ جس کے پاس ٹیلنٹ ہو، اسے ضرورت ہو نہ ہو...... اپنے ٹیلنٹ کو آزمانا ضرور چاہیے......" سرمد یوں بات کر رہا تھا جیسے وہ اپنی بہت چاہنے والی بیوی سے بات کر رہا ہو۔

"میں پہلے بھی ضرورت کے لیے جاب نہیں کر رہی تھی بابا...... اور اس جاب سے جو تنخواہ مجھے ملتی ہے وہ میری ضرورت سے بہت زیادہ ہے......"

"ارے واہ......" بابا نے کہا۔ "پہلی لڑکی دیکھی ہے یار جو کہہ رہی ہے کہ پیسہ اس کی ضرورت سے زیادہ ملتا ہے اسے۔ میں نے تو کسی کو ایسا قناعت پسند نہیں دیکھا اور لڑکیوں کی ضروریات تو کبھی ختم ہی نہیں ہوتیں......" وہ ہنس کر سرمد سے کہہ رہے تھے۔

"نتالیہ عام لڑکی نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں قناعت پسند بھی ہے۔" خالہ نے کہا تو ان کی بات کی تہہ میں چھپے مطلب کو غالباً صرف میں ہی سمجھ پائی تھی۔ بابا اور خالہ چائے پی کر چہل قدمی کے لیے لان میں گئے تو ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔

"مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں، اس کا فیصلہ مجھے خود ہی کرنا پسند ہے، مجھے دوسروں کے اشاروں پر ناچنے کی عادت ہے نہ ہی اپنے فیصلوں اور اپنی زندگی کے معاملات میں کسی کی دخل اندازی کرنا پسند ہے...... خواہ وہ آپ ہوں، خالہ یا بابا......" میں نے غصے سے کہا اور پیر پٹختی واپس اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

"مجھے تمہارا اس انداز سے بات کرنا قطعی پسند نہیں آیا نتالیہ......" وہ میرے پیچھے پیچھے ہی کمرے میں آ گیا تھا۔ "کوئی میرے بابا اور خالہ کی توہین کرے...... ہرگز نہیں نتالیہ!" اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "تمہیں مجھ سے نفرت ہے تو مجھ سے بات کرو، کوئی زور زبردستی نہیں، تم چھٹکارا چاہتی ہو تو میں ایک لمحہ نہیں ضائع کروں گا تمہیں آزاد کرنے میں...... میں اگر چار دن سے تمہارا یہ رویہ اور بدتمیزیاں برداشت کر رہا ہوں تو اس لیے نہیں کہ مجھے تم سے کوئی لالچ ہے...... صرف اس لیے کہ مجھے بابا اور خالہ سے محبت ہے، میں انہیں کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا...... میرے صبر اور میری برداشت کو نہ آزماؤ، تمہیں فیصلے کا اختیار دیا ہے تو مجھے اپنا فیصلہ جب چاہے سنا دینا لیکن اس کے بعد تم نے بابا یا خالہ سے اس طرح بات کی تو میں خود ہی فیصلہ کر لوں گا...... مجھے گھر میں ڈیکوریشن پیس رکھنے کا کوئی شوق نہیں۔"

وہ میرے سر پر بم پھوڑ کر چلا گیا...... جس بات سے مجھے اماں نے بارہا منع کیا تھا وہی ہوا تھا۔ میں نے اپنے غصے میں ان بزرگوں کا احترام بھی بھلا دیا تھا اور ان کے سامنے بدتمیزی سے بات کی تھی۔ حالانکہ

میں اس بات کا خود بھی اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے ایسے شفیق بزرگ کہیں نہیں دیکھے تھے۔ مجھے دل میں احساسِ شرمندگی ہوا مگر اب اس کا کیا فائدہ۔

مجھے جو بھی منصوبہ بندی کرنا تھی اسی گھر میں رہ کر کرنا تھی، اماں کے پاس جاتی تو وہ نصیحتوں کے انبار لگا دیتیں اور میں کچھ بھی نہ کر پاتی۔ تب تک، جب تک کہ میں کسی آپشن پر غور نہ کر لیتی، کوئی راستہ نہ پا لیتی، تب تک مجھے یہ سب برداشت کرنا تھا۔

☆☆☆

"یہ فون اور ٹیب تمہارے لیے لایا تھا میں انگلینڈ سے......" سرمد نے میری طرف دونوں چیزیں بڑھائیں۔

"آپ رکھیں، میرے پاس فون ہے اور ٹیب میں استعمال ہی نہیں کرتی......" میں نے ادائے بے نیازی سے کہا۔ "اور اگر مجھے کچھ چاہیے ہوگا تو میں خود لے لوں گی۔ میرے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔"

"کمی نہ بھی ہو تو تم عورتوں کو خود پر رقم خرچ کرنے کا کوئی شوق نہیں ہوتا چاہے خود اپنی محنت سے کماتی ہوں...... بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اپنی کمائی کو ہر عورت بچا بچا کر رکھتی اور شوہر کے پیسوں کو خرچ کر کے خوشی محسوس کرتی ہے۔" اس نے ہنس کر کہا تو میں جل گئی...... جیسے کوئی بہت پیار کرنے والے شوہر اور بیوی کے مابین مکالمہ ہو رہا ہو۔

"شکریہ!" کہہ کر میں نے دونوں چیزیں تھام لیں، ظالمانہ تجزیہ تھا اس کا، واقعی میں اپنی تنخواہ میں سے اپنے لیے کوئی بڑا اخرچہ کرتے ہوئی دس بار سوچتی تھی۔ کپڑے، جوتے وغیرہ تو عام سی چیزیں ہیں، بہنوں اور ان کے بچوں کے علاوہ اماں کے لیے بھی کبھی کبھار کسی موقع کی مناسبت سے تحائف بھی لے لیتی تھی مگر واقعی اس طرف خیال نہ کیا تھا کہ سائنس کی یہ جدید ایجاد میرے پاس ہو اور پوری دنیا سکڑ کر میری مٹھی میں آ جائے۔ ایک اتنی بڑی فرم کے کمپیوٹر سیکشن کی انچارج ہونے کے باوجود میں نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔

"استعمال تو کرنا آتا ہوگا ناں تمہیں؟" اس نے پوچھا تو میں صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔ "یوں ہی پوچھ لیا تھا، میں نے لیا تھا تو مجھے تو استعمال نہیں کرنا آتا تھا۔"

"اسی لیے آپ نے مجھے دے دیا؟" میں پھٹ سے بولی۔

"یہ تمہارے ہیں، سفید رنگ میں اور اسی طرح کے سیاہ میں میرے پاس ہیں۔" اس نے اپنے والے اپنے دراز سے نکال کر مجھے دکھائے...... "میں نے سوچا ہمارے ساتھ میچنگ ہو جائیں گے......" وہ خود ہی ہنس کر اپنی بات سے لطف اندوز ہو رہا تھا، مجھے اس کی اس بات پر تو نہیں البتہ اسے ہنستے دیکھ کر ضرور ہنسی آ گئی، اس کی ہنسی کو بریک لگ گئی اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا...... "تم ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو!"

☆☆☆

میں جو شادی کے ساتھ حسین تصورات سجا بیٹھا تھا، کئی دن گزر جانے کے بعد بھی اس تصور کے حقیقت میں ڈھلنے سے محروم تھا۔ زندگی پہلے اتنی مشکل نہ تھی جتنی اب لگ رہی تھی مگر خالہ کہتی تھیں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا! خالہ تو بھولی ہیں، انہوں نے شاید دیکھا نہیں کہ نفرت میں عورت کس حد تک چلی جاتی ہے، ماں کو اپنی ممتا بھی یاد نہیں رہتی۔

مجھے نتالیہ سے کوئی امید نہیں کہ وہ بدل سکتی ہے، جس طرح اس نے مجھے دھتکارا ہے اس سے وہ میرے دل میں بس ہی نہیں سکی اگر میں خاموش ہوں تو اس مصلحت پر کہ میں بابا اور خالہ کو اس عمر میں کوئی دکھ نہ دوں۔ مشکل سے اور جانے کس طرح چکر چلا کر خالہ نے ایک لڑکی سے اس بندھن میں مجھے باندھ تو دیا ہے جس میں دونوں فریقین ایک دوسرے

کے لیے اجنبی تھے مگر اجنبیت کی یہ دیوار جو شرعی رشتے میں بندھ کر پاٹ لی جاتی ہے، ہم دونوں کے بیچ اسی طرح قائم تھی۔

شکل سے تو نتالیہ بھی ایک عام سی لڑکی تھی مگر اس کے اندر جو غرور مجھے دیکھنے کے بعد سے اُمڈ آیا تھا اور جس طرح اس نے پہلی نظر میں ہی مجھے رد کر دیا تھا، اس کے بعد میرے دل میں بھی اس کے لیے اتنی کشش نہیں رہی تھی۔ خالہ تو کہتی تھیں کہ میں اسے محبت سے جیت لوں گا مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری کس بات کو وہ غلط سمجھ لے اور ہمارے درمیان خلیج مزید گہری ہو جائے۔ میں نے اس سے بھی عہد کیا تھا اور خالہ سے بھی کہا تھا کہ جب بھی وہ مجھ سے علیحدگی کا مطالبہ کرے گی...... میں اس کا مطالبہ تسلیم کرنے میں دیر نہیں کروں گا مگر خالہ کو میری اس بات سے بھی اختلاف تھا اور وہ مجھے منع کرتی تھیں کہ میں اس کے مطالبے کو بلا چون و چرا نہ مانوں...... ایسی کوئی صورت حال آئے تو انہیں بتاؤں اور وہ اسے سمجھانے کی کوشش کریں گی۔ میں نتالیہ کی طرف سے کسی بھی وقت اس مطالبے کا انتظار کر رہا تھا، وہ جانے کس بات کا انتظار کر رہی تھی۔

☆☆☆

تھوڑی دیر پہلے ہی سرمد مجھے شب بخیر کہہ کر اپنی لائبریری میں سونے چلا گیا تو میں ٹیب پر فیس بک کھول لی...... پہلے اکاؤنٹ میں اپنے خاندان کی مصروفیات اور گپ شپ چیک کی...... میری شادی ہی ابھی تک گرما گرم موضوع تھا، میری شادی کی تصاویر جو مختلف لوگوں نے اپ لوڈ کر رکھی تھیں...... ان پر اہلِ خاندان کے کھلے تبصرے...... کوئی مجھے خوش نصیب کہہ رہا تھا اور کوئی سرمد کو، ملی جلی رائے تھی اور میں حیران ہو رہی تھی انہیں پڑھ پڑھ کر، کون لوگ تھے جن کو سرمد پسند آیا تھا۔

"دولھا کیسا ہے تیرا......؟" ایک بے تکلف سہیلی کا سوال تھا۔ وہ ان تصاویر کو نہیں دیکھ سکتی تھی جو مختلف لوگوں نے لگائی تھیں، سو سوچا کہ سرمد کی اور اپنی ایک تصویر لگا دیتی ہوں، اسے جواب مل جائے گا مگر وہ اتنی frank تھی کہ اس کی منہ پھٹ رائے کو میری فیس بک پر سب لوگ دیکھتے، اس لیے میں نے لکھا۔

"دیکھنے کے لیے گھر آنا ضروری ہے......"

"یہ کس طریقے کی دعوت ہے بی بنو؟ صحیح طرح سے انوائٹ کرو......" اس کا جواب آیا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے sign out کیا اور اپنی دوسری ID سے facebook کھولی، اس پر میرے خاندان کے لوگ تھے نہ نزدیکی سہیلیاں، بہت کم لوگ میری اس ID کو جانتے اور اس اکاؤنٹ پر میرے دوست تھے...... کئی دنوں سے اسے کھولا نہیں تھا اس لیے سیکڑوں پیغامات جمع ہو چکے تھے، انہیں delete کرنے میں جانے کتنا ہی وقت لگ گیا۔

"ہائے تتلی!" اتنا مختصر مگر اتنا جھنجھوڑ دینے والا اور کوئی پیغام مجھے ID پر نہیں مل سکتا تھا، یہ میری انتہائی پرائیویٹ ID تھی اور اسے گنتی کے چند لوگ جانتے تھے، جن میں سے زیادہ تر میرے کام کے سلسلے میں مجھ سے رابطہ کرتے تھے۔

"heedy" یہ کون ہے؟ میں نے خود سے ہی سوال کیا...... پیغامات کی لائن پر نظر دوڑائی تو پچھلے ایک ہفتے سے اس ID سے بھیجے گئے درجنوں پیغامات تھے، میں فالتو پیغامات کو delete کرنے لگی تاکہ بعد میں ان پیغامات کو پڑھوں...... فالتو پیغامات ختم ہو گئے تو میں نے اگلا پیغام needy کی طرف سے آنے والا کھولا۔

"تم سوئی نہیں ابھی تک......؟" میرے عقب سے سرمد کی آواز آئی، میرا سارا بدن سُن ہو گیا، مجھے یوں لگا جیسے میں چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہوں۔

دوسرا اور آخری حصہ اگلے ماہ پڑھیں

آخری موقع

نوشین ناز اختر

"دفع ہو جا...... اپنی شکل گم کر لے...... تیری کریلے جیسی کوڑی (کڑوی) شکل دیکھ دیکھ کر میرا بی پی شوٹ کر جاتا ہے۔" صابرہ بی بی نے اپنی بہو کو غصے سے کہا تھا۔

"کریلے جیسی شکل...... ! ہی ہی ہی۔"

پروین ہنسے چلی گئی۔

"آپ کو ڈاکٹر نے اس روز کریلے کھانے منع کیا تھا کیونکہ اُن سے بی پی بڑھتا ہے۔ آپ



نے بھابی کو ہی کریلا بنادیا' ہاہاہا......آپ کو بھابی سے پرہیز کرنا ہے ناں......؟'' پروین کی ہنسی ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی جبکہ بلقیس کا خیال تھا کہ یہ جو پروین ہے بے شک شکل سے ہی مسکین ہے ورنہ اندر سے نمکین ہے ابرار الحق کے گانے کے مطابق ٹھیک ہی تھا اور یقیناً اس سے مقتول کہلانے والی تھی اور اس کی پیلے رنگ کی بتیسی تو بلقیس کے ایک مکے کی مار تھی۔

''تو ذرا اکیلے میں ملنا میسنی......'' بلقیس دانت کچکچاتے پاؤں پٹختے ہوئے اندر چلی گئی تھی۔ ساس سے تو ہنگامے کا مطلب تھا کہ خودکش دھماکا کر کے خود کو ہی شہید کرلیا جائے اس لیے وہ اپنا غصہ اپنے اردگرد کے باقی جات پر نکالتی تھی۔ کچن میں برتنوں کی شامت آچکی تھی۔

''نی کریلی پانڈوں (برتنوں) کی کیوں توں شامت لارہی ہے، پیچھے سے لے کر آئی ہے جو اٹھا اٹھا کر میوزک بجارہی ہے ؟'' صابرہ بی بی کی دہاڑ کے ساتھ ہی اندر میوزک جو بجنا شروع ہوا تھا اب ختم ہوگیا تھا۔

''اماں......تو تو انگریزی بھی شاندار بول لیتی ہے۔ کچن، ڈرائنگ روم، اب یہ میوزک......واہ لگتا ہی نہیں کہ تو نے نہیں پڑھا۔'' پروین نے ہنستے ہوئے کہا۔ اسے ہنسنے کی بیماری تھی۔ وہ ہر بات پر ایسے ہی خوش ہوتی تھی جیسے کوئی لطیفہ یا خوش خبری سن لی ہو۔

''اسکول نہیں گئی تو کیا ہوا...... یہ جو زمانہ ہے ناں یہ بڑے بڑے سبق پڑھا ڈالتا ہے۔'' صابرہ بی بی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔ اس وقت ان کے چہرے کی گرج چمک غائب تھی اور لوڈ شیڈنگ کا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

''اماں تو نے بھی کوئی سبق پڑھ رکھا ہے ہی ہی ہی ہی......'' پروین حسب عادت ہنسی تھی۔

''نہ اتنا ہنسا کر، سودائن لگتی ہے۔'' صابرہ بی بی نے پروین کی ہنسی سے چڑ کر کہا تھا۔

''لو بھلا اتنی حسین لڑکی کہاں سے سودائن لگ رہی ہے اماں تجھے۔'' بلقیس نے باہر نکلتے ہوئے اپنی گزشتہ رائے جو پروین کے متعلق تھی اسے خود ہی غلط ثابت کرتے ہوئے کہا تھا۔

''حسن کو چاٹنا ہے کسی نے اگر عقل اور سلیقہ ہی نہ نظر آیا تو دوسرے دن ہی سسرال سے نکالی جائے گی۔''

''لو بھلا میں کوئی نوکری پر جارہی ہوں جو نکالی جاؤں گی۔'' پروین کو غصہ آیا تھا۔

''نوکری ہی ہوتی ہے بے وقوف......بس دعا کرنا نوکری پکی لگے ورنہ دوسری نوکری کی گنجائش بھلا عورت کی زندگی میں کہاں ہوتی ہے۔'' صابرہ بی بی ...بڑبڑاتی وضو کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی جبکہ جواباً پروین کی ہنسی نے یہ ثابت کردیا تھا کہ اس نے اپنی اماں کی اس بات کو بھی بطور مذاق لیا تھا۔

☆☆☆

''اپیا......!بس کرو ناں'...چند دن رہ گئے تمہاری شادی میں اور تمہاری شاپنگ ہے کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آرہی ہے۔ ہر موقع کے لیے تم نے الگ' الگ ڈریس بنوایا ہے۔ مایوں ،مہندی، بری دکھائی، نکاح کا الگ، شادی، ولیمے، مکلاوے اور جانے کس کس کا ہے۔ ہر ایک کے ساتھ میچنگ جیولری اور جوتے، پارٹی وئیر بیگ بھی ہیں۔ یہ شادی ہے کہ فینسی ڈریس شو......'' ہما اپنی اپیا کی اتنی تیاریوں سے تنگ آگئی تھی۔ ہر ایونٹ پر اس نے بیوٹیشن ہائر کی تھی۔ اس نے دو سال جتنا کمایا تھا ان ہی خرافات پر لگا دیا تھا کیونکہ ابا کو بیٹیوں کے پیسوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

''میری جان ہر لڑکی کی زندگی میں یہ فینسی ڈریس شو بس ایک بار ہی آتا ہے پھر تو اسے ہمیشہ اسٹیج کے نیچے اتر کر ساس نندوں کے کیے ڈرامے پر

تالیاں ہی بجانی ہوتی ہیں کیوں ناں اپنے دن تو انجوائے کریں۔'' اپیا نے ہنستے ہوئے کہا تھا جبکہ ہما نے کندھے اچکانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ وہ مزید کہہ کر اپنے الفاظ ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

''چل چھڈ دے ریاض۔'' صابرہ بی بی نے مار کھاتی بلقیس کو ریاض سے چھڑوایا تھا۔

''اماں، اس کی قینچی کی طرح چلتی زبان کو یا تو کاٹ دے یا پھر لگام دے ورنہ کسی دن میرے ہاتھوں ضائع ہوجائے گی۔ ذبح کر کے ٹوٹے ٹوٹے کردوں گا اس کے۔'' ریاض نے وارننگ بلقیس کو دی تھی اور مخاطب وہ صابرہ بی بی سے تھا۔

''تو بھی قصائی کا قصائی رہنا عورت اور مرغی میں فرق کیا کر......'' کافی کٹائی کے بعد اس نے بہو کو بچایا تھا۔ ''یہ تیرے بچے کی ماں ہے، سارا دن مرغیاں کاٹتا ہے پھر آ کر بے چاری پر ہاتھ چلاتا ہے تو مرد ہے کہ جانور ؟'' صابرہ بی بی کا لیکچر ریاض سے برداشت کرنا مشکل تھا بلکہ اس سے زیادہ اس کی ناراضی برداشت کرنا مشکل تھی۔ دنیا میں ایک ہی ہستی سے اسے محبت تھی اور وہ اس کی ماں تھی جس نے ساری عمر اُن کے لیے تپتے صحرا میں کاٹی تھی اب اگر وہ اس کے پاؤں بھی دھو کر پیتا تو کم تھا۔

''اچھا معاف کردے اماں تو موڈ ٹھیک کرلے۔'' ریاض نے ماں کو کندھوں سے تھام کر کہا۔ ''نہیں کہتا، تیری لاڈلی کو کچھ......'' ریاض نے ماں کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔

''نی جا مرتو...... روٹی تو لے کر آ......آج اگر گوبھی کھلی کھلی نہ ہوئی بلکہ اس کا بھرتا ہوا تو تیرا بھرتا بنا دوں گی۔'' صابرہ بی بی نے اپنی لاڈلی بہو کے ساتھ لاڈ کرتے ہوئے کہا تھا۔ صابرہ بی بی کو سبزیاں اپنی اصل رنگت اور شکل میں پسند تھیں۔ ذرا جو زیادہ نرم یا سخت رہ جاتی تو صابرہ بی بی کے عتاب کا نشانہ بننا بلقیس کے لیے واجب ہو جاتا تھا۔

تازہ بہ غازہ

رخ زیبا پلستر در پلستر
عجب کوہان سا باندھا ہے سر سے
ٹھٹک کر رہ گئی ہے والدہ بھی
دلہن آئی ہے بیوٹی پارلر سے

پسند: دُرِ امانت رسول، ملتان

''میں کسی ہوٹل کی باورچی رہی ہوں جو ہانڈیوں کی رنگت' سائز اور شکل سو فیصد درست رہ جائے۔'' وہ بلقیس ہی کیا جو منہ بند کر کے رکھے۔

''نی! اس کے لیے باورچی بننے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، نیت اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے جو تجھ میں نہیں ہے۔ جا دفع ہو کھانا لا۔ سارے دن بعد تیرا بندہ گھر آیا ہے اور تو اپنی چونچ نہ بند کرنا۔'' صابرہ بی بی نے غصے سے بلقیس کو بھگایا تھا۔ اس گرج چمک میں دو لوگ بے حد پُرسکون تھے۔ ایک پروین جو کپڑے استری کرنے کے ساتھ ساتھ بھائی کے موبائل سے ایف ایم سن رہی تھی کیونکہ سارے دن بعد یہ ہی وقت ہوتا تھا جب موبائل گھنٹے کے لیے اس کے ہاتھ آتا تھا۔ اور گانے سننے کی اس عیاشی کے لیے اسے ریاض بھائی کا کوئی نہ کوئی ایکسٹرا کام کرنا پڑتا تھا اور اس چھوٹی سی انٹرٹینمنٹ کے لیے وہ اکثر ریاض بھائی کے کام کرتی نظر آتی تھی۔ دوسرا خود ریاض تھا جو اَب بڑے مزے سے عبدالرحمٰن سے کھیل رہا تھا۔ ننھا عبدالرحمٰن باپ کی توجہ سے بے حد خوش ہوتا تھا کیونکہ اسے اپنی ماں کی جانب سے کبھی کوئی لفٹ نہیں ملتی تھی اپنے ہی کاموں پر وہ زیادہ تر جھاڑیں کھاتی نظر آتی تھی۔

☆☆☆

''اقبال تیرے ساتھ ٹھیک تو ہے ناں؟'' وہ صابرہ بی بی کے پاس بیٹھتی تو صابرہ بی بی سوال کرتیں اور اگر بلقیس کے پاس بیٹھتی تو یہ ہی سوال مسلسل بلقیس کرتی تھی۔

''توبہ ہے بھابی کتنی بار پوچھوگی؟ کیوں بے چارے اقبال کو مشکوک بنادیا ہے۔'' پروین نے زچ ہوکر پوچھا تھا۔

''بس ایسے ہی......تو اب ہر بات پہ ہنستی نہیں ہے ناں کچھ عجیب سا لگتا ہے۔'' بلقیس نے کھانا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ بغور پروین کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''زندگی میں لطیفے زیادہ ہوجائیں تو بھابی ہر بات پر ہنسی نہیں آتی حیرت زیادہ ہوتی ہے۔'' پروین نے دل ہی دل میں کہا تھا۔ ''بس بھابی شادی کے بعد تو زندگی سیریس ڈراما ہوتی ہے ناں۔ اس میں کہاں کسی کامیڈی کی گنجائش ہوتی ہے۔'' پروین نے فلاسفروں کی طرح فلسفہ جھاڑا تھا۔

''تو نے ابھی تک ڈرامے دیکھنے بند نہیں کیے؟ ہائے ہائے اقبال بھائی بھی کیا کہتے ہوں گے کہ کیسی ٹی وی کی دیوانی بیوی ملی ہے، جس کو ڈرامے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔'' شادی سے پہلے پروین کوئی بھی مزاحیہ پروگرام نہیں چھوڑتی تھی۔ اس نے مزاحیہ پروگرامز کے چینل سیٹ کر رکھے تھے۔ چھوٹے سے ٹی وی میں وہ گھس کر پروگرام دیکھتی اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجایا کرتی تھی۔ یوں جیسے اسے ہنسنے کی حرص تھی۔ ہنسنا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ ایسے میں اس کی ہنسی کے ختم ہونے پر سب کی تشویش بجا تھی۔

''بس بھابی کیا کروں...... اللہ بھی شکر خورے کو شکر دیتا ہے مجھے تو اب ٹی وی چلانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی ہے اور ڈرامے دیکھنے کو مل جاتے ہیں بلکہ سارا دن ڈرامے ہی ڈرامے ملتے ہیں۔'' پروین عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے بولی تھی جبکہ بلقیس دکھ سے ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''بیٹا، یہ دیکھو میں نے دوا ٹھیک لی ہے؟'' صابرہ بی بی نے ہما سے پوچھا تھا۔ ہما الٹرا ساؤنڈ کے لیے آئی تھی لیکن ابھی اس کے چیک اپ میں کچھ وقت باقی تھا۔ اس لیے وہ باہر اسپتال کے لان میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ دسمبر کی سردی میں دھوپ اس کے وجود میں سکون اتار رہی تھی۔ حالانکہ اس کی زندگی میں سکون بالکل ناپید تھا۔ ہما نے دوائی کا نسخہ اور دوائیں اٹھا کر دیکھیں۔

''ہاں جی، ٹھیک ہے۔'' ہما نے مختصراً کہا۔

''تمہارے ہاں بچہ آنے والا ہے؟'' صابرہ بی بی نے ہما کے بھرے بھرے وجود کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اللہ کرے اماں بچہ ہی ہو...... بچیاں تو میرے لیے ممنوع ہیں۔'' ایسا کہتے ہوئے ہما کی نگاہوں میں دعا، ندا اور ردا کے معصوم چہرے گھوم گئے تھے۔ دعا کے بعد ندا اور ردا جڑواں تھیں اور وہ جو male dominated سوسائٹی سے الرجک تھی آج اسے اپنے اور اپنی بچیوں کے سروائیول کے لیے لڑکے کی ضرورت تھی۔ بہت مضبوط خیالات رکھنے والی ہما آج ایک کمزور ترین ماں تھی جو اپنی بیٹیوں کو زندگی کے بنیادی حقوق تک دینے کے قابل نہ تھی۔ سید کامران اور اس کے خاندان کو وارث درکار تھا جو اس کے بس میں ہوتا تو وہ اپنی زندگی قربان کر کے لے آتی کیونکہ اس تکلیف دہ جنگ میں اس کی معصوم بیٹیاں پس کر رہ گئی تھیں۔

''بیٹا جی بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں، کیا تم اللہ کی رحمت سے گھبرا گئی ہو؟'' صابرہ بی بی نے دکھی چہرے والی اس لڑکی کو سمجھایا تھا جس کے چہرے کی اداسی اس کے نقوش میں گھل سی گئی تھی۔

''رحمت کو رحمت کتنے لوگ مانتے ہیں اماں؟ کچھ لوگ اس رحمت کو زحمت بنا دیتے ہیں ایسے میں وہ اللہ سے تو کھلی جنگ کرتے ہی ہیں لیکن وہ انسانوں کی زندگی بھی تباہ کردیتے ہیں۔'' ہما نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔

''بیٹا اگر برا نہ مان تو مجھ سے اپنے دل کی بات

کہہ دے۔ اجنبی سے بات کر کے بوجھ زیادہ اتر جاتا ہے کیونکہ وہاں ڈر اور بھرم کے کھاتے نہیں کھلتے۔'' صابرہ بی بی ہاتھ میں شاپر پکڑے اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ اسے اس لڑکی سے بے پناہ ہمدردی محسوس ہو رہی تھی اس کے چہرے میں اسے پروین اور بلقیس کے چہرے نظر آرہے تھے۔ ہما نے ایک پل کو غور سے صابرہ بی بی کو دیکھا تھا۔ متوسط طبقے کی یہ عورت صاف ستھرے لباس میں کسی مسیحا کی طرح چہرے پر مسکراہٹ لیے اس کا درد بانٹنے کی خواہش مند تھی۔

''بیٹا...... خوشی بانٹنے سے خوشی بڑھتی ہے اور درد بانٹنے سے کم ہوجاتا ہے۔ رب کا انتظام ہے۔ بندے کو بندے کی ضرورت پڑتی ہے ورنہ تو وہ یہ لاوا لے کر اندر ہی اندر جل مرجاوے۔'' صابرہ بی بی کی ڈھارس پر ہما نے اپنی ساری کہانی کہہ سنائی...... وہی کہانی جو بڑی پرانی تھی۔ بیٹے کی طلب میں ماں اور بیٹیاں تنے ہوئے رسے پہ کھڑی تھیں۔

سید کامران نے اسے کل کھڑے کھڑے خوب گالیاں سنادی تھیں اور دکھ دینے والی بات بھی کی طلاق کی دھمکی دے کر کیونکہ ان کے گھر آنے والی ایک بزرگ دائی نے اپنے تجربے کی روشنی میں بتایا تھا کہ آنے والا بچہ لڑکا نہیں پھر سے لڑکی ہے۔

آج... الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے گویا اپنی قسمت کا فیصلہ سننے آئی تھی۔

''بیٹی ہوئی تو کیا کروگی؟'' صابرہ بی بی نے ہما کے مرجھائے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''بیٹی......'' ہما کا پیلا رنگ مزید پیلا پڑ گیا تھا۔

''اماں میں شاید مرجاؤں گی۔'' ہما نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔ خوف سے اس کی آواز پھنسی پھنسی نکل رہی تھی۔

''اور بعد میں تیری بیٹیوں کا کیا ہوگا؟ سوچا ہے کبھی تو نے۔ وہ باپ جو تمہاری زندگی میں ان سے اچھا سلوک نہیں کرتا تمہارے بعد تو وہ ان کو جانوروں کی طرح رکھے گا کیونکہ بقول تمہارے ان بچیوں کی شکل تک دیکھنا نہیں پسند کرتا۔'' صابرہ بی بی کے ایک سوال ہی نے ہما کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ جس نے سرنڈر کر کے خود کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اسے اپنی بیٹیوں کے معصوم چہرے پریشان کرنے لگے۔

''تو پھر اماں میں کیا کروں؟ وہ تو مجھے بہت مارے گا یا مجھے بالکل ہی گھر سے نکال دے گا۔ آج کل تو میں کچھ دنوں کے لیے ماں کے گھر آئی ہوں پر ہمیشہ کے لیے نہیں آنا چاہتی۔''

''دھمکی ہی تو دی ہے ناں......'' صابرہ بی بی نے پوچھا۔

''ہوں......'' جواباً ہما کی بس رندھی رندھی ہوں...... ہی نکل سکی تھی۔

''تو تو واپس اپنے گھر چلی جا......'' صابرہ بی بی نے اپنے تئیں اسے مشورہ دیا۔

''کیسے چلی جاؤں اماں......'' ہما کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئی تھیں۔ سید کامران کا سراپا لہرایا تھا۔ وہ منظر آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا جب سید کامران نے ہما کے والدین کو بلا کر اسے گھر سے جانے کو کہا تھا۔ وہ کیسا سخت انسان تھا جس نے کسی لڑکی کے ماں باپ کے نازک دل کا بھی احساس نہیں کیا تھا۔ ہما کے بھائی تو اس بے عزتی پر اس قدر غصے میں آگئے تھے کہ بات ہاتھا پائی تک آگئی تھی اگر ہما کے بہنوئی بیچ بچاؤ نہ کرواتے تو شاید کوئی جانی نقصان بھی ہوجاتا۔ ایسے میں وہ کیسے واپس جاسکتی تھی؟

''وہ تیرا گھر ہے اور اپنا گھر چھوڑ کر تجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔ چاہے کوئی کتنا بھی کہہ لیتا۔'' صابرہ بی بی کی بات پر ہما ٹوٹے کانچ جیسی ہنسی ہنسی تھی۔

''کیسی باتیں کرتی ہو اماں، کوئی گھر میں رکھنا نہ چاہے تو کیسے میں رہ لیتی۔'' ہما کو اس بوڑھی عورت کی بات خاصی مضحکہ خیز لگی تھی۔

"کوئی عورت کیا گالی گلوچ سن کر پیا کا گھر چھوڑ کر آجاتی ہے؟ عورت ہی مکان کو گھر بناتی ہے ناں؟ پھر تو کیوں اپنا گھر چھوڑ آئی......؟" صابرہ بی بی ...کی آواز جذبات سے بھاری ہو رہی تھی۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بول رہی تھی۔

"اماں تم نہیں سمجھو گی۔ یہ کہنا آسان ہے کرنا بہت مشکل ہے۔" ہما کو لگا کہ وہ کم پڑھی لکھی عورت اس کے دکھ پر جذباتی ہو کر یوں ہی بولے جا رہی ہے۔

"میں...... میں کیوں نہیں سمجھوں گی بھلا؟ کیا میں عورت نہیں ہوں؟ میں نہیں تیرا دکھ سمجھ سکتی؟" صابرہ بی بی نے پوچھا تھا۔

"اماں میں یہ بات نہیں کہہ رہی۔ میں دراصل یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ آپ کو ایسی سچویشن کا اندازہ نہیں ہے۔ مطلب...... ایسے حالات کا......" ہما نے بے بسی سے کہا تھا۔ اسے اس عورت کی آنکھوں کی سچائی پر ایک دم سے یقین ہو گیا تھا لیکن وہ...... اس کی بات کو کیسے مان لیتی...... جس طرح انسلٹ کر کے سید کامران نے اسے اور اس کے گھر والوں کو باہر نکالا تھا۔ اس کے گھر والے کیسے اسے واپس جانے دیتے۔ کیسے غلیظ جملے اس کی ذات پر چسپاں کیے گئے تھے۔ لاکھ ہما اپنے گھر کو بچانا چاہتی تھی لیکن اس کے بھائی خلع کے لیے متفق ہو رہے تھے۔ وہ اور اس کی بچیاں بے حد مشکل دور میں آن پھنسی تھیں۔

"باجی...... ہماری اماں جی سے زیادہ آپ کے درد کو کوئی نہیں جان سکتا۔" جانے کب سے بلقیس کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ تو اماں کو ڈھونڈتی اِدھر آئی تھی لیکن اماں اور ہما کی باتیں سن کر بولے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

"کیا مطلب......؟" ہما نے اس انجان عورت کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ جس کا چہرہ کسی قدر اپنائیت لیے ہوئے تھا۔

"میں اِن کی بہو ہوں، میرا نام بلقیس ہے۔ یہ میری ساس ہیں۔ آج سے دو سال پہلے میری نند جب حاملہ تھی تو اس کے میاں نے اسے مار کر گھر سے نکال دیا تھا۔ ہمارے گھر میں تو رونا پیٹنا پڑ گیا تھا۔ میری ایک بری عادت ہے کہ میں ہر بات کا دوبدو جواب دیتی ہوں جس پر ہمیشہ مجھے شوہر اور ساس سے سخت سننا پڑتی ہیں میری نند کو آئے تیسرا دن تھا کہ میں اپنے شوہر کو دو بدو جواب دے رہی تھی میرے شوہر کو بہن کا اتنا غصہ تھا کہ اس نے کھڑے کھڑے مجھے طلاق کی دھمکی دے دی۔ اماں جی نے جب تک ریاض کو ٹوکا تب تک وہ مجھے بہت مار چکا تھا میں نے اپنی زبان درازی کے ہاتھوں نقصان اٹھایا تھا اور میری نند نے چپ رہ کر...... اسی لیے وہ گھر سے نکالی گئی۔" بلقیس نے گہری ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ اس دوران صابرہ بی بی بس ہما کے چہرے کو تکی جا رہی تھی۔ اسے ہما کے چہرے میں اپنی بیٹی کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ پروین کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ڈرا سہما ہوا چہرہ......

"ریاض تو مجھے ایک طلاق دے کر غصے سے باہر نکل گیا اور میں...... بچے اور اپنا کچھ سامان لے کر اپنے میکے چلی گئی...... اماں جی بہت روتی رہیں لیکن کچھ غصے اور کچھ اس خیال سے کہ میرا اس گھر سے اب کیا ناتا باقی رہ گیا ہے میں گھر چھوڑ کر چلی آئی جب کوئی گھر میں رکھنا ہی نہ چاہے تو زبردستی کیسے رہا جا سکتا ہے۔" بلقیس نے ایک اور ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"مجھے تو یوں لگتا تھا کہ میری تو دنیا ہی اجڑ گئی ہے۔" صابرہ بی بی بولی۔ "ایک ماں کی دنیا تو اپنے بچوں کی خوشی سے ہی بستی ہے۔ میں بیٹی اور بیٹے دونوں کو اتنا غمزدہ دیکھ نہ پاتی تھی۔ ایسے میں روتے روتے میری ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ کوئی راہ نہ ملتی تھی۔ میں اپنے اللہ سے رو رو کر ہر وقت بس دعا کرتی تھی کہ مجھے اس مشکل سے نکال دے۔ سکھ میں تو کم ہی بندہ اللہ کے حضور جاتا ہے لیکن دکھ کے پلوں

میں وہ اس در کا غلام بن جاتا ہے۔ کوئی خیر جب تک نہ پڑے تو وہ کہاں اس در سے اٹھتا ہے۔ ہے تو لالچی انسان...... مطلبی بھی ہے، پر اس کے علاوہ وہ جائے بھی تو کہاں جائے؟'' صابرہ بی بی کی باتیں ہما کو خود پر بیتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''میں جس بیگم کے کپڑے لا کر سیتی تھی، ان کے ہاں ایک بہت بڑی محفلِ میلاد تھی۔ ان کا بیٹا ڈاکٹری پاس کر کے ولایت سے آیا تو انہوں نے شکرانے کی قرآن خوانی اور محفلِ میلاد کروائی...... مجھے بھی بلایا...... وہ پہلے بھی ایسی محفلیں گھر میں ہمیشہ کرتی رہتی تھیں پر میں آج تک نہیں گئی تھی لیکن اس وقت میرا دل ٹوٹا ہوا تھا، میں چلی آئی...... ختم قرآن پر ان کی نند نے بہت پیاری دعا کروائی پھر انہوں نے بہت ساری احادیث سنائیں جیسے جیسے وہ احادیث سناتی گئیں محفل میں موجود عورتیں ان سے بہت سارے مسائل پوچھنے لگیں۔ اس سے پہلے میں بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ سادہ سے حلیے والی عورت بیگم کی نند تھی اور اتنا علم رکھتی تھی اور اتنے پتے کی باتیں کرتی رہی تھی۔ ایک عورت کے سوال پر ہی انہوں نے سورہ نسا اور اس کی تفسیر سنائی کہ اگر عورت کو ایک دو طلاق ہو جائیں تو عورت کو عدت اپنے شوہر کے گھر ہی گزارنی چاہیے تاکہ غلط فہمیاں دور ہوں اور رجوع کے امکانات زیادہ ہو جائیں۔ مجھے اپنے پیارے اللہ سائیں اور نبی ﷺ کی اس بات پر رج کے پیار آیا تھا۔ میں نے گھر آ کر اپنے بیٹے کو بھی سمجھایا اور مولوی صاحب سے جا کر مسئلہ بھی پوچھا۔'' صابرہ بی بی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔ وہ ماضی میں کھو گئی تھی۔ اس کے درد نے اب بھی اسے دکھی کر دیا تھا۔ ہما ان کے چہرے پر آ جانے والا دکھ بخوبی پڑھ سکتی تھی۔

درد مشترک ہو تو ایک بندھن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ دوسرے سے رشتے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ہما کو بھی چند ہی پلوں میں ان دو عورتوں سے ایک رشتے کا احساس ہونے لگا تھا۔

''میں جاہل عورت جو رب سے فریاد کر رہی تھی اس نے میرا حل نکال کر پلیٹ میں سجا کر دے دیا تھا۔ بس اس حل پر عمل کرنا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا اس کانٹوں بھری راہ پر چلنے کا کیونکہ میں جانتی تھی کہ آج... کانٹوں کا سامنا کر لوں گی تو ہی میرا کل سکھ کے پھول کھلا پائے گا۔ میں نے پہلے اپنی بہو کو لانے کا سوچا۔ ایک بار دوبار پھر دسویں بار بالآخر میں اپنی بہو اور اس کے گھر والوں کو سمجھانے اور منانے میں کامیاب ہو گئی اور بہو کو گھر واپس لے آئی۔ میرا بیٹا ایک دو روز بکتا رہا اور مجھے کفر میں شامل کرتا رہا لیکن پھر شاید بیوی بچوں کی شکل دیکھ کر رہ نہ پایا اور تیسرے ہی دن میرے پاس رات کو میری چارپائی پر آ بیٹھا...... کہنے لگا اماں...... کیا اب بھی بلقیس میری بیوی ہے؟ میں اسے مولوی صاحب کے پاس لے گئی مجھے جو رستہ اتنا مشکل لگتا تھا وہ تو آدھا فوراً ہی طے ہو گیا تھا۔ میں نے میلاد میں ہونے والی محفل اور سوال جواب سب اسے بتا دیے۔ بات اس کے دل کو لگی تھی لیکن اپنے مسئلے کو اس نے مسجد کے مولوی سے بھی اگلے دن پوچھا تو اسے امید کی کرن نظر آ گئی۔ رب کا لاکھ بار شکر ادا کرتا وہ گھر واپس آیا کہ میں نے تین طلاق نہیں دی ورنہ کوئی رستہ نہ نکلتا اور وہ کبھی اپنی غلطی کا مداوا نہ کر پاتا۔ وہ میرا بھی مشکور تھا کہ میں مہلت ختم ہونے سے پہلے اس کی بیوی کو لے آئی ورنہ انا اور سوچوں میں مہلت کا وقت ختم ہو جانا تھا۔ میں نے دوسرے کی بیٹی کا بھلا کر دیا تھا اب مجھے پورا یقین تھا کہ رب سوہنا میری بیٹی کی زندگی میں بھی خیر ڈالنے والا تھا۔ اقبال کی نوکری فیصل آباد میں تھی اور ماں باپ کا گھر لاہور میں، میں رب کا نام لے کر گاڑی پکڑ کر چل پڑی۔ سارے رستے پروین کو بس یہی

سمجھاتی رہی کہ بس یہ ہی موقع ہے جو کہ آخری موقع ہے۔ بچا لے اپنی زندگی کو۔ پتر میں ایسا کر کے اپنی بچی کی انا کو نیچے نہیں لگا رہی تھی بس میں ایک بار اسے جھکنے کو کہہ رہی تھی تاکہ ساری زندگی وہ سر اٹھا کر چل سکتی۔ بس ایک موقع تھا اور مجھے اس موقع کو ہرگز نہیں گنوانا تھا۔ اقبال کے دفتر جب ہم پہنچے تو وہ ہکا بکا رہ گیا اس نے پروین اور مجھ سے ملنے سے صاف انکار بھی کر دیا پر میں اسے لیے بیٹھی رہی دوپہر کے کھانے پر وہ باہر نکلا تو پروین کے روئے روئے چہرے کو دیکھ کر اس کا دل کمزور پڑ گیا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ شرعی طور پر اب بھی یہ تیری بیوی ہے رکھنا ہے تو رکھو نہیں رکھنا تو دارالامان میں بھیج دو۔ تیرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ بیوی کو تو دربدر کیا تم نے ایک ماں کو دربدر کرو گے تو اللہ کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤ گے۔ وہ اپنے گھر والوں سے ڈرتا تھا لیکن میری بے نیازی دیکھ کر گھبرا گیا۔ کہنے لگا۔

''اماں میں اسے کہاں رکھوں میں تو خود ایک کمرے کے کوارٹر میں رہتا ہوں۔''

''بیٹا رہ لے گی یہ بھی اسی کمرے میں آخر کو رب سوہنے نے اسے تیرا لباس بنایا ہے وہ کیوں نہ تیرے دکھ سکھ ساتھ جھیلے گی؟'' شام تک وہ ہر بات کو سوچتا بولتا گیا۔

بالآخر میں دونوں کو وہیں چھوڑ کر اللہ کے سپرد کر کے واپس آ گئی۔ دل میرا پتے کے مانند کانپتا رہا۔

ساتویں دن پروین کی کھلکھلاتی آواز فون پر سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''آپ کو پتا ہے اماں اقبال کو اگلے ہی دن اس کے دفتر میں ترقی کا لیٹر ملا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا اور آج اس کو کمپنی کی طرف سے بونس بھی ملا ہے۔ وہ آج مجھ سے کہہ کر گئے تھے کہ وہ مجھے ہمیشہ ساتھ رکھیں گے۔ انہوں نے مجھ سے معافی بھی مانگی ہے اور ابھی مجھے فون کروانے باہر لے کر آئے ہیں۔ میں فون کر رہی ہوں اور وہ میرے لیے سامنے والے اسٹور سے دودھ وغیرہ لینے گئے ہیں۔ اماں ...... کیا واقعی دعائیں پوری ہو جاتی ہیں؟'' پروین روتے ہنستے پوچھ رہی تھی اور میرے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ مجھے تو اس رب سوہنے کا بس شکر ادا کرنا تھا کہ اس نے میری لاعلمی ختم کروا کر میرے بچوں کا گھر دوبارہ آباد کروا دیا تھا۔'' صابرہ بات کرتے کرتے رو پڑی تھی۔

''اس دن کے بعد میں نے باقاعدہ اس باجی سے درخواست کی کہ وہ مجھے اسلام اور حدیث کی باتیں ضرور بتایا کریں کیونکہ ہماری اپنے مذہب سے لاعلمی اور بے عملی ہی تو ہے جو ہمیں مشکلوں میں گھیرے رکھتی ہیں۔ باجی نے فوراً حامی بھر لی۔ جانتی ہو پتر......؟ پہلے میں اکیلی جاتی تھی اب سارے محلے کی عورتوں کو لے کر جاتی ہوں۔ ہماری زندگیوں میں ڈھیروں آسانیاں، خوشیاں آئی ہیں اس وجہ سے۔ ہفتے کا ایک گھنٹا ہماری ساری زندگی کے گھنٹوں کو سکھی کر جاتا ہے۔'' صابرہ بی بی کہہ رہی تھی اور ہما کو خود کے اندر بھی ایک توانائی کا احساس ہونے لگ گیا تھا۔ وہ ایک دم صابرہ بی بی کے گلے جا لگی۔

''اماں میرے لیے بھی دعا کرنا...... میں بھی اپنی زندگی کا آخری موقع آزمانا چاہتی ہوں۔''

''انشاء اللہ پتر تو دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس صبر سے کام لینا... اور جب جب صبر ٹوٹے تو یاد رکھنا صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ ہوتا ہے۔ تیرا صبر...... تیرا حوصلہ ہی بڑی ذات کے ساتھ کے احساس کی وجہ سے کبھی نہ ٹوٹے گا۔'' صابرہ بی بی نے اس کا ماتھا چوم کر کہا تھا۔ ہما نے الٹرا ساؤنڈ کروانے کے لیے جو پرچی بنوائی تھی وہیں کھڑے کھڑے پھاڑ دی تھی کیونکہ اس نے ایک اور فیصلہ لیا تھا۔ جس کے لیے الٹرا ساؤنڈ کا

رزلٹ غیر ضروری تھا کیونکہ وہ اللہ کے بتائے رستے پر چل کر منزل تک جانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

مبارک ہو اللہ نے آپ کو جڑواں بچے دیے ہیں۔ دو بیٹے ہیں آپ کے۔'' نرس نے باہر آکر اطلاع دی تھی۔ سید کامران کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا تھا۔ اسے مزید شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ شرمندہ تھا اس عظیم عورت کے سامنے جس نے اس کی بدسلوکی اپنے اور اپنے خاندان دونوں کے لیے جھیلی تھی۔ جس نے اس کے لیے اپنے خاندان کی ناراضی جھیلی تھی اور اس کے پاس واپس آگئی تھی۔ بے شک اس نے کتنا اسے اذیت میں رکھا تھا لیکن وہ بے وقعتی سہتی رہی لیکن واپس نہیں گئی تھی پھر انہی دنوں سید کامران کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تو اس نے دن رات اپنی حالت کی پروانہ کرتے ہوئے اس کی بے انتہا خدمت کی تھی۔ کیسے اس کی ننھی پریوں نے باپ کے لیے دن رات دعا کی تھی۔ بچیاں ہر وقت باپ کے سرہانے ہی رہتی تھیں۔ جب وہ بستر پر تھا تو اللہ نے اس کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دیا کہ اولاد وہی ہے جو والدین سے پیار کرے، تابعدار ہو خدمت گزار ہو اور اس کی بیٹیاں تو ننھی پریاں تھیں۔ کیسے اس کے لیے آنسو بہا بہا کر اللہ سے اس کی صحت زندگی مانگتی تھی۔ ان کے دلوں میں یہ محبت ڈالنے والی بھی تو ان کی ماں تھی۔ اگر وہ چاہتی تو وہ اولاد کے دلوں میں باپ کی نفرت پیدا کر کے اس محاذ پر اسے بری طرح ہرا دیتی لیکن اس نے اسے ہارنے سے بچا کر ہمیشہ کے لیے خود کی جنت حاصل کرلی تھی اسے اپنے رویے پر بے حد شرمندگی تھی لیکن اس عظیم عورت کے سامنے معافی کے الفاظ نہ تھے۔ سید کامران پلستر لگی ٹانگ کے ساتھ چھڑی پکڑ کر چلتے اندر گئے تھے ہما نڈھال سی لیٹی دروازے کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ اسی پل پیچھے سے دروازہ کھول کر ان کی بیٹیاں اپنی پھپھو کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھیں۔

''بھائی، بھابی مبارک ہو...... ڈبل مبارک دو بیٹے اللہ نے دیے ہیں۔'' سید کامران کی بہن کی آواز خوشی سے پھٹ رہی تھی۔ ''وہ بھول گئی تھی کہ کچھ ماہ پہلے یہی بھابی اسے منحوس لگتی تھی جو خاندان کو وارث نہیں دے سکتی تھی۔

''لیں جی...... اپنے دونوں شہزادے...... پر پہلے ہماری مٹھائی کے پیسے دیں۔'' دو آیا بچوں کو اٹھائے اندر آئی تھیں۔ سید کامران نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پیسے نکال کر ان کو دیے لیکن بچوں کو پھر بھی نہ پکڑا۔

''لیں جی اپنے شہزادوں کو پیار کرلیں۔'' آیا نے بچے آگے بڑھائے۔

''پہلے میں اپنی شہزادیوں کو پیار کرلوں۔'' سید کامران نے تینوں بچیوں کو بازوؤں کے حلقے میں لے کر چوما تھا۔ ہما کی آنکھیں شکر کے آنسوؤں سے لبریز ہوگئی تھیں۔ کیا واقعی سامنے کا منظر حقیقت تھا......؟ سید کامران نے اپنی بیٹیوں کے ماتھے چوم کر اپنے بیٹوں کی شکل دیکھی تھی۔ ہما کے دل میں موجود سارے ملال اس شخص کے لیے دھل گئے تھے۔

اسے بے اختیار وہ خضرؑ جیسی اماں صابرہ یاد آئی تھیں جن کی باتوں کے علم سے اس کی زندگی میں روشنی آئی تھی۔ اسلام تو ہے ہی کامیابی اور سکھ کا راستہ...... بس مشکل تب ہی آتی ہے جب آدھے ادھورے علم پر عمل کرتے ہیں اور خود کو کامل ایمان پر اور کامل مسلمان سمجھتے ہیں۔ کم علمی اور کج فہمی پر اڑے رہتے ہیں اور ادھورے انسان بن کر جیتے ہیں۔



درِ رحمت

قانتہ رابعہ

فجر کی اذان بلند ہوئی ساتھ ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

''اللہ خیر کرے......'' بے اختیار منہ سے نکلا، بجلی کسی غریب کے مقدر کی طرح کہیں منہ چھپائے بیٹھی تھی اور یوپی ایس بے چارہ کیا کرتا...... سیل فون کی ٹارچ آن کی اور کون ہے؟ کی کڑاکے دار آواز کے ساتھ دروازہ کھولا۔

''احتیاط سے کہیں چور ڈاکو نہ ہو۔'' رفیعہ گھبرائی

ہوئی پیچھے آئی۔

''او بھلیے لوکے...... چوڑا کو بھلا دروازے پر دستک دے کر آئیں گے؟''

دروازہ کھولا...... سامنے جو تھا کم از کم میرے لیے وہ اجنبی تھا۔

''ناصر اقبال صاحب...... میں...... توقیر ہوں۔'' قدرے بھاری آواز میں تعارف آیا...... میں کچھ پہچاننے کے سلسلے میں شاید لمبا غوطہ کھا گیا جب رعب دار آواز میں اس اجنبی نے کہا۔

''اوئے ناصر یار اپنے بٹ بیلی کو نہیں پہچانتے...... بٹ بادشاہ، توقیر بادشاہ۔''

''ہا...... ئیں...... تم...... بٹ یار۔'' میں نے بے اختیار جپھی ڈالی بہت دیر تک یہ جپھیاں ڈالنے، الگ ہونے کا سلسلہ چلتا رہا جب اس نے تلقین شاہ کے انداز میں کہا۔

''او ناصر...... بے ہدایتا، اندر آنے کو نہیں کہو گے۔''

''ایک منٹ......'' میں نے انگلی کے اشارے سے اسے روکا۔ ''ابھی اپنی بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں، تم گاڑی لاک کرو۔'' اردگرد کے دروازے اور کھڑکیوں سے بہت سی آنکھیں صبح سویرے اس منظر کو دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

بریف کیس ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور ٹانگیں پسار کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''اپنے لنگوٹیے یار کو بیس سال بعد دیکھ کر کیا محسوس ہو رہا ہے؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔

''سچی بات ہے میرے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ تم یوں اچانک ٹپک پڑو گے۔'' میں نے فوراً کہا۔

''تم ویسے کے ویسے ہی ہو دبلے پتلے، لمبے...... بس عینک کا اضافہ ہوا ہے اور اِدھر مجھے دیکھو......'' اس نے اپنے گرے بالوں، موٹی توند کی طرف اشارہ کیا۔ ''خیر تم کچھ سیانے نہیں ہو گئے ہو۔'' اس نے ایک دم گفتگو کا موضوع بدلا۔

''کیا مطلب......؟'' میں حیران ہوا۔

''مطلب یہ کہ باؤ ناصر......'' اس نے ناصر پر پورا زور صرف کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلے اندر بٹھانے کے لیے دروازہ نہیں کھول رہے تھے اب چائے پانی کا نہیں پوچھ رہے ہو۔'' اور ساتھ ہی اس نے چھت پھاڑ قسم کا قہقہہ لگایا۔

جونہی میں اٹھنے لگا اس نے بازو سے پکڑ کر بٹھا لیا۔

''بیٹھ جا یار...... اب تو کبھی دن دہاڑے بھوک نہیں لگی۔ رات گئے کیا کھانا اور کیا پینا۔'' مجھے اس کے لہجے میں کچھ درد محسوس ہوا۔

''چل تو بعد میں اپنی اسٹوری سنانا پہلے میری دکھ بھری داستان سن لے۔'' اس نے ایک اور ٹھنڈی سانس بھری۔

''کاروبار میری گھٹی میں پڑا ہے، نوکریاں ہم بادشاہ لوگوں کو کہاں راس آتی ہیں، بچے دو ہیں اب یار یہ مت سمجھنا کہ دو بچے خوش حال گھرانا بلکہ رب نے دو پر ہی اسٹاپ لگا دیا۔ بیٹا بائیس سال کا ذہنی جسمانی دونوں طرح سے معذور...... بیٹی تو اپنے بچپن میں تمہاری گود میں ہی کھیلی ہے وہ اب دو بچوں کی ماں ہے۔ اب تم سناؤ مجھے تو لگتا ہے عمر گزشتہ نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا وہی سنہری دمکتی رنگت وہی بی بی شرماں مائی والا انداز...... وہی واپڈا کے کھمبے جتنا قد......'' اس نے میرا تفصیلی پوسٹ مارٹم کیا اور گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ تم بھی اپنے والد مرحوم کی طرح کسی بیل کی طرح رزق حلال کے دائرے میں چکر لگا رہے ہو۔'' اس نے میرے سادہ سے ڈرائنگ روم پر نظر ڈال کر کہا...... ''اب بتاؤ، شادی کہاں ہوئی، بھابی کہاں کی رہنے والی ہیں، بچے کتنے ہیں؟''

''تم سانس لینے کو رکو گے تو اپنا کچا چٹھا کھولوں گا ناں!'' میں نے بے ساختہ کہا جس کا اس نے خوب مزہ لیا۔

''شادی کو بیس بائیس سال ہو گئے ہیں، بیوی دور پار کی رشتے دار تھی اب تو مجھے اس عمر میں آکسیجن کی طرح لگتی ہے۔ بچے تین ہیں، دو بیٹے ایک بیٹی، بیٹی شادی شدہ ہے اور بس......'' میں نے کہا۔

''چلو یار نماز کا وقت ہو گیا ہے۔'' میں نے موبائل پر ٹائم دیکھ کر کہا۔

''آج تمہاری خاطر رب کو سجدہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔'' اس نے لمبی جمائی لی...... اس کے چہرے پر تھکن، اذیت، درد کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ ہاں مسجد جاتے ہوئے رفیعہ کو میں پُرتکلف ناشتے کا پیغام دینا نہیں بھولا تھا۔ گھر میں اکثر پرانے دوستوں کے تذکرے میں توقیر کا تذکرہ ہوتا تھا غائبانہ تعارف تو اس کا تھا ہی۔

☆☆☆

''واہ...... مدت بعد آج ایسا ناشتا کیا ہے۔'' ہاتھ ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''اتنے مزے کا ناشتا کم از کم میں نے پہلے نہیں کیا۔'' پھر اس نے مصنوعی حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا۔

''لگتا ہے بھابی نے کس کے قابو میں رکھا ہوا ہے، ورنہ یہ تو ممکن ہی نہیں ایسا شاندار کھانا کھا کے بندے پر بوٹی نہ چڑھے...... اتنے تکلف کی ضرورت تو نہیں تھی...... مجھے دیکھو بی پی شوٹ کر جاتا ہے، آئل منع ہے، میں نے حلوا پوری سے پھر بھی پورا انصاف کیا ہے قیمہ کریلے، نان چنے سب منع ہیں لیکن پرانے یار سے یاری بھی تو نبھانا تھی ناں۔''

''اوئے تمہیں بلڈ پریشر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، شوگر کے علاوہ انجائنا کا اٹیک بھی ہو چکا ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''اور یہ سب ان ٹینشنوں کی دین ہے جو پچھلے بیس سال سے جونک کی طرح میرے ساتھ چمٹی ہیں۔''

اتنے میں چائے آ گئی، اس نے آرام سے تین کپ پیے۔ خوب لمبی سی ڈکار لے کر بولا۔

''آیا تو میں دس منٹ کے لیے تھا لیکن بھابی کے ناشتے اور تمہاری محبت نے چار گھنٹے کے لیے روک لیا...... فلائٹ میری نکل چکی ہے اب دوسری فلائٹ سے جانا پڑے گا...... خیر یاری میں یہ سب تو چلتا ہے۔'' وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ''یار مولوی تیری بیوی پردہ تو نہیں کرتی، میں نے شکریہ ادا کرنا تھا مدت کے بعد میں نے سارے پرہیز ایک طرف رکھ کے اتنا کھایا ہے۔ خود شکریہ ادا کر سکتے ہو یا میں کر لوں۔''

''کیا شکریہ، شکریہ کی گردان کر رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

اس نے جوتے پہنے، بریف کیس اٹھایا...... ایک دم مجھے خیال آیا تو میں نے پوچھا۔

''بٹ بادشاہ تو اتنے لمبے عرصے کے بعد مجھ تک پہنچا کیسے؟''

''تم نے پوچھا ہی کب تھا؟ بہرحال سنو، میری ہوٹل اور ریسٹورنٹ کی ایک چین ہے، ایک ملازم ہمارے گاؤں کا تھا ناں، شبیر لوہار...... اس کا بیٹا ہے اس سے تھوڑی بہت تفتیش کی کچھ اپنی تگ و دو سے پہنچ ہی گیا۔ کیوں، اچھا نہیں لگا؟'' اس نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں بہت کچھ یاد آ گیا تم سے مل کر...... ملتے رہنا آئندہ بھی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یار، پتا نہیں کیا بات ہے تمہارے گھر میں آکر وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ بہت سکون اور رحمت ہے یہاں۔ میں تو مشین کی طرح کام کر کر کے گھس گیا تھا ڈاکٹرز نے ہر وقت پُرسکون رہنے کی تلقین کی۔ بشیر لوہار کا بیٹا تمہارے بڑے گن گاتا ہے سوچا کر دیکھتے ہیں اس دنیا میں کوئی ٹینشن فری بھی ہے۔''

"بہت مہربانی، تمہارا اپنا گھر ہے جب چاہو آؤ۔" میں نے دل سے کہا۔

"ہاں۔" وہ پھر ٹھنڈی سانس لینے لگا۔ "بٹ صاحب بٹ صاحب سنتے سنتے اب دل کرتا ہے کوئی تو کہے..... "اوئے بٹ دے پتر۔"

"میں اس کام کے لیے حاضر ہوں۔ بٹ دے پتر۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ پندرہ من وزنی قہقہہ حلق سے برآمد کرکے رخصت ہوگیا۔

اتنا تو میں نے بھی دیکھا کہ دمِ رخصت اس کی آنکھیں گیلی تھیں، خدا جانے کون کون سے دکھ اندر گھر کیے بیٹھے تھے کہ اس کا حوصلہ پانی بن کر آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔

☆☆☆

بہ مشکل چار چھ دن کے بعد ایک دن میرا چھوٹا بیٹا نعمان ہانپتا کانپتا اندر آیا۔

"ابو..... ابوجی، اس دن والے انکل آئے ہیں۔"

"کون سے انکل؟" میں نے پوچھا۔

"وہی والے جو اس دن آئے تھے....." اس نے پھولی ہوئی سانسوں میں بتایا اور ساتھ ہی بٹ کی آواز آئی۔ بھابی کو اندر ڈربے میں کرلو..... بٹ بادشاہ آیا ہے۔" اس سے ملنے کے لیے میں آگے بڑھا۔

"یہ کیا.....؟" میں نے بگڑ کر کہا۔ جہازی سائز کے شاپنگ بیگ، بڑے بڑے کارٹن بیکری کے بڑے بڑے پیک۔

"بٹ بادشاہ ہوگے اپنے گھر میں، میرے ہاں خالی ہاتھ آیا کرو۔"

"اوہو..... ہو....." وہ ہنسا۔ "تمہارے لیے نہیں اپنے بھانجے، بھانجیوں کے لایا ہوں۔"

"بھان..... جے....." الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔ "تمہارا مطلب ہے میرے بچے تمہارے بھانجے اور میں تمہارا بہنوئی..... شرم کرو، شرم....." میں نے اسے شرم دلائی۔

"معاف کردو بھائی..... میں اس وقت غم کے نشے میں ہوں۔" اس نے کہا میں چپ کا چپ رہ گیا۔ فضا بوجھل اور اداس تھی لیکن بہرحال مجھے اتنے تحائف کا زیر بار ہونا بھی منظور نہ تھا..... میں نے ان تحائف کی طرف اشارہ کیا۔

"او..... چھڈ ناصر یار..... اس شہر میں میرا ہوٹل کھلا ہے، اسی سے کچھ کھانے پینے کا سامان لے آیا ہوں، آرام سے بیٹھو تم۔" اس نے مصنوعی بشاشت لہجے میں پیدا کی۔

"کھانا منگواؤں؟" دودھ سیون اپ کا گلاس تھماتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"نہیں، کھانا کھا چکا ہوں۔ پتا نہیں کیوں... ائرپورٹ جاتے ہوئے قدم ادھر اٹھ گئے ہاتھوں نے اِدھر گاڑی کا رخ موڑ لیا..... مصنوعی زندگی اور دکھوں کے پہاڑ نے مجھے ختم کردیا ہے۔" اس کی آواز آنسوؤں سے غمگین ہوگئی تھی..... میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"بھائی کہتے ہو اور اتنی بیگانگی..... دکھ غم کے رونے روتے ہو کچھ بتاؤ گے تو پتا چلے گا..... میرے گھر میں دولت کے انبار نہیں خلوص اور محبت وافر موجود ہے۔"

"ہاں..... تم ٹھیک کہتے ہو، یہی دیکھ کر آیا ہوں ورنہ دنیا سوائے مکروفریب اور دھوکے کے کچھ نہیں..... ہر بندہ غرض کا بندہ ہے۔" وہ پُردرد لہجے میں بولا۔

"شاید تمہاری یہ رائے اس لیے بنی کہ کمائی میں حلال کا پورا دھیان نہیں رکھا گیا ورنہ حلال کمائی میں ایثار، محبت، وفاداری آٹے میں نمک کی طرح ملے ہوتے ہیں۔" میں نے گویا اسے زندگی کے اصول بتائے۔

"تمہارا مطلب ہے یار مولوی کہ میری کمائی حرام کی ہے؟" اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔

"یہ تم خود بہتر جانتے ہو..... میں تو کسی پر یہ ٹھپا نہیں لگا سکتا۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"نانا ابو کھانا کب کھائیں گے، نانی پوچھ رہی ہیں۔" میری نواسی عائزہ نے مجھ سے پوچھا۔

"نانا..... اوئے تم نانا ابو بھی ہو.....؟" اس کے چہرے پر رنگ بکھر گئے۔ "ماشاء اللہ....." اس نے عائزہ کو پاس بلایا اور پوچھا۔

"بیٹا کیا نام ہے؟"

"عائزہ....." بٹ نے عائزہ کو خوب پیار کیا۔

"یار تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہاری بیٹی بائیس سال کی ہے اور یہ بچی.....؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں تو میٹرک کا امتحان دیتے ہی شادی کردی تھی بیٹی کی..... بہت اچھا رشتہ تھا۔" میرے لہجے میں اپنی اکلوتی بیٹی حفصہ کے لیے محبت ہی محبت تھی۔

"تمہارا داماد کیا کرتا ہے؟" اس نے تفتیش کی۔

"اپنا جنرل اسٹور ہے ماشاء اللہ..... آمدنی اچھی ہوجاتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور داماد عادتاً کیسا ہے، تنگ تو نہیں کرتا؟" اس نے رک رک کر پوچھا۔

"داماد بہت اچھا ہے..... تم....." بات روک کر میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ہزار داستانیں اس کے چہرے پر رقم تھیں۔ ہر داستان کا الگ عنوان تھا۔ کرب، دکھ، اذیت..... اپنے دوست کو اس حالت میں دیکھ کر میرے دل کو بہت صدمہ ہوا۔

"یار..... تم پہیلیاں بہت بجھواتے ہو کچھ بتاؤ تو سہی ماجرا کیا ہے؟ شاید تمہارا غم ہلکا ہوجائے۔"

"نہیں....." اس نے قطعیت سے کہا۔ "میرا غم کائنات کی کوئی شے ہلکا نہیں کرسکتی..... بیٹے کے بیٹی، جسمانی معذور ہونے کو میں نے ربّی فیصلہ سمجھ کر تسلیم کرلیا تھا لیکن بیٹی کا دکھ میری ہڈیوں کے گودے

انوکھا رابطہ

رات کے پچھلے پہر
بیڈروم میں پھیلی
نائٹ بلب کی زرد روشنی میں
جب اس کی نیند کھلتی ہے
میری جگہ بستر پر، خالی سلوٹیں پاکر
پھر وہ یک دم اٹھتا ہے
اور اس کے قدم خود بخود
ٹیرس کی طرف بڑھتے ہیں
پھر دبے قدموں سے میرے پیچھے آکر وہ
دھیرے سے میرے شانوں پر
ہاتھ رکھ کر کہتا ہے
کیا چاند کا شاعرانہ حسن
تمہیں اس قدر اٹریکٹ کرتا ہے
کہ تم راتوں کو اٹھ اٹھ کر
پہروں اس کو تکتی ہو
کچھ یہی سمجھ لو تم
اتنا کہہ کر میں اس کو ٹال دیتی ہوں
پھر اس کی سنگت میں
سیڑھیاں اترتے وقت،
دل کے نہاں خانے سے
اِک آواز آتی ہے
کس طرح بتاؤں میں
کیسے یہ سمجھاؤں میں
مجھ سے دور کہیں کوئی
گرمیوں کی راتوں میں
لائٹ کے جانے پر
حبس زدہ کمرے کی
جب کھڑکی کھولتا ہوگا
چاند کو دیکھتا ہوگا.....

اُم ثمامہ، جھڈو سندھ

میں جم چکا ہے۔" اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"اللہ رحم کرے گا...... زندگی امتحان ہے اور امتحان میں صرف وہی ناکام ہوتا ہے جو حوصلہ ہار دیتا ہے۔" میں نے اس کی پشت تھپتھپائی۔

"یہ آزمائش نہیں، سزا ہے۔ خوفناک سزا......" وہ چیخا...... "تم نے نہیں سنا بے جی کہا کرتی تھیں دھی سکھی تو جد سکھی، دھی دکھی تو جد دکھی...... مجھے لگتا ہے میں نے زندگی میں کبھی خوشی کا منہ نہیں دیکھا...... میرے پاس پہنچتے پہنچتے خوشیاں کڑوی ہو جاتی ہیں۔" وہ حد درجہ قنوطی ہو رہا تھا۔

"اللہ خیر کرے گا......" میں نے اسے تسلی دی۔

"اللہ کیوں خیر کرے گا...... خیر کے دروازے تو ہم نے اپنے اوپر خود بند کر لیے ہیں۔ خیر بھی تو اپنے قدموں سے چل کر ہمارے گھر آئی تھی، ہم نے اسے دھکا دے دیا۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

"اللہ تمہاری اور میری توقع سے زیادہ رحیم ہے، غلطی کا احساس ہو جانا بھی اس کی رحمت ہے۔ تم ایک دفعہ اس کے در پر مانگ کر تو دیکھو وہ کتنے خیر کے دروازے اور کھولے گا۔" میں نے پورے یقین سے کہا۔

"اچھا یار اگلی قسط میں ہمت پیدا کروں گا غم بانٹنے کی۔" وہ تھکی تھکی الجھی نظروں سے مجھے بہت دیر دیکھتا رہا...... پھر ایک دم جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا دوبارہ کب آؤ گے؟" میں دروازے تک چھوڑنے گیا تو پوچھ بیٹھا۔

"عجیب بات ہے شاید مجھے ناسٹلجیا ہو گیا ہے حد دیکھو کہ اپنے ہوٹل میں رات رہنے سے دل گھبراتا ہے۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا۔ "آج شام میں ہی آؤں گا...... شاید اندر کی گھٹن باہر آئے تو زندگی نسبتاً آسان ہو جائے۔"

☆☆☆

صفائی ستھرائی کے لیے ماسی آئی تو ڈرائنگ روم کا سامان دیکھ کر بولی۔

"حاجی صاحب یہ سامان؟"

"یہیں رہنے دو، میرے دوست کا ہے وہ ابھی تھوڑی دیر تک لینے آئے گا۔" خلافِ توقع وہ عصر کے بعد ہی آ گیا...... مجھے اپنی بیوی رفیعہ کا پورا لیکچر اچھی طرح یاد تھا۔

"یہ دکھ ایسا نہیں جو اٹھایا نہ جا سکے جیسے بھی ہو اللہ سے اچھے دنوں کی امید ضرور رکھنی چاہیے۔" وغیرہ وغیرہ۔

اندر آتے آتے اس کی سانس بری طرح پھول چکی تھی۔

"یار جب بھی کسی بڑی بیماری نے مجھ پر حملہ آور ہونا ہوتا ہے میری سب سے پہلے سانس پھولتی ہے۔" اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا اور سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "ہر بیماری تو میرا منہ دیکھ چکی ہے سوائے موت کے۔"

"تم مجھے یہ بتاؤ اپنے اندر پورا اسپتال کیوں جمع کر رکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا کرو گے پوچھ کے......؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

"تمہارے اصل مرض کی تشخیص کروں گا...... غم...... غم، غم کی گردان کرتے ہو۔ تمہارے غم کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔" میں نے کسی سراغرساں کی طرح کہا۔

"غم تو ایک ہی ہے، ماریہ کا...... میری پہلوٹھی کی معصوم بیٹی...... تمہیں پتا ہی ہے جب ابا کی ایک دکان اور ایک ڈھابا تھا تو گھر میں کتنا سکون تھا، آج میں چار ہوٹلوں اور دنیا کے پانچ ملکوں میں جائداد کا مالک ہوں لیکن سکون نہیں ہے...... تم نہیں جانتے میں کتنا دکھی اور گناہگار ہوں۔" وہ اب رو رہا تھا...... میں اس انتظار میں تھا کہ وہ اپنا دکھ خود بانٹے...... پانی کا گھونٹ بھرنے کے بعد وہ بولا۔ "تم نعیم کو جانتے

ہو ناں...... میرا سالا...... خواجہ نعیم وہی کبوتر منڈی والا اس کے بیٹے تھے یار بڑے سیدھے سادے شریف، بچپن سے اُدھر ہی اپنی بیٹی کی بات طے تھی...... تب میں نے ہزاروں کی گنتی کی تھی لاکھوں کروڑوں کی گنتی سے دور تھا...... جب میرا ڈھابا فور اسٹار ہوٹل میں بدلا...... میں بٹ باؤ سے بٹ صاحب بنا تو خواجے کو اللہ جانے کیا دورہ پڑا...... اس نے لمبی سی ڈاڑھی رکھ لی دنیا اور دنیا داری کے جھمیلوں سے یکسر بے نیاز ہو گیا پھر سنا اس کا بیٹا طاہر جسے میرا داماد بننا تھا وہ بھی ڈاڑھی دار بن گیا...... جب جاؤ نماز روزے کی باتیں...... حرام حلال کے تبصرے، میں نے اپنی بیوی کو ان کے ہاں بھیجا کہ اگر رشتہ کرنا ہے تو شرافت کے ساتھ حلیے بدلو...... طور طریقے بدلو...... ہر وقت اسلام، اسلام کی باتیں سن کر بھی تو بندہ اسلام سے چڑ جاتا ہے...... انہی دنوں قسمت نے یاوری کی اور میرا ایک ہوٹل پنڈی میں بنا...... اب میں مشہور کاروباری شخصیت تھا...... اور جب میرے ہوٹل میں ایک ڈاکومنٹری کے سلسلے میں برطانیہ سے ایک وفد آیا تو اس کے ڈائریکٹر نے اپنے بیٹے کے لیے ماریہ کا رشتہ مانگ لیا...... میرے علم میں اُڑتی اُڑتی سی خبر آئی تھی کہ طاہر، ماریہ کا منگیتر لاپتا ہو گیا ہے...... میں نے اپنی بیوی کے مشورے سے اب آنے والے رشتے کو قبول کر لیا......" اس نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔

"میں تو لاکھوں سے کروڑوں میں چلا گیا لیکن میری بیٹی جس کے لیے میں نے حسن، دولت، شہرت سب کچھ یکجا اس رشتے میں منتخب کیا وہ عرش سے فرش پر آ گئی...... پتا نہیں قسمت بری تھی یا ہم نے دین کو ٹھکرایا تھا...... یا...... یا پھر...... طاہر کی آہ لے ڈوبی...... جب وہ واپس آیا تو پتا چلا کہ جسے میں اور لوگ لاپتا کہہ رہے تھے وہ تو عمرہ کرنے گیا تھا۔ ہم نے بھی بس یہ سوچ کر برادری کیا کہے گی جھٹ منگنی پٹ بیاہ کے محاورے پر عمل کیا۔ شادی پر سب کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا...... ماریہ کتنی پیاری لگ رہی ہے، یہ سوچا ہی نہیں وہ چپ کیوں ہے...... جب رخصتی کے وقت اپنی مامی کے گلے لگ کے وہ روئی تب پہلی دفعہ مجھے خیال آیا...... کہیں کچھ غلط تو نہیں ہو گیا...... آخر بچپن سے رشتہ طے تھا...... اگلے لمحہ داماد کی دولت کی ریل پیل اور اس کی مضبوط پی آر او نے سب بھلا دیا۔ لمحاتی کشمکش بھی ختم ہو گئی...... جب انگلینڈ جانے سے پہلے وہ ہم لوگوں سے ملنے آئی تو ایک چلبلی شوخ ماریہ کے بجائے مدبر، باوقار سی ماریہ سامنے تھی۔ میں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اس کی خاموشی بیوی کے سامنے رکھی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا...... اس کی ساس اور میاں بہت نائس لوگ ہیں۔" اس نے کہا۔ اب کے وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

"آج...... پندرہ سال گزر گئے اس آس، امید پر کہ سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن کچھ ٹھیک نہیں ہوا...... میری بیٹی نے کبھی حرفِ شکایت نہیں ہم سے کہا۔ یہ تو اس کی سسرالی عزیزہ نے ایک دفعہ فون پر بتایا...... بیٹیاں رخصت کرتے ہیں تو ان کا جنازہ نہیں اٹھاتے۔" مجھے سمجھ میں نہیں آیا وضاحت طلب کی تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ شراب کباب کا تو اللہ معاف کرے میرے ہوٹلوں میں بھی سلسلہ چلتا ہے وہ تو بالکل ہی بے غیرت ہے۔ مارنے سے بھی باز نہیں آتا۔ ملنے کے لیے آنے نہیں دیتا۔" نفرت سے اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

"تو ٹھیک ہے اسے واپس لے آؤ۔ ہم مسلمان ہیں اور یہ سوچ تو سراسر ہندوانہ ہے کہ بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے فقرہ کانوں میں ڈالیں اس گھر سے تمہاری ڈولی نہیں جنازہ اٹھا ہے، اسلام تو عورت کو بہت مقام دیتا ہے بہت مان بڑھاتا ہے تم اس کی طرف سے خلع کا دعویٰ کر دو۔"

”کیا تھا یہ بھی......“ اس نے بے بسی سے کہا۔ ”حالانکہ حق مہر ہم نے پچاس لاکھ لکھوایا تھا سوچا بیٹی کے سکون کے لیے وہ بھی چھوڑ دیتے ہیں لیکن وہ خبیث بچے کو لے جاتا ہے اور ماریہ بیٹے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”یہ تو واقعی تشویش ناک بات ہے، اچھا ماریہ نے تم لوگوں سے کوئی شکایت کی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ اللہ میاں کی گائے کیا شکایت کرے گی۔ میری بچی تو ہر ظلم سہنے والی ہے یا شاید اس نے اپنے نفس کو ہی مار لیا تھا...... جب ہم نے اس کا رشتہ توڑا تھا۔“ وہ بلک بلک کر رو دیا۔

”روؤ نہیں یار...... دل بڑا کرو...... اللہ نے ہر مسئلے میں ہی اس کا حل رکھا ہوتا ہے اس طرح تو تم سب کے لیے اذیت کا باعث بنو گے، ویسے یار تمہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“ میں نے اسے ٹھنڈا کیا۔

”ہاں...... یہی تو غلطی کی تھی۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی کہ بابا ابھی میری شادی نہیں کریں۔ اس وقت سب نے کہا لڑکیاں ایسے ہی کہتی ہیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میں اس پر کتنا بڑا ظلم کرنے لگا ہوں۔ اب تنگ آ کر پچھلے نو دس ماہ سے میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا ہے لیکن بیٹے کے بغیر اس کی چپ مجھے مارتی ہے جب وہ چھپ چھپ کے روتی ہے تو میرا دل کٹ جاتا ہے...... میرا دل کرتا ہے یا میں اپنا گلا کاٹ لوں یا اس خبیث نامراد کا جس نے میری بیٹی کو دکھ دیے۔“

”صبر...... یہ تو حل نہیں...... اچھا میں اپنے نواسے کو بلاؤں تم ذرا بہل جاؤ گے۔“ میں نے اپنے نواسے کو آواز دی۔

”تمہارا داماد آنے دے گا اسے۔“ اس نے بچوں کی طرح آنکھیں پٹپٹا کر پوچھا۔

”افوہ...... تم اصل میں داماد کے ڈسے ہوئے تو تمہیں ہر داماد اپنے داماد جیسا لگتا ہے حالانکہ یہ... فارمولا تو نہیں کہ ہر داماد بھی ایسا ہو اگر ایسا ہوتا تو دنیا میں کوئی بادشاہ، وزیر جھگی والا بھی اپنی بیٹی رخصت نہیں کرتا...... تم اصل میں اس رشتے کے ہاتھوں مجروح ہوئے ہو اس لیے تم دنیا کے ہر داماد کو شک کی عینک سے دیکھتے ہو۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”یہ تو تم صحیح کہتے ہو۔“ اس نے سر ہلایا۔

”تمہارا داماد رشتے دار ہے؟“ اس نے معلومات لیں۔

”پہلے تو نہیں تھا اب الحمدللہ مجھے اپنے بیٹوں سے زیادہ محبوب ہے۔“ میں نے بتایا۔ اس کے چہرے پر سایہ سا آیا اور گزر گیا۔

”یار سچ بتاؤ تم نے اپنے داماد میں کیا دیکھا؟“ اس کے اندر کی بے چینی سوال بن کر آئی میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

”بات یہ ہے میرے انتخاب کی بنیاد، بہت مضبوط تھی جبکہ تمہارا المیہ یہ ہے کہ تمہاری ”بنیاد“ بہت کمزور تھی۔ ساری بات اسی ”بنیاد“ کی ہے۔ تم اگر میرے داماد کے قریب جاؤ گے وہ ہے تو بندہ بشر لیکن اتنا ہی اچھا نکلے گا...... اس کی شخصیت مسحور کن ہو گی...... اس لیے کہ میری بنیاد دین اور سیرت تھی جبکہ تم نے انہی دین اور سیرت کو ٹھکرا کر دنیاوی چکا چوند اور عہدے کو پسند کیا تو تم خود ہی تو پچھلی دفعہ کہہ رہے تھے دنیا بہت مکار اور دھوکے باز ہے۔“ میں نے بڑے آرام سے اسے بڑی بڑی باتیں سمجھائیں...... ”اور اگر بہت بچپن میں جھانکو تو تمہیں یاد ہو گا کہ میرا باپ نان چھولے کی ریڑھی لگاتا تھا...... حالانکہ انہیں جس محکمے میں جاب ملی تھی وہاں پر تنخواہ اور سہولتیں بہت زیادہ تھیں...... تین چار ماہ کی ملازمت میں انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں حلال کا لقمہ بھی حرام میں ڈبو کر ملے گا...... انہوں نے وہ نوکری چھوڑ دی...... سب نے بڑی تف تف کی لیکن انہوں نے ایک ہی جواب دیا۔ پورے قرآن میں یہی تو واحد حکم ہے جو اللہ نے پوری دنیا کے انسانوں کے ساتھ

ساتھ اپنے رسولوں کو بھی دیا ہے کلو حلال طیبا...... میں اب اس کی نافرمانی کیسے کروں؟ ہماری پرورش ابا کی اسی نان چھولوں کی ریڑھی سے ہوئی۔ حلال کا لقمہ، برکت، رب راضی یہ تین الفاظ نہیں تین زاویے ہیں جن کے ارد گرد ہماری زندگی کا پہیہ گھومتا تھا اگر کمائی حلال ہے تو ہر کام کی درستگی میرے رب کے ذمے ہے اور اگر کمائی میں حرام کا لقمہ بھی شامل ہے تو عبادت بھی قبول نہیں حج، عمرہ تو بعد کی بات ہے...... خوب صورتی رب کی عطا کردہ ہوتی ہے، مال آنی جانی چیز ہے باقی رہ گئی پائیدار چیز تو وہ صرف سیرت و اخلاق ہے سو میں نے داماد کے انتخاب میں بس اسی کو آگے رکھا۔“ میں نے ٹھہر ٹھہر کر اسے بتایا۔

”یار یہ ساری باتیں تم نے کہاں سے سیکھیں؟“ وہ گم صم مجھے دیکھ رہا تھا پھر ایک دم چونک کر کہنے لگا۔

”حدیثِ مبارکہ سے...... سنتِ رسول ﷺ سے۔“ میں نے ترت کہا۔ ”حدیث مبارکہ ہے آپ ﷺ نے فرمایا...... ’عیسائی رشتے کے انتخاب میں حسن دیکھتے ہیں، یہودی مال و دولت دیکھتے ہیں مسلمان دین (سیرت) کو سامنے رکھتا ہے‘! تو میرے یار مجھے بتاؤ میں اپنے محبوب کے فرمان کو کیسے پسِ پشت ڈال دیتا؟ جب میرے سامنے میرے لیے بیٹی کا رشتہ آیا تو اس کی عمر صرف سترہ سال تھی...... تم کہتے کہ ابھی تو بچی ہے حالانکہ بلوغت کے ساتھ ہی اچھا رشتہ آئے تو قبول کرنے کا حکم ہے...... اور اچھا رشتہ بغیر وجہ کے ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہے...... سو میں نے اپنے طور پر تحقیق کی ایک دو ملاقاتیں بھی آنے بہانے داماد سے کر لیں۔ دل مطمئن تھا کہ اس کے اندر تو کل کی دولت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی...... باتوں باتوں میں رشتے کا ذکر آیا تو ہنس کر وہ کہنے لگا۔

”خدا نے بندے کے دو کام رزق اور رشتے اپنے ذمے لے کر بندے کو ٹینشن فری کر دیا ہے۔ اللہ کو بہت اعتقادِ کے ساتھ ربِ اِنّی لِمَا اَنزَلتَ اِلَیَّ مِن خَیرٍ فَقِیر...... کی درخواست پیش کر دی ہے مجھے یقین ہے میرا رب مجھے خیر ہی خیر دے گا......“ میں کچھ دیر رکا پھر مسکرا کر بولا۔

”تم سوچ سکتے ہو بٹ...... کہ جب گہرے سانولے اور معقول سی آمدنی رکھنے والے اس نوجوان نے اپنی یہ سوچ مجھ سے شیئر کی تو مجھے اس پر کتنا رشک آیا...... میرے دل میں بے اختیار خواہش پیدا ہوئی اتنی پختہ سوچ رکھنے والا کاش میرا اپنا ہو...... کسی ڈوری میں تو ہم اکھٹے بندھیں...... جب میرے داماد کی ماں نے یہ پیغام بھجوایا کہ آپ کی بچی بہت صالح فطرت ہے مجھے امید ہے کہ آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گے تو میں ساری رات روتا اور تکیہ بھگوتا رہا...... رفیعہ بار بار پوچھتی رہی۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اور میں ساری رات فلو سے سر بھاری ہو رہا ہے کا فقرہ زبان سے ادا کرتا رہا...... ساری رات مجھے اشفاق احمد کا فقرہ یاد آتا رہا کہ رب نے مجھے شاید بیٹی اس لیے نہیں دی کہ میں اتنا خبیث ہوں کہ رخصت کرنے کا حوصلہ کیسے لاتا...... تم سمجھتے ہو ناں بٹ کہ آپ کی اولاد آپ کے وجود میں پیوست ناخن کی طرح ہوتی ہے، کیا ناخن اکھاڑا جا سکتا ہے؟ میری آواز میں آنسوؤں کی نمی شامل ہو گئی...... لیکن مجھے اس وجود کے ٹکڑے کو اپنے سے الگ کرنا تھا کہ میرے نبی ﷺ نے بھی کمالِ حوصلے سے یہ کام کیا تھا...... ساری رات میں ہمت جمع کرتا رہا، الفاظ ترتیب دیتا رہا...... سترہ سالہ گڑیا نے مجھ سے رخصت ہو جانا تھا...... بہرحال...... میں نے دو نفل پڑھ کر رب کے سامنے اپنی حاجت رکھی پھر جب ناشتے کے بعد وہ یونیفارم پہنے میرے پاس آئی تو میں نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔

”حفصہ بیٹے آج کالج نہ جاؤ۔“ اس کی رخصتی کا سوچ کر میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ میری جان میری گڑیا مجھے روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگی اور

پوچھنے لگی۔

"ابو آپ ٹھیک تو ہیں؟ آپ کو کیا ہوا ہے؟"

"بیٹے مجھے آپ سے ضروری کام ہے آپ آج میرے ساتھ دن گزارو گی؟" وہ چپ چاپ یونیفارم تبدیل کر کے میرے پاس آ گئی۔

"میں نے اسے اپنے سے قریب کیا، بیٹے سنا تھا لڑکیاں بانس کی طرح جلدی بڑی ہو جاتی ہیں، ابھی تم پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہی تھیں، ابھی امی سے پونی بنوا رہی تھیں اور اب....." میری آواز رُندھ گئی۔

"ابو آپ ٹھیک تو ہیں؟" اس نے پریشان ہو کر پھر پوچھا۔

"بیٹے ایک باپ کے لیے یہ کتنا مشکل ہے کہ وہ یہ فرض خود ادا کرے لیکن اپنی طرف سے میں نے تمہارے لیے بہت اچھا رشتہ منتخب کیا ہے۔"

"ابو آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اب کے وہ پریشان ہو گئی تھی۔

"بیٹا کسی بھی ماں باپ کے لیے سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں اولاد کے فرض سے سبکدوش ہوں، اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنا فرض ادا کریں لیکن میری مانو، یقین کرو حتمی فیصلہ تمہارا ہوگا..... تم جانتی ہو کہ میں نے ساری زندگی اصولوں کے تحت گزاری ہے وہی اصول اس وقت میرے سامنے ہیں، انکل حنیف نے اپنے کسی جاننے والے کا رشتہ تمہارے لیے بھیجا ہے..... یہ بات ایسی ہے کہ یقین کرو میں تم تک پہنچانے کے لیے تمہاری ماں کو بھی قابلِ اعتبار نہیں سمجھتا..... اس لیے میں خود تم سے بات کر رہا ہوں ویسے بھی شرع میں کیا شرم..... جوڑ بلاشبہ اللہ بناتا ہے لیکن حیلے، وسیلے ہزار ہوتے ہیں، میں نے ہر لحاظ سے تحقیق کی ہے لڑکا دیندار اور باعمل مسلمان ہے۔ بشری کمزوریاں ہر ایک میں ہوتی ہیں لیکن جہاں قرآن اور اللہ رسول کی شریعت ہوگی وہاں کمزوریاں کم ہوں گی، تیسرا یہ کہ اس رشتے میں مجھے یہ چیز اچھی لگی کہ کردار کے ساتھ ساتھ اخلاق بھی پاکیزہ ہے، گھر ذاتی ہے، لڑکے کے پاس اعلیٰ ڈگری ہے، آخری چیز شکل صورت کی ہے عادت و اطوار بدلنا اپنے اختیار میں ہوتا ہے، شکل تو اللہ کی بنائی ہوئی ہوتی ہے سو اوپر والی خوبیوں کے ساتھ یہ ذہن میں رکھنا کہ لڑکا سانولے رنگ اور درمیانے قد کا ہے۔ رنگ سانولا لیکن دل نورِ ایمان سے منور ہے..... بلالِ حبشی کی طرح۔ اب تم جو چاہو فیصلہ کر سکتی ہو....." میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

"پھر کیا ہوا؟" بٹ نے بے تابی سے پوچھا۔

"پھر کیا ہونا تھا بند لفافے میں تصویر اس کے حوالے کر کے میں سارا دن گونگا بنا رہا..... کچھ بولنے یا کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا میں سارا دن نوٹ کرتا رہا..... حفصہ کا چہرہ خالی خولی سا تھا نہ تبسم نہ تکلم۔ لیکن اگلی صبح..... میں جب نماز پڑھ کر گھر آیا تو رفیعہ کھٹ کھنی بلی کی طرح مجھ پر جھپٹی۔

"آپ نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا؟"

"کس بات کا.....؟" میں دانستہ انجان بن کر بولا۔ "باتیں تو ہزار طرح کی روزانہ ہوتی ہیں۔"

"حفصہ کے رشتے کا..... میں حفصہ کی کچھ نہیں لگتی..... میں نے نو ماہ پیٹ میں رکھا، پیدا کیا پالا پوسا..... نیندیں حرام کیں اور آپ نے کتنے مزے سے مجھے اس قصے سے نکال باہر کیا۔" موتیوں کی لڑی کی طرح آنسو اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے..... غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، مجھے کچھ دیر تو صدمہ ہوا لیکن میں نے اس سے کہا۔

"تم اگر ٹھنڈے دل سے سوچو تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں اس لیے کہ اس نے زندگی میں ہر چھوٹی بڑی پریشانی مجھ سے ہی شیئر کی ہے دوسرا یہ کہ اگر میں تم سے پہلے مشورہ کرتا تو تم نے اپنی رائے دینا تھی، حفصہ کی نہیں، مجھے حفصہ کی رائے مطلوب

تھی۔ استخارہ اس نے ہی کرنا تھا اور......"

"مبارک ہو...... استخارہ اس نے کر لیا ہے۔" رفیعہ میری بات کاٹ کر بولی۔

"اچھا..... کیا.....؟" دل میں حفصہ پر حیرانی تھی باپ کے گلے کا ہر وقت ہار بنی رہنے والی اس وقت ماں کے پاس ہی گئی۔

"بس لال گلال ہو رہی تھی کہ مجھے اچھا اشارہ ملا ہے۔" میں نے سکون کی لمبی سانس لی کہ میری بیٹی نے بھی میری طرح ظاہر کے بجائے باطن کو دیکھا اور اللہ اسے خوش رکھے پھر...... یہ کہ بٹ....." میں شاید بول بول کر تھک گیا تھا۔

"پھر یہ کہ ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر حفصہ کی شادی ہو گئی...... اس کی زندگی ہماری خوشی ہے...... اس کے بچے ہماری رونق ہیں اس کا میاں ہماری چاہت ہے....." میرے بس میں نہیں تھا کہ میں کس طرح اپنے جگر کے ٹکڑے کی تعریف کروں۔

"اور اس کے دونوں بچے عائزہ اور فہد خرگوش کے بچوں کی طرح لگتے ہیں..... پتا ہے تم سے مل کر کیا فرما رہے تھے؟" میں نے بٹ کو متوجہ کیا۔

"کیا.....؟" وہ اشتیاق سے بولا۔

"کہہ رہے تھے نانا جان اگر یہ آپ کے دوست ہیں تو داڑھی اور عینک کیوں نہیں لگاتے؟" اس کے بعد بٹ تھا اور قل قل کرتے قہقہے..... ان قہقہوں کے بیچ پتا نہیں کیوں اس کی آنکھ سے آنسو ٹپک پڑا۔

"بٹ بیلی..... دنیا میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہوتا جس کا حل نہ ہو اگر اجازت ہو تو حل پیش کروں۔" میرا دل کٹ کر رہ گیا..... تڑپ کر میں نے کہا۔

"ہاں اسی آس میں تو تمہارے پاس آتا ہوں..... غرض کا بندہ ہوں یہی غرض کہ تم بے لوث مشورہ دو گے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "بس یہ

دھیان رکھنا بچے کے بغیر وہ رہ نہیں سکتی اور طلاق وہ دیتا نہیں۔"

"پہلی بات یہ ہے کہ....." میں نے اسے پوری طرح متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس سوال کا جواب ڈھونڈو یہ مسئلہ پیدا کیوں ہوا؟ محض اس لیے کہ تم نے انتہائی شریف النفس اور سادہ لوح بچے کا رشتہ ٹھکرا دیا تم نے خدا اور اس کے رسول ﷺ سے منہ پھیرا اور اللہ نے تم سے منہ پھیر لیا۔"

"یہی تو دکھ کھائے جاتا ہے....." اس نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

"یار توبہ کا دروازہ تو سب کے لیے کھلا ہے..... احساسِ ندامت ہی آدمیت کی پہچان ہے۔ ابلیس اسی احساسِ ندامت سے تو محروم تھا..... دوسرا بلنڈر تم نے یہ کیا کہ دنیا کی چکاچوند دیکھی، ایک شریف کی حیا سے منہ موڑا تو دنیا جہاں کی بے حیائی اور بدکاری تمہارے پلے پڑ گئی..... تیسرا یہ کہ تم نے دین کی وجہ سے رشتہ ٹھکرایا، دین نے تمہیں کیسے ٹھکرایا تم خود ہی بتا رہے تھے کہ شراب کباب تو کوئی گناہ نہیں سمجھا جاتا..... سور کا گوشت بھی کھاتے ہیں..... غلیظ عورتیں گھر میں آتی ہیں اور گھر اور قحبہ خانے میں کوئی فرق نہیں ہوتا..... نماز کا سجدہ کبھی عید، بقر عید پر بھی کرنے کی توفیق نہیں ہوتی..... یہی ہے ناں صورتِ حال؟" میں نے اسی کے جملے دُہرائے۔ وہ اقرار میں سر ہلا رہا تھا۔

"دیکھو میری بات سنو، ہم منہ سے اللہ، اللہ سارا وقت کرتے ہیں لیکن اپنے فیصلوں میں اللہ کو ایک طرف کر دیتے ہیں اللہ سے زیادہ تو بہترین فیصلے کرنے والا کوئی نہیں، تم نے اس کے چاہنے والے کو ٹھکرایا اور نئے رشتے کے انتخاب میں اس سے کوئی مدد نہیں مانگی..... پھر بتاؤ تم کیسے بہتری کی امید رکھے ہو؟"

"میں فخر سے تو نہیں عاجزی سے بتاتا ہوں کہ تسبیح ذکر اذکار اپنی جگہ لیکن ہر چھوٹے بڑے فیصلے میں، میں نے اپنے اللہ سے بھی مدد طلب کی ہے اور میرے اللہ نے کبھی مجھے مایوس نہیں کیا..... میں کبھی محروم نہیں رہا..... اس نے ہمیشہ میری اوقات سے زیادہ نوازا ہے..... سکون، دولت، رحمت، برکت، عافیت یہ سب مجھ ناچیز پر اس کے انعامات ہیں جن سے تم محروم ہو، تم جس عزت، دولت، شہرت اور اسٹیٹس کے پیچھے بھاگتے رہے اس نے تمہیں سکون، عافیت اور رحمت سے محروم کر دیا۔ بتاؤ ایسا ہی ہے ناں.....؟" میں نے لوہا گرم دیکھ کر ضرب لگائی۔

"میرے یار جب مرض کی تشخیص ہو ہی گئی تو علاج بھی کر دیکھتے ہیں پہلے تو اپنی کمائی پر نظر ڈالو منافع کی شرح سے کوالٹی تک ہر چیز میں حرام کو نکال پھینکو پھر ماریہ کا علاج کرتے ہیں۔"

"کیا علاج.....؟" بڑی بے تابی سے اس نے پوچھا۔

"پہلا حل تو یہ ہے کہ ماریہ بیٹی اپنے بچے سے اس کی بلوغت تک جُدا رہے یا پھر عدالت سے رجوع کرے دوسری صورت یہ ہے کہ ماریہ اپنے میاں سے کہے کہ وہ دوسری شادی کر لے..... خود بچے کی خاطر وہیں رہے۔"

"دوسری شادی! تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" بٹ نے تیز لہجے میں کہا۔

"تمہارا مطلب ہے ماریہ اسے دوسری شادی کا کہے؟"

"ہاں..... بالکل..... ہر گٹر میں منہ مارنے اور حرام خوری سے کہیں بہتر ہے کہ وہ ایک ہی گٹر کا پانی ہے..... دنیا جہاں کا گندا کام کر کے کون سادہ ماریہ کو مطمئن کرتا ہے جو اَب وہ بے سکون ہوگی..... کم از کم اس سے یہ مثبت پہلو ضرور آئے گا کہ گھاٹ گھاٹ کے پانی پینے والے کو اپنی ہم ذوق عورت کو بیوی بنا کر رکھنا پڑا تو وہ قیدِ نکاح میں کب تک رہ پائے گی؟ تم نے سیاست میں بڑی برائی اور چھوٹی برائی کا فارمولا سنا ہے ناں..... بس بہت بڑے گناہ سے بچنے کے لیے یہ چھوٹا سا کام تو برداشت کرنا ہی ہوگا....." ماریہ کی قدر بھی اسی صورت ہوگی..... گرل فرینڈ اور بیوی میں بہت فرق ہوتا ہے، ایسا کر کے تو دیکھو۔"

ٹکر ٹکر..... بٹ میری شکل دیکھے جا رہا تھا۔

"کام تو مشکل ہے لیکن اس کے اثرات خوش آئند ہوں گے ایک پاکباز عورت جو اپنا احتجاج ریکارڈ نہیں کرا سکتی اور ایک لوز کریکٹر عورت میں بہت فرق ہوتا ہے تم بتاؤ ماریہ نے ہر پابندی برداشت کی کیا دوسری بیوی سہہ لے گی؟"

"ہاں! بات میری سمجھ میں آ گئی ہے لیکن کیا اب میں اسے فوراً واپس بھجوا دوں۔" بٹ کے چہرے پر چمک آئی۔

"وہ تو بھجوانا پڑے گا..... اس لیے کہ اپنی عورت..... لمبا عرصہ شوہر سے دور رہے تو پاکباز سے پاکباز مرد بھی دوسری عورت میں دلچسپی لے سکتا ہے۔" میں نے ہلکے، ہلکے لہجے میں کہا اور بات بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔ "اور رب پر پورا بھروسا کرو معافی کا ایک جملہ خدا کے خوف کا ایک آنسو تمہاری ساری کوتاہیوں کو مٹا سکتا ہے..... تم تجربہ کر کے تو دیکھو۔"

"یار اس سے تو کبھی مانگا ہی نہیں۔" رفیعہ چائے بھجوا چکی تھی..... کپ ہاتھ میں لے کر بٹ نے شرمندگی سے کہا۔

"تو اب مانگ لو..... آخری سانس تک مانگنے کے لیے در کھلا ہے۔ تم یقیناً دیکھو گے دنیا جہاں کی خوشیاں تمہارے پاس ہوں گی۔ انشاء اللہ!" پورے یقین سے میں نے پیش گوئی کی۔

چائے کے بعد بٹ نے میرے ساتھ ہی مسجد میں نماز ادا کی..... آنسو برسات کی جھڑی کی طرح اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔

خدا کی قسم اس لمحے مجھے اس پر رشک آ رہا تھا..... خدا کا ایک گمشدہ بندہ واپس خدا کو مل گیا..... کیا اس سے بڑھ کر کوئی بات اس وقت قابلِ رشک ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

بٹ کو ہمارے ہاں سے گئے صرف دس منٹ ہوئے تھے صرف دس منٹ جب اس کا فون آیا..... میں لمبی گفتگو سے تھکا ہوا تھا لیکن میرے مسلک میں دلجوئی بہت بڑی عبادت ہے، سیل فون آن کیا تو اس کی خوشیوں سے بھرپور مسرت سے لبریز آواز سنائی دی۔

"یار ابھی میں تمہارے شہر میں ہی ہوں، ماریہ کا فون آیا ہے، پتا ہے کیا.....؟" وہ بچوں کی سی خوشی سے بولا۔

"کیا.....؟" میرا خون سمٹ کر جیسے چہرے پر آ گیا ہو۔

"ماریہ کے میاں نے دوسری شادی کر لی ہے اور دوسری بیوی نے شرائط میں پہلی بیوی کو طلاق اور بچے کو اس کی ماں کے پاس بھجوانا طے کیا ہے..... طلاق کے کاغذات اسے مل گئے ہیں اور بچہ اگلی فلائٹ سے پاکستان آ رہا ہے۔" ایک اطمینان بھرا پُرسکون لہجہ جس کی حسرت چند لمحے قبل اس نے مجھ سے کی..... میرے رب نے کتنی جلدی اسے عطا کر دیا۔ میں صرف اس بات پر دنگ تھا کہ کیا بٹ خدا کو اتنا ہی زیادہ محبوب تھا کہ میں دعا مانگوں تو کبھی پلک جھپکنے میں قبول نہیں ہوتی جتنی جلد اس کی ہو گئی۔

خوشی سے بھرپور لہجے میں بٹ مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رہا تھا اور میں اپنے رب کی اس عنایت پر دنگ تھا کہ دعا پہلے تو کبھی اتنی جلدی عرشوں تک پہنچتے سنا نہ دیکھا..... واہ مولا تیری اُچیاں شاناں۔



گمشدہ جنت

صائمہ اکرم

منی ناول

تیسرا حصہ



''بی بی جی، بی بی جی وہ انعم بی بی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے بہت زیادہ چیخیں مار رہی ہیں......'' گھر کی ملازمہ نے حواس باختہ انداز میں آکر اطلاع دی تو الماس بیگم نے سخت نظروں سے اپنی چھوٹی بہن رومیصہ کا فق چہرہ دیکھا۔ وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئیں اور بوکھلا کر ملازمہ کے پیچھے انعم کے کمرے کی طرف بھاگیں۔

''ایک دم جاہل ہے یہ رومیصہ بھی......''

الماس بیگم کے ماتھے کی تیوری میں اضافہ ہوا۔ ''جب پتا ہے کہ بچی ایسے موسم میں گھبرا جاتی ہے تو اسے خود خیال کرنا چاہیے۔'' وہ مہمانوں کا خیال رکھے بغیر خاصی بلند آواز میں اس صورتِ حال پر تبصرہ کر گئیں۔ مہمان بھی کون سے ان کے پسندیدہ تھے۔ موسم اچھا ہونے کی وجہ سے ابراہیم صاحب نے خود ہی اوپر کے پورشن والوں کو چائے اور پکوڑوں کی دعوت دے دی جس کی تیاری میں رومیصہ کے ذہن سے نکل گیا کہ بارش کی آواز سے انعم ڈر جاتی ہے۔

''یہ انعم کیا ابھی تک بارش سے خوفزدہ ہوتی ہے......'' شامی نے سخت حیرت سے پوچھا۔ کچھ سال پہلے بھی جب وہ پاکستان آیا تب بھی یہی صورتِ حال تھی۔

''ہاں، کوئی ''اومبروفوبیا'' ٹائپ چیز ہے۔ علاج تو چل رہا ہے لیکن ابھی کوئی خاص بہتری نہیں آئی۔'' ابراہیم صاحب نے اپنی بیگم کی تیوری سے نظر چرا کر وضاحت کی۔

''تو ماموں آپ لوگ سنجیدہ ہو کر کسی اور اچھی جگہ سے علاج کیوں نہیں کرواتے......'' شامی کی بات پر الماس بیگم کے تن بدن میں آگ سی لگی لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہیں۔

''علاج تو بہترین جگہ سے ہو رہا ہے۔'' ابراہیم صاحب فوراً بولے۔ ''لیکن اس کی ڈاکٹر کا تعلق لاہور سے ہے جس کی وجہ سے باقاعدگی سے سیشن نہیں ہو پاتے......'' ابراہیم صاحب نے فوراً صفائی دی۔

''تو آپ لوگ یہاں اسلام آباد میں کوئی اچھا ڈاکٹر کیوں نہیں ڈھونڈتے......'' شامی نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کر اپنی عطیہ ممانی اور نانو کا سنجیدہ چہرہ دیکھا جو تنبیہی نظروں سے اسے اس موضوع پر گفتگو کرنے سے جتنا منع کر رہی تھیں اتنا ہی وہ سنی ان سنی کر رہا تھا۔

''مسئلہ اسلام آباد میں ڈاکٹر ڈھونڈنے کا نہیں ہے......'' ابراہیم صاحب نے فوراً صفائی دی۔

''اگر کوئی اور پرابلم ہے تو میں ماما سے بات کرتا ہوں۔ ہم انعم کو باہر لے جاتے ہیں وہاں سے اچھا ٹریٹمنٹ ہو جائے گا......'' شامی کی آفر پر الماس بیگم نے بے ساختہ کوفت بھرے انداز سے پہلو بدلا۔ عبیرہ ہمیشہ کی طرح فوراً ہی اپنی ماں کی مدد کو آئی۔

''احتشام بھائی مسئلہ انعم کو باہر لے جانے کا نہیں، وہ تو ہم لوگ بھی لے جا سکتے ہیں۔'' عبیرہ نے رکھائی سے کہا۔ ''اصل مسئلہ تو رومی خالہ کا ہے۔'' عبیرہ کے ایک دم بولنے پر سب کی توجہ اس کی جانب مبذول ہوئی۔

''رومی خالہ کو کیا مسئلہ ہے؟'' شامی نے جانچتی نظروں سے اپنی اس کزن کا چہرہ دیکھا جو اسے بالکل الماس ممانی کی فوٹو اسٹیٹ کاپی لگتی تھی۔

''انہوں نے انعم کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ کوئی بھی ڈاکٹر ان کو پسند نہیں آتا، اوپر سے یہ ضد کہ ڈاکٹر بھی کوئی خاتون ہو، ورنہ پاپا کے ایک بہت اچھے دوست کے بھائی سائیکاٹرسٹ ہیں، انہوں نے بارہا کہا ہے کہ وہاں چیک کرواتے ہیں۔'' عبیرہ نے بالکل اپنی ماں کے اسٹائل میں ناک چڑھا کر کہا۔ اس وقت یہاں نویرہ موجود نہیں تھی ورنہ ایک آدھ جنگ ہو چکی ہوتی۔

''یہ کیا منطق ہوئی بھلا بلکہ یہ تو کم عقلی ہے سراسر۔'' شامی کے لہجے میں ناگواری جھلکی۔ جبکہ وہاں موجود تینوں خواتین نے بے چینی سے ایک دفعہ پھر پہلو بدلا۔

''میرا خیال ہے کہ اب اٹھا جائے، شام کے کھانے کا وقت ہو رہا ہے اوپر حرا بیچاری اکیلی تنگ ہوئی ہو گی۔'' ارجمند خاتون نے بہت طریقے سے محفل برخاست کرنے کا اشارہ کیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کی بڑی بہو زیادہ دیر تک مروت نبھانے کی قائل نہیں اور پھر نتیجے کے طور پر ان کے بیٹے کو ساری

بھگتنا پڑتی۔

''جی اماں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں میں ذرا حرا کو دیکھوں کہیں ٹیپو اسے تنگ نہ کر رہا ہو......'' عطیہ چچی سب سے پہلے بہانہ بنا کر اٹھیں اور اُن کے پیچھے ہی ارجمند خاتون نے بھی وہاں سے اٹھنے میں ہی عافیت سمجھی۔

''ارے شامی بیٹا اپنی بوڑھی نانو کو ذرا اوپر تک پہنچا آؤ، کہیں پاؤں واؤں نہ پھسل جائے......'' ابراہیم صاحب نے کن انکھیوں سے اپنی بیگم کا برہم مزاج بھانپتے ہوئے شامی کو بھی یہاں سے اٹھایا جو خود بھی کسی بہانے کی تلاش میں تھا۔ اس نے مشکور نگاہوں سے اپنے بڑے ماموں کو دیکھا جو اکثر اسے کسی کہانی کا مظلوم سا کردار لگتے تھے۔

''عابی، یہ نویرہ مجھے کل سے نظر نہیں آ رہی، خیریت ہے؟'' ان سب کے نکلتے ہی ابراہیم صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''پاپا اس کا مزاج آج کل پتا نہیں کیوں سوا نیزے پر ہے۔ ہر وقت ماتھے پر تیوری چڑھائے پھرتی ہے۔'' عبیرہ نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

''کوئی اسٹڈی کا تو مسئلہ نہیں ہے'' ابراہیم صاحب فوراً پریشان ہوئے۔

''اسٹڈی کو تو کبھی اس نے مسئلہ سمجھا ہی نہیں۔'' الماس بیگم طنزیہ انداز میں بھویں اچکا کر بولیں۔ ''صاحبزادی ضرورت سے زیادہ ہی اونچا اڑنے کی کوشش کر رہی تھیں ابھی پہلی پرواز ہی بھری تھی کہ فضا میں موجود عقابوں نے پر کتر کر نیچے پھینک دیا۔''

''الماس بیگم آپ نے کیا گھما پھرا کر بات کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔'' ابراہیم صاحب جی بھر کر بدمزہ ہوئے۔ ''سیدھی طرح بات کیا کریں۔'' اور کچھ نہیں سمجھے تھے۔

''سیدھی بات یہ ہے کہ آپ کی بھابی صاحبہ آج کل اپنے نور چشم ارسلان فہیم صاحب کا رشتہ ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔'' الماس بیگم بولیں نہیں بلکہ زہریلے لہجے میں پھنکاریں۔

''تو اس کے ساتھ نویرہ کا کیا تعلق بنتا ہے؟'' ان کی آنکھوں میں ایک فطری استعجاب کی لہر دوڑی۔

''ابراہیم صاحب مانا کہ اللہ نے آپ کو اولادِ نرینہ سے نہیں نوازا لیکن یہ تینوں بیٹیاں تو مجھ سے زیادہ آپ کے قریب تھیں، کیا آپ اتنے ہی لاعلم ہیں یا صرف میرے سامنے ہی ڈرامے کرتے ہیں۔'' الماس بیگم نے ہمیشہ کی طرح بہت جلد ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔

''آپ کا دماغ ٹھیک ہے؟'' ابراہیم صاحب کو بھی غصہ آ گیا۔ ''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے ڈرامے کرنے کی۔ ہمارے گھر میں جب بھی آسکر ایوارڈ آئے گا تو اس کے لیے بہترین اور مضبوط امیدوار صرف آپ ہی ہوں گی۔ دیکھ لیجیے گا۔'' انہوں نے بھی موقع پر ہی حساب برابر کیا۔ کمرے میں ایک دم گھٹتی سی خاموشی پھیلی۔

''کیا آپ لوگ آرام سے بات نہیں کر سکتے۔'' عبیرہ نے انتہائی سنجیدگی سے اپنے والدین کے غصے سے لال چہرے دیکھے۔

''یہ بات آپ اپنی ماما کو سمجھائیں تو زیادہ بہتر ہے۔'' ابراہیم صاحب نے اٹھتے ہوئے طنزیہ انداز میں بیٹی کو مشورہ دیا۔

''ہاں، اس سے پہلے عابی اپنے باپ کو بتا دینا کہ ان کی صاحبزادی کا موڈ آج کل ارسلان کی وجہ سے خراب ہے، اس بے وقوف لڑکی کو سمجھ نہیں آ رہی کہ کس طرح اپنی عطیہ چچی کی آنکھوں کے چشمے کا نمبر بدلوا دے تاکہ انہیں اس گھر میں ہی ایک رشتہ نظر آ جائے۔'' الماس بیگم اپنے میاں کا سکون غارت کر کے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئیں جبکہ ابراہیم صاحب جو باہر جانے کے لیے کھڑے تھے۔ وہ دھڑام سے صوفے پر دوبارہ آن بیٹھے۔ انہیں اب

اس بات کی سمجھ آئی تھی ۔وہ سخت بے یقینی، رنج اور صدمے کا شکار لگ رہے تھے۔

☆☆☆

"یہ تمہارا مزاج کیوں برہم ہے، پیپر اچھا نہیں ہوا یا دماغ کو گرمی لگ رہی ہے؟" امتحان کے کمرے سے باہر نکلتے ہی شرزمہ نے نویرہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ جو ہال میں بھی گم صم انداز میں بیٹھی تھی۔ اپنا پیپر کرتے ہوئے بھی بار بار وہ نویرہ کے لیے ہی پریشان ہوتی رہی۔

"مزاج خراب نہیں، قسمت خراب ہے۔" اس نے باہر کاریڈور میں آتے ہی راستے میں پڑے ایک چھوٹے سے پتھر کو پاؤں کی ٹھوکر سے سائڈ پر کیا۔

"ہوں، اس کا مطلب ہے کہ ماما کے ساتھ ایک اور جنگ بِپا سی ہو گئی ہے۔" شرزمہ نے فوراً اندازہ لگایا۔

"نہیں، آج کل میں ان سے ایسے ہی کترا رہی ہوں جیسے لوگ گھر سے نکلتے ہوئے کالی بلی سے کتراتے ہیں۔"

"مائی گاڈ! تم اپنی ماما کے لیے کیسے، کیسے جملے استعمال کرتی ہو۔" نویرہ کی بات پر اسے ہنسی آ گئی۔

"میں ان کے لیے اس سے بھی زیادہ "سنگین" جملے استعمال کر سکتی ہوں لیکن کیا کروں نہ مذہب، نہ اخلاقیات اور نہ ہی میرا ضمیر اس چیز کی اجازت دیتا ہے۔" نویرہ کے حد درجہ سنجیدہ انداز پر وہ چونکی۔

"ایسا کیا کر دیا ہے انہوں نے جو تم ہاتھ منہ دھو کر اُن کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔" وہ چلتے چلتے رکی اور اس کا سپاٹ چہرہ دیکھنے لگی۔

"بہت سی باتیں اور چیزیں اتنی بدصورت، گھناؤنی اور مکروہ ہوتی ہیں کہ انسان اپنی ذات کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتا۔" وہ عجیب سے لہجے میں ہنسی اور تیز تیز چلتے ہوئے ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

"اچھا یہ چاکلیٹ کھاؤ اور اپنا موڈ فریش کرو۔" شرزمہ نے اس کے پاس بیٹھ کر اپنے بیگ سے ایک چاکلیٹ نکالی اور اس کی جانب بڑھا دی۔

"تمہارا پیپر کیسا ہوا؟" شرزمہ نے فکرمندی سے اس کا رنجیدہ چہرہ دیکھا۔

"بہت برا اور بکواس!" نویرہ نے صاف گوئی سے کہا تو اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ "پچھلے تین دن سے ایک لفظ بھی نہیں پڑھ پائی، دماغ ماؤف سا ہو کر رہ گیا ہے۔"

"وہ کیوں؟" شرزمہ نے چاکلیٹ کا ریپر انگلی پر لپیٹتے ہوئے اب اسے غور سے دیکھا۔

"گھر میں آج کل اسٹار پلس کا ایک نیا ڈراما شروع ہو گیا ہے جس نے کسی اور کی تو پتا نہیں لیکن میری نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔" نویرہ نے زہرخند لہجے میں اطلاع دی۔

"اسٹار پلس کا کون سا ڈراما؟" شرزمہ بے تابی سے بولی۔

"میری عطیہ چچی صاحبہ آج کل اپنے بیٹے ارسلان کے لیے بڑے زور شور سے رشتہ ڈھونڈ و مہم شروع کیے ہوئے ہیں۔" نویرہ کی اطلاع پر شرزمہ کی سانس حلق میں اٹکی۔

"یہ ارسلان تمہارا وہی کزن ہے ناں، جس کی باتیں سنا سنا کر تم نے میرا دماغ کھا لیا تھا۔"

"ہاں وہی ہے۔" نویرہ چاکلیٹ کھانا بھول کر تلخی سے مسکرانے لگی۔

"لیکن وہ اور تم تو ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو یار۔" شرزمہ نے اسے یاد دلایا تو وہ استہزائیہ انداز میں ہنس کر چپ ہو گئی۔

"تم اس کو کہو ناں کہ اپنی ماما سے بات کرے۔" شرزمہ نے آسان سا حل بتایا۔

"کاش یہ اتنا ہی آسان ہوتا جتنی آسانی سے تم نے کہہ دیا ہے۔" نویرہ نے رنجیدہ انداز میں آنکھیں بند کر کے سر اپنے گھٹنوں میں دے دیا۔

"اس میں کیا پرابلم ہے وہ اچھا خاصا پڑھا لکھا اپنے پیروں پر کھڑا مرد ہے اور مردوں کے لیے کسی بھی چیز کو ہینڈل کرنا کون سا مشکل کام ہے۔" شرزمہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اتنی سی بات پر اتنی پریشان کیوں ہے۔

"تمہیں پتا ہے شرزمہ ہمارے گھر کا بڑا عجیب سا مسئلہ ہے؟" نویرہ کی آنکھیں ضبط کی کوشش میں سرخ ہوئیں۔ شرزمہ نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا جو انتہائی طنزیہ لہجے میں گویا تھی۔

"ہر وہ گھر جہاں عورتوں کی حکمرانی ہوتی ہے اور مردوں کو پسِ پشت رکھا جاتا ہے۔ وہاں کے مرد آہستہ آہستہ انتہائی بزدل، قوتِ فیصلہ سے عاری اور عجیب سی شخصیت کے حامل بن جاتے ہیں۔ ان گھروں میں مرد حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے بعض دفعہ بڑے مضحکہ خیز طریقے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ جن میں کمال درجے کی بے حسی کی چادر اوڑھ لینا یا خاموشی کا پیراہن زیب تن کر کے مکمل ہتھیار ڈال دینا شامل ہے۔"

"کیا مطلب؟" شرزمہ کو اس کی بات پر جھٹکا لگا۔ "یہ تو بہت عجیب سچوئیشن ہے یار۔"

"ہمارے گھر کے مردوں میں اتنی ہمت نہیں کہ گھریلو سیاست سے نبرد آزما ہو سکیں۔ وہ حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے یا تو گھر سے بھاگ جاتے ہیں یا بھیگی بلی بن کر ایک کونے میں بیٹھ جاتے ہیں۔" نویرہ نے استہزائیہ انداز میں کھل کر مذاق اڑایا۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا؟" شرزمہ کو سن کر انتہائی برا لگا۔ "تم ارسلان سے کھل کر بات کرو۔" اس نے قدرے خفگی سے مشورہ دیا۔

"وہ اپنی ماما کے آگے کبھی بھی نہیں بولے گا، اس میں اتنی ہمت نہیں ہے۔" نویرہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔

"اتنی ہمت اور حوصلہ نہیں تو آرمی کیسے جوائن کر رکھی ہے۔" شرزمہ نے ناک چڑھا کر دلیل دی۔

"وہاں کون سا گندی گھریلو سیاست ہوتی ہے وہ تو خود کہتا ہے کہ "دشمن ملک کی سرحدوں پر لڑنا آسان جبکہ گھر میں ہونے والی گھٹیا مورچہ بندی اور فضول لفظوں کی بمباری سے لڑنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ جہاں جذبات کے ڈیزی کٹر بم چلائے جاتے ہیں۔ منافقت کی فائرنگ اور نفرت کے تیروں کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔ بندہ ان گھریلو محاذوں پر کہاں، کہاں لڑے تھک ہار کر میدانِ جنگ سے اپنا دامن چرا کر بھاگ جانا ہی دانشمندی ہے۔"

"یہ تو انتہائی بزدلانہ تھیوری ہے اس کی۔" شرزمہ کو غصہ آیا۔ "تمہیں بھی کیا محبت کرنے کے لیے اپنے ہی خاندان کا بزدل بندہ ملا تھا۔" اس نے فوراً طعنہ دیا۔

"ہاں تو جنہوں نے اس روایت سے بغاوت کی اُن کو کون سا پھولوں کے ہار ڈالے گئے ہیں۔" نویرہ نے زہرخند انداز میں کہا۔

"کس نے بغاوت کی؟" شرزمہ حیران ہوئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ نویرہ کے خاندان میں بھی کوئی ایسا جی دار ہو سکتا ہے۔

"پہلے میرے ایک چچا نے اور پھر میری جیا آپی نے۔" نویرہ کا لہجہ پست ہوا۔

"کیا بنا اُن کا؟" شرزمہ نے عجلت میں بات کاٹی۔

"کیا بننا تھا ان کا!" ایک تلخ مسکراہٹ اس کے چہرے پر ٹھہر سی گئی۔ "ہمارے ہاں ایسی باغی محبتوں کے بس مقبرے ہی بنتے ہیں۔ جہاں جذبات کے ہاتھوں شکست خوردہ مردہ جسموں کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ جہاں بغاوت کا انجام بھی مایوسی اور ناکامی ہی ہے۔ محبتوں میں کامیابی اور خوش قسمتی کا سنہری تاج ہر ایک کو تھوڑی ملتا ہے۔" نویرہ کے لہجے اور لفظوں میں دکھ ہی دکھ تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس قدر ویرانی تھی کہ اگلے کئی لمحوں تک شرزمہ کچھ بول ہی نہ پائی۔

"تمہارے تو اپنی چچی سے اچھے تعلقات نہیں تھے بھلا؟" شرزمہ کی سوئی اسی کے مسئلے میں اٹکی ہوئی تھی۔

"مفادات کی جنگ میں ہر بندہ صرف اپنا فائدہ دیکھتا ہے تعلق یا واسطہ نہیں۔" نویرہ نے چاکلیٹ سامنے لگے ڈسٹ بن میں ڈال دی۔

"میری ماما اور عطیہ آنٹی میں ساری زندگی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی دوڑ لگی رہی، اب ایسا موقع وہ کیوں ہاتھ سے جانے دیتیں۔"

"وہ کیسے؟" شرزمہ چونکی۔

"ماما کا تعلق انتہائی غریب خاندان سے تھا اور اُن کا واحد ہتھیار ان کی ڈگری اور گورنمنٹ کی جاب تھی جبکہ میٹرک پاس عطیہ چچی کا تعلق ٹھیک ٹھاک خاندان سے اور اُن کا ہتھیار ان کے میکے کا پیسہ تھا۔ دونوں خواتین کھل کر میدان میں اتر آئیں، خاندان کے بزرگ تو یہی بتاتے ہیں کہ اس سے پہلے ارجمند خاتون جو میری دادو ہیں اُن کا اپنے سارے خاندان پر رعب تھا آگے سے جو بڑی بہو میری ماما آئیں ان کے ساتھ جہیز میں ان کے کافی سارے کمپلیکسز بھی آگئے۔ انہوں نے دادو کو پہلی ہی بال پر آؤٹ کر کے نکڑ پر بٹھا دیا۔" نویرہ یوں بتا رہی تھی جیسے کسی ڈائجسٹ کی کہانی سنا رہی ہو۔

"اس کے بعد ماما نے گھر کے ایک، ایک فرد کو اپنے حُسن، ذہانت اور سرکاری گریڈوں کی مار مارنا شروع کر دی۔ ان کو نہ جانے کیسا خوف تھا کہ کہیں اس گھر کی کوئی نئی بہو پورے گھر پر حاوی نہ ہو جائے۔ انہوں نے پہلے پاپا کے چھوٹے بھائی فہیم ــ سے اپنی اکلوتی بہن کی شادی کی کوشش کی لیکن دادو کو ماما کے ہاتھ لگ چکے تھے وہ ان سے مقابلے کے لیے اس دفعہ بڑے گھر کی لڑکی لے آئیں اور اس کے بعد ان دونوں کے درمیان نہ ختم ہونے والے محاذ کھل گئے۔ اوپر سے ہم تین بہنیں تھیں اور عطیہ چچی کو اللہ نے دو بیٹے دے دیے۔ ماما اور زیادہ گھبرا گئیں اور سوچا کہ کہیں تیسری دیورانی بھی آکر عطیہ چچی کے ساتھ نہ مل جائے۔" نویرہ کہانی سناتے سناتے رکی۔

"پھر کیا ہوا؟" شرزمہ کی سخت حیرت سے پوری آنکھیں کھل گئیں۔

"پھر میرے رضا چچا کی شامت آگئی جو سب سے چھوٹے تھے۔ ماما اور عطیہ چچی دونوں اپنی، اپنی بہنوں کے رشتے لے کر میدان میں اتر آئیں۔ غضب کا گھمسان رن پڑا۔ ماما جو کہ میری نانو کی وفات کے بعد میری رومی خالہ کو پہلے ہی سسرال میں لے آئی تھیں انہوں نے ایسا ڈراما کیا کہ چچا کو اُن سے شادی کرنا ہی پڑی یہ اور بات کہ وہ اس کے کچھ عرصے کے بعد جو دبئی بھاگے تو دوبارہ لوٹ کر نہیں آئے اور ان کے انتقال کی خبر ہی آئی۔" نویرہ کی بات پر شرزمہ کا دماغ گھوم گیا۔

"مائی گاڈ، تمہاری ماما کیسے اتنے محاذوں پر اکیلے لڑ لیتی ہیں، تمہارے پاپا ان کو کچھ نہیں کہتے؟"

"وہ بیچارے شریف مرد ہیں اور ہمارے ہاں شریف مردوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ بیوی کی ہر جائز اور ناجائز بات مانتے جائیں۔" نویرہ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا اس لیے اس نے خوشگوار انداز میں کہا۔

"تھینکس گاڈ...... تمہارے چہرے پر بھی مسکراہٹ آئی۔" شرزمہ نے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز سے منہ پر پھیر کر شکر ادا کیا تو وہ ہنسنے لگی۔

"اب ایسی صورتِ حال میں، میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟" شرزمہ نے خلوصِ دل سے اپنی دوست کو کہا۔

"یار تم اپنے پروفیسر آفاق سے کہہ کر مجھے اس پیپر میں پاس کروا دو پلیز۔" اس کی عجیب و غریب سی فرمائش سن کر وہ ہکّا بکّا رہ گئی۔ نویرہ بڑی آس اور امید کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جبکہ شرزمہ حیرانی سے سوچ رہی تھی کہ وہ یہ کام کیسے کروا سکتی ہے۔

☆☆☆

"میری بات مانو رومی تم انعم کی شادی کر دو۔" الماس بیگم جو آج کالج سے جلدی گھر آگئی تھیں کھانے کی میز پر اپنی بہن کے ساتھ نسبتاً بہتر موڈ میں گفتگو کرتے ہوئے اچانک بولیں۔

"الماس آپی، کون کرے گا اس بیچاری سے شادی؟" رومیصہ کے لیے نوالہ توڑنا دشوار ہو گیا۔ وہ حیرت سے اپنی بڑی بہن کا چہرہ دیکھنے لگیں جنہیں آج بیٹھے بٹھائے نہ جانے کہاں سے انعم کی شادی کا خیال آگیا تھا۔

"کیوں، کیا ہوا ہے انعم کو، چلو اور کچھ نہیں ایف اے تو کر رکھا ہے ناں اس نے چاہے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ہی۔" الماس بیگم نے رائتہ اٹھاتے ہوئے یاد دلایا۔

"لیکن اس کی ذہنی حالت؟" رومیصہ تذبذب کا شکار ہوئیں۔

"کچھ نہیں ہوا اس کی ذہنی حالت کو، تم لوگوں نے بیمار کہہ کہہ کر اسے بیمار بنا رکھا ہے۔" وہ ذرا تیز لہجے میں بولیں۔

"پھر بھی آپی سب کو پتا ہے۔" رومیصہ خود بھی دل سے چاہتی تھیں کہ اُن کی بیٹی کا گھر بس جائے لیکن اس کی حالت کے پیشِ نظر مصلحتاً خاموش رہتیں۔

"کیا پتا ہے؟" انہوں نے طنزیہ نظروں سے اپنی بے وقوف بہن کا متذبذب چہرہ دیکھا جو کھانا بھول کر اب کسی سوچ کا شکار تھی۔

"اچھی خاصی شکل صورت کی لڑکی ہے انعم، جب شفق آپا کی عام سی شکل صورت کی حرا کا رشتہ ہو سکتا ہے تو انعم کا کیوں نہیں۔" ان کے لہجے میں اپنی اکلوتی نند اور اس کی بیٹی کے لیے ہمیشہ زہر ہی ہوتا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ ان کی دیورانی عطیہ اور نند شفق کے بہترین تعلقات تھے۔ حرا اور احمر کے رشتے کا بم بھی اچانک ہی ان کے سر پر پھوڑا گیا تھا جس کی وجہ سے الماس بیگم کو اپنے سسرالی اور زیادہ برے لگنے لگے۔

"آپی حرا کا رشتہ تو گھر میں ہی ہو گیا، شفق آپا کو اس کے لیے باہر ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔" رومیصہ نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

"جب حرا کا رشتہ گھر میں ہو سکتا ہے تو انعم میں کون سے کانٹے لگے ہوئے ہیں۔" سیدھی طرح سے بات کرنا تو شاید الماس بیگم نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ڈائننگ روم میں تیزی سے اندر داخل ہوتی نویرہ پردے کے پیچھے ہی رکی۔

"گھر میں کون سا رشتہ ہے، میں سمجھی نہیں؟" رومیصہ نے حیرت سے اپنی بڑی بہن کا چہرہ دیکھا جس پر ایک پُراسراری مسکراہٹ تھی۔

"ارسلان کا، اور کس کا؟" الماس بیگم نے کمرے میں بم ہی تو پھوڑا تھا۔ پردے کے پیچھے کھڑی نویرہ کا چہرہ زرد ہوا۔ رومیصہ نے عجلت میں ان کی بات کاٹی۔

"کمال کرتی ہیں آپ بھی آپی۔" ان کے چہرے پر ناگواری کا عنصر نمایاں ہوا۔ "آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ ارسلان اور نویرہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ میں بیچ میں کیوں اپنی بیٹی کی ٹنگ ڈال دوں، مجھے جیسے انعم عزیز ہے اس سے زیادہ نویرہ پیاری ہے۔" انہیں ٹھیک ٹھاک قسم کا غصہ آیا۔

"نویرہ تو بے وقوف ہے۔" وہ بھڑکیں۔ "ارسلان محض اس کے ساتھ فلرٹ کرتا پھر رہا ہے محض مجھے نیچا دکھانے کے لیے، میں اس خاندان کی ساری گندی سیاست کو تم سب لوگوں سے زیادہ سمجھتی ہوں۔ عطیہ کی اولاد کبھی میری اولاد کا اچھا سوچ ہی نہیں سکتی۔" وہ بدگمانی کی انتہا پر تھیں۔

"خیر آپی اب ایسی بھی کوئی بات نہیں، عطیہ بھابی کے جتنے بھی آپ کے ساتھ مسئلے مسائل ہوں، احمر اور ارسلان نے کبھی بدتمیزی نہیں کی اور نہ ہی کبھی آگے سے پلٹ کر آپ کو جواب دیا۔" رومیصہ

کی طرفداری پر الماس بھڑک اٹھیں۔
''یہی تو تم لوگوں کی سب سے بڑی بھول ہے۔'' انہوں نے بھویں اچکا کر اپنی بہن کو دیکھا جس کی بے وقوفی پر انہیں کسی بھی دور میں شبہ نہیں رہا تھا۔ ''اگر ارسلان کو اتنا نویرہ سے لگاؤ ہے تو کرے ناں پھر اپنی ماں کے ساتھ بات، وہ کیوں ہر روز ہار سنگار کر کے لوگوں کی لڑکیوں کے پورسٹ مارٹم کرنے نکل جاتی ہے۔'' ان کی آنکھوں سے شعلے نکلے۔

''تم آج لکھ لو میری بات رومی اگر نویرہ اس کے پاؤں بھی پڑ جائے تو وہ اس کے لیے کبھی بھی اپنی ماں کے آگے کھڑا نہیں ہوسکتا۔'' انہوں نے سیدھا سادہ چیلنج کیا تو ایک لمحے کو رومیصہ اور باہر کھڑی نویرہ کا دل بھی ڈوب سا گیا۔

''عطیہ کے دماغ میں بیٹوں کی ماں ہونے کا غرور ایسے ہی نہیں بھرا ہوا۔ کبھی تم نے دیکھا ہے کہ اس کے دونوں بیٹوں میں سے کوئی ایک بھی آنکھ اٹھا کر اپنی ماں کی طرف دیکھتا ہو۔'' الماس آپی کی اس بات پر تو رومیصہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی اقرار میں سر ہلانا پڑا۔

''اِدھر میری اولاد ہے، پہلے بڑی والی نے مجھے دن میں تارے دکھائے اور اب چھوٹی والی آسمان کو ٹاکیاں لگاتی پھر رہی ہے۔'' الماس بیگم کو اپنی بیٹیوں سے بھی سخت شکایتیں تھیں۔

''عطیہ نے ایک دفعہ احمر کو حکم دیا کہ بس حرا سے شادی کرنی ہے اور احمر جو اپنی کسی کلاس فیلو کو پسند کرتا تھا۔ اس نے فرمانبرداری کی انتہا کر دی اور اُف تک نہ کی۔ ورنہ کہاں احمر اور کہاں وہ کالی کلوٹی چھپکلی سی حرا۔'' الماس بیگم کو خاندان کے سارے چیدہ چیدہ واقعات انگلیوں پر ازبر تھے۔

''دفع کریں، آپ ان سب باتوں کو۔'' رومیصہ بیزار ہوئیں۔

''تم دوٹوک انداز میں اماں سے بات کرو، انعم اور ارسلان کے رشتے کی۔'' انہوں نے دوبارہ اپنی بہن کو اکسایا۔

''سوری آپی، مجھے یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں لگتا۔'' رومی نے بھی بغیر لگی لپٹی صاف گوئی کی انتہا کر دی۔

''ٹھیک ہے پھر تم شفق آپا سے کہو کہ احتشام یا فرزام کے لیے انعم کا رشتہ لے لیں۔'' انہوں نے نیا شوشا چھوڑا جو رومی کو پہلے مشورے کی نسبت کچھ بہتر لگا۔ باہر کھڑی نویرہ نے بھی کچھ سکون کی سانس لی جبکہ رومیصہ کے چہرے پر بھی ایک سوچ نے احاطہ کیا۔ جوں جوں وہ سوچ رہی تھیں انہیں الماس آپی کا یہ مشورہ اب اتنا بھی غیر مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

☆☆☆

''ہنی آپ، مجھ سے ناراض ہیں کیا؟'' شرزمہ جو پچھلے دو دن سے دیکھ رہی تھی کہ ہانیہ خاصی سنجیدہ، سنجیدہ سی تھیں اور گھر میں ہونے کے باوجود شرزمہ سے کوئی خاص بات چیت بھی نہیں کر رہی تھیں۔ اپنے کپڑے پریس کرتے ہوئے شرزمہ نے اچانک ہی انہیں مخاطب کیا۔

''میں اور ناراض؟ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔'' اجنبیت سے بھرپور لہجہ شرزمہ کی آنکھوں میں آنسو لانے کا باعث بنا۔

''آئی ایم سوری ہنی، میں نے اس دن کے ایف سی فون کر کے ڈیل منگوائی تھی وہ اسود زبردستی ساتھ نتھی ہو گیا کہ میں بھی آپ کے ساتھ شیئر کروں گا۔ یقین کریں، میں نے اسے نہیں بلایا تھا۔'' شرزمہ نے پریشانی سے صفائی دینے کی کوشش کی لیکن ہنی نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''دیکھو شیری میں نے تم سے کوئی وضاحت نہیں مانگی، میرا کام تمہیں سمجھانا تھا، سو وہ میں نے کر دیا، باقی ہر شخص کو اپنی زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔'' ہنی کا لہجہ اب بھی بیگانیت کا تاثر لیے ہوئے تھا اور یہ چیز شرزمہ کی روح فنا کرنے کو کافی تھی۔

''میری زندگی پر ہنی آپ کو ہر طرح سے حق ہے، آپ مجھے روک سکتی ہیں، ٹوک سکتی ہیں، میں نے کبھی بھی اس چیز پر مائنڈ نہیں کیا۔'' شرزمہ کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہنے لگے۔

''بھئی یہاں کون سا اسٹار پلس کا ڈراما چل رہا ہے۔'' اسود اچانک ہی ہلکا سا دروازہ ناک کر کے اندر داخل ہوا۔ شرزمہ نے بوکھلا کر اپنے بازو کی پشت سے چہرہ صاف کیا۔ ایک لمحے کو تو ہانیہ بھی ہڑبڑا گئیں۔

''تم کیا ملک الموت کی طرح ہر جگہ ٹپک پڑتے ہو۔'' ہنی نے کچھ سنبھل کر اس پر طنز کیا۔ جو سارا دن کسی بے چین روح کی طرح اوپر نیچے گھومتا رہتا تھا۔

''ظاہر ہے ملک الموت اچانک ہی ٹپکے گا، اب باجے گاجے بجا کر تو آنے سے رہا۔'' وہ کون سا کسی سے کم تھا۔ اس نے کھوجتی نظروں سے شرزمہ کی روئی روئی آنکھیں دیکھیں۔

''یہ ان بی بی کو کیا ہوا ہے؟'' اسود نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔ ''کہیں اس دن والا دکھ تو نہیں یاد آگیا، جب میں ان کی ''کے ایف سی'' والی ڈیل کا زبردستی مہمان بن گیا تھا۔'' اس کا انداز غیر سنجیدہ تھا لیکن اس کی بات پر ہنی اور شرزمہ دونوں نے ہی چونک کر ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا۔

''تم تو صدیوں سے بھوکے ہو۔ یہی حال رہا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں آدم خور ہی نہ بن جاؤ۔'' ہنی نے برا سا منہ بنایا۔ جبکہ شرزمہ کو اس کی بے موقع محل آمد پہلی دفعہ اچھی لگی کیونکہ اس سے کم از کم اس کی پوزیشن ہانیہ کے سامنے کافی کلیئر ہو گئی تھی۔

''جس دن آدم خور بنا تو یقین کریں میرا پہلا شکار آپ ہوں گی۔'' وہ بڑی بے تکلفی سے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ اب شرزمہ کی طرف دیکھنے لگا جو فریج کھول کر اللہ جانے اس میں سے کیا تلاش کر رہی تھی۔

''اے نیک دل کنجوس لڑکی، الائچی والی چائے کا گرما گرم ایک کپ ملے گا۔'' اس کی فرمائش پر شرزمہ نے مڑ کر اسے دیکھا جس کی شوخ آنکھوں میں ستارے دمک رہے تھے۔

''شیری ایک کپ میرے لیے بھی۔'' ہنی نے بھی خوشگوار لہجے میں فرمائش کی تو شرزمہ نے سکون کی سانس لی۔

''قسم سے ہنی، ان محترمہ نے تو اس دن بڑی کوشش کی کہ کسی طرح مجھے ٹرخا ہی دیں لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ میں ایک ٹھیک ٹھاک قسم کا تجربہ کار بندہ ہوں، کھانے پینے والی دعوتوں میں اپنی جگہ بنانا میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔'' وہ ایک دفعہ پھر شروع ہو چکا تھا۔ جبکہ سامنے امریکن کچن میں کام کرتی شرزمہ نے اس گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ وہ خاموشی سے اپنے کام میں مگن رہی۔

''یہی بات تو میں شرزمہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں کہ تم جیسے عیار اور مکار لوگوں سے بچ کر ہی رہے لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات آتی ہی نہیں۔'' ہانیہ نے ہنستے ہنستے شرزمہ پر چوٹ کی۔ پتی کے جار کی طرف بڑھتا شرزمہ کا ہاتھ خلا میں معلق ہوا اس نے چونک کر اسود کا سادہ اور بے ریا سا چہرہ دیکھا جو ہنی کے اس مذاق پر کھلے دل سے ہنس رہا تھا۔ جبکہ یہ تو صرف شرزمہ ہی جان سکتی تھی کہ ہنی کی اس سنجیدہ بات میں مزاح نام کی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں۔

''ویسے ہنی کہتے ہیں کہ چور کو ہر بندہ، چور ہی لگتا ہے، کیا یہ بات درست ہے؟'' وہ بھی ہنستے ہوئے ان پر جوابی حملہ کر چکا تھا۔

''یہ تو چور کو ہی پتا ہو گا۔ اپنی طرف تو سارے معاملات صاف شفاف ہوتے ہیں۔'' وہ تھوڑی سنجیدہ ہوئیں۔ شرزمہ نے ان کو گفتگو میں مگن دیکھ کر دم پر رکھی چائے کپوں میں انڈیلی۔

''ہاں بھئی آپ کی طرف بڑا اداسی والا موسم

چل رہا ہے، خیر ہے ناں!" وہ غضب کا چہرہ شناس تھا۔ شرزمہ گڑبڑا سی گئی۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ اپنا چائے کا کپ لے کر باہر نکل آئی۔ اسے شام کی چائے لان میں بیٹھ کر پینا ہمیشہ سے ہی اچھا لگتا تھا۔

"پتا نہیں، ہنی کو پاکستان میں آ کر کیا ہو گیا ہے، وہ اتنی نیرو مائنڈڈ تو کبھی بھی نہیں تھیں۔" مختلف سوچوں میں الجھی وہ سیڑھیاں اتر کر لان میں نکل آئی جہاں رنگ برنگے پھولوں کی بہار آ چکی تھی۔ لان کا حلیہ بہت بہتر ہو گیا تھا۔ سامنے پروفیسر صاحب کی بنٹی اسے نظر آ گئی۔ اس سفید رنگ کی بلی سے اسے خصوصی انسیت ہو گئی تھی۔

"بنٹی تم کہاں چھپ جاتی ہو؟" اس نے اپنا چائے کا کپ میز پر رکھ کر بلی کو بے اختیار بانہوں میں بھرا۔ اس کی کرنجی آنکھوں میں بھی ایک چمک سی آ گئی۔

"کیا تم بھی آج میری طرح اداس ہو؟" بلی کو اپنی گود میں بٹھا کر وہ اس کا جسم سہلانے لگی۔

"بنٹی جب اداس ہوتی ہے تو یہ گیٹ کے ساتھ والی دیوار پر چڑھ کر بیٹھ جاتی ہے اور آتے جاتے لوگوں کو چپ کر کے دیکھتی رہتی ہے۔" سفید کرتے شلوار میں پروفیسر آفاق اس کے بالکل سامنے آ کر بولے۔ ان کے بولنے پر وہ زبردست چونکی اور خفت سے اس کا چہرہ لال ہوا۔ ایک دم ہی اسے ہنی کا خیال آیا تو وہ ڈر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ اتنی جلدی خوفزدہ کیوں ہو جاتی ہیں؟" پروفیسر آفاق کی زیرک نگاہوں سے اس کے تاثرات کبھی بھی نہیں چھپ سکتے تھے یا پھر اس کا چہرہ ہی کھلی کتاب کی طرح تھا جس پر ہر چیز فوراً ہی عیاں ہو جاتی۔

"جی نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے کن انکھیوں سے ٹیرس کی طرف دیکھتے ہوئے صاف انکار کیا۔ یہ اور بات کہ اس کا کھوکھلا لہجہ اس کی جھوٹ کی صفائی دے رہا تھا۔ اور پر ہنی اور اسود کسی لمبی بحث میں مصروف ہو گئے تھے۔

"شرزمہ، مجھے آپ سے ایک بہت ضروری اور خاص بات کرنی ہے، کیا آپ کل میرے آفس میں مجھ سے مل سکتی ہیں؟" پروفیسر صاحب کا سنجیدہ انداز شرزمہ کو تعجب میں مبتلا کر گیا۔

"یونیورسٹی میں؟" اس کی آنکھوں میں استعجاب سمٹ آیا۔

"جی یونیورسٹی میں، آپ کل کسی بھی وقت مجھے مل لیں اور مناسب سمجھیں تو اس کا تذکرہ ہانیہ سے مت کیجیے گا۔" ان کی اگلی بات نے اسے مزید تحیر میں مبتلا کیا۔ اپنی بات کا جواب سننے کے لیے وہ رکے نہیں، جبکہ وہ اپنے چائے کے کپ پر جمی گہری بھوری سی ملائی کی تہ کو دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔

☆☆☆

موسم کافی حد تک بدل گیا تھا۔ فضا میں موجود تپش پر اب ہلکی ہلکی سی خنکی غالب آنے لگی تھی۔ اسلام آباد میں تو ویسے بھی موسم زیادہ تر خوشگوار ہی رہتا تھا۔ اس دن وہ یونیورسٹی آئی تو نویرہ کو نہ پا کر اسے سخت کوفت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے ساتھ جا کر پروفیسر آفاق سے مل آئے گی۔ رات بھر مختلف سوچوں نے ذہن میں اودھم مچائے رکھا۔ رتجگے کی وجہ سے ہونے والے ہلکے سے گلابی پن نے اس کی آنکھوں کو مزید دلکش بنا دیا تھا۔

"تم آج کیمپس آؤ گی کہ نہیں؟" شرزمہ نے نویرہ کے سیل پر ٹیکسٹ کر کے پوچھا۔

"نہیں!" دوسری جانب سے فٹ جواب آیا۔

"دفع ہو جاؤ۔" اس نے غصے میں اسے جواباً ٹیکسٹ ہواؤں کے دوش پر ارسال کیا۔ سمسٹر کے اختتام پر آج کل کیمپس میں اسٹوڈنٹس کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہی تھی۔ آج تو وہ اسود بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا ورنہ اکثر وہ اسٹوڈنٹس کے گھیرے میں

نظر آ ہی جاتا تھا۔ اس کی سنجیدگی ڈیپارٹمنٹ میں عروج پر ہوتی، وہ نظر کا چشمہ لگائے لائبریری میں اپنے پی ایچ ڈی کے تھیسس پر کام کرتا کہیں نہ کہیں نظر آ ہی جاتا تھا۔

شرزمہ اپنی غیر ہموار سانسوں کے تسلسل پر قابو پا کر پروفیسر آفاق صاحب کے آفس میں آ ہی گئی۔ وہ گرے پینٹ کوٹ میں بڑے پُروقار انداز میں سامنے ہی بیٹھے تھے۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائے اور اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا حال احوال پوچھنے کے بعد انہوں نے اچانک پوچھا۔

"آپ کو پتا ہے شرزمہ دنیا کا مشکل ترین کام کیا ہے؟" ان کے لہجے کی غیر معمولی سنجیدگی پر شرزمہ کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوئیں۔ اسے آج احساس ہوا کہ کسی کی گہری نظروں کے حصار میں بیٹھنا دنیا کا مشکل ترین کام ہوتا ہے۔ ان کے سوال کے جواب میں شرزمہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"دنیا کا سب سے مشکل کام اپنے کردار کی گواہی دینا ہے۔" ان کی بات پر شرزمہ نے چونک کر دیکھا۔

"آپ کہنا، کیا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کردار ایک ایسی چیز ہے، جس پر ہم دنیا جہان کے پردے بھی ڈال لیں وہ ہماری کسی نہ کسی چیز سے جھلک کر سامنے آ ہی جاتا ہے۔ انسان اپنے وجود کی عمارت کے گرد جتنی بھی بناوٹی اینٹیں لگا لے کہیں نہ کہیں کوئی روشندان کھلا رہ ہی جاتا ہے۔ جس سے انسان کی شخصیت کے پوشیدہ پہلو عیاں ہو جاتے ہیں۔" ان کی بات پر شرزمہ کچھ الجھن کا شکار ہوئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس بات کے لیے تمہید باندھ رہے ہیں۔

"آپ کو ایک اور بات بتاؤں شرزمہ؟" پروفیسر صاحب کے لہجے میں کچھ تھا کہ اس کے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا برپا ہوا۔

"جی۔" اس نے سوالیہ نگاہ سے انہیں دیکھا۔

"عورت پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے۔ اس کو اللہ نے بڑے جدید قسم کے سیکورٹی سسٹم سے نوازا ہے۔ جو اس کے دماغ میں فٹ ہوتا ہے وہ اپنی طرف اٹھتی ہر نظر کو پہچانتی ہے۔ ایک سرسری سی غلط نگاہ بھی اس کے اندر کے سیکورٹی سسٹم میں لگے سارے الارم جگا دیتی ہے۔ اس لیے اسے دھوکا دینا آسان نہیں، وہ جان بوجھ کر دھوکا کھا جائے تو یہ اور بات ہے۔" ان کی بات پر شرزمہ نے جھنجلا کر انہیں دیکھا۔

"جان بوجھ کر کون دھوکا کھاتا ہے؟"

"بہت سے لوگ دنیا میں جان بوجھ کر دھوکا کھاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم جس بندے پر اپنے خالص جذبات کا خزانہ لٹا رہے ہیں وہ اس قابل نہیں ہے۔ اس کے باوجود انسان بڑا خوش فہم واقع ہوا ہے۔ وہ ایک ذرا سی امید اور خوش گمانی کے چکر میں اپنی محبت کے مدار کے اردگرد چکر لگاتا رہتا ہے کہ شاید کہیں کوئی اندر جانے کا راستہ مل جائے۔ ایسے لوگ جان بوجھ کر اپنے دل کے کہنے پر سرابوں کے پیچھے بھاگتے ہیں اور آخر کار تھک ہار کر گر جاتے ہیں۔"

"آپ پلیز مجھ سے وہ بات کریں جس کے لیے آپ نے مجھے بلایا ہے۔" وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہوئی۔

"جی، میں اسی بات کی طرف آ رہا ہوں۔ آپ کی ہانیہ کی فلاسفی ہے ناں کہ مرد قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔" پروفیسر صاحب کی بات پر وہ ایک لمحے کو گڑبڑا سی گئی۔

"یہ بالکل غلط بات ہے کہ مرد قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں یہ محض صنفی تعصب کے سوا کچھ نہیں۔ بات عورت یا مرد کی نہیں ہوتی، بات انسانوں کی ہوتی ہے۔ انہیں منفی خصوصیات کے حوالے سے صنف کی اقسام میں بانٹ دینا میرے خیال سے یہ انسانیت کے ساتھ زیادتی ہے۔" انہوں نے بہت

سنجیدگی سے شرزمہ کا ہراساں چہرہ دیکھا۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' شرزمہ نے اٹک، اٹک کر کہا...... اتنا تو اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ بات کچھ سنجیدہ نوعیت کی ہے۔

''میں صرف آپ سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں، اپنے کانوں سے سنیں۔ اپنے پیاروں پر اعتماد اچھی بات سہی لیکن بعض دفعہ اندھا اعتماد ہمیں واقعی ''اندھا'' بنا دیتا ہے۔ ہم ساری زندگی دوسروں کی لاٹھی کو پکڑ کر چلنے کی کوشش کرتے ہیں یہ کوشش کبھی کبھی مہنگی بھی پڑ سکتی ہے کیونکہ اگلا بندہ کسی بھی لمحے وہ لاٹھی چھین کر آپ کو نادانستگی میں گرا بھی سکتا ہے۔'' ان کے لہجے میں طنز کی چبھن اتر آئی۔

''آپ نے جو کہنا ہے کھل کر کہیں، مجھے یہ پہیلیاں سمجھ نہیں آتیں۔'' شرزمہ کو اُن کی الجھی باتوں سے کوفت ہوئی۔

''کھل کر صرف اتنا کہنا ہے کہ آپ لوگ فاروق صاحب کے ریفرنس سے میرے پاس آئے ہیں۔ آپ سے پہلے ان کی بڑی بیٹی اور مسز بھی ایک مہینہ یہاں قیام کر کے گئی تھیں جب اُن کی بیٹی کا کوئی ایگزام تھا۔ اگر کوئی شخص آپ کو ایسی جگہ پر بھیج رہا ہے جہاں اس کی فیملی کے لوگ بھی بے تکلفی سے آتے ہوں، ایسے شخص کے خلوص پر شک کرنا کسی طور بھی مناسب نہیں۔'' وہ پیشانی کو ہاتھ سے مسلتے ہوئے بہت ٹھہر ٹھہر کر بولے۔

''تو اُن کے خلوص پر کس نے شک کیا ہے؟'' شرزمہ کو فطری سی پریشانی نے گھیرا۔

''آپ کی ہنی نے!'' ان کے جواب پر اسے دھچکا سا لگا۔

''آپ سے کس نے کہا؟'' شرزمہ کو اپنی آواز کسی پاتال سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''میں سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتا، الحمدللہ میری سماعتیں بالکل درست حالت میں کام کر رہی ہیں۔'' وہ بے تکلفی سے بولے۔ ''میں تو کچھ دن پہلے خیر سگالی کے جذبات کے ساتھ اوپر والے پورشن میں آیا تھا۔ سوچا کہ آپ کو کچھ ادبی کتابیں بھی پڑھنے کو دے آؤں گا اور دوسرے ہانیہ جب بھی آتی ہیں تو شکوہ کرتی ہیں کہ میں نے ایک دفعہ بھی اوپر کا چکر نہیں لگایا لیکن پہلی دفعہ جانا ہی میرے لیے اعصاب شکن ثابت ہوا۔'' ان کی وضاحت پر شرزمہ کے چہرے کا رنگ اڑا۔ اسے پتا چل گیا کہ انہوں نے ہانیہ کی گفتگو سن لی ہے جو وہ اس دن اسے سمجھانے کی غرض سے کر رہی تھیں۔

''ایک تو ویسے بھی آپ لوگ جس بیڈروم میں تھے اس کی کھڑکیاں سیڑھیوں کی جانب کھلتی ہیں۔ اس لیے اس بیڈروم میں کھڑکیوں کے پاس رکھے صوفے پر بیٹھ کر کوئی گفتگو کرلے تو باہر سے گزرتا ہوا بندہ ساری گفتگو آرام سے سن سکتا ہے لیکن بخدا میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا۔'' انہوں نے بڑی سرعت سے صفائی دی۔

''ہانیہ کی آواز کا والیوم اتنا زیادہ تھا کہ ساری بات بغیر کسی کوشش کے آرام سے سیڑھیوں تک آرہی تھی، یقین مانیں کہ میری اوپر آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔'' اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے وہ شرزمہ کو ڈھیروں خفت میں مبتلا کیے جارہے تھے۔ شرزمہ کو بے تحاشا خفت نے آن گھیرا۔ اس دن ہنی کی گفتگو بھی تو خاصی تلخ تھی۔

''میری ساری زندگی کی کمائی میرا کردار اور وہ عزت ہے جو میں نے اس ادارے سے کمائی ہے۔ میری زندگی میں بس ایک لڑکی آئی اور اسے میں نے خلوصِ دل سے اپنانے کی کوشش کی لیکن میری قسمت نے وفا نہ کی۔ اس کے بعد میں نے کسی کو دانستہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔'' انہوں نے سرگوشی کے انداز میں اپنی صفائی دی۔ جبکہ شرزمہ کا بس نہیں

چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

''آپ میرے ڈیپارٹمنٹ میں کسی سے بھی میرے بارے میں پوچھ لیں۔ مجھے دعویٰ تو نہیں لیکن الحمدللہ اس اوپر والی ذات نے بہت عزت دی ہے، اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔'' وہ سر جھکائے بہت رنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔ شرزمہ کی پیشانی ننھے ننھے پسینے کے قطروں سے بھر گئی۔

''ہاں جہاں تک بات اسود کی ہے تو وہ شوخ و شرارتی، ہنس مکھ اور ایک زندہ دل انسان ضرور ہے لیکن کمزور کردار کا حامل نہیں۔ اس کی شرارتیں صرف چند لوگوں کی کمپنی تک محدود ہوتی ہیں۔ کیمپس میں وہ بہت سنجیدہ اور محتاط ہوتا ہے۔ اس چیز کا اندازہ تو آپ کو بھی ہو گیا ہوگا۔'' انہوں نے گہری سانس لے کر اپنے سامنے بیٹھی سادہ سی لڑکی کو دیکھا۔ جو شرمندگی سے سر جھکائے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو مسل رہی تھی۔ جس کے چہرے پر شرمندگی کے سائے اتنے گہرے تھے کہ پروفیسر آفاق خود بھی خفت کا شکار ہو گئے۔

''آئی ایم سوری سر، میرا نہیں خیال کہ ہنی نے آپ لوگوں کے کردار پر کوئی شک کیا ہے۔'' شرزمہ کچھ سوچ کر بولی تو وہ زیرِلب مسکرا دیے۔

''اصل میں وہ میرے معاملے میں ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ اس حساسیت کی وجہ سے وہ کچھ جذباتی ہو گئی تھیں ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔'' شرزمہ نے محتاط انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''یہی بات تو میں آپ کو سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ آپ دنیا کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور جج کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سادہ سے انداز میں بولے۔

''میرے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے۔'' اس نے سر جھکا کر شرمندگی سے اعتراف کیا۔

''غلط کہہ رہی ہیں آپ!'' انہوں نے فوراً ہی اس کی بات قطع کی، شرزمہ کی بھوری آنکھوں میں دنیا جہان کا تحیر سمٹ آیا۔

''میرے خیال میں آپ ہانیہ مصطفیٰ سے زیادہ اچھا دنیا کو جج کر سکتی ہیں، ان کا تجزیہ کر سکتی ہیں۔ آپ نے خواہ مخواہ خود کو ہانیہ کے پیچھے چھپا رکھا ہے۔''

''آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' شرزمہ متجسس ہوئی۔

''جو لوگ کم گو اور اچھے سامع ہوتے ہیں وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو ان لوگوں سے زیادہ اچھے طریقے سے سمجھ سکتے ہیں جن کی ساری توجہ اپنی باتوں سے دنیا کو متاثر کرنے پر لگی ہوتی ہے۔'' ان کا تبصرہ خاصا بے لاگ بلکہ بے رحمانہ تھا۔ وہ مسکرا دی۔

''آپ پلیز اپنا دل ہانیہ کی طرف سے صاف کرلیں۔ ان کا مقصد بالکل بھی غلط نہیں تھا۔'' اس نے ایک دفعہ پھر صفائی دینے.... کی کوشش کی۔

''میرا دل ان کی طرف سے صاف ہی ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہانیہ کا دل بھی ہماری طرف سے شفاف ہی ہوگا، بس آپ کے دل کے آئینے پر دھند آگئی ہوگی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کو کچھ چیزیں کلیئر کر دوں۔'' انہوں نے بڑے پُروقار انداز میں جواب دیا تو وہ ہنس دی۔

''میں اتنی جلدی بدگمان نہیں ہوتی۔''

''اچھا کرتی ہیں ورنہ یہ جلد بدگمان ہونے والے لوگ بھی زندگی میں بہت بڑا امتحان ہوتے ہیں۔ ایسا امتحان جن میں وہ اپنے پیاروں کو ہر تیسرے دن کوئی نہ کوئی ''سلپ'' پکڑا دیتے ہیں۔ کسی محبت کرنے والے کو شک کی عینک سے دیکھ کر فوراً عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کمال ہوتا ہے حالانکہ سچائی زیادہ دیر تک چھپ نہیں سکتی کبھی نہ کبھی زندگی میں آئینہ بن کر آپ کے سامنے کھڑی ہو ہی جاتی ہے۔'' ان کے لہجے میں کوئی گہرا تجربہ بول رہا تھا۔ شرزمہ نے ان کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اب اس سے اسٹڈی کے

متعلق پوچھ رہے تھے۔

”تو کیا میں یہ سمجھوں کہ آج کی یہ گفتگو، آپ کے اور میرے درمیان ہی رہے گی ناں؟“ وہ جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو پروفیسر صاحب کی آخری بات نے اسے حیران کیا۔

”کیا آپ کو یہ کہنے کی ضرورت تھی؟“ شرزمہ کی بات نے پروفیسر صاحب کو لاجواب کیا۔ وہ کافی دیر تک مسکرا کر اسے دیکھتے رہے۔

”آپ کے بارے میں ایک اندازہ تو میرا غلط ثابت ہوا۔“ شرزمہ نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”میرا خیال تھا کہ آپ کی ہر سوچ، ہر احساس اور ہر جذبے پر شاید ہانیہ نام کی ایک چیک پوسٹ ہے۔ جس سے گزر کر ہی آپ کی زندگی کے سارے مرحلے شروع اور ختم ہوتے ہیں۔“ ان کی بات پر شرزمہ کھل کر مسکرائی۔ اس نے ان کی اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

سورج نے چہرے سے رات کا نقاب الٹ دیا۔ اب آسمان پر چمکنے والا چاند معدوم ہو گیا تھا۔ روشنی نے جیسے ہی زمین کا احاطہ کیا زمین پر ہلچل شروع ہو گئی۔ ارجمند ولا میں بھی زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔

”تم رات اپنے کمرے میں نہیں سوئی ہو۔“ الماس بیگم بادامی رنگ کے بریزے چکن کے سوٹ میں بالکل تیار اپنے کالج کے لیے نکل رہی تھیں جب انہوں نے ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر سر جھاڑ منہ پھاڑ لیٹی نویرہ کو دیکھا۔ رات جب وہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے جا رہی تھیں تب بھی نویرہ اسی انداز میں آڑی ترچھی لیٹی ہوئی تھی۔ انہیں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اس کے انداز کچھ عجیب سے ہیں۔ ورنہ وہ اپنی بے چین طبیعت کی وجہ سے زیادہ دیر تک کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

”کیوں، یہاں لیٹنا منع ہے کیا؟“ اس کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر نمودار ہوا۔ اس سے بھی زیادہ سرعت سے الماس بیگم کے اندر اشتعال کی ایک لہر ابھری لیکن انہوں نے مصلحتاً تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ انہیں نہ جانے کیوں نویرہ کو ایسے رنجیدہ اور افسردہ لیٹے دیکھنا اچھا نہیں لگا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ کچھ بھی تھا وہ ان کی اولاد تھی۔ اس لیے فکر مند ہونا ایک فطری امر تھا۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔“ اس نے بیزاری سے جواب دے کر کشن اپنے چہرے پر رکھا۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ مزید بات کرنا نہیں چاہ رہی۔

”یونیورسٹی نہیں جانا کیا؟“ الماس بیگم کے دل میں بہت سے چھوٹے بڑے وسوسے پانی کے بلبلوں کی طرح بنے۔

”نہیں۔“ اس نے کشن کے اندر سے ہی جواب دیا۔

”کیوں؟“ وہ اب بالکل اس کے سر پر آن کھڑی ہوئیں۔

”سمسٹر ختم ہوا ہے ابھی اور کلاسز نیکسٹ ویک سے شروع ہوں گی۔“ اس نے بھی خلافِ عادت بڑے تحمل سے جواب دیا۔ جسے سننے کے بعد تو الماس بیگم کو یقین ہو گیا کہ وہ واقعی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اس طرح کے سوال جواب سے تو وہ فوراً ہی بھڑک اٹھتی تھی۔ ان کے اور نویرہ کے تعلقات ایک دوسرے سے کبھی بھی خوشگوار نہیں تھے لیکن دونوں پھر بھی ایک دوسرے کے آنکھ کے اشاروں کو بھی سمجھتی تھیں۔ الماس بیگم شروع سے اپنی درمیان والی بیٹی عبیرہ کے زیادہ قریب تھیں۔ جو عادتاً، مزاجاً اور فطرتاً بالکل الماس بیگم کا پرتو تھی۔

”رومی، نویرہ کے لیے ناشتا بنواؤ، میٹھا ملائی والا پراٹھا اور چائے۔“ الماس بیگم کے نئے حکم پر صوفے پر لیٹی نویرہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے اس وقت تنہائی کے علاوہ کسی چیز کی طلب نہیں تھی۔ الماس

بیگم کچھ دیر وہیں کھڑی اس کے ردعمل کا انتظار کرتی رہیں لیکن نویرہ نے بھی شاید آج خاموش رہ کر اپنی ماں کو حیران کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ کچھ منٹ انتظار کے بعد اکتا کر کالج کے لیے نکل پڑیں۔

”رومی خالہ مجھے کوئی ناشتا نہیں کرنا، پلیز اب سوال جواب کر کے مجھے تنگ مت کیجیے گا۔“ باہر گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنتے ہی نویرہ نے کشن منہ سے ہٹایا اور کچن کے دروازے میں حیران کھڑی رومی خالہ کو بیزاری سے کہا اور دوبارہ کشن منہ پر رکھ لیا۔ وہ کندھے اچکا کر رہ گئیں۔

”سنو پوستی لڑکی!“ شامی بڑی تیزی سے لاؤنج کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ ”میرے ساتھ فیض آباد تک چلو گی، ارسلان آ رہا ہے اسے وہاں سے پک کرنا ہے۔“ شامی کی فرمائش پر نویرہ نے اپنے دل میں مچلتے جذبات کو تھپکی دے کر سلایا۔

”شامی بھائی میرے سر میں درد ہے، آپ پلیز ڈرائیور کو ساتھ لے جائیں۔“ اس نے صاف انکار کیا۔

”ڈرائیور تو الماس ممانی کو کالج چھوڑنے گیا ہے۔“ انہوں نے کھوجتی نگاہوں سے اس کا چہرہ جانچا۔ ”ویسے تمہیں ہوا کیا ہے؟ کوئی میڈیسن لی؟“

”ویسے ہی طبیعت بیزار سی ہو رہی ہے۔“ اس نے سستی سے جواب دیا۔

”آ رہا ہے ارسلان، آ کر ساری طبیعت کی بیزاری دور کر دے گا۔“ شامی نے اسے چھیڑا۔ اسے معلوم تھا کہ دونوں کی نوک جھونک خوب چلتی تھی۔

”مجھے کسی کے آنے یا جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ جس مقصد کے لیے آ رہا ہے اسے خوشدلی سے وہ ہی کرنے دیں۔“ وہ اس قدر تلخی سے بولی کہ اپنی جگہ پر کھڑا شامی ہکا بکا رہ گیا۔ وہ سامنے لیٹی نویرہ کو یوں سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

☆☆☆

میرا پاکستان

میری عزت میری آن ہے پاکستان
میرا دل اور میری جان ہے پاکستان
جس میں میرا بنیادی کردار رہا
اس افسانے کا عنوان ہے پاکستان
آج میں اس کے دم سے ہوں جو کچھ بھی ہوں
میری شہرت میری شان ہے پاکستان
اس کے نام سے سر اونچا کرتی ہوں میں
مجھ کو فخر ہے میرا مان ہے پاکستان
جس میں پھول محبت کے کھلتے ہیں سدا
ایسا پیارا نخلستان ہے پاکستان
تمثیلہ آزاد فضا میں ہوں جو میں
ہم پر قائد کا احسان ہے پاکستان

شاعرہ: تمثیلہ لطیف...... جودھالہ

ایک تو چودھویں کی سحر انگیز رات اور اوپر سے بھید بھری خاموشی میں بجنے والا ستار، شرزمہ خود کو باہر نکلنے سے نہیں روک پائی، ننگے پاؤں وہ ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر آئی ٹھنڈی ہوا کے دلفریب جھونکے نے اس کا استقبال کیا۔ فضا میں ایک خوبصورت غزل کی دُھن نے سماں باندھ رکھا تھا۔

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، تیرے ہونٹوں کے سراب

گہرے سرمئی رنگ کے آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کے درمیان مغرور سا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اس کی چاندنی سفید پریوں کی طرح زمین پر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ نیچے لان میں پروفیسر صاحب کرسی پر اس طرح بیٹھے تھے کہ ان کی ٹانگیں بے تکلفی سے سامنے رکھی کرسی پر تھیں۔ ستار ان کی گود میں تھا اور اس کے

تاروں کو بڑی مہارت کے ساتھ چھوتی انگلیاں فضا میں گویا کوئی جادوئی سا منتر گھول رہی تھیں۔

دشتِ تنہائی میں دوری کے خس و خاک تلے
کِھل رہے ہیں تیرے پہلو کے سمن اور گلاب

وہ نہ جانے کس دُھن میں سیڑھیاں اتر آئی۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ لان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چاند کے گرد ہالے میں موجود اداسی نے اچانک ہی رقص شروع کر دیا۔ فضا میں عجیب سا سحر طاری ہو گیا تھا وہ خاموشی سے ان کے بالکل سامنے آ کر بیٹھ گئی اور دونوں پاؤں بھی لاشعوری طور پر اس نے کرسی پر رکھ لیے تھے۔ پروفیسر صاحب کو آنکھیں بند کیے اچانک ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ستار پر چلتی ان کی انگلیاں تھم گئیں، یوں لگا جیسے ہر چیز ساکت ہو گئی ہو۔

''سنائیں ناں، رک کیوں گئے؟'' شرزمہ کی آواز پر انہیں دھچکا ہی تو لگا۔ انہوں نے ناگواری سے اپنے سامنے بیٹھی شرزمہ کو دیکھا جو نہ جانے کب رات کے اس پہر اوپر والے پورشن سے لان میں آ گئی تھی۔ اپنے تخلیے میں اس کی موجودگی ان کو اچھی نہیں لگی۔

''آپ اس وقت نیچے کیوں آ گئیں؟'' ان کے لہجے میں کوفت بھری جھنجلاہٹ تھی۔

''اس خوب صورت دھن کو سنتے ہوئے مجھے پتا ہی نہیں چلا۔'' اس کے معصومیت بھرے انداز پر انہوں نے ستار ایک سائڈ پر رکھا اور کھڑے ہو گئے۔

''آپ اوپر جائیں، یہ مناسب نہیں لگتا کہ رات کے اس پہر ہم لوگ اکٹھے یہاں بیٹھیں، ہم صبح بات کریں گے۔'' ان کے روکھے انداز پر شرزمہ ہکا بکا رہ گئی۔ بے عزتی کے گہرے احساس کی وجہ سے اس کی بھوری آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ چاند کی روشنی میں وہ اجلی لڑکی پروفیسر صاحب کے کئی زخموں کے ٹانکے ادھیڑنے کا باعث بنی تھی۔ وہ بے عزتی کے گہرے احساس کے ساتھ تیزی سے اٹھی اور برق رفتاری سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز اور دل ایک بے نام سے دکھ کے حصار میں آ گیا۔ رات کی خاموشی اور سناٹے میں ستار کے تاروں میں پروفیسر صاحب کے پتا نہیں کون کون سے دکھ بین کرتے رہے۔ صبح چار بجے کے قریب اس کی آنکھ لگی اور سات بجے وہ اٹھی تو آنکھیں رتجگے کی عکاسی کر رہی تھیں اور سر بہت بھاری سا تھا۔ بہت بے دلی سے وہ کیمپس جانے کے لیے تیار ہوئی۔ وہ بیزاری سے پوائنٹ کے اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی جب اسے ایک گاڑی بالکل اپنے پاس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''ہم یونیورسٹی جا رہے ہیں اگر مناسب سمجھیں تو ہمارے ساتھ ہی چلیں۔'' پروفیسر صاحب کی گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اسود بڑی گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شرزمہ نے چونک کر دونوں کو دیکھا۔ ذہن کے پردے پر رات کا منظر پوری قوت سے بیدار ہوا۔ غصے کی ایک لہر اسے اپنے پورے وجود میں پھیلتی محسوس ہوئی۔

''سوری، میں اسے مناسب نہیں سمجھتی۔'' اس نے اپنی چھوٹی سی تیکھی ناک چڑھا کر سپاٹ لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئی۔

''ہائیں...... انہیں کیا ہوا؟'' اسود اس کے ردِعمل پر ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا جس کی پشت پر لمبے بالوں کی چوٹی کسی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ اس کی برابر والی سیٹ پر بالکل فریش بیٹھے پروفیسر صاحب زیرِ لب مسکرائے انہیں اندازہ تھا کہ یہ کس چیز کا شدید ردِعمل ہے۔

وہ یونیورسٹی پہنچی تو سامنے ہی اداس اور رنجیدہ سی نویرہ کو دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی۔

''تھینکس گاڈ، اگر تم آج بھی نہ آتیں تو میں نے سوچ رکھا تھا کہ گھر جا کر تمہیں شوٹ کر کے آؤں

گی۔'' اس نے نویرہ کے پاس سیڑھیوں پر بیٹھتے ہی اپنے غصے کا اظہار کیا۔ جبکہ اپنے ہاتھ میں پکڑے پیپل کے پتے کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین پر پھینکتی نویرہ کے چہرے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

''کاش کہ تم مجھے شوٹ کر ہی دو تو اچھا ہے۔ سب سے جان چھوٹ جائے گی۔'' اس کی بات پر شرزمہ ٹھٹکی اور غور سے اسے دیکھا جو حد درجہ ذہنی پراگندگی کا شکار لگ رہی تھی۔

''اوئے خیر ہے ناں، یہ تم اٹھارویں صدی کی ہیروئن کی طرح غم کا اشتہار کیوں بنی ہوئی ہو؟'' شرزمہ نے ہلکے پھلکے انداز میں سوال کیا تو وہ خاموش رہی اور کچھ توقف کے بعد بولی۔

''میرے جیسے لوگ صرف غم کا اشتہار ہی بن سکتے ہیں۔''

''پھر تم کیوں نہیں اس غم سے نکلنے کی کوشش کرتیں۔'' شرزمہ نے اسے سمجھایا۔

''کاش میں بھی جیا آپی کی طرح بہادر ہوتی۔'' اس نے ایک لمبی آہ بھر کر ہاتھ میں پکڑا پتا زمین پر پھینک دیا۔ وہ اس کھیل سے اکتا گئی تھی۔

''انہوں نے کیا، کیا تھا؟'' شرزمہ نے تجسس سے پوچھا۔

''محبت۔'' نویرہ نے اپنا چہرہ گود میں چھپا لیا۔ وہ آج کیمپس آنا نہیں چاہتی تھی لیکن پھر بھی آ گئی تھی۔

''کس سے؟'' شرزمہ نے عجلت بھرے انداز میں دریافت کیا۔ اس سے پہلے کہ نویرہ کوئی جواب دیتی۔ فائنل ائیر کی ایک اسٹوڈنٹ ان کے پاس آن رکی۔

''ایکسکیوزمی، آپ میں سے شرزمہ کون ہیں؟'' اس کے سوال پر وہ دونوں ہی چونکیں۔

''جی میں ہوں، خیریت؟'' شرزمہ نے فوراً ہی جواب دیا۔

''آپ کو پروفیسر آفاق صاحب اپنے آفس میں بلا رہے ہیں، میں اپنی اسائنمنٹ جمع کروانے گئی تھی تو انہوں نے آپ کا نام بتا کر کہا تھا کہ آپ کو بھیجوں، آپ کی کلاس میٹس نے بتایا کہ آپ یہاں ہیں۔'' اس نے بہت شائستگی سے وضاحت دی۔

''شرزمہ کو......؟'' نویرہ نے چونک کر شرزمہ کا سپاٹ چہرہ دیکھا جس کے اعصاب تن سے گئے تھے۔

''اکس، اوکے، میں چلی جاؤں گی، تھینکس۔'' شرزمہ نے اس لڑکی کو صاف ٹرخایا۔

''یہ پروفیسر آفاق نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟'' نویرہ نے اس لڑکی کے جاتے ہی اس سے حیرانی سے دریافت کیا۔

''دفع کرو، پھر کبھی مل لوں گی، چلو اٹھو یہاں سے، کوئی اور دعوت نامہ نہ آ جائے۔'' وہ بے پروائی سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے موڈ سے نویرہ کو اندازہ ہوا کہ وہ وہاں نہیں جائے گی۔

''لیکن شرزمہ، وہ ہمارے استاد ہیں، بے شک ہمیں ابھی نہیں پڑھاتے لیکن تمہیں ان کی بات سننی چاہیے۔'' نویرہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''زیادہ اماں نہ بنو، جب میرا دل کرے گا تو مل آؤں گی۔'' اس کے شانِ بے نیازی سے جواب دینے پر نویرہ ایک دفعہ پھر حیران ہو گئی۔

''تمہارا میرے پیچھے دماغ تو خراب نہیں ہو گیا کیا؟'' اسے واقعی اس کے پُراسرار سے رویے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''ہاں ہو گیا ہے۔'' وہ چڑی۔ ''اگر اسی طرح سوال جواب کرتی رہو گی تو تمہارا بھی ہو جائے گا۔ اٹھو، مجھے ناشتا کرنا ہے۔'' اس نے عجیب ڈھٹائی والا انداز اختیار کیا۔

''کیوں، گھر میں کیا کھانے پینے کی ہڑتال چل رہی ہے۔'' نویرہ کو اس کی حرکتیں کوفت میں مبتلا کر گئیں۔ ''بندہ کم از کم ناشتا تو اپنے گھر سے کر کے آتا ہے۔''

"آج کل کے اینکرز کی طرح بے تکا بول بول کر میرا سر نہ کھاؤ۔" وہ چل پڑی تھی نویرہ نے اس کی پیروی کی۔ "ایک تو تمہارے ان پروفیسر صاحب کے ستار نے ساری رات سونے نہیں دیا۔ عین لان میں میرے کمرے کی کھڑکی کے نیچے بیٹھ کر پتا نہیں کون کون سے راگ اپنے ستار پر بجاتے رہے، قسم سے ابھی تک سر پھٹ رہا ہے۔" شرزمہ غصے سے اصل بات اگل ہی گئی۔

"پروفیسر صاحب کو ستار بجانا آتا ہے۔؟" نویرہ حیرت اور جوش سے ذرا اونچا ہی بول گئی۔

"کیوں، تم نے ان سے ستار سیکھنے کی کلاسز لینی ہیں کیا؟" شرزمہ کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔ جبکہ نویرہ کو اس کی بات پر صدمہ ہوا۔

"کتنی بدذوق ہو تم، لوگ کسی کی لائیو پرفارمنس کو سننے کے لیے ترستے ہیں اور اِدھر دیکھو، چراغ تلے اندھیرا۔"

"تم اپنی چونچ بند ہی رکھو، ابھی کچھ دیر پہلے تو ملکۂ غم بنی بیٹھی تھیں، اب دیکھو کیسے زبان چل رہی ہے۔" شرزمہ کے طنزیہ انداز پر وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"یہ کتابیں، رسالے، یونیورسٹی، کلاسز سب کچھ مجھے کچھ دیر کے لیے ہی سہی لیکن بہت سی چیزوں کو بھلانے میں مدد دے دیتے ہیں لیکن آج تو لگتا ہے کہ تم بھی ان سب کے ساتھ مل کر میرے زخموں پر نمک پاشی کرنے بیٹھ گئی ہو۔" وہ کینٹین کے پاس آ کر رکی۔ شرزمہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"اُف لگتا ہے کہ ساری ہی عوام گھروں سے بھوکی اٹھ کر آ گئی ہے، دیکھو ذرا پہلی کلاس ہی بنک کر کے اسٹوڈنٹس کیسے یہاں ڈیرا ڈالے بیٹھے ہیں۔" شرزمہ کو رش دیکھ کر کوفت ہوئی۔

"ہماری عوام کا سب سے بڑا مسئلہ ہی روٹی ہے۔" نویرہ نے بھی تلخ لہجے میں کہا اور بیزاری سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ شرزمہ اتنے رش میں بھی کچھ نہ کچھ کھانے کو لے ہی آئی۔

"ہاں اب بتاؤ کہ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ یہ چہرے کے سارے بلب فیوز کیوں ہیں؟" شرزمہ نے چاول چھولے کھاتے ہوئے ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔

"جیسے ہماری عوام کا آج کل سب سے بڑا مسئلہ لوڈشیڈنگ ہے۔ اسی طرح میرے جیسے جذباتی لوگوں کے بھی زیادہ تر مسئلے، مسائل محبت کی برقی توانائی سے ہی وابستہ ہوتے ہیں۔ جب تک دل کی طرف جانے والی لائنوں کی وائرنگ ٹھیک رہے مسئلہ ٹھیک رہتا ہے۔ جیسے ہی اس میں کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے والی خواہش کا فیوز اڑ جاتا ہے۔ محبت کے نظام کا بریک ڈاؤن... ہوتے ہی زندگی میں بس تیرگی اور مایوسی کا ہی احساس باقی رہ جاتا ہے۔" اس کے فلسفیانہ انداز پر شرزمہ اتنی حیران ہوئی کہ چمچ منہ میں لے جانا بھول کر تعجب سے اسے دیکھنے لگی جو خود بھی ایک کونے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

☆☆☆

"ہنی ہم لوگ کہیں اور گھر نہیں لے سکتے؟" اس دن کیمپس سے آتے ہی اس کی عجیب سی خواہش سن کر ہانیہ حیران رہ گئیں۔ وہ ایپرن باندھے خلافِ معمول کچن میں کچھ مصروف دکھائی دے رہی تھیں حالانکہ انہیں کچن کے کاموں سے سخت الرجی تھی۔

"خیریت ڈارلنگ، کیا ہوا؟" ہنی نے میکرونیز کا پیکٹ شیلف پر رکھ کر اس کا بیزار چہرہ دیکھا۔

"بھئی عجیب گھر ہے یہ، نہ بندہ سکون سے سانس لے سکتا ہے، نہ گھوم پھر سکتا ہے اور نہ سو سکتا ہے۔" اس نے بیگ اور فائل سائڈ میز پر رکھی اور ٹانگیں پھیلا لیں۔ جبکہ ہنی اپنا کام چھوڑ کر اس کے پاس آن کھڑی ہوئیں۔

"تو اس میں کیا مسئلہ ہے، کس نے منع کیا ہے۔" وہ اب کھوجتی نگاہ سے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ چہرہ جو انہیں سب سے زیادہ پیارا تھا۔

"منع تو کسی نے نہیں کیا، یہ جو نیچے دو دو باڈی گارڈز گھوم رہے ہیں۔ مجھے ان سے کوفت ہوتی ہے۔" اس کا اشارہ سمجھ کر ہنی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"وہ بیچارے تمہیں کیا کہتے ہیں؟"

"آپ بھی ناں ہنی عجیب خاتون ہیں، ابھی کچھ دن پہلے مجھے مردوں کے بارے میں اپنی خوفناک قسم کی تھیوریاں پڑھا رہی تھیں اور اب کچھ ہی دن کے بعد وہ آپ کو بیچارے لگنے لگے ہیں۔" شرزمہ کو ٹھیک ٹھاک غصہ آ گیا۔

"لو میں نے ان دونوں کا نام تھوڑی لیا تھا، میں تو جنرل بات کر رہی تھی۔" وہ صاف مکر گئیں۔

"اُف ہنی۔" شرزمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ "کیا چیز ہیں آپ، پل میں تولہ، پل میں ماشہ۔"

"بس میری جان، مجھے تھوڑی سی غلط فہمی ہو گئی تھی لیکن اب ایسی کوئی بات نہیں، تم آرام سے گھومو، پھرو، کوئی مسئلہ نہیں۔" وہ بے پروائی سے گویا ہوئیں۔

"تھینکس، مجھے کوئی ضرورت نہیں ایسے ویزے کی، جو کبھی مسترد کر دیا جائے تو کبھی اس پر قبولیت کی مہر لگا دی جائے۔" شرزمہ ناگواری سے کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"یہ شیری پاکستان آ کر کچھ تیز نہیں ہو گئی، پہلے تو چپ چاپ ہر بات مان لیتی تھی لیکن اب اس نے آگے سے بڑی مزاحمت دکھانا شروع کر دی ہے۔" ہانیہ نے گرم پانی میں میکرونیز ڈالتے ہوئے لاشعوری طور پر سوچا۔

"یہ ہنی بھی پاکستان آ کر کچھ عجیب ہی ہو گئی ہیں۔" شرزمہ نے اپنے کمرے میں آتے ہوئے سوچا۔ "اور میں اس سے بھی زیادہ عجیب۔" ایک

اور سوچ نے اس کے ذہن کا احاطہ کیا۔ "میں نے بھی آج بدتمیزی کی انتہا کر دی۔" اسے کیمپس میں کی گئی اپنی حرکت یاد آئی تو اب افسوس ہونے لگا۔ وہ پروفیسر صاحب کے بلانے پر اُن کے آفس نہیں گئی بلکہ ڈھٹائی سے اُدھر ہی گھومتی رہی۔ اب اسے اپنی حرکت کا احساس ہوا تو ساتھ ہی دل میں شرمندگی کے کئی پودے لہلہانے لگے۔

"میں سوچ رہی ہوں شیری کہ مجھے اب اپنی زندگی کے بارے میں کچھ سنجیدہ ہو کر سوچنا چاہیے۔" ہنی چکن میکرونیز اور کیچپ کی بوتل ٹرے میں رکھے اندر داخل ہوئیں۔

"کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔" شرزمہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ وہ حیرانی سے ہنی کو دیکھنے لگی جو اسے بھی کھانے کا اشارہ کر رہی تھیں۔

"نہیں ہنی، آج کیمپس میں نویرہ کے ساتھ کینٹین میں ہی بہت کچھ کھا لیا تھا۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے وضاحت کی۔

"یہ تم اپنی نویرہ کو کسی دن بلاؤ ناں گھر، صبح شام اس کی باتیں کرتی ہو اور ایک دفعہ بھی مجھ سے نہیں ملوایا۔" ہنی نے پلیٹ میں ڈھیر سارا کیچپ انڈیلا۔

"ہاں بلاؤں گی کسی دن۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ویسے بائی داوے آپ نے اپنے بارے میں سنجیدہ ہو کر کب سے سوچنا شروع کیا۔" شرزمہ کو اچانک یاد آیا۔

"بس سوچ تو میں تب سے رہی ہوں، جب سے پاکستان آئی ہوں۔" انہوں نے بے پروائی سے کہا۔ "لیکن ذرا سنجیدگی سے اب سوچنے لگی ہوں جب سے مجھ پر پروفیسر صاحب نے زور ڈالا ہے۔" ہنی کی بات پر وہ زبردست انداز سے چونکی۔

"ان کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے آخر کب تک وہ اس لڑکی کی بے وفائی کا سوگ مناتے رہیں گے۔" شرزمہ نے الماری سے اپنا سوٹ نکالتے

ہوئے کہا۔

"یار سچ پوچھو تو وہ اس موضوع پر بات کرنا ہی پسند نہیں کرتے، اس لیے میں نے بھی دوبارہ اصرار نہیں کیا۔" شرزمہ کو ان سے اس قدر عقلمندی کی توقع نہیں تھی اس لیے حیران ہوئی۔

"اچھا کیا جو نہیں پوچھا، ہمیں کیا ضرورت ہے۔" شرزمہ کو پہننے کے لیے ایک سوٹ مل ہی گیا۔

"یہ تم کیوں اداس، اداس سی ہو، خیریت ہے ناں؟" انہوں نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ہوں...... اداس تو ہوں۔" وہ فوراً متفق ہوئی۔ "ویسے ہنی کتنا اچھا ہوتا کہ ہم اپنے بارسلونا میں ہی ہوتے، میں قسم سے اسپین کو بہت مس کرتی ہوں۔" شرزمہ نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ایک اور عجیب سی بات کی۔

"یہ آج تمہیں ہوا کیا ہے۔ ایک دم سے ہی بات کرتے کرتے کوئی اور موضوع چھیڑ دیتی ہو۔" ہنی نے تعجب سے اس کا اداس چہرہ دیکھا۔

"پتا نہیں کیوں ہنی کل سے مجھے اپنا وہاں والا گھر، ماما، پاپا، وہاں کے فرینڈز اور کالج وغیرہ بہت یاد آرہے ہیں۔" شرزمہ زبردستی مسکرائی۔

"میرا تو مکمل ارادہ ہے کہ تمہاری شادی کر کے میں خود بارسلونا واپس چلی جاؤں گی۔" ہنی کی بات پر اسے کرنٹ لگا۔

"یہ کیا بات ہوئی، ابھی آپ اپنے بارے میں سوچ رہی تھیں اب ایک دم میری شادی کہاں سے درمیان میں آگئی۔" اسے ہنی کی بات بالکل اچھی نہیں لگی۔

"بے وقوف تمہاری شادی کر کے ہی تو کچھ اپنے بارے میں سوچوں گی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔" ہنی نے اسے چھیڑا۔

"جی نہیں، آپ مجھ سے بڑی ہیں، پہلے اپنے بارے میں کچھ سوچیں، مجھے ابھی بہت سارا پڑھنا ہے۔" شرزمہ نے صاف انکار کیا تو وہ ہنس دیں۔

"تمہاری موجودگی میں میرا تو کچھ نہیں بن سکتا۔ اب تمہیں کیا میں جہیز میں لے کر ادھر ادھر پھروں گی۔" ہنی کی مذاق میں کہی ہوئی بات اسے تیر کی طرح لگی۔

"میرا کوئی مسئلہ نہیں، میں یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہ لوں گی۔" اس کا لہجہ بھیگ سا گیا۔

"جس دن میں مرجاؤں تو، اس دن بے شک تم ہاسٹلوں میں رہ لینا، میری زندگی میں تو ایسا بالکل ممکن نہیں۔" ہنی نہ جانے کیوں سنجیدہ سی ہو گئیں۔ شرزمہ نے تڑپ کر اُن کی طرف دیکھا۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں ہنی، مریں آپ کے دشمن۔" اس نے فوراً اٹھ کر بانہیں ان کے گلے میں ڈالیں اور چٹاچٹ پیار کرنے لگی۔

"جتنا مرضی مسکا لگا لو لیکن میں نے اب سوچ لیا ہے کہ تمہیں بس اپنے گھربار کا کرنا ہے۔" ہنی نہ جانے دل میں کیا ٹھان کر بیٹھ گئی تھیں۔ شرزمہ نے بھی ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا۔ پتا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک کسی چیز کو اپنے دماغ پر حاوی نہیں کرتیں۔ اسے یقین تھا کہ صبح تک وہ اس بات کو بھول بھال جائیں گی۔

☆☆☆

"آج اوپر بڑی رونقیں لگی ہیں خیر ہے؟" الماس بیگم نے رومیصہ کو دیکھتے ہی طنزاً پوچھا۔ آج رومی کافی مصروف تھیں۔

"ہاں آپی، آج ارسلان کو دیکھنے آرہے ہیں کچھ لوگ۔" انہوں نے نوریہ کو ٹی وی میں مصروف دیکھ کر ذرا دھیمے لہجے میں کہا لیکن نوریہ کی تو آج کل حساسیت عروج پر تھی۔

"بھابی تو پسند کر آئی ہیں لڑکی۔" رومیصہ نے ذرا دھیمے انداز میں مزید بتایا۔

"ہونہہ ہماری بلا سے۔" انہوں نے سلگ کر

رومیصہ کو دیکھا جس کے ہر انداز سے لاتعلقی نمایاں تھی۔

"آپی، وہ بڑی اماں کہہ رہی تھیں کہ جب مہمان آجائیں تو آپ کچھ دیر کے لیے اوپر آجائیے گا مہمانوں کو آپ سے ملوانا ہے۔" رومیصہ نے کچھ جھجک کر کہا۔

"کیوں؟" وہ زہرخند لہجے میں بولیں۔ "میں ہی فالتو ہوں جسے عین وقت پر صرف کارروائی ڈالنے کے لیے بلایا جارہا ہے۔"

"آپی مجھے تو اماں نے کہا تھا کہ آپ سے کہہ دوں، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" رومی خالہ نے بے چارگی سے اپنی صفائی دی۔

"تم بھی آرام اور سکون سے بیٹھ جاؤ، کوئی ضرورت نہیں بھاگ بھاگ کر خدمتیں کرنے کی، نوکرانی نہیں ہو تم اس گھر کی، ہزار دفعہ دن میں تمہیں یاد دلانا پڑتا ہے۔" ان کا نخوت زدہ لہجہ پورے کمرے میں گونجا اور اندر آتے ہوئے ارجمند خاتون نے بھی اچھی طرح سن لیا۔

"السلام علیکم!" اپنی ساس کو پیچھے دیکھ کر الماس خاتون کی پیشانی پر ان گنت لکیریں ابھر آئیں اور عافیت رہی کہ انہوں نے مزید کچھ نہیں کہا۔

"بہو، مجھے تم سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔" ارجمند خاتون نے اندر آتے ہی بغیر کوئی تمہید باندھے کہا جبکہ الماس بیگم کے اعصاب تناؤ کا شکار ہوئے۔

"جی فرمائیے، کیسے یاد آگئی میری؟" الماس بیگم کا لفظ لفظ زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"بھئی گھر کی بڑی بہو ہو تم، کیسے بھول سکتے ہیں تمہیں۔" انہوں نے دانستہ ہلکا پھلکا انداز بنایا۔ جبکہ الماس بیگم کو بھی شاید ان کے سارے ہی انداز ازبر تھے۔ اس لیے ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی طنزیہ مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔

"آج ارسلان کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں۔ تم بھی اس موقع پر موجود رہنا، آخر کو بڑی بہو ہو اس گھر کی۔" انہوں نے بہت سنبھل کر محتاط لفظوں کا انتخاب کیا لیکن شاید انہیں بھول گیا تھا کہ الماس بیگم کو اگلے بندے کے سر ہونے کے لیے کسی خاص وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

"بڑی جلدی آپ کو خیال آگیا کہ میں اس گھر کی بڑی بہو ہوں۔" انہوں نے ایک، ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔

"مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے، اس میں بھولنے والی کون سی بات ہے۔" ارجمند خاتون بھی کون سا کسی سے کم تھیں۔

"ہاں تبھی گھر کے ہر اچھے رشتے کے لیے آپ کو میری بیٹیوں کے نام یاد نہیں رہتے۔ مجھ سے تو چلو کوئی کدورت سہی۔ یہ نوریہ تو بڑی لاڈلی تھی آپ کی۔" ان کے لبوں پر بڑی تمسخرانہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ نوریہ کے ساتھ رومیصہ کو بھی جھٹکا لگا اور اتنے دوٹوک انداز میں بات سننے کی ارجمند خاتون کو بھی کہاں توقع تھی تبھی وہ گڑبڑا سی گئیں۔

"میں نے کب کہا کہ نوریہ میری لاڈلی نہیں۔" انہوں نے بوکھلا کر نوریہ کو دیکھا جو بڑے ہی عجیب انداز میں اپنی دادو کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی دفعہ اسے اپنی ماں کی بات بری نہیں لگی۔

"دیکھو الماس، احمر، ارسلان دونوں عطیہ کے بیٹے ہیں جس طرح عبیرہ اور نوریہ تمہاری بیٹیاں ہیں۔ ہر ماں باپ کو اپنے بچوں کے لیے اپنی خواہش کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔" انہوں نے بڑے تحمل بھرے انداز میں گفتگو کو آگے بڑھایا۔ "میری تو اس میں کوئی مرضی نہیں۔" انہوں نے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش کی۔

"رہنے دیں اماں۔" انہوں نے بیزاری سے ناک سے مکھی اڑائی۔ "جب حرا کے معاملے میں آپ اپنی مرضی چلا سکتی ہیں تو نوریہ میں کون سے کانٹے لگے ہوئے تھے۔" ان کی آنکھوں سے شعلے

نکلے۔ گفتگو اتنے براہ راست انداز سے شروع ہو جائے گی اس کا کسی کو بھی گمان نہیں تھا۔ نویرہ اور رومیصہ دونوں کے چہرے کی ہوائیاں اڑیں۔ جبکہ ارجمند خاتون خود ہکا بکا تھیں کہ الماس نویرہ کی موجودگی میں کیسے اتنے کھلے ڈلے انداز میں اس موضوع پر بات کر سکتی ہیں۔

نویرہ کو ابھی تک اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ ماما اس کی خاطر دادو کے سامنے ڈٹ سکتی ہیں۔ دوسری جانب الماس بیگم نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلیں تھیں انہوں نے محض نویرہ کے دل میں آئی اپنی طرف سے بدگمانی کو دور کرنے کے لیے عین ٹائم پر یہ کھیل کھیلا تھا۔ نویرہ نے سخت تاسف بھرے انداز میں اپنی دادو کو دیکھا اور احتجاجاً کمرے سے نکل گئی۔

"دیکھو بہو۔" ارجمند خاتون نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نویرہ کے لیے عطیہ سے بالکل کہہ سکتی تھی لیکن میں نے محض اس لیے نہیں کہا کہ تمہارے مزاج کا کوئی پتا نہیں کہ انکار کر دو اور میں اپنی بات کہہ کر گنوا بیٹھوں۔" انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔

"خیر اب تو یہ آپ محض گونگلوؤں سے مٹی جھاڑ رہی ہیں۔" الماس بیگم تلملا کر بولیں اُن کی اس بات پر ارجمند خاتون کو بھی غصہ آیا۔

"بہو، گونگلوؤں سے مٹی میں نہیں، تم جھاڑ رہی ہو۔ جب تم جیا اور شامی کے رشتے کے لیے سارا خاندان اکٹھا کر سکتی تھیں تو نویرہ بھی تو تمہاری ہی بیٹی تھی۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ تمہاری ابھی پہلے رشتے والی ہی خفت ختم نہیں ہوئی تھی اس لیے تم دوسری دفعہ کیسے کہتیں۔" ان کی بات پر وہ چاروں شانے بری طرح سے چت ہوئیں۔ جبکہ ارجمند خاتون کے لبوں پر دل جلاتی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں اپنی خفت مٹاتی پھروں، جیا کے انداز تو کبھی کے سامنے تھے۔ وہ اس رشتے کے لیے مشکل مانی تھی اور یہ بات بھی آپ سب کو ہی پتا تھی لیکن نویرہ کو تو ارسلان دن دیہاڑے سہانے خواب دکھاتا رہا ہے۔ مجھ مجھے نیچا دکھانے کے لیے۔" وہ آگ بگولہ ہوئیں۔

"اے لو الماس یہ تم نے دنیا سے نرالی بات کر دی، عطیہ نے اپنے بچوں کی ایسی تربیت نہیں کی کہ وہ گھر کی لڑکیوں کو خراب کرتے پھریں۔" ارجمند خاتون نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا اور کچھ انہوں نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے ابراہیم صاحب کو دیکھ لیا تھا۔

"اگر عطیہ نے اپنے بچوں کی ایسی تربیت نہیں کی تو کیا میں نے اپنی بیٹیوں کو دوسروں کے لڑکے تاڑنے کے ڈپلومے کروا رکھے ہیں؟" انہوں نے سلگ کر ان کی بات قطع کی۔

"کیا ہو گیا ہے بھئی!" ابراہیم صاحب کو اندر داخل ہوتے ہی ماحول کی سنگینی کا احساس ہوا۔ الماس بیگم کے تو پیروں سے لگی اور سر پر بجھی۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس گھر کے سب لوگوں کا، خدا خوفی تو نام کی نہیں رہی، قبر میں ٹانگیں ہیں اور ان سب کے ڈرامے ہی ختم نہیں ہوتے۔" الماس بیگم کے اشتعال میں اضافہ ہوا۔ ان کے چہرے پر سختی اور لہجے میں اس قدر تنفر تھا کہ ایک لمحے کو تو ارجمند خاتون کے ساتھ ساتھ ابراہیم صاحب کو بھی سانپ سونگھ گیا۔

"میری بیٹیوں کے ساتھ اللہ جانے کون سا بیر باندھ رکھا ہے سارے جہان نے، چلو ماں تو زہر لگتی ہے لیکن بچیوں کے ساتھ تو خون کا رشتہ ہے ناں۔" انہوں نے جتلاتی ہوئی نگاہ اپنے میاں پر ڈالی اور پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔ ارجمند خاتون کو اپنی پوزیشن بہت آکورڈ سی محسوس ہوئی۔ الماس بیگم آج بھی انہیں ناکوں چنے چبوانے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھیں۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے تم دونوں کو اوپر جانے کی، غضب خدا کا بڑھیا کی اس عمر میں بھی چالاکیاں ختم نہیں ہوتیں۔" ڈائننگ روم میں جاتے ہی ان کی سانس پھول سی گئی اور آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ سامنے ہی عبیرہ اور نویرہ بیٹھیں تھیں۔

"آپ کو ضرورت کیا تھی دادو کے منہ لگنے کی، سارے فساد کی جڑ ہی وہ ہیں۔" نویرہ نے اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے انتہائی غیر متوقع بات کی۔ ایک لمحے کو تو الماس بیگم کو اپنی سماعتوں پر شک ہوا جبکہ سلاد کے لیے کھیرے کاٹتی عبیرہ نے بھی سخت حیرت سے اپنی بہن کا چہرہ دیکھا۔ جو ہمیشہ اوپر والوں کی طرفداری کے لیے ان کے سامنے تن کر کھڑی ہو جاتی تھی۔

"یہی چیز میں تمہیں ساری زندگی سمجھانے کی کوشش کرتی رہی لیکن تم نے ہمیشہ ماں کو غلط اور اپنی چچی اور دادی کو درست سمجھا۔ دیکھ لیا ناں آج اپنی آنکھوں سے۔" الماس بیگم نے اپنے اشتعال پر قابو پا کر ذرا دھیمے لہجے میں جو بولنا شروع کیا تو پھر اگلے دو گھنٹے تک بولتی ہی گئیں۔

☆☆☆

"زندگی میں گلے شکوے، ناراضیاں سب بجا سہی لیکن اپنے پیاروں کو ایک دفعہ تو ضرور صفائی کا موقع دینا چاہیے۔" اس دن وہ چمپا کے پھولوں کی مہک کو محسوس کرتے ہوئے بنٹی کو پیار کر رہی تھی جب پروفیسر صاحب نے اسے اچانک پکارا۔ شرزمہ کے صبیح چہرے پر شرمندگی کی دھنک بکھری۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے بہت آہستگی سے کہا تو وہ مسکرا دیے۔

"آپ سوری کیوں کر رہی ہیں، معذرت تو مجھے کرنی چاہیے، آپ اس دن مجھ سے خفا جو ہو گئی تھیں۔" متانت بھرے انداز میں انہوں نے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو توصیفی نگاہوں سے دیکھا جو سفید چوڑی دار پاجامے کے ساتھ بے بی پنک کلر کی لمبی قمیص پہنے ہوئے تھی جبکہ اس کے بال آج چوٹی میں گندھے ہوئے تھے۔

"ایکچوئلی، اس سے اگلے دن میں نے بھی تو بدتمیزی کی انتہا کر دی اور آپ کے بلانے پر نہیں گئی۔" اس نے اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو پروفیسر صاحب کے دل کی دنیا میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ انہوں نے سر جھٹک کر خود پر قابو پایا۔

"چلیں آپ میرے ساتھ اندر چلیں، میں آپ کو کافی بنا کر پلاتا ہوں اس کے بعد آپ کی فرمائش پر ستار پر دھنیں سنائی جائیں گی۔" انہوں نے فوراً ہی کھڑے کھڑے پروگرام مرتب کیا۔

"نو، نو اٹس او کے۔" شرزمہ نے بوکھلا کر نفی میں سر ہلایا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ صرف اور صرف اس کی ناراضی دور کرنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔

"شرزمہ مجھے بہت اچھا لگے گا۔ یقین کریں پورے پانچ سال، سات ماہ اور آٹھ دن کے بعد میں کسی کو اس کی فرمائش پر کچھ سناؤں گا۔" ان کے ٹھہرے ہوئے لہجے اور بولتی نگاہوں میں کچھ تھا کہ شرزمہ خود کو روک نہیں پائی۔

"آئی ایم سوری اس دن میں کچھ آپ سے زیادہ ہی روڈ ہو گیا۔" وہ پندرہ منٹ بعد کافی کا مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ دونوں ٹی وی لاؤنج میں تھے سامنے فضلو کی اماں پالک کے پتوں میں ابھی اپنے کام میں مگن تھیں۔

"ایک تو وہ وقت بہت نامناسب سا تھا۔ اسود یا ہانیہ میں سے کوئی اٹھ کر آ جاتا تو آپ کی پوزیشن عجیب ہو جاتی اور میں اپنے سے وابستہ رشتوں کی عزت کے معاملے میں بہت حساس ہوں۔" انہوں نے مزید صفائی دی تو شرزمہ پر شرمندگی کا بھرپور حملہ ہوا۔

"اٹس او کے سر، مجھے خود بھی بعد میں احساس ہو گیا تھا کہ میرا رویہ بہت بچکانہ تھا۔" شرزمہ نے سر

جھکا کر اعتراف کیا۔

''اوں ہوں۔'' انہوں نے ٹوکا۔ ''غلطیاں انسانی فطرت کا حصہ ہیں اور ان کا اعتراف آپ کی شخصیت اور آپ کے عمدہ کردار کی عکاسی کرتا ہے۔ بشرطیکہ آپ اسے سدھارنے کا جذبہ رکھتے ہوں۔'' ان کے متانت بھرے انداز پر شرزمہ متاثر ہوئی۔

''لیکن آپ اس رات اتنا زیادہ روڈ کیوں ہوئے تھے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''اس دن میرے تلخ ہو جانے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔'' اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے انہوں نے غور سے دیکھا۔ کچھ توقف کے بعد وہ گویا ہوئے۔

''مجھے ایک لمحے کو لگا جیسے اجالا میرے سامنے آ گئی ہو۔''

''اجالا؟'' شرزمہ چونکی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اپنے سامنے کافی کے مگ کی سطح پر انگلی پھیرتے شخص کو دیکھا جس کے ہر انداز سے شکستگی نمایاں تھی۔

''وہ بالکل آپ کے جیسی تھی۔ معصوم، کم گو، ذہین اور خوب صورت، اس کی آنکھوں کا رنگ بھی آپ کی آنکھوں کی طرح گہرا بھورا تھا۔'' شرزمہ نے ان کی بات پر انہیں بے یقینی سے دیکھا۔

''اسے بھی بارشوں، رنگوں، خوشبوؤں، تتلیوں اور جگنوؤں سے عشق تھا۔ اسے بھی دنیا کے سارے ہی لوگ سادہ اور دل کے سچے لگتے تھے۔ وہ دنیا کے مکروفریب سے دور اپنی جنت بنانا چاہتی تھی۔ اس نے میرے سنگ رہنے والے اگلے کئی سالوں کی پلاننگ کر لی تھی۔ میرے گھر کے گیٹ پر لگی الجنت کی تختی اسی نے آویزاں کی تھی۔'' وہ بولتے بولتے رکے تو شرزمہ کی سانسیں کہیں حلق میں ہی اٹک گئیں۔

''لیکن وہ بہت جلد باز، بے صبری اور جذباتی تھی۔'' انہوں نے مزید کہا۔ دکھ اور اداسی ان کے انگ انگ سے عیاں تھی۔

''اسے مجھ سے محبت ہوئی تو اس نے اگلے ہی دن اسے اظہار کا پیراہن دے کر مجھے حیران کر دیا۔ میری زندگی میں سارے گلابی اور کاسنی زاویے اسی کے دم سے تھے۔ میں کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے اگر ایک پل کو اس کی بھوری آنکھوں میں جھانک لیتا تو سارے لفظ میرے ذہن سے بھک کر کے اُڑ جاتے۔ وہ ان لمحوں میں اپنے گلابی ہونٹوں میں بال پوائنٹ دبائے سارے جہاں کی شرارت اپنی آنکھوں میں سمو کر میری طرف دیکھتی تو مجھے لگتا جیسے زمین گردش کرنا بھول گئی ہے۔'' کسی خوب صورت یاد نے ان کے چہرے پر بڑے انوکھے رنگ بکھیرے۔

''اس کا کہنا تھا کہ ہمیں کہیں دور جگنوؤں کے دیس میں اپنا گھر بنانا چاہیے۔ جہاں تتلیاں ہوا کے خوشبودار جھونکوں کے ساتھ رقص کرتی ہوں۔ جہاں محبتوں کی دھوپ اور چاہتوں کے سارے موسم ہوں۔ وہ خوابوں میں رہنے والی لڑکی بھی اچانک ہی ایک دن خواب ہو گئی۔'' بڑے دلگرفتہ انداز میں انہوں نے شرزمہ کو دیکھا جو یہ ساری داستان سانس روک کے سن رہی تھی۔

''اسود کے علاوہ اگر میں نے کبھی کسی سے یہ بات شیئر کی ہے تو وہ آپ ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کا یہ باب بالکل ہی بند کر دیا ہے۔'' انہوں نے آہستگی سے ادھوری داستان سنائی۔

''کہاں گئی وہ؟'' شرزمہ کے حلق سے لفظ بمشکل نکلے۔

''وہ مجھے چھوڑ کر انجان سفروں پر نکل گئی۔'' انہوں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی آنکھوں کو دباتے ہوئے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب......؟ اس نے آپ کو چھوڑ دیا کیا؟'' شرزمہ ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

''ہاں'' انہوں نے اپنا سر یوں جھکایا جیسے کوئی

مجرم اعترافِ جرم کے بعد جھکاتا ہے۔ وہ آنکھیں بھینچ کر یوں بیٹھے تھے جیسے اپنے سینے میں مچلتی سسکیوں کو دبا رہے ہوں۔

''جس دن اس کی یاد میرا دامن پکڑ لیتی ہے تو میں وہ سارے کام کرنے لگتا ہوں، جو اسے اچھے لگتے تھے۔ اسے ستار پسند تھا۔ میں کئی کئی گھنٹوں اس کی پسندیدہ غزلیں گنگناتا ہوں۔ اسے مزاروں پر دیوانہ وار رقص کرتے قلندر بھاتے تھے، میں سارا سارا دن مختلف مزاروں کی خاک چھانتا ہوں۔ اسے پرندے اچھے لگتے تھے۔ میں باجرہ اپنی مٹھیوں میں بھر کر لان میں اچھال دیتا ہوں اور پھر اس کی یاد کے پرندوں کو اڑتے دیکھتا ہوں۔ یہ جو لاؤنج میں پیانو پڑا ہے یہ ہم دونوں مل کر اس کی سالگرہ والے دن ڈھونڈ کر لائے تھے۔'' وہ آنکھیں بند کیے کسی اور ہی جہاں میں پہنچے ہوئے تھے۔

''لیکن وہ آپ کو چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟'' شرزمہ کو اس ان دیکھی لڑکی پر بے تحاشا غصہ آیا۔

''جلد باز اور عجلت پسند تھی ناں......اس لیے۔'' پروفیسر صاحب نے آنکھیں کھولیں تو اُن میں وحشت کے رنگ اتنے نمایاں تھے کہ شرزمہ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔

''یہ جو جلد باز، جذباتی اور عجلت پسند لوگ ہوتے ہیں ناں، ان کے ساتھ رہنے والے لوگوں کے حصے میں اکثر دھوپ کے موسم ہی آتے ہیں۔ یہ اپنے بے صبرے پن سے کئی دفعہ خود چھاؤں کے موسم گنوا بیٹھتے ہیں اور پھر ساری زندگی اس کا ذمے دار کبھی خود کو تو کبھی دوسروں کو ٹھہراتے ہیں۔'' وہ بولے تو اُن کے لہجے میں صدیوں کی تھکن تھی۔

''ہاں ٹھیک کہتے ہیں آپ۔'' شرزمہ فوراً ہی ان سے متفق ہوئی۔ اسے اب اس کمرے میں پڑے ستار اور پیانو سے نہ جانے کیوں الجھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ ان دونوں چیزوں کو کہیں دور پھینک آئے۔

☆☆☆

''مائی گاڈ نویرہ، یہ تم نے کیا کیا۔'' شرزمہ سخت حیرت سے نویرہ کو دیکھ رہی تھی جو کلاس لینے کے بعد اب کینٹین سے مسالا لگی مولی خرید کر لے آئی تھی اور اسے کھاتے ہوئے بڑے مزے سے اسے کل کا واقعہ سنا رہی تھی۔

''تم نے ارسلان کے متوقع سسرالیوں کو بھگا دیا، مائی گاڈ۔'' شرزمہ سخت بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی جس نے بڑے مزے سے چٹخارہ لیا۔

''ہاں ناں، میرے تو تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔'' اس نے مرچوں کی زیادتی سے سرخ ناک کو بازو کی پشت سے رگڑ ادیا۔

''ماما تو ساری زندگی بول بال کر بری بنتی رہیں لیکن اس دفعہ تو پنگا انہوں نے نویرہ ابراہیم سے لیا تھا۔'' اس نے مولی کا ایک اور ٹکڑا منہ میں ڈالا۔ ''کھاؤ ناں بڑے مزے کی ہے۔''

''پیچھے ہی رکھو اس مرچوں کے طوفان کو۔'' شرزمہ لاشعوری طور پر ایسے پیچھے ہٹی جیسے وہ زبردستی اس کے منہ میں ڈال دے گی۔

''لیکن یہ تمہارے ذہن میں آیا کیسے؟'' شرزمہ کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

''بیٹا جب دل و دماغ میں آگ لگی ہوئی ہو تو انتقام لینے والی حس خود بخود تیز ہو جاتی ہے۔'' اس نے اپنا فلسفہ بیان کیا۔

''جیسے ہی مجھے سارا معاملہ سمجھ میں آیا، میں تو بلی کی طرح اپنے شکار کی تاک میں لان میں جا کر بیٹھ گئی۔'' نویرہ نے بڑے فخریہ لہجے میں اپنا کارنامہ اب ذرا اور تفصیل سے سنایا۔

''پھر؟'' شرزمہ نے بے صبری سے پوچھا۔

''جیسے ہی ارسلان کے ہونے والے سسرالی لوگ اندر داخل ہوئے، میں معصومیت کا اعلیٰ نمونہ بن

کران کے سر پر پہنچ گئی۔'' نویرہ نے ایک لمبا چسکا لیا۔

''جیسے ہی انہوں نے عطیہ آنٹی کا پوچھا تو میں نے اپنا ڈراما شروع کر دیا۔'' نویرہ کی زبان پر مرچوں نے اپنا رنگ دکھا دیا تھا وہ اب باقی ماندہ مولی ٹشو میں لپیٹ کر بیگ میں رکھ رہی تھی تاکہ تھوڑی سی طبیعت جب بحال ہو تو تب کھا سکے۔

''تم نے ان سے کہا کہ ارسلان کا تم سے نکاح ہو چکا ہے۔ جو گھر والوں کے اختلافات کی وجہ سے خطرے میں ہے اور عطیہ آنٹی محض تم لوگوں کو نیچا دکھانے کے لیے اپنے بیٹے کی دوسری جگہ بات پکی کرنا چاہتی ہیں۔'' شرزمہ نے ساری بات دہرائی۔

''ہاں اور میں نے مزید کہا، اس لیے آج جب آپ لوگ بات فائنل کرنے آرہے ہیں تو میری ماما جو لڑکے کی تائی ہیں وہ احتجاجاً اس پروگرام میں شریک نہیں ہوں گی۔'' نویرہ نے قہقہہ لگا کر باقی ماندہ تفصیل پر روشنی ڈالی۔

''اس کے بعد تم نے ان سے کہا کہ تم اور ارسلان ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو لیکن اپنے بڑوں کے اختلافات کی وجہ سے مجبور ہو۔'' شرزمہ کو اس کہانی کا ایک، ایک لفظ ازبر تھا۔ نویرہ نے اپنے نادیدہ کالر کھڑے کرتے ہوئے اسے داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔

''جی جناب، اس لیے ان سب لوگوں کا مزاج کچھ اکھڑا اکھڑا رہا، ماما بھی اوپر نہیں گئیں، ان کو اندازہ ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے جواب دے دیا۔'' نویرہ اب اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ شرزمہ نے تاسف بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''لیکن نویرہ، تم ایسا کب تک کرو گی؟'' شرزمہ نے الجھن بھرے انداز سے سوال کیا۔

''جب تک کر سکتی ہوں، تب تک تو ضرور کروں گی۔'' نویرہ کے جواب نے اسے سخت مایوس کیا۔

''یار تم ارسلان سے صاف، صاف بات کر کے اس مسئلے کا حل کیوں نہیں نکالتیں۔''

''کیا حل نکالوں، جب عطیہ آنٹی اور دادو کی ہی مرضی نہیں۔'' نویرہ نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

''کل تک تو تم کہتی تھیں کہ دادو بیچاری تمہارے حق میں ہیں لیکن عطیہ آنٹی کے سامنے ان کی نہیں چلتی۔'' شرزمہ نے اسے یاد دلایا۔

''یار میری بے وقوفی تھی، میں ساری زندگی ماما کو ہی غلط سمجھتی رہی اور مجھے تو اب پتا چلا ہے کہ محاذ تو دونوں ہی جانب کھلے ہوئے تھے۔'' نویرہ نے برا سا منہ بنایا۔

''مائی ڈیئر، اتنی جلدی اندازے نہیں لگاتے اور جیسی باتیں تم مجھے اپنی دادو کی بتاتی رہی ہو، مجھے لگتا تو نہیں ہے کہ وہ ایسی خاتون ہوں گی۔'' شرزمہ نے غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا۔

''میں بھی یہی سمجھتی تھی۔'' نویرہ نے اپنے ہاتھ ٹشو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے اب سمجھ آئی کہ جب احمر بھائی حرا آپی کے لیے بالکل نہیں مانتے تھے تب تو دادو نے اپنی نواسی کے لیے سارے جہان سے اپنی منوالی تھی۔ میری دفعہ ان کی زبان کیوں نہیں کھلی۔'' وہ ان کی طرف سے اچھی خاصی بدگمان ہو چکی تھی۔

''ہیلو!'' اسود اچانک ہی پیچھے سے آ کر بولا تو وہ دونوں چونک گئیں۔

''شرزمہ یونیورسٹی کی ٹرانسپورٹ نے اچانک ہی ہڑتال کر دی ہے۔ کوئی پوائنٹ نہیں چلے گا۔'' اسود کی اطلاع پر وہ پریشان ہوئی جبکہ نویرہ اپنے سامنے سر اسود کو دیکھ کر خاصے مؤدبانہ انداز میں کھڑی ہو گئی تھی۔

''میں گھر جا رہا ہوں ہنی سے بات ہو گئی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ آپ کو بھی لیتا آؤں۔'' اسود کی سنجیدگی پر اس کے پاس اثبات میں سر ہلانے کے علاوہ کوئی چارا نہیں تھا۔

''سر یہ ٹرانسپورٹ والوں کو کیا ہوا؟'' نویرہ نے معلومات میں اضافے کے لیے فوراً پوچھا۔

''شاید ان کا کسی الاؤنس وغیرہ کا ایشو ہے۔ وہ سب لوگ ایڈمن بلاک کے سامنے احتجاج کر رہے ہیں۔'' اسود نے مختصراً بتایا اور شرزمہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''چلیں؟''

''جی۔'' شرزمہ نے فوراً ہی اختتامی کلمات سے نویرہ کو نوازا اور ساتھ ہی تنبیہی نظروں سے آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ مزید گھر میں ارسلان کے حوالے سے کوئی ایشو کھڑا کرنے کی کوشش نہ کرے۔

''ہاں ہاں، پتا ہے مزید کچھ نہیں کرتی۔'' نویرہ نے ہنستے ہوئے اسے یقین دہانی کروائی۔ اسود اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''یار بندہ ہینڈسم اور اسمارٹ ہے، اگر ارسلان والا چکر نہ ہوتا تو ضرور ٹرائی مارتی۔'' نویرہ نے اس کے کان میں گھس کر شرارت سے سرگوشی کی۔

''ارسلان والے چکر پر مٹی ڈال کر میرا خیال ہے کہ تم اس کے بارے میں ہی سوچ لو۔ اچھا ہے دو شوخے مل جائیں گے۔'' شرزمہ نے جل کر کہا تو نویرہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ جبکہ اس کے قہقہے کی آواز اتنی بلند تھی کہ کافی فاصلے پر چلتے اسود نے بھی مڑ کر دیکھ لیا۔ دونوں پر گھڑوں پانی پھر گیا۔

''آپ کی دوست کا والیوم کچھ ضرورت سے زیادہ اونچا نہیں۔'' گاڑی کو مین سڑک کی طرف لاتے ہوئے اسود نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''وہ ایسی ہی ہے شروع سے، زندہ دل اور شوخ۔'' شرزمہ نے فوراً ہی صفائی دی۔

''ان کی بڑی بہن تو ایسی نہیں تھیں وہ تو بہت ریزرو، ڈیسنٹ اور دھیمے سے مزاج کی تھیں۔'' اسود کی بات پر وہ چونکی۔

''آپ اس کی بڑی بہن کو کچھ ضرورت سے زیادہ نہیں جانتے؟'' الجھا الجھا سا ایک سوال شرزمہ کے لبوں پر مچلا۔ اس کی بات پر اسود ہنسا۔

''ہاں، جو برائٹ اسٹوڈنٹس ہوں، وہ یاد رہ جاتے ہیں۔'' اس نے بے پروائی سے کہتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھائی۔ ''آپ کا اس ناچیز کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کس ناچیز کے بارے میں؟'' شرزمہ نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا وہ بڑی پُرشوق نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میرے بارے میں جناب!'' اسود کا لہجہ شریر و متبسم تھا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں، میں کون سا آپ کو جانتی ہوں۔'' اس نے جل کر کہا تو اسود کا قہقہہ زبردست تھا۔

''بھئی آپ کے خیال میں، میں کس قسم کا بندہ ہوں، کچھ تو اندازہ ہوا ہوگا ناں؟'' اسود نہ جانے اس سے کیا پوچھنا چاہ رہا تھا۔ وہ الجھ سی گئی۔

''بھئی میں دوسروں کے بارے میں اندازے نہیں لگاتی، آپ جیسے بھی ہوں مجھے اس چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''اور اگر مستقبل میں اس چیز سے فرق پڑ سکتا ہو، تب آپ کیا کہیں گی؟'' اسود نے گاڑی تیسرے گیئر میں ڈالی۔

''مستقبل کس نے دیکھا ہے۔'' شرزمہ نے سادہ سے لہجے میں کہہ کر اپنی نگاہ باہر کے مناظر پر مرکوز کر لی۔

''ہو سکتا ہے کہ آپ بہت جلد دیکھ لیں۔'' اس کے ذومعنی انداز پر وہ بری طرح جھنجلائی۔

''جب آئے گا تب دیکھ لوں گی، ابھی مجھے وہ دکھائیں جو آپ دکھانا چاہ رہے ہیں۔'' اس کا انداز جتنا سنجیدہ تھا اسود کے حلق سے نکلنے والا قہقہہ اتنا ہی

بے ساختہ تھا۔ اسود کچھ کہتے کہتے رک سا گیا۔

☆☆☆

''دیکھو انعم، زندگی میں حادثے انسانوں کے ساتھ ہی ہوتے ہیں، تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی۔'' شامی آج بڑی مشکلوں سے اسے کمرے سے نکال کر لے آیا تھا وہ کسی روٹھے ہوئے بچے کی طرح دونوں ٹانگیں کرسی پر رکھے بیٹھی تھی۔

''اچھی خاصی شکل صورت ہے تمہاری اور تم نے بیڑا غرق کر کے رکھ دیا ہے۔'' وہ آج اس کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے رہا تھا۔ انعم نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''جب سے میں آیا ہوں تم ایک دن بھی اپنے کمرے سے نہیں نکلیں، کھانا سب کے ساتھ نہیں کھاتیں۔ پڑھائی کا سلسلہ بھی منقطع کر رکھا ہے۔ کیوں رومیصہ ممانی کو تنگ کرتی ہو۔'' شامی نے ناگواری سے اسے دیکھا جو اپنے ہاتھوں کے ناخن چبا رہی تھی۔

''یہ ہاتھ نکالو اپنے منہ سے۔'' شامی کے ذرا تیز انداز میں بولنے پر وہ خوفزدہ ہوئی۔

''کیا تماشا بنا رکھا ہے تم نے، تمہاری وجہ سے رومیصہ ممانی بیچاری نے ساری خوشیاں اپنے اوپر حرام کر رکھی ہیں اور تم کس چیز کی سزا دے رہی ہو انہیں؟'' شامی کے خفگی بھرے انداز پر انعم کا چہرہ خفت سے لال ہو گیا۔ اس نے شرمساری سے نگاہیں جھکا لیں اور اب لان کی گھاس کو دیکھنے لگی۔

''اٹھو، چلو میرے ساتھ۔'' وہ ایک دم فیصلہ کن انداز میں کھڑا ہوا۔ انعم کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلانے لگے۔

''کھا نہیں جاؤں گا تمہیں۔'' اس نے بازو سے پکڑ کر اسے بے تکلفی سے کھڑا کیا تو وہ دونوں ہتھیلیوں سے اپنا چہرہ ڈھک کر سسکنے لگی۔

''کچھ نہیں کہوں گا تمہیں، شاباش۔'' شامی نے نرمی سے اس کا بازو پکڑا تو وہ بدک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''دیکھو انعم، اگر میری بات نہیں مانو گی تو میں بہت برے طریقے سے پیش آؤں گا تم سے۔'' شامی نے انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی تو وہ سہم گئی۔ اتنا تو اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کے غصے سے تھوڑا سا خائف ہو کر بات ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

''اندر رومیصہ ممانی کو بتا دیں کہ میں انعم کو لے کر باہر جا رہا ہوں۔'' شامی نے پاس سے گزرتی ملازمہ کو کہا تو انعم کا چہرہ سپید پڑ گیا۔

''میں ماما کے بغیر نہیں جاؤں گی۔'' وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ شامی کا دل ایک انجانی لے پر دھڑکا۔ اتنے میں رومیصہ ممانی بھی باہر نکل آئیں۔

''ممانی، چلیں آپ اور انعم میرے ساتھ۔'' اس کی اچانک فرمائش پر وہ بوکھلا سی گئیں۔ ویسے بھی جب سے انہیں نویرہ نے بتایا تھا کہ شامی بھائی انعم کو زبردستی کمرے سے نکال کر باہر لان میں لے کر گئے ہیں تب سے ان کے دل کو پنکھے سے لگ گئے تھے۔

''کہاں جانا ہے شامی؟'' انہوں نے گھبراہٹ میں پوچھا۔ انعم بھی ڈر کے ان کا دوپٹا پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''ممانی آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے کیا؟'' وہ دونوں بازو سینے پر باندھے اب انتہائی سنجیدگی سے بولا تو وہ ایک دم گڑبڑا سی گئیں۔

''بیٹا ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''پھر آپ دونوں چلیں میرے ساتھ۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''لیکن یہ انعم کے کپڑے تو تبدیل کروا لوں، تین دن سے ایک ہی جوڑا پہنے گھوم رہی ہے۔'' انہوں نے مزاحمت کی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے، ٹھیک ہے انعم کا حلیہ، آپ لوگ بس چلیں۔'' اپنی بات کہہ کر وہ رکا نہیں

اور پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں ماں بیٹی بھی مرے مرے انداز میں اس کے پیچھے چلنے لگیں۔

تین گھنٹے کے بعد ان تینوں کی واپسی ہوئی تو رومیصہ خاصی مطمئن اور انعم بھی پُرسکون تھی۔ وہ ان دونوں کو ہی اپنے ایک سائیکاٹرسٹ دوست کے پاس لے کر گیا تھا۔ جس کے پہلے ہی سیشن سے دونوں ماں بیٹی کو کافی افاقہ ہوا تھا۔

''کہاں رہ گئی تھیں تم، مجھے چوکیدار نے بتایا کہ شامی کے ساتھ باہر گئی ہو؟'' گھر آتے ہی الماس بیگم ان کی کلاس لینے کو سامنے کھڑی تھیں۔ رومیصہ کا رنگ زرد ہوا۔ اپنی بڑی بہن کے غصے سے اُن کی جان جاتی تھی اور آج کل تو ویسے بھی اُن کا مزاج سوا نیزے پر رہتا تھا۔

''کیوں، میرے ساتھ جانا منع ہے کیا؟'' وہ ایک دم سے اندر آیا اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے بولا۔ الماس بیگم کے غبارے سے ساری ہوا نکل گئی۔ وہ واحد بندہ تھا جس سے وہ کتراتی تھیں اور انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ بھی انہی کے پیچھے ہی آ رہا ہوگا۔ ورنہ وہ یہ تفتیش کا سیشن بعد میں کر لیتیں۔

''میں نے یہ کب کہا؟'' انہوں نے نظریں چرا کر تحمل بھرے انداز میں کہا اور ساتھ ہی ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آن کیا۔

''میں رومیصہ ممانی اور انعم کو اپنے دوست سائیکاٹرسٹ کے پاس لے کر گیا تھا۔ یہ پتا نہیں کس پھٹیچر خاتون سے انعم کا ٹریٹمنٹ کروا رہی تھیں جس کا کوئی نتیجہ ہی نہیں نکل رہا تھا۔'' اس کے نڈر انداز پر الماس بیگم کو اپنے اعصاب جھنجھناتے ہوئے محسوس ہوئے۔

''دو دن بعد پھر جانا ہے ان کے پاس، ہاں کل میں انعم کو بی اے کی کتابیں بھی لا کر دوں گا، اس کو میں خود پڑھاؤں گا، دیکھوں گا کہ کیسے نہیں

حکمت اور معرفت کے انمول موتی

☆ ارشاد رب العزت ہے: اے فرزندِ آدم، روزی کا غم نہ کھا، اس وقت تک جب تک میرا خزانہ بھرا ہوا ہے اور میرا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوگا۔

☆ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے ظالم بادشاہ اور امیر کبیر سے مت ڈر، جب تک میری سلطنت ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے ہے۔

☆ اے فرزند آدم! میں نے سب چیزیں تیرے لیے بنائی ہیں اور تجھے اپنے لیے، پس تو اپنے آپ کو دوسروں کے دروازے پر رسوا مت کر۔

☆ اے میرے بندے! جس طرح میں تجھ سے کل کا عمل نہیں چاہتا، اسی طرح تو بھی مجھ سے کل کی روزی مت مانگ۔

☆ اے میرے بندے جب میں سات آسمان اور عرش و کرسی اور سات زمینوں کے پیدا کرنے سے عاجز نہیں ہوا، اسی طرح تیرے پیدا کرنے اور روزی دینے سے عاجز نہیں ہوں گا۔

☆ اے فرزندِ آدم! جس قدر میں نے تیری قسمت میں رکھ دیا ہے، اس پر راضی رہ اور نفس و شیطان کی خواہشوں سے دل کو مت بہلا۔

☆ اے ابنِ آدم! میں تیرا دوست ہوں تو بھی میرا دوست بن رہ اور میری محبت اور عشق کے غم سے خالی نہ ہو۔

☆ اے ابنِ آدم! میرے غصے سے غافل مت ہو، جب تک تو پل صراط سے گزر کر بہشت میں داخل نہ ہو جائے۔

☆ اے ابنِ آدم! تو مجھ پر اپنے نفس کی مصلحت کے باعث غصہ ہوتا ہے اور اپنے نفس پر میری رضامندی کے لیے غصہ نہیں ہوتا۔

☆ اگر تو میری تقسیم پر راضی ہو جائے تو، تو اپنے آپ کو میرے عذاب سے چھڑا لے گا اور اگر تو اس پر راضی نہ ہوا تو نفس کو تجھ پر مقرر کر دوں گا تا کہ تیرا نفس جانوروں کی طرح تجھے جنگلوں میں دوڑاتا پھرے، مجھے قسم ہے اپنی عزت کی کہ تجھے کچھ حاصل نہ ہوگا مگر اسی قدر جو میں نے تیرے لیے مقرر کیا ہے۔

مرسلہ: عقیلہ حق، کراچی

پڑھتی۔" اس کے پُراعتماد انداز پر انعم سے زیادہ سراسیمگی خود الماس بیگم کے چہرے پر عیاں ہوئی۔

"مجھے نہیں پتا، جو مرضی کرو۔" رومیصہ کو اس کی باتیں اور پریکٹیکل اپروچ اچھی لگی تھی لیکن الماس آپی کے سامنے اس کی تائید کرنا اپنی شامت آپ لانے کے مترادف تھی اس لیے انہوں نے دانستہ خود کو بے پروا ظاہر کیا۔ شامی نے بھی وہاں کھڑے رہنا مناسب نہیں سمجھا وہ اوپر والے پورشن کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ الماس بیگم کے دماغ پر گویا اس کی باتوں کے ہتھوڑے برس رہے تھے۔

☆☆☆

آسمان پر صبح سے پھرنے والی آوارہ بدلی کے تعاقب میں آنے والے بادل ایک دوسرے کے پیچھے اٹکھیلیاں کرنے کے بعد اب پوری قوت سے برس رہے تھے۔ بوندوں کی روانی میں ایک تسلسل سا تھا۔ شرزمہ نے ان سرمئی بادلوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ وہ فرنچ فرائز کی ایک بڑی پلیٹ اپنے سامنے رکھے ٹیرس پر بیٹھی بارش سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ہانیہ صبح سے اسود کے ساتھ اپنے بوتیک کے لیے کچھ سامان خریدنے گئی تھیں۔

"ہیلو سر۔" شرزمہ نے گیٹ کھول کر اندر آتے پروفیسر آفاق صاحب کو دیکھ کر بڑے جوش سے ہاتھ ہلایا۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا لیکن بارش میں اس قدر روانی تھی کہ ان کی آنکھوں کے آگے پانی کا ایک پردہ سا تن گیا۔

"سر موسم تبدیل ہو رہا ہے کہیں ٹھنڈ وٹھنڈ نہ لگ جائے۔" اس کی زبان پھسلی اور اگلے ہی لمحے اس نے زبان دانتوں تلے داب لی۔ اتنے میں پانی میں بھیگے پروفیسر آفاق سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئے۔

"جی اب بتائیں کہ آپ، کیا کہہ رہی تھیں۔" ان کا لہجہ پُروقار جبکہ آنکھوں میں ہلکی سی شوخی جھلک رہی تھی۔

"کچھ نہیں سر ایسے ہی مذاق میں کہا تھا۔" اس نے بوکھلا کر صفائی دی تو وہ زیرلب مسکرا دیے۔

"مجھے اچھا لگا تھا اس لیے پوچھ رہا ہوں۔"

"آپ چائے پییں گے؟" ان کی آنکھوں سے عیاں ہلکی سی شرارت اب شرزمہ کے ہاتھ پیر پھلا رہی تھی۔ اس لیے وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ بارش کی جلترنگ نے ایک خوب صورت سا سماں باندھ دیا تھا۔ وہ وہیں ٹیرس پر بیٹھ گئے۔

"بارش اور چائے کے ساتھ ایک اچھا دوست بھی ہو تو موسم کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔" پروفیسر آفاق نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دی۔ عام سے موضوعات سے شروع ہونے والی ان کی گفتگو ایک اچھی خاصی طویل نشست پر مشتمل ہو گئی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ، فاروق انکل۔" پروفیسر آفاق سے بات کرتے کرتے وہ بڑے پُرجوش انداز میں کھڑی ہوئی۔ اس کی نگاہیں کسی مقناطیس کی طرح گیٹ پر جمی ہوئی تھیں جہاں پیلی ٹیکسی سے نکلتے فاروق انکل کو دیکھ کر ایک لمحے کو تو اسے اپنی بصارت پر دھوکا ہوا۔

"سر یہ انکل فاروق ہیں ناں؟" پروفیسر آفاق نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو کھل کر مسکرا دیے۔

"ارے یہ تو واقعی فاروق صاحب ہیں۔" وہ بھی بے تابی سے کھڑے ہوئے۔

"اُف اٹس اے گریٹ سرپرائز، یہ بارش ہمیشہ مجھے کوئی نہ کوئی اچھی خبر ضرور دیتی ہے۔" اس کے لہجے کی کھنک اس کی اندرونی خوشی کی عکاسی کر رہی تھی۔ وہ بڑے عجلت بھرے انداز میں سیڑھیاں اتر کر گیٹ کی طرف بھاگی۔ اس سے پہلے گیٹ کھولتی کوئی بڑی عجلت میں اندر داخل ہوا۔ بارش کی رم جھم میں وہ اگلے بندے کے ساتھ بری طرح ٹکرائی۔ جس نے اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر زمین پر

گرنے سے بہ مشکل بچایا۔

"کیا ہو گیا ہے بھئی، یہ آپ مجھے دیکھ کر اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہیں؟" اسود نے اپنی گہری آنکھوں کے حصار میں اسے لیتے ہوئے ذومعنی انداز میں کہا۔ وہ تڑپ کر اس کے بازوؤں سے نکلی۔ اس کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ بے ترتیب دھڑکنوں کے ساتھ اس بارش کی پھوار میں وہ ایک دوسرے کے بالکل سامنے کھڑے تھے۔ شرزمہ کا چہرہ سخت شرمندگی کے گہرے احساس سے سرخ ہو گیا۔ وہ سٹپٹا کر گیٹ کی طرف دیکھنے لگی جہاں ہنی فاروق انکل کو اندر لانے کے بجائے وہیں کھڑی بے تابی سے حال احوال دریافت کر رہی تھیں۔

"بھئی ہانیہ، فاروق صاحب کو اندر تو آنے دیں، کیوں بارش میں بھگو کر بیمار کریں گی۔" پروفیسر آفاق پورچ میں کھڑے ذرا اونچی آواز میں بولے۔

"ان کو کس نے کہا تھا کہ ہمیں سرپرائز دینے کی غلطی کریں، اس غلطی کی سزا تو ملنی چاہیے ناں۔" ہنی اب فاروق انکل کو لے اندر آ گئی تھیں۔ وہ بہت پُرجوش انداز میں بڑے جھینپے انداز میں کھڑی شرزمہ سے مل رہے تھے۔

"میری بیٹی نے مجھے مس کیا تھا ناں؟" انہوں نے شرزمہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شفقت بھرے انداز میں کہا۔

"جی انکل بہت۔" وہ ان کے شانوں سے لگی اب اپنی بے ربط دھڑکنوں پر قابو پا چکی تھی۔

"اس لیے تو میں آ گیا۔" وہ ان سب کے ساتھ ہی اندر آئے۔

"بھئی کم از کم مجھے تو بتا دیتے، میں ائرپورٹ پر ڈرائیور کو بھیج دیتا۔" پروفیسر آفاق کا چہرہ اپنے دوست کو دیکھ کر کھل اٹھا۔

"اگر تمہیں بھی بتا دیتا، تو یہ جو اتنے پیارے اور پُرجوش چہرے اور بے ساختہ محبت کا اظہار دیکھنے کو ملا ہے اس سے محروم ہو جاتا۔" انہوں نے تولیے سے اپنے بال خشک کرتے ہوئے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔ اسود نے فضلو کے ساتھ کچن میں اپنی ذمے داری سنبھال لی تھی جب کہ ہانیہ وہیں جم کر بیٹھی ان سے بے تابی سے بارسلونا میں مقیم اپنے فیملی فرینڈز کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ شرزمہ خاموشی سے سب کی گفتگو سن رہی تھی۔

"اُف یہ قربِ قیامت کی نشانیاں نہیں تو کیا ہیں فاروق انکل۔" اسود نے چائے اور بھاری بھرکم لوازمات کی ٹرے ان کے سامنے رکھتے ہوئے مصنوعی لہجے میں صدمے کا اظہار کیا۔

"کون سی نشانیاں برخوردار؟" فاروق انکل کو اپنے دوست کا یہ خوش مزاج زندہ دل بھانجا بہت اچھا لگتا تھا۔

"یہی کہ دو دو خواتین کی موجودگی میں ایک جوان جہان لڑکے کو کچن میں کام کرنا پڑ رہا ہے۔" اس نے دہائی دی۔

"اچھا ہے ناں پریکٹس ہو جائے گی، مستقبل میں تمہیں ہی سہولت ہو گی۔" ہانیہ نے بڑی بے تکلفی سے نگٹس اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"جی نہیں، میں اپنی ہونے والی بیوی کا پہلے ایک کوکنگ ٹیسٹ لوں گا۔" اسود کی شرارت پر سبھی مسکرائے۔

"پھر انشاء اللہ تم کنوارے ہی رہو گے۔" ہانیہ کی برجستگی پر فاروق انکل نے بڑا جاندار سا قہقہہ لگایا جبکہ پروفیسر صاحب بس اپنے مخصوص متانت بھرے انداز میں مسکراتے رہے۔

"اچھی خاصی لیڈی ڈیانا سے ملتی آپ کی شکل ہے لیکن زبان اللہ جانے کس کالے حبشی کی اللہ نے آپ کو لگا دی ہے۔" اسود جل کر بولا۔

"ہاں تو تم باتیں ہی اتنی بے تکی کرتے ہو۔ انٹرویو اور ٹیسٹ تو ایسے لو گے جیسے خود کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں شیف لگے ہوئے ہو ناں!" ہانیہ نے اسے مزید چڑایا۔

"آپ ایسا کریں فاروق انکل ان خاتون کو تو آپ پہلی فرصت میں واپس اسپین لے جائیں، ان کا اور ہمارا گزارہ نہیں۔" اسود خود بھی چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھانا شروع ہو گیا تھا۔

"کیوں، آپ دونوں کا کیا کوئی پرسنالٹی کلیش ہے؟" فاروق انکل نے بھی شرارت کی۔

"بس یوں سمجھیں کہ ہر قسم کا ہی کلیش ہے، بس اب گزارہ نہیں۔" اسود نے شرارتی انداز سے کہا۔

"اور شرزمہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" فاروق انکل نے یونہی پوچھا۔

"وہ تو سیدھی سادی، بھلی مانس، اللہ میاں کی گائے ہیں، جس بھی کھونٹے پر باندھ دو، وہیں بندھی رہیں گی اور اُف تک نہیں کریں گی۔" اس کی آنکھیں شرارت سے چمک اٹھیں جبکہ اپنے بارے میں یہ کمنٹس سن کر شرزمہ بلش ہوئی۔

"بس پھر یوں سمجھو کہ میں بھی شرزمہ کے لیے کوئی اچھا سا "کھونٹا" ہی ڈھونڈنے آیا ہوں۔" فاروق انکل نے ایک سنجیدہ بات انتہائی غیر سنجیدہ انداز میں کی۔ کمرے میں موجود باقی چاروں افراد ہی بری طرح چونکے۔ ہنی کے چہرے پر ایک گہری سوچ کا تاثر ابھرا۔ جبکہ پروفیسر صاحب نے اپنے دل کی اتھل پتھل ہوتی کیفیت کو بہ مشکل سنبھالا جبکہ اسود تو منہ کھولے بس سبھی کے چہرے پر پھیلے تاثرات کو کھوجتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

"یہ تم نے پرسوں آنے والے مہمانوں سے کیا کہا تھا؟" ارسلان دھڑ دھڑ کرتا سیڑھیاں اتر کر بالکل اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ کسی ڈرامے کی اسٹوری میں محو نویرہ نے چونک کر اسے دیکھا جس کے چہرے پر اس قدر رکھائی اور بیگانہ پن تھا کہ ایک لمحے کو نویرہ کو اپنا دل ہاتھوں سے نکلتا محسوس ہوا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اتنے دنوں بعد اس دشمنِ جاں کو دیکھ کر نویرہ کا دل بے ہنگم انداز میں دھڑکا۔

"میرا مطلب وہی ہے جو تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔" ارسلان نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں کسی سے کچھ کہوں۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنی ازلی بے نیازی سے جواب دیا۔

"جھوٹ مت بولو۔" اس کے چیخ کر بولنے پر نویرہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"تمہارے سوا اس گھر میں ایسی فضول بات کوئی نہیں کر سکتا، انہوں نے صاف صاف انداز میں کہا ہے کہ اس گھر کی لڑکی نے انہیں ساری باتیں بتائی ہیں۔" ارسلان کے اندر نہ جانے کون سا الاؤ بھڑک رہا تھا جبکہ اس کے یہ تیور نویرہ کے ہاتھ پیر پھلائے دے رہے تھے۔

"اس گھر میں صرف میں ہی ایک لڑکی تھوڑی ہوں، عبیرہ ہے، انعم ہے اور حرا آپی بھی تو ہیں۔" اس نے خود کو کور کرنے کی ایک ناکام کوشش کی۔

"جسٹ شٹ اپ نویرہ!" اس نے انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی۔ "ایک لفظ بھی مت کہنا۔" ارسلان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"قصور تم لوگوں کا نہیں الماس آنٹی کا ہے، جنہوں نے تمہاری تربیت کرتے ہوئے جھوٹ اور سچ کا فرق نہیں بتایا، تم لوگوں کے نزدیک ہر وہ بات جس سے اپنا فائدہ نکلے، وہ ٹھیک ہے۔ چاہے اس کے لیے ہزار جھوٹ ہی کیوں نہ بولنے پڑیں اور مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔" اس کے تلخ لہجے میں اس قدر تنفر تھا کہ نویرہ کی قوتِ گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے سامنے کھڑے اس شخص کو دیکھتی رہ گئی جس سے اسے دنیا میں سب سے زیادہ محبت تھی۔

(باقی آئندہ)

آفس کے ماحول پر ایک پُراسرار خاموشی طاری تھی۔ فون کی گھنٹی نے ماحول کے سکوت کو توڑ ڈالا۔ ساتھ ہی کاغذات کی پھڑ پھڑاہٹ کرسیوں کی اکھاڑ پچھاڑ......... وہ تیزی سے کرسی پر گھوم گیا اور سامنے ہینگ ہوئے کوٹ کو اٹھانے کے لیے بڑھا...... قریب کھڑے چاق و چوبند اور مستعد سیکریٹری نے فوری ایکشن لیتے ہوئے صاحب کی مدد کی اور کچھ فائلز اور بریف کیس اٹھا کر پیچھے پیچھے

دھوپ میں بارش

تسنیم منیر علوی



چل پڑا...... اسموکنگ زون میں پہنچ کر سیکریٹری نے سگار پیش کرنا چاہا جسے اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا...... باہر باوردی ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ محافظ دائیں بائیں براجمان ہوگئے اور گاڑی چل پڑی۔ ساتھ ہی آگے پیچھے دو اسکواڈ وین بھی روانہ ہوگئیں۔ آپ اس تمہیدِ طولانی سے ذرا بھی پریشان نہ ہوں کیونکہ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے۔ ہر سیاست داں، صنعت کار، مل اونر مختلف چینل کے مالکان سب اسی طرح محوِ سفر ہوتے ہیں...... تو اگر ہم نے حفیظ اللہ پراچہ جو کئی کمپنیوں کے مالک، اشتہاری کمپنی کے اونر اور جانے کس کس پروجیکٹ کے سربراہ ہیں ان کی تصویر کشی کردی تو کوئی اہم بات تو نہ ہوئی ناں۔

آج کچھ خاص ان کے ساتھ معاملہ ہے کہ وہ سگار پیے بغیر کسی پروجیکٹ پر کے بغیر، نہایت جلدی میں روانہ ہوگئے اُن کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ ہیلی کاپٹر سروس شروع کردیں کہ فاصلے سمٹ کر لمحوں میں بدل جائیں...... مگر وہ مجبوراً شہر کی بے ہنگم ٹریفک میں پھنس کر رہ گئے، بے بسی سے انہوں نے آنکھیں موند لیں اور سیٹ سے ٹیک لگالی۔

☆☆☆

میں ''حفیظ اللہ پراچہ'' ایک مڈل کلاس چار افراد پر مشتمل فیملی سے تعلق رکھتا تھا جہاں میری چھوٹی بہن فضا اور ابا، اماں ہوتے تھے...... ابا کی ایک اشتہاری کمپنی تھی پھر میرے ایم بی اے کے بعد میں نے ان کے ساتھ کام سنبھالا اور انتھک محنت سے کئی پروجیکٹ کا مالک بنا۔ فضا ابھی زیرِ تعلیم تھی مگر ایک اچھا اور معقول رشتہ آجانے پر والدین نے رشتے کی منظوری دے دی۔ یوں جلد ہی اس کی شادی ٹھہر گئی۔ والدین اب حج پر بھی جانا چاہ رہے تھے۔ سویوں گھر میں ڈھولک پر تاپ پڑی اور فضا میں شادی بیاہ کے گیت گونج اٹھے۔ دن رات کزن جمع رہتے۔ مایوں مہندی کے لیے زبردست تیاریاں جاری رہیں۔ گھر کو خوب صورتی سے آراستہ کیا گیا۔ تقریبِ مایوں کے لیے مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی۔ دولھا والوں نے وقت کی پابندی کا مظاہرہ کر کے ابا کا تو دل موہ لیا تھا۔ یوں اس رنگ و نور کی محفل میں کیمروں کی چکاچوند نے ماحول کو سحر زدہ کردیا۔ دادی کے اصرار پر فضا کو گلابی جوڑا پہنایا گیا تھا اور سارے کزن پیلے جوڑوں میں ملبوس تھے یوں میری گڑیا سی بہنا کھلتا گلاب لگ رہی تھی...... وہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں سیڑھیاں اتر رہی تھی اور میں اسٹینڈ بائے کیمرے کے ساتھ کھٹا کھٹ تصویر کشی میں مصروف تھا۔ جب فضا کو پھولوں سے سجے اسٹیج پر لاکر بٹھا دیا گیا اور مایوں کی رسومات کا آغاز ہوا تو ساتھ ہی گانوں کا مقابلہ شروع ہوگیا۔ اُدھر مقابلہ دلِ ناتواں نے خوب کیا...... مگر بازی ہمارے ہی ہاتھ رہی۔ دوسرے کزن خالد نے مجھے بھی گھسیٹا مگر میں ان معاملات میں بالکل کورا ہوں سو معذرت کرلی۔ ہاں تصویر کشی میرا شوق ہے اس لیے ہر زاویے سے ماحول کو اپنے کیمرے کی آنکھ میں سمو رہا تھا کہ اچانک قوسِ قزح کے سارے رنگ چرائے وہ نازک ادا، گل پیرہن جلوے بکھیرتی قریب ہی پڑی ایک کرسی پر ٹک گئی۔ کوئی ہار نہ سنگار سادے سے گلابی گھیر دار فراک اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس ایک اپسرا کی طرح بڑے سے جارجٹ کے دوپٹے میں اپنا آپ سنبھالے وہ سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ پھر تو وہ کیمرے کے لینس میں سماتی چلی گئی۔ جانے مجھے کیا ہوگیا تھا۔ میری عادت کے برخلاف...... میں اس جہاں سوزِ حسن میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں جو ہمیشہ نیچر کو کیمرے میں مقید کرتا رہا ہوں...... آج ایک سرسراتے رنگین آنچل میں کھو سا گیا...... شادی بخیر و خوبی انجام کو پہنچی۔

شادی کی ویڈیو میں وہ کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے فضا سے رابطہ کیا۔ تصویریں دکھائیں فضا بھی اس کے حدود اربعہ سے لاعلم نکلی۔

''شاید تمہاری کسی سہیلی کی کزن...... سوچو فضا سوچو۔'' میں نے بے قراری سے اس کے ہاتھ تھامے۔ ''اچھا شاید تمہاری سسرال سے کوئی رشتے داری یا خاور کے دوست کی بہن؟'' جانے میں کیوں اتنا جذباتی ہوگیا تھا کہ اس کو کسی نہ کسی نسبت سے جوڑنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

''بھائی میرے خیال میں وہ کوئی آسمانی مخلوق، میرا مطلب کوئی حور تھی جو اس وقت ہمارے صحنِ خانہ میں اتری اور پھر جلوہ بکھیر کر فضا میں تحلیل ہوگئی۔'' فضا نے میرا تمسخرانہ انداز میں نقشہ کھینچا۔

''اچھا تو تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے...... مگر میں ایسے ہار ماننے والا نہیں، یہ ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے انشاء اللہ معلوم ہوجائے گا۔'' میں نے تسلی کے لیے جیسے دل کو اطمینان دلایا...... دراصل فضا میرے اس تفتیشی انداز پر شاید بری طرح گھبرا گئی تھی۔ اس نے بہانہ تراشا کہ جب گھر رہنے آئے گی تو ساری سہیلیوں سے معلومات کرے گی...... ابھی فی الحال اتنی جلدی کچھ نہیں ہوسکتا۔

☆☆☆

آج چھ سال بعد ہمایوں کی اچانک کال نے مجھے ماضی میں دھکیل دیا کہ وہ ماہ رخ ہمارے شہر میں ہے...... اس لیے میں آج تمام پروگرام اور میٹنگ بالائے طاق رکھتا ہوا آفس سے بھاگ کھڑا ہوا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ آکر چلی جائے اور میں پھول چنتا رہ جاؤں (ادا جعفری سے معذرت) وہ جو میری متاعِ حیات بن گئی وہ اس شہرِ نارسا میں موجود ہے اور میں لاعلم ہوں۔ زندگی کے چھ سال سب کے اصرار پر بھی میں نے شادی سے انکار کردیا اور بے آب و گیاہ ریگستان میں العطش العطش پکارتا زندگی گزارتا رہا۔ والدین میرے سہرے کے پھول

دیکھنے کا ارمان لیے اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ ہمایوں کے پاس پہنچا تو اس کی اطلاع نے مجھے حیران کردیا جب میں اس کی مطلوبہ جگہ پہنچا تو وہ شہر کا ایک مشہور کلب تھا جہاں ایک گلوکاری کا پروگرام تھا۔ ہمایوں مجھے جلد ہی ہال میں لے گیا سامنے اسٹیج پر وہ پری جمال غزل سرا تھی۔ ہال کی خنکی میں بھی میں پوری جان سے پسینے میں شرابور ہوگیا۔ میں دل تھام کر رہ گیا...... میری چھٹی حس آہستہ آہستہ بحال ہو رہی تھی۔ چھ سالہ تلاشِ گوہرِ آبدار کو ڈھونڈنے کے بعد یہ نابغۂ روزگار ہاتھ لگا تو ایک گلوکارہ کے روپ میں۔ میں غزل کے زیر و بم میں گم ہونے کے بجائے اس ناز آفریں کا مشرقی سرسراتا آنچل اور حسین سراپا دیکھنے میں غرق تھا...... اس نے جیسے ہی غزل ختم کی ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ''ونس مور ونس مور'' کا طوفانِ بلا بھی اس کو دوبارہ اسٹیج پر نہ لاسکا۔ میں دیوانہ وار سیٹوں کو پھلانگتا باہر کو لپکا۔ ہمایوں میرے پیچھے پیچھے...... اور جب منتظمین سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو سوائے نام کے کوئی انفارمیشن نہ ملی...... میں پہلے تو اس کا نام سن کر گنگ سا رہ گیا۔

''دُرِ نایاب......!'' واقعی وہ میرے لیے ایک انتہائی نایاب مگر مطلوب شخصیت بن گئی تھی۔

''ہمیں فون نمبر اور ایڈریس دینے کی اجازت نہیں...... ہاں آپ کیونکہ شہر کی ایک معزز شخصیت ہیں اس لیے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ شوقیہ گانے والی ہیں، اپنی گلوکارہ دوست کے اصرار پر ایک غزل سنا کر وہ اسی لیے چلی گئی ہیں اور ان کی رہائش آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں ہے جہاں وہ اعلیٰ تعلیم کے مراحل طے کررہی ہیں۔ فی الحال اب آپ ہمیں معاف کریں۔'' پروگرام کے آرگنائزرز نے بتایا انہوں نے صاف دلی سے معذرت کرلی...... آپ لوگ بھی دل میں ہنس رہے ہوں گے اس گلوبل

ولیج امیج کے زمانے میں جہاں لیپ ٹاپ کمپیوٹر کے دور میں ایک شخصیت کا کھوج کیا مشکل...... مگر جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے وہ دُرِ نایاب جو ہے تو ''ملکوں ملکوں ڈھونڈو نہ پاؤ گے مجھے نایاب ہیں ہم'' کی تصویر ہے وہ۔

دے کر جھلک سی آپ تو پردے میں ہو رہے
اور کہہ گئے نگاہ کو ڈھونڈا کرے کوئی

میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اس پری وش کی تلاش میں صحرا نوردی کر لوں گا...... میرا ویزا تو آسٹریلیا کا لگا ہی ہوا تھا کمپنی کی ایک میٹنگ کے سلسلے میں جانا ہوا تھا سو دوبارہ بھی سفر کر لیتے ہیں...... سڈنی میں ساری یونیورسٹی میں تلاش کے ڈول ڈال دیے...... دُرِ نایاب نام کی ایک پاکستانی دوشیزہ کی نشاندہی ہونے پر انفارمیشن لی تو معلوم ہوا کہ میلبورن کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے چلی گئی ہیں۔ وہاں سے شاید پاکستان کیونکہ معلومات کے مطابق وہ تعلیمی مراحل تو دو سال پہلے مکمل کر چکی ہے۔ اپنی کسی کمپنی کے سلسلے میں آتی جاتی ہے یعنی میں ایک بار پھر گوہرِ مطلوب کو پانے سے محروم رہ گیا۔ ابھی پاپا بھی نہیں تھا کہ اسے کھو دیا...... میں بے نیل و مرام واپس عازمِ پاکستان ہوا...... ایک موبائل نمبر حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی تھی مگر اس پر ٹرائی کرنے پر ایک ہی جملے کی تکرار تھی آپ کے مطلوبہ نمبر پر فی الحال رابطہ نہیں ہو رہا۔

اُف...... سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے۔

پاکستان میں پاپا کی وفات کے بعد میں نے ان کا کاروبار سنبھال لیا تھا فضا جو اب ماشاء اللہ دو پیارے پیارے بچوں کی ماں ہے۔ مجھ سے شکوہ کناں رہتی۔

''بھائی تم اس حور شمائل کا خیال دل سے نکال کیوں نہیں دیتے، دنیا بہت خوب صورت اور وسیع ہے تم نے یہ کیا روگ پال لیا ہے۔'' وہ پور پور درد میں ڈوب جاتی۔ میں کیسے خود کو شکستہ پا سمجھ لوں، ایک لڑکی کی تلاش کیا اتنی دشوار ہو گئی بقول ہمایوں۔ ''یار یہ تو ہمارے لیے انتہائی مطلوب فرد بن گئی ہے۔'' اس نے ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ شخصیت کا نام لیا۔ میں اس تمسخر کو بھی سہہ جاتا لیکن جانے اس دلِ حزیں کو کیا ہوا جو کسی اور کے لیے دھڑکنا ہی نہیں چاہتا۔ دھڑکتا ہے تو اسی مشامِ جاں کے لیے...... میں اپنے تمام وسائل آزما رہا ہوں اور مجھے یقین ہے ایک دن گوہرِ مراد پا جاؤں گا...... ایک ستم اور میری جاں...... ابھی جاں باقی ہے۔

☆☆☆

میں ''دُرِ نایاب'' فیاض علی ایوبی کی اکلوتی بیٹی...... سب مجھے نایاب کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔ میری ماں نے مجھے بڑی احتیاط اور زمانے کی نگاہوں سے بچا کر پالا۔ ان کا خیال تھا کہ میں ایک حسن کی دیوی ہوں اور دنیا غلاظت بھری رہ گزر...... کوئی بری نگاہ نہ پڑے مگر اسے کیا کہیے کہ میرے بچپن میں ہی میری ماں کو ایک موذی مرض مجھ سے جدا کر گیا۔ پھر میں پاپا کی مرکزِ نگاہ بن گئی...... پاپا نے ماما جیسی پابندی کو بالائے طاق رکھا اور مجھے کافی آزادی دی...... میں نے ذہانت کا بڑا اعلیٰ معیار پیش کیا...... حسن و ذہانت نے مل کر میری شخصیت کو دو آتشہ بنا دیا۔ لوگ مجھے زہرہ جبیں، پری وش جیسے خطابات سے نوازتے...... آپ جانتے ہی ہوں گے حسن و ذہانت اور دولت کی چکا چوند کیسے لوگوں کو فیسی نیٹ کرتی ہے۔ میری صورت پر مر مٹنے والوں کو میری بردباری اور پُروقار اندازِ نشست و برخاست نے مل کر میری پوری شخصیت کو پُراسرار سا بنا دیا تھا اور پاپا کے لاڈ و پیار نے مجھے فضاؤں میں اڑنا سکھا دیا تھا ایسے میں میری زندگی میں ارمغان کی انٹری ہوئی۔

موسمِ بہار کی ایک دوپہر میں کالج کے گیٹ سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ رہی تھی کہ ایک گاڑی سے

ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ میں نے خشمگیں نگاہوں سے ٹکرانے والے کو دیکھا، جانے اس کی شخصیت میں کیسا سحر تھا کہ میں بجائے لڑ مرنے کے ایکسکیوز می کہہ بیٹھی مگر وہ جلدی سے گاڑی سے اتر کر سوری، سوری کرتا ہاتھ جوڑتا رہ گیا...... اس کی مسکین صورت دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں اچانک تیز ہو گئیں اور اسی اضطرابی کیفیت میں میری کالج فائل پھسل کر اس کے قدموں میں جیسے آہ و فغاں کرنے لگی۔ میں جلدی سے گاڑی میں جا بیٹھی۔

''بی بی جی اس صاحب کو تو ٹھیک ٹھاک مزہ چکھانا چاہیے تھا آپ مجھے اجازت دیتیں تو ایک آدھ ہاتھ تو جڑ دیتا مگر آپ نے مجھے ہاتھ سے اشارہ کر دیا کہ تم بیٹھو اور گاڑی اسٹارٹ کرو۔ بڑا اسمارٹ سوٹڈ بوٹڈ بن رہا تھا مگر تمیز نام کی کوئی چیز نہیں۔'' زمان بابا بے حد درشت ہو چلے تھے۔

''بابا جی نقصان تو کچھ نہیں ہوا ناں اس لیے خاموشی بہتر ہے۔''

میں اپنے گھر کی بالکونی میں کھڑی اودے اودے نیلے نیلے بادلوں کی آنکھ مچولی انجوائے کر رہی تھی جب ایک میٹلیک گرے گاڑی گھر کے آگے آ کھڑی ہوئی۔ میں نے دل میں سوچا جیسا میں نے چاہا ایسا ہی ہوا...... ہو نہ ہو...... وہ ہی ہو گا...... میں نے بھی کالج فائل جان کر کچھ یوں تو نہیں گرائی تھی۔ آخر معاملہ دل کا جو آن پڑا تھا...... سو یہ بہانہ کام کر گیا اور میں جانے کس کششِ ثقل کے تحت کھنچتی ہوئی تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ گئی اور گیٹ پر جا پہنچی...... جبکہ آنے والا ابھی بیل پر ہاتھ رکھنے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ میں نے گیٹ کھولا۔ چہرے پر مصنوعی تلخ تناؤ ابھرا۔

''اب آپ یہاں تک یعنی مابدولت کے گھر تک آن پہنچے؟ میں سمجھ گئی تھی چھچھورے لڑکوں کی طرح فائل دینے کے بہانے میرا پیچھا کریں گے۔''

''فائل؟'' سیاہ مونچھوں کے نیچے لب مسکرائے۔ ''تو نیور میں بہانے وغیرہ کا قائل نہیں۔ جو کہنا ہے ڈائریکٹ کہنے کا قائل ہوں اور پھر یوں بھلا بے مقصد ایرے غیروں کی بیل کیوں بجاتا۔''

میں نے قدرے خفگی سے اپنی سنہری آوارہ لٹوں کو پرے کرتے ہوئے کہا۔

''ایرا غیرا؟ یہ کیا غیر پارلیمانی لینگویج استعمال

کررہے ہیں؟''
''ویسے یہاں پارلیمنٹ میں کیا نہیں ہوتا۔ جناب پورے ایک ہفتے کی خواری کے بعد یہ جو ہرِ نایاب ہاتھ لگا ہے۔'' اس نے قدرے خوش دلی سے اپنی بات کہہ ڈالی۔
''اُف خدایا...... آپ کو میرا نام، وہ بھی بگاڑنے کی اجازت کس نے دی؟''
''اچھا تو آپ کا نام نامی نایاب ہے۔ واقعی اسمِ بامسمیٰ ہیں۔'' میں تو اس کی نگاہوں کی تپش سے ہراساں سی ہوگئی اور اپنی ساری چالوں کو الٹا پڑتے دیکھ کر۔
''اچھا...... اچھا وہ جو کچھ بھی ہو آپ آنے کا مقصد تو بیان کریں نا۔'' میں نے جلدی سے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔
''وہ مقصود صاحب ہوں گے گھر پر؟'' اس نے بڑے ادب سے پوچھا۔
''جی...... جناب یہاں نہ کوئی مقصود...... نہ انور مقصود اور نہ ہی گوہرِ مقصود......'' میں نے اس کی حالت سے لطف اٹھاتے ہوئے کہا۔
''اچھا شاید مجھے فون پر ایڈریس سمجھنے میں غلطی ہوئی دراصل میں یوکے سے آیا ہوں۔ مقصود صاحب کی بھانجی عذرا آپا نے ایک پیکٹ دیا تھا کہ اسے یہاں پہنچادوں۔'' اس نے مایوسی سے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔
''اوہ نو۔'' میں تو اس کا منہ ہی تکتی رہ گئی۔ میری ساری چوکڑی دھری رہ گئی۔
''اچھا عذرا باجی...... اوہو اچھا خیر آپ اندر آجائیں، میرا مطلب مقصود صاحب ابھی آئے نہیں ہیں...... سوری میں کچھ اور سمجھی تھی۔'' میں نے شرمندگی سے کہا۔
''یعنی کیا؟'' وہ شرارت سے بولا۔
''وہی کل کالج گیٹ پر ایک حادثۂ جانکاہ ہوتے ہوئے بچ گیا تھا۔'' میں نے تفصیل میں جانا چاہا۔
''کون سا حادثہ؟ کیا آپ کے ساتھ کل کچھ حادثہ ہو گیا تھا کہیں چوٹ تو نہیں آئی گوہرِ نایاب صاحبہ؟'' وہ قدرے انجان بن کر بولا۔
''نہیں، نہیں بس...... کچھ نہیں ایک بدتہذیب گاڑی ڈرائیور نے ٹکر ماردی تھی۔ آپ پاپا کا ویٹ کریں گے...... یا پھر کل آجائیں، پیکٹ میں پاپا تک پہنچادوں گی۔'' میرے سارے حربے دھرے کے دھرے رہ گئے جو سوچتی جواب نفی میں آتا۔
''لیکن محترمہ میرا گھر تو اسی علاقے میں ہی ہے فیز 7، غزل ایونیو یہاں سے میں روز گزرتا ہوں سی ویو پر واک کے لیے جاتا ہوں...... ہیلو ہائے ہوتی رہے گی۔'' وہ بے نیازی سے واپس جانے کو مڑا......
یہ کیا ہو رہا ہے جو سوچ رہی ہوں...... وہ نہیں ہو رہا۔
''اچھا تو آپ تشریف رکھیں کچھ ٹھنڈا منگواتی ہوں۔''
''نہیں، میں کولڈ ڈرنک نہیں لیتا۔'' نایاب کی تو جیسے جان چھڑانا مشکل ہوگئی۔
''میرا خیال ہے جناب آپ بھول رہے ہیں یہ پاکستان ہے لندن نہیں...... آپ جو ڈرنک لیتے ہیں وہ ہمارے یہاں ممنوع ہے۔'' میں نے زچ ہو کر بھرپور وار کیا۔ جواب اس سے بھی شاندار آیا۔
''ڈرنک وغیرہ جیسے فضول روگ ہم جیسے لوگ نہیں پالتے۔ ہم تو شربتِ دیدار پیتے ہیں، آنکھوں کے راستے دل میں اترتے ہیں۔'' اس کے اس بے باک جواب نے مجھے الجھا دیا...... وہ بھی شاید اس ہاں اور نہیں کے کھیل سے پریشان ہو گیا تھا۔ ''اچھا ہمیں گھر بھی جانا ہے۔ قصہ ذرا مختصر کرلیں۔ مجھے ارمغان کہتے ہیں۔ میرے اپارٹمنٹ کے برابر والے اپارٹمنٹ میں عذرا باجی ہوتی ہیں۔ ایک پاکستانی فیملی ہونے کی وجہ سے ہماری اچھی ملاقاتیں رہتی ہیں اور بس۔'' وہ اپنے میڈ اِن اٹلی شوز پر تیزی سے گھوم گیا اور میں وہیں ہق دق اس برانڈڈ سوٹ میں ملبوس وجیہہ شخصیت کے حصار میں گھری اس کو جاتا دیکھتی رہ گئی۔
رات پاپا سے ملاقات پر میں نے پاپا سے اس

دراز قد، پُراعتماد اور دھیمی آواز میں بات کرنے والے ارمغان نامی شخص کا ذکر کیا۔
''آپ تو پاپا بڑے گہرے نکلے...... لندن میں اپنی بھانجی سے بڑا رابطہ رکھتے ہیں۔ آج ارمغان صاحب مع ایک عدد پیکٹ تشریف لائے تھے کہ مقصود صاحب کی عزیزہ عذرا صاحبہ نے بھیجا ہے۔''
میں نے جلدی جلدی تعارف مکمل کیا انہوں نے جلدی سے پیکٹ کھولا۔ کچھ فرانسیسی خوشبو...... پاپا کا کیوبا کا پسندیدہ تمباکو۔ کوئی مشہور برانڈ کی چاکلیٹ اور ایک تصویرِ بتاں جو خود آنے والے موصوف کی تھی۔ ایک مراسلہ بھی برآمد ہوا...... پاپا نے سامان تو دوسری طرف رکھا اور خط کو پڑھتے گئے اور جیسے جیسے پڑھتے گئے چہرے پر مسکراہٹ کی قوسِ قزح بکھرتی چلی گئی۔
''اوہ...... شریر کہیں کی......'' میں حیرت سے منہ کھولے پاپا کی شکل دیکھ رہی تھی۔
''نایاب بیٹا وہ نوجوان دیکھنے میں کیسا لگا؟'' پھر ہنستے ہوئے بولے۔
''دیکھنے میں...... وہ بس ٹھیک ہی تھا...... کچھ برانڈڈ سا...... ویسے بائی دا وے پاپا آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' میں نے تجسس بھرے لہجے میں پاپا کی ہنستی آنکھوں میں جھانکا...... پاپا اب ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے۔
''یعنی...... وہ میرا مطلب ہے کہ ہائر کریں یا فائر کریں۔''
''اوہ پاپا...... آپ بھی بس کیسی باتیں کرتے ہیں بغیر ملاقات، جانے بوجھے بغیر فیصلہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' میں نے مدھم سے لہجے میں ہلکا سا احتجاج کیا۔
''تو ایسا ہے میں فون کرتا ہوں کل شام آکر مل لے...... ذرا گپ شپ کرتے ہیں...... عذرا نے بہت تعریف لکھی ہے لندن میں بزنس ہے، پاکستان کا چکر لگا تا رہتا ہے۔ کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کا خواہش مند ہے تو عذرا کو ہماری بیٹی کا خیال آیا۔

کھو گیا

ایسا چلا ہوا کا جھونکا
کہ شمعیں ساری بجھا گیا ہے
محبتوں کی وہ باتیں ساری
اُڑا کے جھرنوں سے لے گیا ہے
جسے سمجھتے تھے ہم متاعِ زندگی
وہ سب ہی رستے میں کھو گیا ہے
اپنے ہاتھوں ڈبو گیا ہے

شاعرہ: سامعہ تبسم، ملتان

حضرت اسی سلسلے میں تشریف لائے تھے چائے پر مدعو کرتے ہیں ہو جاتے ہیں دو...... دو ہاتھ۔'' پاپا کی باتوں پر میں مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔
سچی بات یہ تھی کہ زندگی کے ان سالوں میں دل کسی کے لیے پہلی بار دھڑکا تھا...... شاید شاعر حضرات پہلی نظر کی محبت اسی کو قرار دیتے ہیں۔ میرے لیے دوسرے دن کا انتظار...... ایک طویل انتظار میں تبدیل ہوتا نظر آیا...... طولِ شبِ فراق شاید قدرت مجھ پر واقعی مہربان ہوگئی کہ خود بخود آسمان پر جوڑے بننے کا محاورہ صحیح نظر آرہا تھا......
میں باہر راہداری میں کاؤچ پر جا بیٹھی جہاں ابھی تک اس کی دلکش اور مسحور کن خوشبو بسی ہوئی تھی۔ جانے ظالم نے کون سی خوشبو لگائی تھی کہ ابھی تک مدھم نہیں پڑی تھی...... پھر اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ وہ شام سہانی بھی آگئی، میں نے دھانی چنری کا سادہ سا سوٹ اور ہلکی سی جیولری پہن کر کوئی بھینی خوشبو والا پرفیوم ٹیبل پر تلاش کیا...... کہیں وہ میرے پاس سے آتی چیختی چلاتی خوشبو سے ہراساں نہ ہو جائے...... جاتی گرمیوں کی شام ہے سو میں نے ہلکی سی مدھم خوشبو کا انتخاب کیا جب ہی کال بیل پر اس کی آمد کی اطلاع ملی...... بڑے ادب آداب کے ساتھ پاپا سے مل رہا تھا جیسے انکساری اور حلم کوٹ کوٹ کر بھرا

ہوا ہو۔ مجھے ایک دن پہلے کی شرارت بھری گفتگو یاد آگئی...... اور آج رنگِ آسماں بدلا ہوا تھا...... پاپا نے بڑھ کر استقبال کیا...... پاپا اپنا بزنس میرے شوق، ارمغان اپنا بزنس اور اپنے شوق شیئر کرتا بڑا مؤدب سا لگ رہا تھا۔ کبھی کبھی گاہے بگاہے کن انکھیوں سے ستائش بھری نظروں سے میری طرف بھی دیکھ لیتا۔ پاپا اپنا پائپ لینے کے بہانے اٹھ کر گئے تو موصوف جیسے کھل اٹھے۔

''ہم نے تو ابھی تک سرسوں پھولنے کا محاورہ سنا تھا...... آج یہ معلوم ہوا...... دھانی رنگ بھی پھلتے پھولتے بڑے جاذب نظر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے شاعر لوگ شاید پری وش، شعلہ بدن، ماہ پارہ جیسے استعارے استعمال کرتے ہیں مگر آپ کے لیے میرے پاس الفاظ کم پڑ گئے ہیں گو کہ میں اپنی شاعرہ پھپھو سے بہت قریب رہا ہوں مگر اس وقت آپ کے لیے مناسب الفاظ سوجھ نہیں رہے۔ بہر حال عذرا باجی کا خیال بڑا نیک خیال ثابت ہوا، مجھے مشرقی حسن بہت فیسی نیٹ کرتا ہے اس پر کشمیری چائے سی گلابی نمکین، حسین سی دراز قد حسینہ بڑے سے آنچل میں لپٹی......'' اور وہ جانے کیا کچھ شاعری فرما رہے تھے کہ پاپا مع اپنے پائپ حاضر ہوئے۔

''ہاں تو نوجوان آپ کب تک ہمارے وطن میں مہمان ہیں؟'' مجھے اشارہ کیا کہ اندر جا کر کچھ چائے ناشتے کا بندوبست کروں...... میں اپنے بڑے سے دھانی آنچل کو بانہوں میں سمیٹتی تیزی سے اندر کو لپکی جہاں خانساماں لوازمات ٹرالی پر سیٹ کر رہا تھا۔ میں نے ایک تنقیدی نظر لوازمات پر ڈالی کافی اچھا ارینجمنٹ تھا پائیں باغ سے جلدی سے کھلے موسمی پھولوں کا گچھا ٹہنی سمیت توڑ لائی اور ایک نازک سی بلوری گلدان میں سجا دیا...... ٹرالی جیسے سج سی گئی۔ میں نے کہا۔

''جاؤ اب مہمان خانے میں چائے لے جاؤ۔'' وہ تو ٹرالی رکھ کر واپس لوٹ آیا۔ میں تھوڑے وقفے سے اندر داخل ہوئی تو پاپا کو کمرے میں تنہا پایا...... یعنی وہ آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں۔

''کیا ہوا پاپا؟'' میں نے کھڑکی کے شیشے سے دور گیٹ سے پار بڑی سی ہنڈا اکارڈ جاتی دیکھی۔

''یار نایاب! وہ تمہارے قابل ہرگز نہیں......

وہ ہیرے کو پرکھنے میں بالکل ناکام رہا۔ ہماری دُرِ نایاب کے لیے جو ہر قابل درکار ہے وہ یہ ہرگز نہیں...... عذرا نے لکھا تھا اسے ہر چیز برانڈڈ پسند ہے مگر بیوی وہ دیسی چاہتا ہے۔ بیٹا عذرا غلط سمجھی......

اسے شریکِ سفر بھی......'' میں نے پاپا کو آگے بولنے سے روک دیا...... کیونکہ میں معاملے کی تہ تک پہنچ چکی تھی...... وہ ایک حسن پرست انسان کے ساتھ ساتھ مادہ پرست تھا۔ اس نے پہلے تو سجی ہوئی ٹرالی سے کچھ نہ لیا کہ وہ اپنا پانی تک لندن سے ہمراہ لاتا ہے۔ آئس کریم، چائے، کافی کچھ یہاں استعمال نہیں کرتا۔ ایک ہفتے کی آمد پر اپنا سارا اسٹاک باہر ہی سے لے کر آتا ہے...... جوتے بالی، خوشبو پیرس، سوٹ اٹلی ہر چیز پرفیکٹ بے عیب......''

''پاپا آپ اب کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے بس آپ نے فائر کر دیا تو بس...... ٹھیک ہی کیا ظاہر ہے ایسے کیسے چل سکتا تھا۔'' تو یوں میری ایک دن کی ٹائی ٹینک محبت برفانی تودے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ میں بچ تو گئی مگر جینے سے دل اچاٹ ہو گیا۔ یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ میری زندگی میں آنے والا شاید یہ پہلا اور آخری شخص ہے...... ورنہ تو حسن و دولت کے پجاری تو میرے اطراف شہد کی مکھیوں کی طرح چہار سمت بھنبھنا رہے تھے...... کسی کو میری شخصیت، میری تعلیم، میری نیچر سے کچھ مطلب نہیں، پاپا کا کاروبار اور میرا حسن...... اس دن سے میں نے مردوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا...... میرے لیے

بس وہ چند لمحے ہی کشید ہو سکے اس کے بعد میرے دل نے کسی کے لیے دھڑکنا چھوڑ دیا...... مگر اب کئی سال سے میں دیکھ رہی ہوں کہ حفیظ اللہ صاحب میرے تعاقب میں ہیں...... ویسے تو ان کی ثابت قدمی دیکھ کر داد دینے کو جی چاہتا ہے مگر میری ساری دلنوازی اس ظالم نے چھین لی ہے میں بالکل تہی دست، تہی داماں ہوں...... پاپا اس واقعے کے بعد بجھ سے گئے، اس کے بعد بھی کئی امیدوار میدان میں آئے مگر دل نے کسی کی نہ مانی۔ پاپا کا سارا بزنس میں ہی دیکھتی ہوں۔ جب سے پاپا کو ہارٹ اٹیک ہوا میں آسٹریلیا سے ان کے پاس ہی آگئی ہوں۔ میری متاعِ حیات میرا باپ بسترِ مرگ پر زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا...... اور پھر ایک دن وہ منحوس گھڑی بھی آن پڑی...... کاش میں ان کی محبت کے کچھ قیمتی لمحے زندگی سے اور کشید کر پاتی...... پاپا میرا سب کچھ ساتھ لے گئے۔

اب بھری دنیا میں میرا کوئی نہیں...... خاندان کے لوگ جمع تھے میری قسمت کے فیصلے کے لیے گویا جرگہ بیٹھا تھا۔ ماموں، ممانیاں سر جوڑے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ دور پرے کے چچا مع اپنے صاحب زادے کے بھی دو دن سے براجمان ہیں۔ جن کی شکل آج میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ وہ بھی بڑھ بڑھ کر رشتہ جوڑ رہے ہیں...... گویا مصر کا بازار لگا ہے۔ دام لگ رہے ہیں بولیاں لگائی جا رہی ہیں...... موٹی آسامی جو ہوئی ہر ایک مجھے ''اون'' کرنا چاہ رہا ہے، دور دور تک مجھے اپنا کوئی نظر نہیں آ رہا ہے ایسے میں ایک روشنی کی کرن نظر آئی ایک جگنو سا چمکا۔ شہرت، عزت، وجاہت اور دولت کے باوجود کوئی شخص سالوں سے آپ کی تلاش میں سرگرداں ہو...... تو اس کے لیے سوچنا چاہیے، مجھے اچانک اپنے وجود پر شبنم کی پھوار سی پڑتی محسوس ہوئی اپنے کمرے سے نکل کر میں بڑے ہال میں داخل ہوئی...... سوئم کے بعد سے یہ لوگ میرے فیصلے کے منتظر تھے اس لیے اب مجھے فیصلہ کرنا ہی تھا۔ اس وقت مجھے حسنِ بصیرت اور تدبیر سے کام لینا تھا، میں صوفے کے کنارے پر ٹک گئی اور ایک خاموش نگاہ جمع ہوئے مجمع پر ڈالی۔ ماحول میں ہلکی سی ہلچل مچی پہلے چچا جان نے گلا کھنکھارا۔

''بیٹا نایاب! میں تمہارا چچا ہوں تم میری بیٹی ہو تمہیں میرے ساتھ چلنا چاہیے۔''

''پہلا حق تو ہمارا ہے۔ ہم نایاب کو پھولوں کی طرح رکھیں گے۔'' ماموں اور ممانی بھی بول پڑے پھر تو جیسے سب کو ہی زبان مل گئی۔ اب میرے لیے مشکل گھڑی آن پڑی تھی کہ کوئی ناراض بھی نہ ہو اور میری بات بھی بنی رہ جائے۔ میں نے پہلے سب لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ گو کہ اس وقت جب مجھے تنہائی چاہیے تھی مجھے زندگی کا فیصلہ کرنا پڑ رہا تھا پھر یہ مشکل گویا ہوئی۔

''آپ لوگوں کی محبت کہ اس مشکل گھڑی میں آپ لوگوں نے میرا ساتھ دیا۔ مجھے فی الحال ابھی کسی

خسارہ

انسان بھی عجیب مخلوق ہے، پوری زندگی دوسرے انسانوں کو ہی خوش کرنے کی سعی میں لگا رہتا ہے، کبھی جذبوں کے لیے، کبھی محبت کے لیے، کبھی خوشی کے لیے تو کبھی دولت کے لیے اور ایک لمحہ اس کی زندگی میں ایسا آتا ہے جب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنا وقت، عمر، جذبے اور دولت ایسے ہی ضائع کر دیے۔ اتنی کوشش اتنی محنت اور اتنی لگن اگر انسان اپنے پیدا کرنے والے سے کرے تو یقیناً فلاح کی راہ کا تعین کر لے لیکن ہم انسان بہت نادان ہیں، ہمیشہ خسارے کا سودا کرتے ہیں، مطمئن رہتے ہیں اور اسی کو کل سمجھ کر پوری عمر گزار دیتے ہیں۔

مرسلہ: اُمِ ایمان، کوٹ چھٹہ

کے ساتھ نہیں جانا۔ اس گھر کے چپّے چپّے میں میرے چاہنے والوں کی خوشبو بسی ہے اس سے جدا ہو کر شاید میں زندہ نہ رہ سکوں اور ایسا آپ لوگ ہرگز نہیں چاہیں گے تو فی الحال آپ لوگ بے فکر ہو کر اپنے، اپنے گھر جائیں اگر مجھے ضرورت پڑی تو ظاہر ہے آپ لوگ ہی میرے ہیں، آپ کو ہی مدد کے لیے پکاروں گی۔ ابھی تو میں تنہائی چاہتی ہوں۔ میرے پرانے بااعتماد ملازم بابا میرے ہمراہ ہیں۔ اس کے علاوہ پاپا نے ایک عورت میرے لیے رکھی تھی۔ باہر گارڈ بھی موجود ہے۔ ابھی پاپا کی یادوں کے ساتھ مجھے رہ لینے دیں۔'' اور پھر میں جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ سب نے مجھے تسلی دی اور آہستہ آہستہ مجمع چھٹنے لگا۔

اگلی صبح ایک اداس سی ملگجی سی صبح تھی عام دنوں سے قدرے مختلف...... پھر میں ایک نئے عزم سے اٹھ کھڑی ہوئی، آفس جا پہنچی۔ صبح کا کافی وقت تو تعزیت کی نذر رہا پھر میں نے شام کو ارجنٹ میٹنگ طلب کی، میں آج ہی دفتری امور نپٹا کر حفیظ اللہ صاحب سے ملنا چاہتی تھی تا کہ پھر تمام رشتے داروں کو میری تنہائی ستانے نہ لگے۔ ''ہائے بے چاری یتیم لڑکی'' مجھے ان کے یہ ہمدردی کے الفاظ ہضم نہیں ہو رہے تھے۔

''شام کی میٹنگ میں کچھ فارنرز بھی آ رہے ہیں۔'' سیکریٹری نے اطلاع دی۔ ''سب کو کال کر دی ہے سارا پروگرام ڈن ہے صرف عظیم صاحب کو کچھ مسئلہ ہے۔''

''کیوں...... وہ تو اس پروجیکٹ کو ڈیل کر رہے ہیں؟'' میں نے خفگی سے پوچھا۔

''جی میڈم! کہتے ہیں آنے سے معذور ہوں اہلیہ کو اسپتال لے جانا ہے۔''

''کیا کہا آپ نے؟ کیسا جواز تراش رہے ہیں۔ آج معلوم ہوا کہ وہ معذور ہیں...... خیر چلیں اگر وہ مصروف ہیں تو کم از کم اس مصروفیت کو اپنی معذوری کا نام تو نہ دیتے، وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل نارمل ہیں ان کو یہ لفظ زیب نہیں دیتا۔'' اور سیکریٹری سر جھکا کر واپس پلٹ گیا۔ میں نے کرسی کو گھماتے ہوئے اپنا سر پکڑ لیا کیسے کیسے عقل کے کوروں سے سابقہ پڑا ہے، اتنے میں ملاقاتی بیل ہوئی اور آنے والے سے میں کاروباری معاملات شیئر کرنے لگی...... میری سخت گیری کو لوگ غرورِ حسن سے تعبیر کرتے۔ مگر مجھے ایک صنفِ نازک کے عہدے کا پاس ہے کہ میری نرم خوئی سے کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھا لے اس لیے فاصلہ ضروری ہے۔ پھر میں جس تیزی سے ترقی کے زینے طے کر رہی تھی وہاں کوئی سازش بڑی آسانی سے کی جا سکتی تھی اس لیے میں اس مقولے پر کاربند رہی۔ ''وہ صدی تمہاری تھی...... یہ صدی ہماری ہے۔'' میرے خیال میں مردوں کے اس معاشرے میں اکثر خواتین مالکان کو اپنے گرد سخت گیری کا جالا بُننا پڑتا ہے پھر بھی بعض لوگ نقب لگانے سے باز نہیں آتے...... اب تو پاپا کے بعد لوگ مجھے چارے کی طرح استعمال کرنا چاہ رہے ہیں، ان چار پانچ دنوں میں ہر شخص مجھے شکنجے میں جکڑنے کی تگ و دو میں بازی جیت لے جانے میں مصروف تھا اسی لیے میں جلد سے جلد حفیظ اللہ پراچہ سے ملنا چاہتی تھی۔ فضا کے مایوں میں ان کی بے تابی میں جان گئی تھی، میں آسٹریلیا سے آئی تھی، یمی کو فنکشن میں جانا تھا اس نے زبردستی مجھے بھی گھسیٹ لیا جبکہ میں اَن وانٹڈ گیسٹ بننا نہیں چاہتی تھی اسی لیے بغیر کھانا کھائے پلٹ آئی تھی۔ صبح میری آسٹریلیا واپسی تھی۔ پھر اسے اپنے پیچھے بھاگتے پایا...... محفلِ غزل میں ونس مور کے باوجود ہال میں بیٹھے اس پر نظر پڑتے ہی میں بھاگ کھڑی ہوئی۔

''اُف خدایا! تعاقب ہے یا کوئی مقناطیسی قوت۔''

شام کی میٹنگ اچھی رہی اور میں شام ڈھلے گھر لوٹ آئی۔ آج پہلی بار پاپا کی مسکراہٹ نے میرا

استقبال نہ کیا۔ میں سونی راہداری سے گزر کر اپنے کمرے میں پہنچی اور حفیظ صاحب سے رابطہ کیا...... پہلی بیل پر دوسری طرف وہی تھا۔

''حفیظ صاحب...... میں دُرِ نایاب آپ سے ملنا چاہتی ہوں کیا آپ اپنی مصروفیت سے وقت نکال سکتے ہیں؟'' میں نے سوال کے جواب میں بڑے مہذب انداز میں اس کا جواب سنا۔

''آپ جب چاہیں، ہم حاضر ہو جاتے ہیں۔''

''تو پلیز مجھے آپ کی فوری مدد درکار ہے۔ آپ فوراً پہنچیں۔'' اور میں نے اپنا ایڈریس سمجھا کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور سامنے صوفے پر ڈھے سی گئی۔ یہ وقت بھی آنا تھا کہ دُرِ نایاب کو کسی کی مدد درکار ہو؟ شاید یہ وہی برا وقت کہلاتا ہے کہیں لاشعور میں چھپا ارمغان پھر چھپاک سے باہر آیا۔ پھر وہی کہانی نہ ہو خود غرضانہ، وہی مناظر، وہی کنائے، وہی اشارے دہرانا نہ پڑیں۔

☆☆☆

''حفیظ صاحب ملنا چاہتے ہیں۔'' جب ہی ملازم نے اطلاع دی۔ آج کوئی سائرن بجاتی گاڑی بھی ہمراہ نہ تھی اور شاید گارڈ بھی...... وہ میرے در پر سر جھکائے ایک سوالی کی طرح کھڑا تھا۔ بابا نے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔

''حفیظ صاحب مجھے معلوم ہے اللہ نے آپ کو ہر طرح سے نوازا ہے اور الحمدللہ مجھے بھی کسی شے کی کمی نہیں۔ مگر میں آپ کی ثابت قدمی سے بہت متاثر ہوں۔ اس لیے سوچا آپ کو آزما لوں۔ میرے والد صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے اور ایک صنفِ نازک ہونے کے ناتے جبکہ میں اس لفظ سے الرجک ہوں مگر کیا، کیا جائے بعض بدصورتیوں کو ان کی بدصورتی سمیت قبول کرنا پڑتا ہے۔ ایسے نازک وقت پر جبکہ سب مجھے تر نوالہ سمجھ کر نگلنے کو تیار بیٹھے ہیں مجھے ایک ہمدرد، غم خوار اور ہمراہی کی ضرورت ہے۔ میں کوئی کمزور عورت نہیں، میں تو دنیا فتح کرنے نکلی تھی مگر کیا کروں مجبوری کا نام صبر، میں تو امریکا کی ایمی ملینس جیسی حوصلہ مند، بہادر، مضبوط قوتِ ارادی کی مالک بننا چاہتی تھی مجھے خوف آتا ہے اپنے احباب محترم سے جبکہ ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔'' حفیظ سامنے بیٹھا میرے رخسار سرخ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ بعض جملے سرشاری اور حسرت کا بے پناہ احساس دلاتے ہیں۔ گو بہ گو پھیل گئی بات شناسائی کی۔

''آپ اور ایمی ملینس...... وہ بے شک ایک ناقابلِ شکست عورت ہے بلکہ چیتا عورت، ایتھلیٹکس، فیشن ڈیزائنر اور جانے کیا کیا اس نے اپنے پیر کو بیساکھی نہیں بننے دیا مگر آپ تو میرا مطلب......'' اس کی زبان خشک ہو کر تالو سے چپک گئی۔

''بہ احتیاط محبت تو کی نہیں جاتی
کہ تیری بات تجھی سے کہی نہیں جاتی''

میں نے اس کی حالت دیکھ کر اس کی طرف پانی کا گلاس بڑھایا۔ تو وہ گلاس تھامنے کے لیے جیسے ہی آگے جھکا جانے کیسے پانی چھلک گیا۔ اس نے ہراساں ہو کر میری جانب دیکھا میں گھبراہٹ اور شرمندگی سے اپنے ہاتھ سے پانی کے گرے قطروں کو صاف کرنے بڑھی تو حفیظ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جارجٹ کا گلابی آنچل ڈھلک کر نیچے آن پڑا تھا اور میرا دوسرا ہاتھ کہنی تک اپنا وجود رکھے جھول رہا تھا۔

میں نے جلد ہی اپنے حواس بحال کیے۔

''جی...... حفیظ صاحب اس راز اور معمے سے پردہ اٹھنے کے بعد آپ اگر جانا چاہیں تو اس رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جا سکتے ہیں۔'' مگر اب اس کے بھی اوسان نارمل ہو چکے تھے۔ کچھ دیر میں اسے دیکھے گئی پھر بولی۔

''ماں، باپ نے مجھے بہت حفاظت اور دنیا کی

نگاہوں سے پوشیدہ رکھ کر بڑے اہتمام سے پالا، مجھے اعتماد میں ہمالیہ بنادیا...... مجھے ہمیشہ لفظ معذوری اور اسپیشل سے نفرت رہی...... یہ لفظ احساس دلاتا ہے کہ ہم دوسروں سے کم تر ہیں جبکہ میں خود کو کسی سے کم تر نہیں سمجھتی اسی لیے میں نے امی کا حوالہ دیا اور آپ ذرا چونکے یا مجھے ایسا محسوس ہوا۔ وہ وقت میرے وجدان کا لمحہ تھا جب ہی میں نے اپنا آپ، آپ کے سامنے ظاہر کر دیا۔'' میری آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

☆☆☆

اب بولنے کی باری شاید بلکہ یقیناً میری تھی۔ میری چاہت اس سے اور بھی سوا ہوگئی اہل درد ترستے ہیں اس قرینے کو میں تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔

اپنی معذوریاں ہنر کر لیں
آؤ بیساکھیوں کو پُر کر لیں

کہیں پڑھا شعر میری ذہنی رسد میں جا پہنچا۔

''آپ مجھے دوسروں کی طرح کم ظرف نہ سمجھیں۔'' پھر میرے الفاظ میرا ساتھ چھوڑ گئے...... نایاب کے چہرے پر ایک اطمینان بھری سرمستی چھا گئی۔

''حفیظ صاحب! آپ سوچ لیں، میں ایک تہی دست خاتون ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ رک گئی اور میرے سُتے چہرے پر نگاہ ڈالی۔

''نہیں نایاب صاحبہ، تہی دست اور تہی داماں تو میں ہوں آپ کے تعاقب میں کہاں، کہاں نہیں پہنچا۔'' میرے جملے سے پہلے نایاب نے جملہ مکمل کیا۔

''حفیظ صاحب آپ کے اس تعاقب نے ہی مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔'' اور اسی لمحے میں نے اس کا بے جان لٹکا ہوا گلابی ہاتھ تھام لیا۔

''مجھ میں اتنا ظرف ہے کہ آپ کے ہمراہ شاہراۂ زندگی پر بہ خوبی سفر کر سکوں تہی دست تو وہ لوگ ہیں جو اس دھرتی پر معذوری کی وجہ سے بوجھ بن جاتے ہیں۔ اب تو آپ کو یہ بھی جان کر خوشی ہوگی کہ آٹومیٹک اعضا بہ آسانی مل جاتے ہیں اگر آپ ایسا چاہیں گی تو وہ بھی دستیاب ہو جائیں گے مگر پھر بھی مجھے کہنے دیجیے آپ جیسی ہیں جہاں ہیں مجھے دل سے قبول ہیں قبول، قبول ہیں۔'' نایاب نے اپنی سڈول اور صراحی دار گردن کو اقرار کی صورت نیچے جھکا لیا...... اور میں نے ہاتھ سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

''مجھے آپ سے پیار ہے...... یہ کہنے میں زمانے لگے...... اگر آپ پہلے ہی دن فضا کے گھر سے بھاگ نہ جاتیں تو آج ہمارے آنگن میں اس چاند کی چاندنی بکھرے عرصہ بیت گیا ہوتا...... اور یہ بات آپ کے لیے قابلِ فخر ہو گی کہ مجھے آپ کی یہ کمزوری...... جسے میں کمزوری ہرگز نہیں سمجھتا کیونکہ خدا ایک کمی کے بدلے بندے کو بے شمار خوبیوں سے نواز دیتا ہے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں بقول شاعر

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

ہاں اب میں چراغاں سر محفل چاہتا ہوں...... مجھے یہ بات معلوم ہونے کے بعد آپ کی جستجو اور سے سوا ہو گئی۔'' نایاب نے حیرت سے اپنی شرمگیں نگاہوں کو اٹھایا پھر شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔

''اُف خدایا...... اور میں یونہی سالوں آپ سے خوف زدہ رہی کہ آپ بھی کہیں......'' میں نے آگے بڑھ کر اس کے نازک لبوں پر اپنی انگلی رکھ دی۔

ہم دونوں اپنی، اپنی جگہ سرشار، آنے والے دنوں کی تابنا کی ہماری آنکھوں سے عیاں تھی۔

''اور نہیں تو کیا ورنہ اب تک ہمارے آنگن میں کئی جگنو اپنی ضیا پاشی بکھیر رہے ہوتے......'' معنی خیز مخمور لہجہ...... شوخ انداز...... وہ سمٹ کر اپنے سرسراتے آنچل کو خواہ مخواہ ہی انگلیوں پر گھمانے لگی اسے لگا کڑی دھوپ میں چھما چھم بارش شروع ہو گئی ہے۔

پیاری اماں اور چاند رات

غزالہ فرخ



ارقم کے چہرے پر ہلکا سا تاریک سایہ رینگ گیا پل بھر کو یا پھر اس سے بھی کم ساعت کے لیے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ انہوں نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور پھر جلد ہی وہ نارمل نظر آنے کی کوشش کرنے لگے۔ میرا دل یک دم کٹ سا گیا۔ یوں جیسے کسی نے اسے مٹھی میں لے کر مسلنے کی کوشش کی ہو۔ ارقم، میرے پیارے جیون ساتھی، میرے چاہنے والے شریکِ حیات، میری زندگی اور اس سے جڑی ہر خوشی

ہر تمنا کا محور وہی تو تھے۔ اپنی ازدواجی زندگی کے گزرے برسوں میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بڑا پیار اور مان دیا ہے مگر میں اس ایک دم متغیر ہونے والی ان کی حالت کے لیے بالکل بے قصور تھی۔ وہ اپنی مملکت کے راجا اور میرے دل کے مالک تھے مگر اماں کے گھر میں ان کی حیثیت ثانوی سی تھی... اگرچہ اماں اپنے دامادوں سے بہت پیار کرتی تھیں۔ اماں کے علاوہ میرے میکے میں احمد بھائی تھے۔ شریف النفس اور بے ضرر سے انسان اگر کسی کی دل آزاری نہ کرتے تو بہت عزت افزائی کا بھی طریقہ نہ تھا۔ مجھے احمد بھائی سے کبھی کسی عمل پر کوئی گلہ نہیں ہوا۔ بس میکے میں عزت اور مرتبے میں فوقیت دی جاتی تو مغیث بھائی کو...... ہاں مغیث بھائی میرے بڑے بہنوئی، ارفع آپی کے میاں وہ گھر کے بڑے داماد تھے اور حیثیت اور مقام میں ہم سے بہت برتر۔

☆☆☆

ارفع آپی جب اماں کے یہاں اپنا چاند سا چہرہ لے کر آتیں تو درحقیقت سب طرف اجالا پھیل جاتا۔ اماں بھی اپنے وقتوں میں بہت خوب صورت سمجھی جاتی تھیں مگر جب ارفع آپی دنیا میں آئیں تو سب ہی کہہ اٹھے کہ ”اماں سے دو ہاتھ بڑھ کر ہے“ اماں بتاتی ہیں کہ ارفع کی پیدائش پر آنے والی دایہ بولی تھی۔

”اتنی خوب صورت بچی ہے، بیٹے کے برابر پیسے لوں گی۔“

احمد بھائی ہم دونوں سے بڑے تھے۔ مناسب نین نقش والے عام سی شکل صورت والے لیکن مرد تھے اس حیثیت سے ہی ہمارے معاشرے میں ان کے لیے برتری کا احساس تھا مگر جب ارفع آپی کے بعد میں نے اس گھر کے آنگن میں اپنی انٹری دی تو سب ذرا مایوس سے ہوئے۔ ایک تو دوسری لڑکی اور پھر نارمل شکل صورت کے ساتھ...... کم شکل تو میں بھی نہ تھی اب بھی ذرا ڈھنگ کے کپڑے پہن لوں اور ہلکا سا میک اپ کرلوں تو ارقم کے خیال کے مطابق ملکہ حسن لگتی ہوں۔ یہی بات میں نے ایک دن لاڈ میں آکر ارفع آپی کو سنائی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں یوں ہنسنے سے ان کے گال کا ڈمپل کافی نمایاں ہوگیا اور موتی جیسے دانت چمک اٹھے۔

”اری پگلی کبھی ملکہ حسن بننے کا کوئی ٹیسٹ نہیں دیکھا ایک ایشوریا رائے کے بعد تو سب سیاہ فام لڑکیاں ہی حسن کی ملکہ گردانی جاتی ہیں۔“

خیر چھوڑیں، ان باتوں کو اصل میں، میں بتانا یہ چاہ رہی تھی کہ آج ارقم اور مجھے اماں کی طرف جانا تھا۔ اماں نے کل فون کیا کہ وہ احمد بھائی کی بچی کا عقیقہ کرنا چاہ رہی ہیں، اماں شوشا کے مکمل خلاف تھیں۔ عقیقہ کچا ہی کرنا چاہتی تھیں مگر اس خوشی کے موقع پر دونوں بہنوں کا ہونا تو بہت ضروری تھا۔ ارقم کے دفتر میں کوئی فارن ڈیلیگیشن آیا تھا اس لیے ان کی ڈیوٹی بڑھ گئی تھی۔ اماں کے فون کے بعد میں انہیں جلد آنے کا اصرار کرنے لگی۔ ارقم عام طور پر میری بات آسانی سے مان لیتے، روایتی مردوں کی طرح ان کی منتیں نہ کرنی پڑتیں مگر وہ مجبور تھے۔ اس لیے پس وپیش کرنے لگے اور میرے پاس وہی بیویوں والا روایتی نسخہ میں نے منہ پھلالیا اور بس ضرورت کی بات کرنے لگی۔ نظر ملانے سے احتراز کرتی اور ننھے ارحم کو بھی بلاوجہ ہی ڈانٹ ڈالا۔

ارقم جان گئے کہ پارہ بہت ہی ہائی ہے۔ اس لیے بڑی ہی مشکل سے وہ میرے لیے وقت نکال پائے۔ اپنی سیٹ پر اپنے ایک کولیگ دوست کو بٹھایا اور اسے یقین دلایا کہ جب اسے بیوی کے اصرار پر اس کے میکے جانا پڑا تو وہ اس کی اسی طرح مدد کریں گے۔ اب ارقم تو وقت پر دفتر سے لوٹ آئے مگر میں ابھی یونہی گندی سندی پھر رہی تھی۔ ارحم بھی اپنے اسکول یونیفارم میں ہی گھوم رہا تھا۔ اصل میں دل اتنا برا ہورہا تھا کہ اس کے کپڑے بھی نہیں

بدلے۔ ارقم ہمیں اس حلیے میں دیکھ کر حیران تھے۔

”میں اتنی مشکل سے گھر پہنچا ہوں اور تم لوگ ابھی تک ریڈی نہیں ہوئے؟“

”وہ اصل میں ارقم......“

”کیا ہوا بھئی، میں تو بہت باتیں سن کر آرہا ہوں وہ رحیم تو گا رہا تھا کہ ساری خدائی ایک طرف اور جورو کا بھائی ایک طرف۔“

”وہ ارقم اصل میں آج کی تقریب...... اصل میں کوئی باقاعدہ تقریب تو تھی نہیں بس مل بیٹھنے کا ایک بہانہ تھا بس میں اور ارفع آپی اس کے مہمان تھے اور ان میں سے بھی ایک کو کوئی مسئلہ ہوجائے تو......“

”تو......؟“

”تو پھر انہیں ملتوی کرنا پڑا۔“

”اوہ...... تو کیا مسئلہ ہوا مغیث بھائی کو؟“

”ان کی بس طبیعت اتنی سیٹ نہیں تھی......“

”تو پھر......؟“ اب وہاں مزید رکنا اور کوئی بات کرنا میری اپنی برداشت سے باہر تھا۔ ارقم کا رنگ بدلا تھا اور میں تیزی سے باہر چل دی۔

اگلے روز اماں میری طرف چلی آئیں۔ ایک ہاٹ پاٹ میں کوفتوں کا سالن تھا اور دوسرے میں مٹن اچاری، کچے گوشت کا حصہ تو تھا ہی الگ۔

”اماں آپ کھانا بنا چکی تھیں تو ہمیں مدعو کرہی لیتیں آپ کا بھی کیا کرایا ضائع گیا۔“ مجھے اس پچویشن پر دکھ ہوا۔

”دیکھو اسریٰ، مغیث بڑا داماد ہے اس کی طبیعت کا بھی تمہیں پتا ہے۔ اگر چڑ کھا جاتا تو پھر؟“

اسی وقت میرے دل میں خیال آیا کہ اگر ایسا ہی خیال ارقم کے ذہن میں جاگزیں ہوتا تو پھر...... مگر اماں کافی دنوں کے بعد میرے گھر آئی تھیں اور میں اس وقت کو طعنوں تشنوں میں ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی بھی تو اماں کے لیے چائے بنانے کچن کی طرف چل دی۔

☆☆☆

میرا بیٹا ارحم اپنے پاپا کی طرح ہی صلح جو سا بچہ تھا۔ ضد کم ہی کرتا تھا بلکہ چھوٹی دونوں بہنوں کو بھی بہلا لیتا تھا۔ علینہ اور صبرینہ البتہ تنگ کرنے والی بچیاں تھیں۔ دونوں تھیں بھی جڑواں، رونا شروع کردیتیں تو اکٹھے ہی راگ الاپنے جاتے۔ بھوک لگتی تو مل کر ہی صدائے احتجاج بلند کرنے لگتیں۔ ارقم اچھی جاب پر تھے اور ان کے ابا کی پراپرٹی سے کرایہ بھی آتا تھا۔ ہمارے حالات میں تنگی بالکل نہ تھی مگر میں ہاتھ روک کر خرچ کرتی۔ نوکر، ملازموں پر بھی زیادہ انحصار نہ کرتی۔ بچیوں کے لیے آیا نہیں رکھی البتہ گھر کے باقی کاموں کے لیے ملازمہ تھی کبھی مشکل وقت آتا تو ارقم ہی میری مدد کرتے۔ ارحم اپنی نانی اماں کا بھی لاڈلا بچہ تھا مگر وہاں جب ارفع آپی کے بچے آجاتے تو اماں کی توجہ بٹ جاتی۔ ارفع آپی کے دونوں شہزادے اپنے ڈیڈی کی طرح چھا جانے اور اپنی منوانے والے تھے۔ ارفع آپی بھی اُن کے سامنے ذرا ڈری سہی رہتیں۔

☆☆☆

”ماما، آپ آئیں گی ناں؟“ ارحم کے اسکول میں کوئی تقریب تھی۔ اس روز بھی وہ پوچھ رہا تھا۔

”بتاؤ ان بچیوں کو کہاں چھوڑوں گی بیٹا؟ تم اپنے پاپا کے ساتھ چلے جانا۔“ مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے پروگرام سے خوش نہیں ہوا مگر وہ صورتِ حال کو سمجھ چکا تھا لہٰذا بس خاموش ہوگیا۔ ارقم ہنسے۔

”دیکھو تمہیں شوہر بھی تابعدار ملا اور بیٹا بھی۔“

”بس اب زیادہ نہ اترائیں جناب۔“

”چلو یوں کرتے ہیں میں آج آفس دیر سے چلا جاتا ہوں۔ بچیوں کو میں دیکھ لوں گا تم ارحم کے ساتھ چلی جانا۔“ ارحم کی آنکھوں میں مشعل سی جل اٹھی۔

”ماما چلیں گی ناں؟“ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور میں نے اسے بڑھ کر سینے سے لگالیا۔

☆☆☆

"اماں آپ نے پھر وہی گلاس نکال لیے۔ آپ کو کہا تھا ناں کہ اسٹینڈ والے گلاس منگوالیں۔" ارفع آپی اماں کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہہ رہی تھیں مگر پھر بھی ان کی آواز کو میں سن پائی تھی۔

"مغیث سوفٹ ڈرنک ایسے سیدھے سادے گلاسوں میں نہیں پیتے۔"

"اچھا بھئی، نمرہ کو کہوں گی اب اچھرہ جائے تو لے آئے۔" اچھرہ بازار کے نام سے ارفع آپی کے چہرے کے تاثرات بدلے مگر بس چپکی ہو رہیں۔ آج ہم دونوں بہنیں اماں کے گھر مدعو تھیں۔ ارفع آپی نارنجی اور سیاہ پھولوں والے سوٹ میں خوب جچ رہی تھیں۔ ان کے دونوں بیٹے ساتھ نہیں آئے تھے۔ وہ اپنے کسی مشترکہ فرینڈ کے پاس ڈے اسپینڈ کرنے گئے تھے۔ میرا ارحم میرے ساتھ تھا۔ اگلے روز نانی اماں کے گھر جانے کا پروگرام ہوتا تو اسے تو خوشی سے رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ آج فرہاج اور وہاج نہیں آئے تھے تو اماں اس سے خوب لاڈ کر رہی تھیں۔ یوں بھی احمد بھائی کی گڑیا سے اس کی خوب دوستی تھی۔ احمد بھائی کو اللہ کی کریم ذات نے ایک بچی ہی دی تھی مگر چندے آفتاب چندے مہتاب تھی۔ سب کہتے کہ بڑی پھپو پر پڑی ہے۔ میری بیٹیوں سے بھی اس کا خوب پیار تھا۔ یوں بھی فرہاج اور وہاج بہت لیے دیے رہنے والے بچے تھے۔ نانی کا گھر ان کی کلاس سے میچ نہیں کرتا تھا تبھی وہ یہاں خود کو خوش نہ رکھ پاتے۔

اس روز کھانے کی ٹیبل پر سجا کھانا دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ تین ڈشیں بنی ہوئی تھیں اور چاول الگ سے مگر ارقم کی پسندیدہ ڈش کوئی نہ تھی۔ ویسے تو ارقم ہر شے صبر و شکر کر کے کھا لیتے مگر آج کا اہتمام صاف طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ مغیث بھائی کے لیے کیا گیا ہے۔ اس لیے وہ ذرا چپ سے ہو گئے تھے۔ پتا نہیں کسی کو احساس ہوا یا نہیں مگر میرا دل تو ارقم کی ایک، ایک رگ اور انداز سے واقف تھا۔ سوئٹ ڈش البتہ دیسی اسٹائل کی تھی گھر کی بنی ہوئی کھیر۔ ڈائٹ کانشس مغیث بھائی نے تو بس ایک چمچ ہی کھایا مگر ارقم نے جم کر کھائی اور نمرہ بھابی کی تعریف بھی کی۔

"یہ اپنی نند صاحبہ کو ایسی کھیر بنانے کا طریقہ سکھا دیں بھابی۔"

"اچھا میں کھانا صحیح نہیں بناتی؟" میں ٹھنک کر بولی۔

"میں نے کھانوں کا ذکر کب کیا ہے میں تو......"

"اچھا پھر بازار سے لا کر کھانا کھایئے گا۔"

میں سراسر روٹھ گئی۔ نمرہ بھابی ہنستے ہوئے بیچ بچاؤ کروانے لگیں۔ ہماری نوک جھوک شاید ارفع آپی اور مغیث بھائی کو اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"چلیں۔" ان کے یہ لفظ بولنے کی دیر تھی کہ آپا بیگ کاندھے پر ڈالے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یوں جیسے حکم کی غلام...... میں تو ارقم کے جانے کا کہنے پر بھی واپسی پر آدھا گھنٹا لگا ہی لیتی اور دروازے پر کھڑے ہو کر اختتامی گفتگو پر پندرہ منٹ کا اصراف الگ۔ ارقم مذاق میں ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے اور میں سنی ان سنی کرتی۔ اسی روز واپسی پر گاڑی خراب ہوگئی۔

"ارقم گاڑی بدل لیں ناں۔"

"میری لاٹری نہیں نکلی بھئی۔"

"جو گاڑیاں بدلتے ہیں ان کی کیا لاٹری نکلتی ہے؟"

"اور تو کسی کا مجھے نہیں پتا، مجھے تو اس کا ہی انتظار کرنا پڑے گا۔" میرا دل دکھ سا گیا۔ میں کہنا نہیں چاہتی تھی مگر نہ جانے کیوں میری زبان سے آپوں آپ ہی پھسل گیا۔

"ارفع آپی کی گاڑی دیکھی ہے؟" ارقم کی یک دم متغیر رنگت سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ میں نے دانستہ ارقم کی جانب دیکھنے سے گریز کیا اور آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

وقت کا کام تو گزرنا ہے وہ تو گزر ہی جاتا ہے

دبے پاؤں بنا آہٹ کیے۔ ہمارے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ ارقم نے اپنے بچوں کے لیے کسی شے کی کمی نہیں رکھی تھی۔ ارحم کو میٹرک پاس کرنے پر نئی بائیک بھی لے کر دی تھی اور بچیوں کو بھی ان کی خوشی کا ہر سامان دیا۔ میں ہر وقت خدا کے حضور سربسجود رہتی کہ اس کی کریم ذات نے مجھے ارقم جیسا شریکِ حیات دیا تھا۔ ہم بے تکلف دوست تھے۔ وقتاً فوقتاً چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہماری زندگی کو بے رنگ ہونے سے بچاتی تھیں۔ میرا ارحم بھی اپنے باپ ہی کی طرح پیار کرنے والا بچہ تھا۔ اسکول کے دور سے نکلا اور کالج کی وسیع اور مختلف زندگی میں قدم رکھا تو اس میں بھی تبدیلی آ رہی تھی۔ وہ اپنے لباس کے بارے میں بہت محتاط ہو رہا تھا۔ بالوں کے اسٹائل بھی بدلتا اور......اور سب سے بڑی بات کہ نانی کے گھر جانے کے لیے ہر وقت کسی بہانے کا متلاشی۔

احمد بھائی کی گڑیا ماشاء اللہ بہت حسین و جمیل ہوگئی تھی۔ آج کل میٹرک کا امتحان دے رہی تھی۔ تبھی تو میں ان دنوں اماں کی طرف جانے سے احتراز کر رہی تھی مگر ارحم میری جان کو آ گیا۔

"ماما، نانی اماں کی طرف چلیں ناں۔"

"نہیں......گڑیا کے پیپرز ہو رہے ہیں وہ ڈسٹرب ہوگی۔"

"اس نواب زادی کی خاطر ہم اپنی نانی سے نہ ملیں۔"

"میں احمد بھائی کو فون کر دوں گی اماں کو لے آئیں چند روز کے لیے۔"

"مگر پھر نمرہ مامی......"

"ارحم مجھے یہ بتاؤ کہ تم اداس کس کے لیے ہو رہے ہو؟" ارحم ہنسا، اس کے چہرے پر کتنے ہی قوسِ قزح کے رنگ پھیل گئے۔

"کچھ نہیں۔" وہ بولا اور نظریں چرا کر باہر نکل گیا مگر بے تابی عروج پر تھی۔ تبھی اگلے ہی دن کاغذوں کا ایک دستہ لیے چلا آیا۔

"ماما نانی اماں کی طرف چلیں، اصل میں آج مجھے میتھس کے زبردست نوٹس ملے ہیں آپ کی لاڈلی کا بھلا ہو جائے گا بہت ڈرتی ہے ناں وہ میتھس سے۔ ہوّا بنا کر رکھا ہے اس نے۔ ان گیس پیپرز پر چلے گی تو لڑھکتی ہوئی پاس تو ہو ہی جائے گی۔"

رات کو ارقم کے کچھ کولیگ کھانے پر آ رہے تھے میں کافی مصروف تھی چاہتے ہوئے بھی جانے کا وقت نہ نکال پائی۔ ارحم کا یہ جذبہ جنون دیکھا تو اسے اکیلے جانے کی اجازت دے دی۔ ارحم کالج اپنی موٹر سائیکل پر ہی جاتا تھا نانی اماں کا گھر اتنی دور بھی نہیں تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ یوں دیوانہ سا ہوا جا رہا ہے ذرا دیر سے لوٹے گا مگر وہ بہت جلد ہی واپس آ گیا اور کاغذ بدستور اس کے ہاتھ میں تھے۔

"کیا ہوا ارحم، گھر میں کوئی نہیں تھا؟"

"تھے ماما سب تھے۔" وہ ذرا بجھ سا گیا تھا۔ میں نے کچھ نہیں پوچھا مگر وہ بھی میرا پیارا ارحم تھا رات سونے سے پہلے ... خود ہی چلا آیا۔

"بڑی خالہ نے گڑیا کے لیے فرہاج کا میتھس کا ٹیوٹر لگوا دیا ہے ماما۔ وہ گھر آ کر اسے تیاری کروا رہا ہے۔"

"اوہو......اچھا ہی ہوا اصل میں ارحم لڑکیاں ایسے ہی خوفزدہ ہو جاتی ہیں ان حسابی کلیوں سے میں خود بڑی گڑبڑا جاتی تھی اور......"

"ماما نمرہ مامی نے تو بڑی خالہ کے بھیجے سر کے لیے ایسے چائے کی ٹرالی سجائی تھی کہ......" وہ میری بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ سہ پہر نانی اماں کے گھر کا وہ نظارہ اس کی آنکھوں میں بسا ہوا تھا اور اسے غمگین کر رہا تھا۔

وقت تھوڑا سا اور سرکا تھا مگر سارے کردار اور تمام واقعات تقریباً اسی طرح رہے تھے۔ ہم اپنے گھر، اپنے گلشن میں بہت خوش اور مگن تھے مگر جب کبھی ارفع آپا کے ساتھ ... مڈبھیڑ ہوتی تو جیسے کم مائیگی کا احساس خود بہ خود ہمارے خیالات کو پراگندہ کر دیتا۔ اماں بہت ضعیف ہوگئی تھیں کئی طرح کی

بیماریوں نے آن گھیرا تھا مگر نمرہ بھابی اور احمد بھائی کی خدمت اور ازحد توجہ نے انہیں سنبھالے رکھا تھا۔ نمرہ بھابی واقعی احمد بھائی کے لیے بہترین انتخاب تھیں۔ احمد بھائی، نمرہ بھابی کے لیے مثالی شوہر سہی مگر وہ ہر بات میں اماں کی بات کو ہی اولیت دیتے تھے اور بھابی کی طرف سے اس بات کا کوئی منفی ردِعمل بھی نظر نہ آتا۔

انہی دنوں فرہاج کی شادی کا غلغلہ اٹھا تھا۔ شادی اپنے ہی پائے کے خاندان میں ہو رہی تھی۔ مغیث بھائی ہی کی طرح امیر اور رئیس گھرانا ڈھونڈا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ خوشی کا موقع ہے ہم دونوں کی کلاس اور اسٹینڈرڈ میں ضرور فرق ہے ورنہ تو ہم دونوں سگی بہنیں ہیں اور کوئی کلیش بھی نہیں تبھی تو آپی کو مبارک باد کے لیے فون کردیا۔ میرا خیال تھا کہ آج کل آپی کو تو مصروفیت نے گھیرا ہوا ہوگا۔ ایک پاؤں بازار اور ایک گھر میں، پتا نہیں کس طرح بات کر پائیں گی مگر میں حیران ہوئی کہ آپی تو بالکل ہی فارغ تھیں۔

''مجھے کیا کرنا ہے بھئی...... ماہی کے ڈریسز کے لیے ایک ڈیزائنر ہائیر کی ہے ہم نے، اس سے ماہی کی اپائنٹمنٹ ہوتی ہے۔''

''مگر آپی آپ کی پسند، فرہاج کی بری تو آپ کی پسند سے بننی چاہیے ناں۔''

''ارے اسریٰ یہاں ہمارے گھروں میں ایسا نہیں ہوتا بھئی۔ تمہارے مغیث بھائی نے ایک بہت معروف میرج پلانر کو کونٹیکٹ کیا ہے شادی کا ہر ایونٹ وہی پلان کرے گا۔''

''مگر آپی ویسے کا ڈریس اور...... اور......''

''ارے پاگل سی لڑکی مجھے بھلا ان کے اسٹینڈرڈ کے مطابق لباس کی کیا سمجھ...... میں تو اس ڈریس ڈیزائنر کی سٹنگز میں بھی نہیں ہوتی۔'' کہاں تو آپی بلند و بانگ باتیں سنا رہی تھیں کہاں یک دم ہی ان کا لہجہ لرز گیا۔ لفظ ڈول گئے اور وہ میری بہن تھیں میں جان سکتی تھی کہ اس ستارہ چہرے پر سجی ان خوب صورت آنکھوں کے جگنو بجھ گئے ہوں گے۔

ارفع آپی کے لہجے کا کھوکھلا پن میرے وجود کے اندر خود اعتمادی کی لہر سی دوڑا گیا۔ میرا گھر میری جنت جس کا ایک پتا بھی میری اجازت اور رضا کے بنا نہ ہلتا تھا۔ ارقم اپنی ماہانہ تنخواہ میرے ہاتھ پر رکھ کر بری الذّمہ ہو جاتے بلکہ میں ان کا جیب خرچ بھی انہیں خوب تنگ کر کر کے دیتی مگر آپی اتنے برس اس گھر میں گزار کر بھی اس گھرانے کا اہم فرد نہیں بن سکی تھیں۔ اپنی خوش شکلی کی بنا پر وہ اس گھر میں تھیں محض ایک ڈیکوریشن پیس کی طرح۔

آپی کے مقابلے میں برتری کے جس احساس نے کچھ دنوں کے لیے میرے دل میں جگہ بنائی تھی وہ احساس جانے کہاں کس اتھاہ میں جا سویا جب میں نے فرہاج کی شادی پر آپی کی تیاری دیکھی۔ اپنے بوتیک کے بیش قیمت کپڑوں اور نازک سے مگر ڈائمنڈ کے سیٹ میں اور کسی شہرۂ آفاق پارلر سے تیاری کے بعد وہ کسی بھی طرح دولہا کی اماں تو نہیں لگ رہی تھیں مگر ان کا رول بس گیٹ پر کھڑے مہمانوں کو مسکرا کر ملنا ہی تھا۔ شادی کے تمام فنکشنز میں وہ بس ایک سجی سنوری سی مورت لگ رہی تھیں۔

آپی نے میری دونوں بچیوں اور احمد بھائی کی گڑیا کو بھی مایوں اور مہندی کے لیے ایک جیسے ڈریس بنوا کر دیے تھے۔ میری بچیاں تو بس میری ہی طرح پُرکشش لگ رہی تھیں۔ گڑیا پر وہ قیمتی کپڑے خوب بہار دکھا رہے تھے۔ شاید تمام مہمانوں میں آپی کے بعد گڑیا ہی سب کی توجہ کا مرکز بنتی مگر وہ ذرا دبی سی اتنے عالیشان ہال میں مجمع میں میری بچیوں کے ساتھ کارنر کی ٹیبل میں گھسی رہی اور کسی کا تو میں کیا جانتی میری نگاہوں کے حصار میں تو میرا پیارا ارحم تھا جو جذبۂ شوق اور بڑی محویت سے گڑیا کو تکتا رہا۔

''یاالٰہی میرے بیٹے کی خواہش کو پورا کرنا۔'' میرے دل سے دعا نکلی۔

شادی کا مرحلہ تو ختم ہوا یوں بھی ہم سب وہاں مہمان اداکار ہی تھے۔ دولہا کے قریبی رشتے دار ہونے کے باوجود نئے سمدھیوں سے ہمارا تعارف تک نہیں کروایا گیا تھا۔ ارقم بھی مارے باندھے اس تقریب میں جاتے اور کھانے کا لقمہ منہ میں جاتے ہی واپسی کا تقاضا کرنے لگتے۔

اماں نے بیماری کی باوجود اس شادی میں شرکت کی تھی۔ اماں کا لاڈلا نواسا تقاریب کے ضروری مواقع پر اماں سے ذرا جھک کر پیار لیتا اور بس۔ میں نے دیکھا کہ اماں اور بھابی نمرہ نے اس شادی پر پرانے اور استعمال شدہ کپڑے پہنے تھے ہاں البتہ آپی کو نانکی چھک کے نام پر خوب صورت لباس سے نوازا گیا تھا مگر ان تحفوں کی بھلا اس شادی میں کیا حیثیت تھی مگر میرا دل خوش تھا کہ اس ایک ہفتے کی تقاریب میں میرا ارحم گڑیا کی سنگت میں بہت شاداں تھا۔ میں نے اس کی محبت بھری نظروں کے پیام کا جواب گڑیا کی جھکتی پلکوں اور لرزتے لبوں میں دیکھ لیا تھا اور میں جلدی ہی کسی اچھے موقع کا انتظار کر رہی تھی۔

☆☆☆

قدرت ارحم پر مہربان تھی تعلیم ختم ہوتے ہی اچھی نوکری مل گئی تھی۔ اس کا میرٹ اس کے کام آیا ہوگا مگر فرم کے مالک مغیث بھائی کے قریبی دوست نکلے تبھی تو۔

''ہیلو نمرہ بھابی۔''

''ارے اسریٰ تم...... ٹھیک تو ہو؟''

''جی بھابی، اماں کیسی ہیں اور بھائی؟''

''سب ٹھیک ہیں۔ تم سناؤ سب طرف خیریت ہے؟'' مجھے جانے کیوں محسوس ہوا کہ نمرہ بھابی بات کو ختم کرنا چاہ رہی تھیں۔ اصل میں آج میں اماں اور

محتاط لمحے

بہت محتاط لمحوں میں
فقط اِک پل کو سوچو تم
ہمارے خون کے رشتے
ہمارا خوں کیوں پیتے ہیں
ہماری زندگی لے کر
وہ اپنے کل میں جیتے ہیں
زنجیریں ڈال کر پاؤں میں
خود آزاد پھرتے ہیں
لگی لپٹی سنا کر بھی
ہمارا دل جلاتے ہیں
پھر خوش حال رہنے کے
ہمیں گُر بھی سکھاتے ہیں
رشتوں کو محبتوں کی ڈوری میں پروتے ہیں
تو دوسروں کے کہنے میں آ کر
پھر کیوں ان کو کھوتے ہیں
بہت محتاط لمحوں میں
کبھی اِک پل کو سوچو تم
زندگی کے رشتے جو
وفا کی علامت ہیں
جفا کے روپ میں ڈھل کر
وہ کیوں اک قیامت ہیں
شاعرہ: شبنم میر، سیالکوٹ

احمد بھائی کی فیملی کو اپنے گھر مدعو کرنا چاہ رہی تھی۔ ارحم کی نوکری لگی تھی اور اسی موقع پر میں احمد بھائی سے ان کی گڑیا کا ہاتھ...... مگر نمرہ بھابی جلدی میں تھیں۔

"نمرہ بھابی آپ جلدی میں ہیں یا کوئی آیا ہے؟"

"ارے نہیں اسریٰ، اصل میں اماں نے ارفع آپی کے خاندان کو شادی کی دعوت دی ہے اُدھر کی تیاری ہے۔"

"ہوٹل جارہے ہیں؟"

"ہاں، ہم نے مغیث بھائی کی پسند اور اسٹینڈرڈ کا ہوٹل ڈھونڈا ہے۔ وہاں پر ہیڈ بہت زیادہ تھا۔ اماں کہنے لگیں کہ آج ان سب کو بلالیں پھر کسی روز مل کر ہم سب......" مجھے یوں لگا کہ جیسے نمرہ بھابی کو یک دم احساس ہوگیا کہ وہ ہمارے بِنا ہی کوئی پروگرام...... بس اپنا تو دل ٹوٹا مگر پیچھے مڑ کر تکنے کا یارا نہیں ہوا۔ میں جانتی تھی کہ وہیں بیٹھے ارقم ہی نہیں ارحم کے چہرے پر بھی کیسے زلزلے کے آثار ہوں گے۔

☆☆☆

کافی دن میرا اماں کے گھر سے رابطہ نہیں ہوا۔ ہاں البتہ ارفع آپی سے فون پر دو ایک دفعہ بات ہوئی۔ ان کا نیا شادی شدہ جوڑا ابھی مختلف ممالک میں گھوم رہا تھا تبھی اب تک آپی کو اندازہ نہیں ہوا تھا کہ ماہی عادت و اطوار کی کیسی ہے۔ آپی کو گھر میں خاموشی اور تنہائی کا احساس تنگ کررہا تھا تبھی انہوں نے ایک جم میں داخلہ لے لیا تھا۔

رمضان کی آمد، آمد تھی ان دنوں میں عبادتوں میں بھی تیزی آتی اور کچن کا کام بھی بڑھ جاتا ہے۔ ماہِ رمضان کی آمد پر دل مسرتوں سے معمور ہوجاتا۔ سحرا اور افطار کے وقت بچیاں میری مدد کرتیں اور ہم بڑے اہتمام سے سب تیاریاں کرتے مگر جانے کیوں میرا دل بجھا سا تھا۔ میں ارقم اور بچوں کو بتائے بغیر اپنی اور ارحم کی خواہش اماں کے گوش گزار کرچکی تھی۔ احمد بھائی سے بات کرنے میں جھجک سی محسوس ہوئی۔ اماں کے لیے میرے دل میں بڑے شکوے ہوتے بس یوں لگتا کہ اماں اپنی بیٹیوں سے محبت کا ترازو برابر نہیں رکھ پاتیں۔ آپی کی حیثیت انہیں بلندی پر لے جاتی مگر جب دل کی بات کہنے کا وقت آیا تو اماں ہی یاد آئیں۔ مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ اماں کیا چاہتی ہیں بس میں نے اپنا مدعا بیان کردیا اور صاحب سلامت پر بات ختم ہوگئی اور اس کے بعد میں اماں کے فون کے انتظار میں تھی، بے کلی سی ہورہی تھی کسی کام میں من نہیں لگ رہا تھا۔

میں تب چھوٹی تھی مگر مجھے یاد ہے کہ ارفع آپی کا رشتہ مغیث بھائی کی طرف سے آیا تو وہ خوشی سے باؤلی سی ہوگئی تھیں۔ اصل میں مغیث بھائی اور ان کی مام آپی کے اسکول میں بزمِ ادب کی تقریب میں مہمانِ خصوصی بن کر آئے تھے۔ ٹیبلو میں آپی کو شہزادی کا رول دیا گیا تھا۔ ان کے بے تحاشا حسن کے سامنے وہ دل ہار گئے تھے اور ان کی مام سوالی بن کر ہمارے گھر آن رہی تھیں۔ تب اماں کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا اور اب میرے اس پیام پر اُدھر سے مکمل خاموشی تھی اور میں جیسے ان کی طرف سے ہاں اور نہ کے منجدھار میں پھنس گئی تھی۔

رمضان المبارک کا مہینہ اپنے اختتام پر تھا۔ احمد بھائی کی طرف سے اس پورے مہینے میں کوئی فون، کوئی اطلاع نہیں آئی۔

رمضان کا آخری عشرہ چل رہا تھا کہ احمد بھائی کا فون آگیا۔ میرا دل زور سے دھڑکا مگر احمد بھائی کی طرف سے صرف یہ دعوت تھی کہ اس دفعہ چاند رات پر ہمیں اماں کے گھر کھانے پر جانا تھا۔

"مگر بھائی، اماں تو عید ملن عید کے دوسرے روز مناتی ہیں۔"

"اصل میں اسریٰ، ارفع کا اس دفعہ بیرون ملک جانے کا پروگرام ہے عید کے بعد ایک ہفتہ فیکٹری

میں کام نہیں ہوتا تو وہ عید کی شام کو فلائی کرجائیں گے اسی لیے......"

"ٹھیک ہے بھائی۔" میری آواز آپوں آپ بوجھل ہوگئی مگر یہ اہتمام ہر سال ہوتا تھا اور مجھے جانا ہی تھا۔ بچیاں سن کر پریشان ہوئیں۔

"ماما ہم تو چاند رات چوڑیاں چڑھاتے ہیں، مہندی لگواتے ہیں اور...... اور جوتے بھی......"

"سب کچھ ہوگا بیٹا مگر سب سے پہلے نانو کے گھر جائیں گے اس کے بعد ساری رات اپنی ہے۔" اس بے وقت دعوت کی وجہ بھی ارقم جانتے تھے مگر پھر بھی نارمل انداز میں بچیوں کو سمجھا رہے تھے۔

☆☆☆

فرہاج اور ماہی تو اس دعوت میں شریک نہیں تھے۔ البتہ ارفع آپی، مغیث بھائی اور دہاج ہم سے پہلے ہی اماں کے گھر میں موجود تھے۔ مجھے حیرت سی ہوئی کیونکہ جب کبھی ہم احمد بھائی کے گھر گئے مغیث بھائی کا انتظار ہی کرنا پڑا۔ بچے باہر برآمدے میں تھے۔ ارحم اور میری بچیاں بھی انہی میں مل گئیں۔ ہم دونوں کمرے میں گئے۔ یوں لگا جیسے کوئی اہم کانفرنس ہورہی تھی یک دم خاموشی ہوئی مگر اگلے ہی لمحے اماں بولیں۔

"ارقم بیٹے اصل میں آج ارفع بیٹی، احمد کی گڑیا کے لیے اپنے دہاج کا ہاتھ مانگنے آئی ہے۔ میں ابھی یہ بات کررہی تھی کہ ایسی ہی خواہش کا اظہار اسریٰ بھی کرچکی ہے ارحم کے لیے۔" ارقم کے لیے یہ انکشاف چونکا دینے والا تھا مگر میں نے ان کی طرف نہیں دیکھا۔ میرا دل لرزا، آپی کے پروپوزل کے سامنے بھلا ہمارے اس حقیر رشتے کی کیا حیثیت۔

"احمد بیٹا اب تم ہی فیصلہ کرو۔" احمد بھائی یک دم اٹھ کھڑے ہوئے بلکہ یہ کہتے ہوئے باہر کو چل دیے۔

"اماں گڑیا کے ہر فیصلے کی آپ مجاز ہیں۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" احمد بھائی باہر کو چلے تو نمرہ بھابی بھی ان کے پیچھے چل دیں۔ میں نے سر جھکالیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ میں جس بات کو صیغۂ راز میں رکھ کر مکمل کرنا چاہتی تھی وہ معاملہ تو جیسے یوں سرِ عام بلکہ چوراہے پر آن پڑا تھا۔

میرے کانوں نے سماعت کی طاقت کھودی تھی۔ میں اس عجب سی کیفیت سے واپس آئی۔ واقعی چہرے پر ہلکا سا تاریک سایہ رینگ گیا تھا پل بھر یا پھر اس سے بھی کم ساعت کے لیے چہرے کا رنگ بدلا تھا اور...... اور...... مگر یہ سب ارقم کے ساتھ نہیں تھا بلکہ مغیث بھائی......!

☆☆☆

کھانا کھانے اور پھر واپسی تک بڑی خاموشی تھی پھر جیسے سب چونکے تھے۔ اماں، ارفع آپی کو بہ آواز بلند سمجھا رہی تھیں۔

"دیکھو ارفع میں نے گڑیا کے لیے یہ بہتر جانا کہ میں نے تمہارا رشتہ بڑے گھرانے میں کرکے جانا کہ رشتے اپنے ہی برابری والوں میں ہوں تو بہتر ہے۔ مجھے اسریٰ کی زندگی تم سے بھی مکمل لگتی ہے اور میرا احمد...... وہ سادہ سا شخص وہ تمہارے گھرانے کے ساتھ پورا نہیں اتر پائے گا اور سب سے بڑی بات کہ ارحم اور گڑیا کے ایک دوسرے کے لیے جذبات...... بس بیٹا تم باقی خود سمجھ جانا۔"

مغیث بھائی، آپی اور دہاج خاموشی کے ساتھ سر جھکا کر واپس جارہے تھے۔ انہیں کل ہی بنکاک کے لیے فلائی کرنا تھا اور ہم اپنی گاڑی میں بچیوں کو لے کر بانو بازار کی طرف جارہے تھے۔ انہیں چاند رات منانا تھی۔ ارحم اپنی بائیک پر دوستوں کی طرف چل پڑا تھا اور ہاں ہماری پچھلی سیٹ پر گڑیا بھی تھی۔ اس کے لیے عید کا جوڑا ابھی لینا تھا اور چوڑیاں اور چپل بھی۔ ماں کی ممتا اور ترازو اپنی اولاد کے لیے یکساں ہی ہوتا ہے بس ہم بچے نادانی میں غلط سوچ لیتے ہیں۔

ناولٹ

سلوشن

سائرہ رضا

جون کے مہینے میں نیویارک سٹی کے سر پر ٹکا سورج کینہ توز نگاہوں سے برگد کے سائے میں بینچ پر براجمان فرحت حسین اور نو پر شرما کو تکتا تھا...... درخت کا گھنا ٹھنڈا سایہ تمازت کی انا پر کاری ضرب کی طرح تھا۔ یہاں اس کی ہٹ دھرمی کا یہ عالم تھا کہ وہ صبح پانچ بجے نکل آتا تو رات نو بجنے پر بھی نہ چاہتے ہوئے واپسی پر آمادہ ہوتا۔ تمام دن ہر شے پر اپنا تسلط جمالیتا، کونوں میں گھس جاتا، درزوں میں بیٹھ جاتا، کھڑکیوں اور روشن دانوں سے چپک جاتا۔

فرحت حسین اور نو پر شرما اپنی تیسری دوست ایبی فوسٹر کی منتظر تھیں۔ فرحت اپنے بیٹوں زین اور حسن کے ہمراہ مقررہ وقت پر پارک آ پہنچی تھی۔ نو سال کے جڑواں بیٹے سائیکل چلا رہے تھے نو پر چونتیس برس کی جوان عورت تھی۔ وہ بلو جینز پر وائٹ سلیولیس شرٹ میں ملبوس تھی۔ ماتھے پر بال گرے پڑے تھے اور گدی خالی...... اس کے بائیں ہاتھ میں بریسلیٹ اور انگوٹھی تھی۔ ماتھے پر درمیان میں سندور کے نام پر سرخ لکیر کھنچی تھی، وہ سلونی رنگت اور بے حد اسمارٹ سراپا رکھنے والی پُر کشش عورت تھی۔ اس نے بینچ کے قریب پہنچ کر فرحت کو اٹھنے کا موقع دیے بغیر خود ہی جھک کر احتیاط سے گلے ملنے کی رسم پوری کی پھر اس کے گال سے اپنا گال جوڑ کر 'اوم ما' کی آواز سے ہوائی بوسے لیتے ہوئے اس کے پیٹ کو دو انگلیوں سے چھوا۔

''کیسا ہے تمہارا واٹر بول، تم نے کنفرم کرلیا ناں' ایک ہی ہے ناں؟'' اس کا انداز شریر تھا۔

''میں نے سب سے پہلے یہی کام کیا تھا۔'' فرحت نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا دونوں کی نگاہیں جُڑواں زین اور حسن پر تھیں۔ پھر دونوں ہنس پڑیں۔

''تم کیا بہت دیر سے آئی ہوئی ہو؟'' نو پر بیگ پیروں کے پاس رکھ کے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

''نہیں، اتنی زیادہ دیر بھی نہیں پر یہ ایبی کہاں رہ گئی؟''

''اسے اس کے کچھ فینز مل گئے، ہم اکھٹے ہی نکلے تھے۔'' نو پر نے دور داخلی راستے کو کھوجا۔

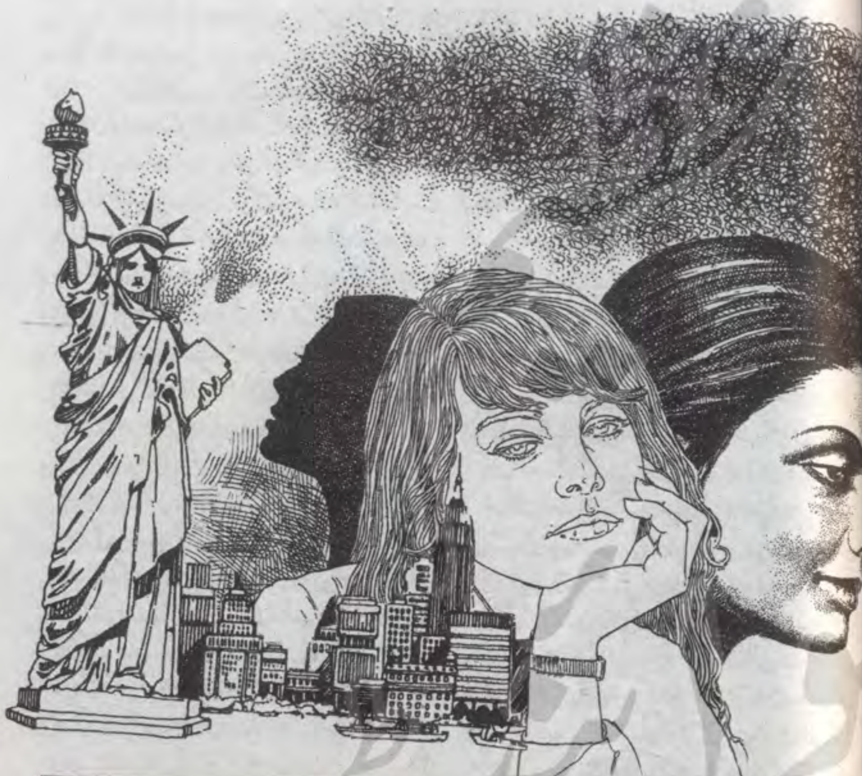
''ایک ایبی اور ایک اس کے فینز......'' فرحت ہنس دی۔

''ہم نہیں مانتے پر فرحت' وہ بہت اچھا گاتی ہے۔'' نو پر کا انداز خود کو بھی اطلاع دینے والا تھا۔

''یقیناً پر مجھے کم از کم اس زندگی میں تو سمجھ میں نہیں آسکتا جو وہ گاتی ہے، لوگ جھومتے ہیں اس کی تانوں پر......''

''وہ آرہی ہے دیکھو اُدھر......'' نو پر کی بات پر فرحت نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔

''یا اللہ......'' ایبی فوسٹر دور سے ہاتھ ہلاتی دھرتی کو دہلاتی ڈولتی آرہی تھی۔ وہ بہت گہرے فیروزی رنگ کے لانگ گاؤن میں ملبوس تھی۔ جس پر بڑے بڑے گلابی پھول بنے تھے پیٹ پر ہم رنگ کپڑے کی بیلٹ کَسی تھی۔ سر کو فیروزی پلین رومال نما اسکارف سے اس طرح ڈھکا ہوا تھا کہ وہ ایک بڑی ٹوپی کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ کان باہر تھے جن میں بہت بڑے پیلے رنگ کے چاند کی شکل کے آویزے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں رنگ برنگی مالائیں اور منکے کڑے پڑے تھے اس نے اپنا بیگ بہ مشکل سنبھال رکھا تھا، دوسرے ہاتھ میں ڈھیروں شاپنگ بیگز تھے۔ وہ



ان کے نزدیک آتے ہی بینچ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ پرس اور بیگز پہلے ہی گھاس پر چھوڑ دیے تھے۔

''کبھی خود کو تم بہت بڑی فنکار ہو اور جہاں کہیں رک جاتی ہو۔ میں تنگ ہوں تمہارے ان پرستاروں سے .... اگر کوئی پاگل کا بچہ تمہیں روک بھی لیتا ہے تو تم کم از کم ڈیسنٹ ہو جاؤ' دھیمے سے تھینک یو بولو اور نکل آؤ...... مگر نہیں تم تو جب تک اُس کے اگلے پچھلوں کو کھنگال نہ لو سکون نہیں ملتا۔ اسی لیے میں تمہارے ساتھ نکلنا نہیں چاہتی تھی۔'' نو پر پھٹ پڑی۔ ایبی نے تحمل سے اعتراضات سنے اور پھر دل کھول کر مردانہ انداز میں قہقہہ لگایا۔

''تم مجھ سے جیلس ہو۔'' اس نے اپنا مخصوص جملہ کہا۔

''ارے بھگوان!'' نو پر نے آسمان پر ملتجی نگاہیں ٹکائیں۔

''اسے چھوڑو تم کیسی ہو فرحت حسین اور یہ تمہارا بے بی ہے؟''

''فرسٹ کلاس میں بھی اور بے بی بھی۔ تم پانی پیو اور سانس بحال کرو۔'' اس نے بوتل آگے کی۔

''میرے پاس ہے۔'' ایبی نے اپنے بیگ سے بوتل نکالی اور گردن پیچھے ڈھلکا کر بوتل منہ سے لگالی۔

''ٹھہر کر، سانس الجھ جائے گی۔'' فرحت نے تادیب کی۔ ''میرے خیال میں ساری سمر شاپنگ آج کرلی گئی ہے؟''

''ہم نے تمہاری بے بی کے لیے بھی شاپنگ کی اور سچ فرحت......'' نو پر نے فرحت کی ران پر اپنا نیل پالش سے سجا سلونا ہاتھ رکھ دیا۔

"بہت خوشی ملی بہت سکون...... ممکن ہوتا تو پورا ایبی ہی...... پورشن خرید لیتے۔"

"ہوں ہوں......" ایبی نے بوتل منہ سے ہٹا کر تائید کی، فرحت نے ایبی کو بغور دیکھا اس کا صرف نام مختصر پیارا اسمارٹ تھا۔ خود اس میں ان میں سے کوئی گُن نہیں تھا۔ وہ سرتاپا ایک موٹا آئٹم تھی۔ بھدی، موٹے موٹے پیر، موٹے کولہے جو کمر تک چڑھ گئے تھے جیسے انعام یافتہ کدو، پیٹ فرحت کے پیٹ سے زیادہ مستقل، بڑے بڑے ہاتھ نسوانی حسن وزنی تربوزوں سے مشابہ موٹے ہونٹ، موٹی بڑے بڑے نتھنوں والی ناک، موٹے پپوٹوں والی بڑی آنکھیں گال کی دونوں ہڈیوں پر بدہیت ٹیٹوز گول بڑا منہ اور اس پر سیاہ رنگ۔ وہ ہوٹل کے ڈائننگ ہال کی پسندیدہ افریقی سنگر تھی...... اور لوگ (صرف افریقی یا کچھ امریکی) اس کی سنگنگ کے دیوانے تھے۔ وہ فرحت اور نوپر کو کئی بار اپنے گانے سنوانے لے گئی اور سمجھایا کہ وہ بہت اچھا گاتی ہے تم سنو اور سمجھو...... اس کا دل رکھنے کو وہ انکار نہیں کرتیں مگر پھر بھی ساری رات پین کلر اور چائے، کافی کے سہارے گزرتی۔ اب دونوں کا بھلا کیا قصور...... نوپر، لتا جیسی گلوکارہ کی پرستار تو فرحت، نور جہاں، نیرہ نور اور ٹینا ثانی جیسی سریلیوں کی دلدادہ...... سُر تو ایبی کے بھی بہت پکے اور اونچے تھے بلکہ صرف اونچے تھے۔ وہ اتنی اونچی تانیں اُڑاتی کہ انہیں گمان ہوتا اگلی سانس نہیں آئے گی۔ اس کے ساتھ بجانے والوں کا جوش وخروش بھی دیدنی ہوتا اور ایبی کا تو حال ہی کیا، وہ اپنی لے پر خود ہی جھومتی اور تھرکتی ہولا ہولا لا...... او...... او...... اور میوزک انسٹرومنٹس ایسے جیسے قلعی گر کی دکان پر پیتل کے برتن بج رہے ہوں۔ جنگلا لالا ہو ہو...... وہ اپنے آپ کو کسی پرانی افریقی غاروں والی فلم کا کردار پاتیں اور اس پر ایبی پھولی سانسوں کے ساتھ سینہ اکڑا کے پوچھتی کیسا......؟ فرحت اور نوپر ایک دوسرے کی آنکھوں میں بے چارگی سے جھانکتیں پھر یک زبان بولتیں۔ "بہت اچھا...... بہت خوب......" سن کر سر دھننے والے پاگل...... بجانے والے پاگل اور ایبی کا حال ہی کیا...... وہ جوش و بے خودی میں مائیک اسٹینڈ سمیت اٹھا کر اسٹیج پر دندناتی حد یہ کہ مائیک نوچ جھومتی جھامتی آڈینس پر اچھال دیتی...... زیادہ تر وہ پرانے افریقی روایتی فوک سونگز گاتی۔ بے خودی کا انداز گائیکی کی مہارت اور بہت خالص انداز حاضرین جھوم جھوم جاتے۔ وہ گزشتہ سات برس سے اس فلور کی مالک تھی اور خوب کماتی تھی۔ عزت، شہرت اور دولت اس کے جُثّے اور رنگ و روپ سے قطع نظر موٹے سیاہ ہونٹوں کے پیچھے بے حد چمکدار سفید دانت...... جب وہ ہنستی یا مسکراتی تو چہرے پر روشنی، سادگی، بے ریائی اور خلوص پھیل جاتا...... یہ سادہ مسکراہٹ ہی فرحت کی اس سے دوستی کا باعث تھی۔

دراصل قصہ یوں تھا۔ ان تینوں کی ملاقات اس برنس ٹاور کی لفٹ میں ہوئی جس کے مختلف حصوں میں یہ تینوں مختلف فرائض ادا کرتی تھیں۔ بظاہر ان کا کوئی تال میل نہیں تھا، زبان، رنگ روپ، کلچر، مذہب تو دور ان کے تو خطے ہی ایک دوسرے کا الٹ تھے۔ ایبی فوسٹر سنگل مدر تھی وہ افریقہ کے کسی دور افتادہ پسماندہ علاقے کی پیدائش تھی، جو بیس برس قبل سولہ برس کی عمر میں اپنے شوہر کے ہمراہ امریکا آبسی...... شوہر کے انتقال کے بعد اس نے ایک طویل تنہا زندگی گزاری اور امریکا جیسے ملک میں ایک تنہا عورت کیسی زندگی گزار سکتی ہے؟ ایبی ان تمام مرحلوں سے چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی گزری۔ تیرہ برس بیشتر اس نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ کی تیسری انگلی میں انگوٹھی سجالی۔ فوسٹر اسی فلور کا ڈرمر تھا۔ اس نے بہت جامع منصوبہ بندی سے ایبی کے لیے راہیں ہموار کیں اور ابھی وہ ایبی کی کامیابیوں کی جھلک ہی دیکھ رہا تھا کہ ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہوگیا۔ ایبی کی گود میں تین برس کی لینی تھی اور وہ ایک بار پھر تنہا مگر اس بار وہ دنیا جھیل چکی تھی۔ وہ شہر کے راستوں سے انجان نہیں تھی۔ اس کے پاس ایک گھر بھی تھا۔ بینک بیلنس بھی، ایک رتبہ بھی، اب زندگی میں خوشحالی اور ایک مقصد تھا لینی...... لینی کا مستقبل اس کی پرورش، اس کے لیے ڈھیروں خواب اور خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے اب وہ کسی کی محتاج نہیں تھی۔ فقط محنت اور نتیجہ حسبِ منشا......

☆☆☆

دوسری جانب نوپر شرما تھی۔ اس نے اپنے پتی کا چہرہ پہلی بار تب دیکھا جب وہ اس کے ماتھے پر ننھی بندیا کو اٹھا کر چٹکی بھر سندور اس کی مانگ میں بھر رہا تھا...... مرد کی عمر نہیں دیکھی جاتی اس لیے وہ پچاس کے ہندسے کو چھو رہا تھا۔ مرد کی شکل بھی نہیں دیکھتے اس لیے کوئی حیرانی نہیں تھی۔ کالا کلوٹا چار بالوں کو جبراً ماتھے پر جمائے اونچا لمبا، بے ڈھنگا ضخیم شحیم مرد کا صرف پیسہ دیکھا جاتا ہے اور وہ اس کے پاس خوب تھا۔ وہ کومل جیسی نازک نوپر کو اپنی بغل میں دبوچ یہاں لے آیا تھا۔ نوپر بارہ جماعت پاس تھی۔ اس کی انگلش اتنی اچھی جو سو میں سے ساٹھ نمبر دلوا سکے بندہ پاس مگر وہ یہاں آکر فیل ہوگئی وہ ریت رواجوں میں پلی مشرقی کنیا تھی اور کمار ایک کوا جو اپنی چال بھی بھول چکا تھا۔ وہ بے تحاشا پیتا پھر اسی حساب سے بکتا جھکتا اور اسے بلاوجہ پیٹتے پیٹتے جب نشے سے بے حال ہو جاتا تو اسی کا بستر بنا کر سو جاتا کوئی اس کی فریاد سننے والا نہیں تھا اسے کیا کرنا ہے، کیا کہنا ہے وہ ان سب سے انجان تھی۔ زبان، راستے، لوگ سب اجنبی اور جو اپنا بن کر اس کے ساتھ رہ رہا تھا وہ سب سے بڑا دشمن...... کمار، شکی تھا، خبطی اور جھکی بھی، وہ دروازے میں تالا ڈالتا پر روشن دان پر چٹخنی بھی نہیں تھی۔ نوپر نے اسی کو پھلانگا اس کے ساتھ دو بچے تھے...... سمت اور سونی...... آگے معاملہ سیدھا ہو گیا اسے واپس نہیں جانا تھا اسے یہیں رہنا تھا۔ اس نے ری ہیبلیٹیشن میں سکونت اختیار کی۔ ہنر سیکھے تعلیم حاصل کی اور برنس ٹاور کے سپر اسٹور میں منیجر کے عہدے پر پہنچ گئی۔ اسے امریکا کے راستے اب اس طرح ازبر تھے کہ ٹیکسی ڈرائیونگ کا لائسنس مل سکتا تھا۔ وہ آزاد ملک میں آزاد شہریت کے مزے لوٹتی، کمار کے ساتھ گزارے چار سال جیسے ایک ڈراؤنا خواب تھے۔ اس کے اندر کی صلاحیتیں امنڈ کر باہر آرہی تھیں چودہ سالہ بیٹا ہاسٹل میں رہتا اور بے فکری سے پڑھائی کرتا۔ گیارہ سالہ سونی اس کے ساتھ رہتی۔ امریکی قانون کے تحت کمار کو ہر ماہ ایک ہینڈسم اماؤنٹ ان تینوں کو دینا پڑتا۔ نوپر کو پیسے کی پرابلم نہیں تھی مگر اب اسے زندگی میں ایک ساتھی کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔ کمار نے اس کی جوانی کی جس بیل کو نوچ پھینکنے کی کوشش کی تھی اس بیل نے دوبارہ جڑ پکڑلی تھی۔ نوپر ہری بھری ہو چکی تھی۔ اس کا جوبن سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ وہ کہیں سے بھی چودہ سالہ بیٹے کی ماں نہیں لگتی تھی۔ اس بار چوائس اس کے ہاتھ میں تھی سو اس نے مرد کی شکل بھی دیکھی ہینڈسم سیکسی مین اسے عمر نے ایسے عذاب میں مبتلا کیا تھا کہ شرما اس سے تین برس چھوٹا تھا۔ ہاں اس کے پاس پیسہ نہیں تھا اور نوپر کو اس کی طلب بھی نہیں تھی۔ اسے بس ایک مرد چاہیے تھا جو اسے چاہے اسے سراہے، اسے موم کی گڑیا کی طرح چھوئے جو بس سرگوشیوں میں اس کا نام پکارے جو کمار کے ہاتھوں نچنے والے اس کے بالوں میں نرمی سے انگلیاں پھیرے بس اور کچھ نہیں...... اور اس دفعہ اسے یہ سب مل گیا تھا۔ شرما اس کے پیسے پر عیش کرتا اور اس کے ان بے ضرر سے خوابوں کو پورا کرتا مگر مرد دھوکے کا بیوپاری ہوتا ہے اور اس کی سب سے بڑی خریدار عورت...... خواہ جتنی مرضی دکانیں بدل لے یا مول لگالے اسے نئی پیکنگ تو مل جاتی مگر مال وہی پرانا...... اور اس بار تو نوپر کے ساتھ زیادہ برا ہوا تھا...... یا نہیں...... شاید ہونے والا تھا...... پتا نہیں۔

☆☆☆

فرحت کا معاملہ الحمدللہ سیدھا تھا۔ وہ اور اس کا شوہر جدہ کے امریکی اسپتال میں نرسنگ کے فرائض انجام دے رہے تھے، بہترین کارکردگی کی بنا پر پروموشن ہوا اور وہ یہاں ٹرانسفر کر دیے گئے۔ ان کا اسپتال اسی طویل المنزلہ برنس ٹاور کے ایک حصے پر پھیلا ہوا تھا۔ حسنِ اتفاق ... فرحت، نوپر اور ایبی کی ٹائمنگ ایک تھیں۔ رسمی مسکراہٹ سے بات ہیلو ہائے سے بائے تک پہنچی اور کب دوستی پیدا ہوئی پتا بھی نہیں چلا۔ نوپر اور فرحت کے لیے زبان مسئلہ نہ تھی وہ بخوبی ایک دوسرے کو سمجھتیں تو ادھر ایبی کچھ نوپر کی بدولت اور کچھ اتنے سالوں تک مختلف ہوٹلوں میں کام کرنے کے باعث ٹوٹی پھوٹی اردو، ہندی کا مکسچر بول اور سمجھ لیتی تھی۔ فرحت نوپر سے دو برس چھوٹی تھی۔ وہ گدرائے ہوئے جسم اور گندمی رنگت والی قبول صورت عورت تھی۔ دو بیٹے تھے اور اب ایک بار پھر تخلیقی کے عمل سے گزر رہی تھی۔ ہفتہ دس دن میں ڈلیوری متوقع تھی۔ وہ

کچھ پیچیدگیوں کے باعث اسپتال سے رخصت پر تھی تقریباً ایک ماہ سے تینوں کی ملاقات نہیں ہو پائی تھی سو آج ویک اینڈ پر ایبی اور نوپر کا شاپنگ کا پلان تھا۔ فرحت اپنے بیٹے ساتھ لائی تھی۔ لینی اور سونی کی بھی آمد متوقع تھی۔ یہ ایک چھوٹی موٹی سی پکنک تھی۔ بچوں کی چھٹیاں فرحت کی عارضی فراغت پھر تو اسے نئے بے بی مشغلے میں مصروف ہو جانا تھا۔ نوپر اور ایبی بھی اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان لائی تھیں۔

☆☆☆

”حسین خفا نہ ہوں کہ میں نے یہ سب تم لوگوں سے لیا۔“ فرحت اپنے ہونے والے بے بی کے لیے ان دونوں کی ڈھیروں شاپنگ کو دیکھ کر کہہ رہی تھی۔

”اس کا اتنا ہمت کیسے ہوئیں گا ام خود اس کو دیکھیں گا۔“ ایبی نے اعلانیہ انداز اختیار کیا۔ ”گاڈ ملوم تمہارا بے بی سے دل ویری اٹیچ یونو ام کو بوت پیار آتا یونو...... آئی ایم رائٹ نوپر......؟“

”بالکل صحیح......“ نوپر نے تصدیق کی۔ ”میں اپنے بچوں کے لیے کب کر سکی اس طرح شاپنگ...... اس کمار کے پاس پیسہ تھا پر خرچ نہیں کرتا تھا۔ مجھ سے کہتا مجھے بچہ نہیں چاہیے، تم کہاں سے لے کر آ گئیں اس...... کو کوئی کہتا جب رات......“ نوپر نے ناقابلِ بیان الفاظ کہے۔

”جانے دو، دل کیوں جلاتی ہو اب تو سب ٹھیک ہے۔“ فرحت یہی کہہ سکی۔

”خاک ٹھیک ہے، تمہیں پتا ہے مجھے دنیا میں سب سے پیاری سونی ہے اور اس کے بچپن کا وہ پہلا سال اس کمار......“ نوپر کا منہ کڑوا ہو گیا۔ ”میں اس کی زندگی کے ان پلوں کو جی بھر کے جی لینے دینا چاہتی ہوں پر۔“

”سونی کو ساتھ نہیں لائیں؟“

”لائی ہوں، اسے ادھر اپنے فرینڈز دِکھ گئے۔ میں بھی شانت ہوئی، بہت ریلیکس تھی میں آج کے دن کا سوچ کر رشتے، کام، ذمے داریاں سب ٹھیک مگر سب سے اچھے پل وہ ہوتے ہیں جب ہم دوستوں کے ساتھ بے فکر ہو کر بیٹھتے ہیں۔ دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے، ہنس لیتے ہیں۔ دوستوں کے سامنے تو رونا بھی سکھ دیتا ہے۔“ نوپر کی آواز مدھم ہو گئی۔

”کیا رونا چاہتی ہو؟“ فرحت نے سرا پکڑ لیا دھیرے سے ٹھوڑی چھو کر چہرہ اپنی جانب گھمایا۔ نوپر نے تیز تیز پلکیں جھپکیں۔ ”کہہ دو جو بھی کہنا ہے۔“ فرحت نے پیار سے اکسایا۔ ”کہنے والی بات نہیں ہے کیا......؟“

”میں شاید کہہ نہ سکوں۔“

”اب تم بول دے ایسا سارا ورلڈ میں ہونے کا...... فرحت کو بولو یہ بوہت جینئس ہے... سولو کرے گا۔“

”بولو نوپر!“ فرحت نے پچکارا اور اسے بازوؤں کے حلقے میں بھر لیا۔

”سونی گھر میں رہنے سے گھبراتی ہے، وہ کب پسند کرتی ہے کہ میرے ساتھ میرے فرینڈز کی پارٹی میں آئے پر آج خود ہی تیار ہو گئی حالانکہ رات کو کہہ رہی تھی بہت تھکن ہے نیند پوری کرے گی اور پھر ریڈی ہو کر آ گئی۔“ وہ الجھے ہوئے انداز میں بہت مدھم بول رہی تھی فرحت پہلے تو کچھ نہ سمجھی...... پھر جیسے کڑیاں ایک دم مل گئیں۔

”اور شرما کو آج گھر پر رہنا ہوگا؟“

”دیکھا ام پہلے بولا فرحت جینئس ہے۔“ ایبی نے نعرہ لگایا۔ فرحت نے ٹھنڈی سانس لی۔ نوپر کے پیروں کی قینچی بنی تھی دونوں ہاتھ بینچ پر ٹکے تھے، گردن گریبان کے اندر...... اس کے گھٹنے پر ٹپ ٹپ ہونے لگی۔ فرحت نے تاسف سے گردن ہلائی۔

”تم بہت کم عمر ہو نوپر، شادی ہر لحاظ سے تمہاری ضرورت تھی مگر تمہیں دھیان رکھنا چاہیے تھا کہ تم ایک بڑی ہوتی بچی کی ماں بھی تھیں تم نے...... وہ ابھی صرف گیارہ سال کی ہے۔“ نوپر اس کی بات کاٹ کر چلائی۔

”وہ ہمیشہ گیارہ برس کی تھوڑی رہتی، ہر منٹ اسے بڑھنا ہے، ساری دنیا کی طلاق والی اور وِدوائیں، بچوں والیاں شادیاں کرتی ہیں تو کیا سب کو ایسے ہی......؟“

”اور تمہیں ایک بے دین شخص سے بھی شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ پتا ہے میرا ماننا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی مذہب عیسائیت، بدھسٹ، مسلم، ہندو اینی ون ہر مذہب فرد

کو رولز اینڈ ریگولیشنز دیتا ہے۔ زندگی گزارنے کا طریقہ...... میرے علم کے مطابق دنیا کا کوئی مذہب بھی شراب کو ڈی فینڈ نہیں کرتا اور کوئی بھی مذہب زنا کے حق میں نہیں۔ کچھ چیزیں، باتیں، عمل روزِ اول سے کلیئر ہیں۔ ہر مذہب فرد کو کنٹرول رکھتا ہے۔ ثواب دِکھا کر یا گناہ جتا کر...... پھر بندہ ثواب کے لالچ میں یا گناہ کے ڈر سے کسی بھی طرح سیدھا رہتا ہے لیکن ایک وہ شخص......“ (فرحت استہزائیہ ہنس دی) ”جو شخص کسی مذہب کو ہی نہیں مانتا وہ ثواب و گناہ پر بھی یقین نہیں رکھتا۔ تو اس کے لیے رشتے کیا معنی......؟“

”اتنا مت بولو تمہارے پاس میرے مسئلے کا حل ہے تو بات کرو ورنہ......“ نوپر نے بے چینی سے جملہ کاٹا وہ پیشانی پر انگلیاں مَل رہی تھی۔

”کیا حل؟“ فرحت کی تیوری چڑھ گئی۔ ”سن سکو گی...... اِدھر یا بتاؤں گی میں چھوڑ دو آتمتیہ شرما کو...... سونی کو تو چھوڑ نہیں سکتیں؟“

”میں محبت کرتی ہوں اس سے۔“ نوپر کو کرنٹ لگا، وہ رو پڑی، ایبی نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”سونی ویری لٹل گرل، جسٹ لائک آ ڈول......“

”کیا وہ بڑی بڑی لگتی ہے، میں نے اسے کوئی چھ ماہ پہلے دیکھا تھا؟“ فرحت نے بھی سوال کیا اس نے سونی کو جب دیکھا وہ گلابی پھولوں والے فراک میں ملبوس تھی ایک اونچی پونی بے حد دبلی پتلی بڑی بڑی آنکھیں چھوٹی ناک معصوم چہرہ...... نوپر نے کوئی جواب نہ دیا وہ ٹشو پیپر استعمال کرتی رہی۔

”اب اس کے لیے ون پرابلم اس کا ہزبینڈ شرما...... میرا بوہت پرابلم، لینی فوسٹر بوہت بڑا بڑا ہو گیا یہ ینگ گرل جیسا فگر بننے جاتا اور ابھی اس کا ایج بوہت کم شی از اونلی تھرٹین بٹ...... مائی گاڈ۔“ ایبی نے جھرجھری لی۔ ”ہم ساری رات فلور پر singing کرتی اور دن میں تھک کر ریسٹ کرتی لینی خود اسکول, eating, going shopping میں ٹائم نہیں دے سکتی۔ بٹ میں ڈرتی یونو...... میں کیسے بولوں تم لوگوں کو...... لاسٹ ویک اسے تھرڈ ایونیو پر غنڈہ لوگ روک لیا۔“ وہ بتانے لگی۔ ”ام بیڈ ٹچ bad touch“ پھر روتا۔ ”ام پریشان فرحت تم جینئس سلوشن دو...... ام خود وہاں موز مبیق میں اونلی فورٹین ایئر ایک بیڈ مین جو اُدھر واچ مین تھا ام کو پکڑ لیا۔ ام بالکل انوسینٹ فرسٹ ٹائم بیڈ ٹچ اینڈ بٹ تھینک گاڈ ام بھاگ گیا۔ اینڈ ناؤ آئی ایم 42 ایئرز اولڈ بٹ اب بھی وہ لیک کے پاس والا کاٹیج اور کوکو کے ٹریز (درخت) ڈراتا ہے۔“

”مائی گاڈ ایبی!“ فرحت ششدر رہ گئی۔

”کہاں ہے لینی، ذرا میں بھی تو اسے دیکھوں اور بلاؤ سونی کو مائی گاڈ......“ فرحت کی سانس پھول گئی۔ نوپر کو دفعتاً اس کی حالت کا احساس ہوا جوس اس کی جانب بڑھایا وہ اپنے آنسو پونچھ چکی تھی اور اپنی لپ اسٹک ٹھیک کر رہی تھی۔

”ہیلو آنٹی ہاؤ آر یو؟“ سونی کی سُریلی آواز ان کے پیچھے گونجی وہ نہ جانے کہاں سے گھومتی برآمد ہوئی تھی۔

”آئی ایم فائن...... کم ہیئر! کہاں تھیں اتنی دیر سے......؟“

”فرینڈز مل گئے تھے۔ بہت انجوائے کیا ورنہ ممی کے ساتھ آتے وقت بوریت کا ڈر تھا۔“ وہ چہکتی آواز میں شرارت سے ماں کو دیکھنے لگی۔

”اچھا کیا آ گئیں، میں تم سے بہت عرصے بعد مل رہی ہوں بہت پیاری ہو گئی ہو۔“ فرحت نے خوش دلی سے کہا۔

”تھینکس آنٹی، ممی کچھ کھانے کو دیں۔“ وہ دری پر پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔ ”زوروں کی بھوک لگی ہے۔“ اس کا انداز عجلت آمیز تھا۔ نوپر خود پر قابو پا چکی تھی۔

”تو بریک فاسٹ اچھے سے کرنا تھا ناں میں نے اس کے فیورٹ دال کے پراٹھے اور سرسوں کی چٹنی بنائی کہ گرما گرم کھائے گی کہنے لگی بعد میں کھاؤں گی اور اب......“

”ایکچوئلی صبح جوس پی لیا تھا سوچا بعد میں...... پھر میں ممی کے ساتھ نکل آئی۔“

”اب وہ کون کھائے گا۔“ نوپر بولی۔

”کچھ چیزیں گرم گرم اچھی لگتی ہیں، گھر میں رہتی تو کھا ہی لیتی اب تو ضائع ہو گئیں۔“

"گھر میں کیسے رہ سکتی تھی جب آپ نکل آئیں حالانکہ مجھے کمپیوٹر پر کام تھا۔ سمر کیمپ کے سلسلے میں میرے فرینڈز جائیں گے۔"

"ارے تو گھر میں رہتی تم، اب کیسے سیٹنگ ہوگی تمہیں انہی کے ساتھ تو جانا تھا۔" نوپر کو دھیان آیا تو یک دم پریشان ہوگئی۔

"گھر میں کیسے رہتی اکیلی، وہاں شرما انکل ہوتے ہیں ناں......" وہ تیزی سے سینڈوچز چبا رہی تھی، بے خیالی میں بول گئی۔

"شرما انکل سے کیا پرابلم ہے سویٹی؟" فرحت نے تیزی سے پوچھا۔

"وہ مجھے بہت عجیب انداز میں گھورتے رہتے مجھے ...... او......" وہ جتنی تیزی سے بولی اسی طرح چونک کر چپ کرگئی۔ "آئی ایم سوری......" اس کے چہرے پر ہراس ٹھہر گیا اس نے خوفزدہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔

"ارے یہ جوس بھی لو ساتھ میں اور میں کباب لائی ہوں یہ لو۔" فرحت بولی...... ابی نے اونچی آواز میں کوئی افریقی دُھن اُڑائی۔

"ہے ہے اے اے ہاہا...... آ آ آ......" نوپر کے چہرے کا رنگ سپید ہوگیا تھا۔ فرحت نے سونی کی جانب بغور دیکھا۔ گلابی جاگرز گھٹنوں سے شروع ہونے والی سفید اسکن ٹائٹ کاٹن ٹائٹس پر بالشت بھر کپڑے سے تیار بلاؤز پہنے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ بلاؤز بالشت بھر کا ایسا کپڑا تھا جو بغل سے نیچے اور پسلیوں سے ہوتا ناف پر رک گیا تھا پیچھے ڈوریاں تھیں، شانے ننگے تھے فقط دو نادیدہ سی ڈوریاں ٹرانسپیرنٹ کچھ نہیں تھا مگر جو تھا وہ صاف دِکھ رہا تھا۔ وہ نابالغ تھی مگر بلوغت کے کچھ آثار۔

"تم ایسے کباب مجھے سکھاؤ اور ایک پاکستانی سونگ بھی۔" ابی نے چٹخارا بھرا فرحت چونک کر سیدھی ہوئی۔

"ایکچوئیلی میں چاہتی کہ ورلڈ کی ہر لینگویج میں ون سانگ مجھے آئے، عرب سانگ میں گایا ناؤ انڈین اینڈ پاکستانی وہ جو اس روز تم گایا میں ٹھیڑی ہوئی پی آر وہیج کو گئی وائے سیب" اس نے تان لگائی۔

"میرے اللہ۔" فرحت کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ "تمہارا کچھ پتا نہیں لگتا نہ موقع او مائی گاڈ اور تم کیا گا رہی تھیں"۔ اس نے نوپر کو ہنسی سے دُہرا ہوتے دیکھا اور پھر خود ہی بے قابو ہوگئی۔

"تم نہیں گا سکتیں۔ چھوڑو، ٹھیڑی کس لیے ہوگئیں۔ میں تیری ہوگئی پیار وچ کھوگئی۔ وے سب تو سوہنیا۔"

"مجھ کو یہ سانگ سیکھنا پڑتا۔ اور تم نوپر وہ چھیاں چھیاں ام کو مانگتا یو نو......"

"گرگٹ رنگ دھیرے بدلتا ہوگا مگر یہ......" فرحت نے نوپر سے کہا۔

"ابھی کیا کہہ رہی تھی اور اب کیسے تانیں اُڑا رہی ہے۔ ابھی کوئی دیکھتا تو تم سے بڑا فکر مند کوئی نہیں ہوتا اور اب...... میں ٹھیڑی ہوگئی۔" فرحت پھر ہنس دی۔ ابی نے فرحت کے ہنستے چہرے کو ساکت نگاہوں سے دیکھا۔

"تم کو مالوم نائیں امارے پاس سلوشن ہے ام وہ کرے گا اور نوپر کو بھی دیں گا، ویری افیکٹو اینڈ ہیلپ فل بلیو می......" اس کا انداز پُراسرار سا ہوگیا۔ اس نے اپنے دیدے گھمائے ایسے وہ جادو کے گولے والی مائی کی طرح دکھائی دی۔

"مجھے بھی بتاؤ حل۔" نوپر اس کے نزدیک ہوگئی۔

"بتاتی ہوں تم کو بھی اور تم کو بھی فرحت، تم بھی بے بی گرل لا رہی ہو۔"

"ہاہاہا...... مجھے، مجھے کیوں......؟" فرحت کو اچنبھا ہوا۔

"ہیلو موم، ہیلو آنٹ......" لینی فوسٹر بھاگتی آئی تھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ پسینہ ہر موسے بہتا تھا۔ وہ پیچ کلر کی فراک میں ملبوس تھی۔ چوکور گلا پیچھے زپ آستین آدھی بہت زیادہ چُنٹوں والی پھولی پھولی فراک...... پیروں میں آرام دہ سوفٹی اور سر پر درجن بھر پنیں جو کرلی بالوں میں پھنسی پڑی تھیں۔ اس کے کانوں میں بالیاں تھیں وہ بالکل ابی کا بچپن دِکھتی۔ بس اس کی ناک ماں کی نسبت کم موٹی تھی وہی بڑے ہونٹوں کے پیچھے سفید دانت کی قطار مگر ایک کشش اور بھول پن تھا اور اپنے جُثے اور قد کی بنا پر وہ واقعی عمر سے بڑی دکھائی دیتی تھی۔ وہ

سویتھ گریڈ میں تھی مگر ایک ینگ کالج گرل سمجھی جا سکتی تھی۔ فرحت کے دماغ میں ہلچل سی ہو رہی تھی۔ کلک سا ہو رہا تھا ایک جھماکا یوں جیسے اگلے پل سب کلیئر ہو جائے گا۔ یوں جیسے سرا اس کے ہاتھ لگنے والا ہو۔ یادداشت کے پٹارے میں کچھ تھا۔ کچھ ایسا جو آج اتنے برس بعد واضح ہونے والا تھا۔

"کیا سلوشن ہے ابی پلیز ٹیل می، تم کیا کرو گی۔" نوپر نے ابی کا چہرہ اپنی سمت گھمایا۔ لینی اور سونی اپنے سینڈوچز کے ہمراہ ان سے کچھ فاصلے پر محوِ گفتگو تھیں۔ زین اور حسن گھاس پر قلابازیاں کھا رہے تھے۔ فرحت دری پر بیٹھی تھی اس کا سر بینچ سے ٹکا ہوا تھا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے ابی کا چہرہ تک رہی تھی جہاں پر قطعیت آٹھہری تھی۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور آنکھوں میں سرد مہری رک گئی تھی۔ وہ سر اٹھا کر گھنے پتوں سے جھلک مارتے نیلے آسمان کو یوں تک رہی تھی جیسے بولنے سے پہلے کسی آسمانی اشارے کی منتظر ہو۔

"بولو ابی......!" نوپر نے اس کی ران پر ہاتھ مارا۔

"ہم افریقی سارے ورلڈ کے لیے ایک مسٹری ورلڈ ہیں ایک جادو جیسی جگہ عجیب و غریب ہمارا وے آف لائف eating habits ایوری تھنگ باقی لوگوں کے لیے جوک کی طرح لگتا بٹ وہ سب سیٹ ہوتا ہے بالکل صحیح اب اِدھر بوہت ترقی ہوگیا لوگ اب پتے نہیں باندھتے اب اچھے گھر بن گئے اسکول، اسپتال، پارک، کلب مگر اپنے طریقے وہی ہیں۔ بٹ ویری افیکٹو......" ابی کی پاٹ دار آواز لہجے کی گمبھیرتا کے باعث زیادہ اعصاب شکن لگ رہی تھی۔

"تم کہو ابی ہم مذاق کیوں بنائیں گے...... مجھے مسئلے کا حل چاہیے ڈیئر آئی ایم سو ٹائرڈ پلیز۔" نوپر گھگیائی۔

"ام تھری سسٹرز بٹ امارے ساتھ تو...... ہماری گرینڈ مدر نے ہماری آنٹ آئی مین مائی فادر، سسٹر رامبا کے ساتھ......" ابی اٹک گئی وہ انگلش بولتی تو فرحت زیادہ نہ سمجھ پاتی اور یوں بھی اسے اب جو کہنا تھا اس کے لیے زبان کا لڑکھڑانا بنتا تھا۔

"میں گرینڈ مدر جیسے......" اس نے جملے ترتیب دیتے ہوئے سر کو جھٹکا۔

"میں اپنا بے بی لینی کا چیسٹ پارم پارک طریقے (روایتی) کے جیسے، داغ دوں گی جیسے امارے ایریا میں کرتے تھے۔"

"واٹ؟" فرحت کے منہ کا زاویہ بگڑ گیا۔ "کیا کہا تم نے...... کلیئر کرو کیسے...... مطلب کیا...... کیا کہہ رہی ہے یہ؟" اس نے نوپر کا کندھا جھنجوڑا جو بہت سنجیدگی سے ہمہ تن گوش تھی۔ ابی ہنوز خلاؤں میں تک رہی تھی وہ جیسے یہاں نہیں تھی۔

"ام جس سے اپنے لیے زمین میں آٹا پیستا، وہ بہت بڑا موٹا ڈنڈا جیسے...... اس کو گرم کر کے آگ کے اوپر...... پھر گرل کو لٹا کر اس کے چیسٹ پر دباؤ دے کر رکھتا بار بار...... ایسا کرنے سے بے بی جلدی بڑا نائیں لگتا۔ وہاں مین (آدمی) ایسے ہی گرل کے بڑے ہونے کا گیس (اندازہ) کرتا تو ایسا کرنے سے گرل bad men سے بچ جاتا۔ اب پتا نہیں ام خود بوہت ٹائم ہوا افریقہ نہیں گیا جیسے...... بٹ ام بلیو کرتا کہ اودر (ادھر) اب بھی ایسا ہوتا، گرل کی سیفٹی کے لیے کرنا پڑتا...... یو نو...... وہاں سب فیملی کو کام کرنا ہوتا کوئی بیکار نہیں بیٹھتا۔ گرل کا باہر کام کرنا یا پڑھنا نکلنا ویری ڈیفیکلٹ...... سو دس از ویری ایزی سلوشن...... یہ سب سے آسان حل ہوتا...... لیکن اب ام نے بوہت دن لگا کر سوچا ایی نوسٹر سنگل مدر اینڈ آئی لو مائی بے بی میں اس کو بچانا جیسے، فرحت حسین میں ایسا کرتی......" وہ بات مکمل کر کے جیسے حاضر ہوگئی تھی اور فرحت اس کے جسم کا رُواں رُواں کھڑا تھا۔ حلق خشک اور آنکھیں تحیر اور خوف سے پھٹی پڑی تھیں۔

"آر یو سیریس؟" اس کے منہ سے بہت مشکل سے، بہت دیر بعد نکل سکا۔

"یس آئی ایم......!" ابی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"تم گھڑ رہی ہو تمہارا آئیڈیا ہے ہا...ہا...وا...... واقعی ایسے کرتے ہیں؟" فرحت کے لفظ ٹوٹ رہے تھے۔

"یہ...... یہ تو taboo ہوا یہ پاگل پن، جہالت

بے وقوفی......"

"نو......نو...... ٹیپو، یہ سلوشن ہے گرلز کو بچانے کے واسطے۔"

"کیسی پیش بندی کس لیے...... کس طرح...... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" فرحت کے اعصاب پر ہتھوڑے برس تھے۔ وہ سُن ہوگئی تھی۔ اس نے رسی کو دتی لینی کو دیکھا۔ کمر...... کے گرد رنگ ڈال کر کولہے و کمر کو ہلاتی سونی کو، ان کی سانس دھونکنی کی طرح چلتی تھی اور وہ منہ کھول کر سانس لیتی تھیں الگ رنگ، الگ خطہ، الگ مذہب بلکہ الگ جہان تھا یہ مگر معصومیت بھول پن کم عمری، بے فکری مگر...... ان کی ہر جنبش سے ہر عضو بولنے لگتا تھا...... فرحت کی آنکھوں کے آگے بے یقینی تھی منظر گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ دماغ کے گوشوں سے دھیرے دھیرے سرکتا پردہ یک دم ہٹ گیا۔ اسے کلیئر ہوگیا۔ ایک الجھن سلجھ گئی۔ بیس بائیس برس قبل کا ایک منظر روشن ہوگیا۔ واضح ہوگیا۔

☆☆☆

فرحت کے والدین کراچی میں رہتے تھے اور دادا، دادی سیالکوٹ پھلواڑی میں...... فرحت کی والدہ ہر سال دو ماہ کی چھٹیاں گزارنے اپنے گاؤں جایا کرتیں جہاں ان کی باقی دیورانیاں جو پنجاب کے مختلف علاقوں میں رہتیں چھٹیاں گزارنے آتیں، ایک اصول بن چکا تھا اس کی پھپیاں بھی بچوں کے ہمراہ میکے آتیں۔ شدید گرمیوں کے دن کہنے کو چھٹیاں اور عیاشی ...... مگر بس نام کو سارا سال اسکول اور مدرسے جانے کے بعد بھی جو تربیت اور پرورش کے نقائص ہوتے وہ یہاں آکر جیسے دور کیے جاتے۔ دادا، دادی کھلاتے سونے کا نوالہ پر دیکھتے شیر کی نگاہ سے۔ لڑکے ہوتے تو دادا جی کے ہمراہ پانچ وقت باجماعت مسجد...... پندرہ سے اوپر ہوتے تو مرغی ذبح کرنا سکھاتے، چارپائی بُننا...... بڑھئی کی دکان پر ہفتہ دس دن کھڑا کردیتے گھر کے کیل کوکے جوڑنے آنے چاہیے...... صبح سویرے کھیتوں کے گرد دوڑ لگواتے اپنے جسم پر تیل ملتے اور پوتوں نواسوں کی بھی شلواریں ٹنگ کر تیل مل مل کے بیٹھکیں نکلوائی جاتیں۔ نعتیں یاد کرنے کو دیتے اور ہر رات مقابلہ ہوتا، انعام بھی ملتا، گھوڑے کی سواری اور سزا ڈھوروں کے پٹھے کترے گا...... مائیں بے فکری کے مزے لوٹتیں، اچار بناتیں، بسترے بنائے جاتے، بچپن کی سکھی سہیلیوں سے ملتیں، دکھ سکھ کہتیں، رشتے ناتے بھی اسی دو ماہ میں دیکھے اور طے کیے جاتے اگلی چھٹیوں میں شادی، ماؤں نے ختنے اور عقیقے سنبھال کر رکھے ہوتے۔ ابا جی سے پہلے ہی جانور تیار کرنے کا کہہ دیا ہوتا۔ گھر کی مالکن دادی جی جنہیں پوتے نواسے سب بے جی کہتے۔ مطلق العنان بادشاہ تھیں...... سیاہ و سفید کی مالک، گورا چٹا رنگ بوٹا سا قد ہار سنگار کی شوقین مہندی کا اتنا شوق کہ شاید ہی کسی نے ان کی ہتھیلی کا اصل رنگ دیکھا ہو سرخ سرخ ناخن دونوں ہاتھوں میں مینے کی سرخ و سبز موٹی چوڑیاں، گلے میں گانی مرتے وقت تک رہی کبھی ہلکے رنگ کے کپڑے زیب تن نہ کیے۔ سرخ سبز گلابی دوپٹا کرن بیل سے سجا...... لڑکے ابا جی کے حوالے ہوجاتے تو لڑکیاں سب کی سب بے جی کے زیرِ نگرانی، مائیں انہیں ماں کے سپرد کر کے بالکل بھول جاتیں۔ بے جی خود قرآن پاک پڑھاتیں۔ بہشتی زیور کے چنیدہ حصے، حمد اور نعتیں سوز و لحن سے پڑھتیں۔ بچیاں بھی ہم آواز ہوتیں۔ بچیوں کے رنگ روپ قد کاٹھ مسئلے مسائل پر گہری نظر ہوتی، حل بتاتیں معاملات سلجھاتیں وہ اور بوڑھوں کی طرح پپیاں، جھپیاں تو نہیں لیتیں پھر بھی گہری فکر مندی محبت کا ثبوت تھی۔ چھٹیاں گزار کے جب بچیاں گھروں کو لوٹتیں تو آٹا گوندھنا، سلاد بنانا، ترپائیاں کرنا، بٹن ٹانکنا آچکا ہوتا۔ تختی لکھ لکھ کر لکھائی بن چکی ہوتی، ڈھیروں قرآنی آیات اور دعائیں یاد ہوتیں۔ پانچ وقت کی نماز تو خیر پہلا مرحلہ تھی۔ فرحت کا دسواں رن لگا تھا اس بار کی چھٹیوں میں گہما گہمی کا عروج تھا۔ ابا جی اور بے جی نے اپنے بچوں کے بچوں کے رشتے جوڑے تھے۔ چار بچوں کی شادیاں طے کردی گئیں، اگلے سال تیاریاں یہیں سے ہونا تھیں ان میں ایک فرحت کے بڑے بھائی جان بھی تھے سو فرحت کی امی اور بڑی بہنیں بری طرح مصروف ہوچکی تھیں...... بے جی کی توجہ کا مرکز اس بار فرحت اور اسی کی ہم عمر مزید دو نواسیاں تھیں صدف اور شہلا...... ان دونوں میں فرحت نسبتاً گدگدی بچی تھی۔ اس سے چھوٹے دو بھائی تھے اور

اس کی ان سے خوب بنتی، وہ کپڑے بھی اُن جیسے پہنتی، ان کے ساتھ غلیلیں چلاتی، چڑے بھوننے کے لیے مسالا بناتی کشتی بھی کرتی۔ بھائی پیار بہت کرتے تھے مگر کشتی کے وقت پوری فارم میں آجاتے ٹکا ٹکا کر گھونسے مارتے، پسلیوں میں لاتیں، ٹانگوں کی قینچی بناتے اور پٹخنیاں دیتے گھونسا مار کے جبڑا گھماتے باکسنگ کے انداز میں سینے پر پے در پے مُکّے مارتے۔ پہلے وہ ہلکا پھلکا چیخ رو کر چپ کر جاتی مگر اب کچھ عرصے سے وہ تکلیف سے دُہری ہوجاتی۔ دلخراش چیخیں مارتی "پیٹ پر نہیں مارو، سینے پر مجھے درد ہوتا ہے۔" وہ سینے پر گھونسا لگتے ہی پسپائی اختیار کرلیتی کیونکہ دونوں سے سال دو سال بڑی تھی۔ سو اس کا پیچھے ہٹنا دونوں کو بڑا مزہ دیتا جی بھر کے پٹائی کرتے۔ بال نوچتے منہ پر ناخنوں سے لکیریں ڈال دیتے۔ وہ سارا دن ہائے ہائے کرتی امی نے دیکھا تو دونوں کی پٹائی لگا کر آئندہ کے لیے تنبیہہ کردی...... پر فرحت کا رونا کم نہ ہوا۔

"آخر تو مسئلہ کیوں نہیں بتاتی، کہیں کوئی ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہو۔" امی نے گھما پھرا کر چیک کیا۔

"درد...... ؟" وہ عاجز آگئیں۔ فرحت کی آنکھوں سے اور آنسو بہے اور اس نے شرمندگی اور خوف سے نگاہیں چُراتے ہوئے اپنی انگلی سینے پر ٹکائی۔

"اِدھر......" ہچکی لی۔ "اور اُدھر بھی، فرحان اور فیض نے مارا ہے۔"

"ہائے بتاؤ! بیڑا اتر جائے نی کلثوم تمہارے بیٹے مسٹنڈے اور ساتھ تم بے شرمو ماں کے گھر آکر آنکھیں اور کان بند کر کے بیٹھ جاتی ہو۔ بڑی ہو رہی تمہاری بیٹی اور اب تک کشتی کرتی ہے بھائیوں کے ساتھ اور تم اندھی...... خبردار اگر کُڑی آج کے بعد میں نے تجھے دیکھا لڑکوں کے ساتھ کھیلتے۔ ان کے اپنے کھیل اور تمہیں بڑے بچوں کی فکریں پڑی ہیں...... اور چھوٹی کو ڈوری باندھ کے ہوا میں چھوڑ دیا اور تو کُڑی اِدھر میرے پاس آ۔ میں نے آج کے بعد تجھے چادر لپیٹے بنا دیکھا تو تیری خیر نہیں۔ سر ڈھک کے اچھی بیٹی بن کے رہا کرو۔ آئی دماغ میں کوئی عقل بوجھ۔ ارے نسیم، میرے بڑے صندوق میں سے ململ کے سفید دوپٹے درمیان میں سے پھاڑ کر اسے چھوٹے چھوٹے بنا کردے۔ اندھی مائیں بے ہدایتیں......" بے جی سارے قصے سے یک دم روشناس ہوگئیں جو بولنا شروع ہوئیں تو رات گئے تک بڑ بڑاتی رہیں فرحت کے ساتھ ساتھ صدف، شہلا پر بھی حد نافذ ہوگئی۔ نانا جی سے نواسے پٹوائے گئے پر ساتھ ہی بیٹیوں، بہوؤں کو آنکھوں، آنکھوں میں جتایا۔ میرے بس میں ہوتا تو تم سب کو ہی ایسے پٹواتی، رات کو عشا کی نماز پڑھی تو دعا کی ہتھیلی میں ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہے۔ فرحت کو نہ صرف اپنے بستر میں اپنے ساتھ چھپی ڈال کر سلایا بلکہ بڑے ماموں کی لائی اسپیشل ٹافیاں بھی دیں جو اُن کی صندوقچی میں بند رہتیں تو قسمت والوں کو ملا کرتی تھیں...... فرحت، شہلا اور صدف کا منہ سر بھی چوما۔ ایک اسپیشل کلاس نانا جی کی معیت میں تمام لڑکوں کی بھی لی گئی۔ جس میں انہیں بتایا گیا کہ آپس کے کھیل کود میں اتنی جارحیت نہیں ہونی چاہیے کہ خطرناک چوٹیں لگیں۔

"زیادہ ڈرامے کرتی ہے ہمیں بھی تو لاتوں سے مارتی ہے جب ہم نے بدلہ لیا تو کیسے سب سے رو رو کر شکایتیں لگائیں، میں نے بھی خوب محمد علی والے گھونسے مارے پیٹ اور سینے پر......" فیض کو زیادہ غصہ تھا اس نے ایکشن کر کے ہوائی گھونسے مارے۔

"اوئے کرلے اِدھر آ......" نانا جی کو اس کی مستعدی بھائی تھی۔ "بہنوں کو کبھی نہیں مارتے، گرم نگاہ سے دیکھنا بھی نہیں، بس پیار سے بات کرتے ہیں، ہتھ نہیں مروڑنا، گُت نہیں کھینچنی۔" تمام لڑکے سمجھی ناسمجھی کی کیفیت میں سر ہلاتے رہے حکم عدولی تو خیر اب نہیں ہونی تھی۔ فرحت، صدف اور شہلا کا گریڈ بڑھ چکا تھا۔ بے جی نے کپڑے کی گڑیا اور گڈے کا بیاہ رچا کر خوب رونقیں اور مصروفیت دے دی تھی۔ بے جی کی اونچی آواز گونجی۔

"اوئے کڑیو سر ڈھکو میں سر ننگا نہ ویکھاں۔" (لڑکیوں سر ڈھانپوں میں سر ننگا نہ دیکھوں) تینوں مستعد رہتیں۔ گرمیوں کے دن بہت کم وولٹیج کی لائٹ رہتی نہ رہتی تینوں کی فراکیں ان سے چھوٹی بچیوں میں بانٹ دی گئیں۔ (بائیس تیئیس برس پہلے مائیں بچوں کے اسٹائلش کپڑوں کے پیچھے بھاگا نہیں کرتی تھیں۔ لال صابن سے

سر دھو کر تیل سے چپڑ کر کسی چوٹیاں، دُھلے نیل لگے بغیر استری کپڑے اور سال میں کپڑے بڑوں چھوٹوں سب کے دو بار ہی بنتے عید شب برات یا پھر پھٹ جانے یا چھوٹے ہو جانے کی صورت...... ان تینوں کے لیے اچانک ہی نئے جوڑے سلائی کیے گئے کھلی قمیص یا پھر کلیوں والے کُرتے، شلواریں اور پہلی بار ہی ان تینوں کے لیے ململ کی نرم شمیزیں سلائی کر دی گئیں۔ بچیاں ان ڈبل قمیصوں سے گھبرائیں مگر بے جی نے اپنا کرتہ اٹھا کر دکھایا ”گرمیوں کے کپڑے ویل کے پتلے پتلے سب دو قمیصوں کو پہنتے ہیں....“ اور اس زمانے میں بچیاں بحث نہیں کیا کرتیں...... بے جی کی نگاہ اب چوکس تھی۔ وہ غیر محسوس طریقے سے پہلے بھی مگر اب اور زیادہ اپنے ساتھ لگائے رکھتیں۔ بچیاں حکم موجب دوپٹا سر پر رکھتیں بے جی کے سر ڈھکو۔ میں اب سختی اور قطعیت ناراضی ابھرنے لگی تھی...... اور وہ تینوں بہر حال ابھی دوپٹا سنبھالنے کے قابل نہیں تھیں۔ سر پر کس کر ماتھا ڈھکا ہوا بھوئیں بہ مشکل نظر آتیں...... کان باہر خرگوش کی طرح نمایاں پھر ٹھوڑی کے پاس سے گردن سے گزرتا دوسرے شانے سے پیچھے گرایا ہوا اپنے تئیں پوری کوشش کرتیں ایک بال بھی نظر نہ آئے۔ دوپٹا کرتے کی چھٹی سے اوپر گزرتا، گردن نظر نہ آتی۔ بے جی... کا تکیہ کلام ان دنوں سر ڈھکو ہی تھا۔ بچیاں حیران و پریشان دوپٹے کی سختی سے منہ پر خون چھلک آتا ”ڈھکا تو ہوا ہے سر اب اور کیسے ڈھکیں“ وہ منہ کھول کر پریشانی کا اظہار کرتیں۔ مشکل میں پڑ گئی تھیں۔

”بڑی ڈھیٹ کڑیاں ہیں اتنا تو مجھے کسی نے تنگ نہیں کیا میرا منہ تھک گیا۔ سر ڈھکو، کناں چے روئی، پائی ہوئی (کانوں میں روئی ٹھونسی ہے) کدرہے گی میری چھتری۔“ بے جی سچ مچ غصے میں آچکی تھیں۔ ادھر ادھر نگاہ کی۔ بچوں کی تختیاں گاچی مل کے لائن سے رکھی تھیں۔ آگے بڑھ کر اٹھالیں۔ ہوا یہ کہ ان سے ملنے کچھ عورتیں آئی ہوئی تھیں۔ فرحت وغیرہ قریب ہی زمین پر بیٹھی گڑیاں سجا رہی تھیں۔ ...... ایک خاتون نے ان کے کھیل کو دلچسپی سے دیکھا۔ ”بچیاں گڈیاں کھیڈ دیاں...... شوق نئیں مکدے کلثوم...... دی اے کڑی تے جوان ہوگئی...... کیوں آپا کل دی گل ہے وڈیاں تتیاں دے کافی پہر بعد ہوئی سی۔“ (بچیاں گڑیاں کھیل رہی ہیں، شوق ختم نہیں ہوتے کلثوم کی بیٹی جوان ہوگئی... کل کی بات ہے تین بڑوں کے کافی سالوں بعد پیدا ہوئی تھی) خاتون کی گہری نگاہ اور بے لاگ تبصرہ بے جی کے کانوں کو گرما گیا اس وقت بہانے سے بچیاں بھیج دیں۔ اب غصے سے کھول رہی تھیں۔ فرحت پر زیادہ غصہ تھا وہ گدگدی گپلو تھی زیادہ نمایاں ہوئی۔ تختی اس کی ران پر ماری۔

”ہائے ہائے بے جی نہ کرو۔ قسم سے۔ جس دن سے آپ نے کہا تھا میں دوپٹا سر پر لیتی ہوں۔ قسم لے لیں یہ دیکھیں اس وقت بھی لے رکھا ہے۔“ دوسری تختی نہ پڑ جائے وہ تیز تیز اپنی صفائی دینے لگی، آنکھوں سے آنسوؤں کا تار الگ...... شہلا اور صدف پہلے ہی کپکپا رہی تھیں۔ آنسو گریبان میں گر رہے تھے۔ بے جی کی یہ ساری کارروائی ان کے بند کمرے میں ہو رہی تھی۔ وہ تادیب کا عمل کسی کے سامنے نہیں کرتی تھیں۔ اب وہ ہچکیوں سے رونے کے درمیان بول رہی تھی۔ ”اے دیکھو اک بھی وال نظر نئیں آریا۔“ اس نے تیز تیز بولتے ہوئے دوپٹا گردن پر مزید کس لیا منہ کُپا ہو کر مزید نمایاں ہو گیا۔ بے جی کی چڑھی تیوری ڈھل گئی۔ ہاتھ بھی ڈھیلے ہو گئے تھکے نڈھال انداز میں تختی رکھ دی۔ ان تینوں کے چہرے بغور دیکھے بھولے بھالے منہ، معصوم برستی آنکھیں اپنے جرم سے نا سمجھی، صفائی کے الفاظ کی گرانی...... بے جی کے ہونٹ پھڑپھڑا گئے صورتِ حال واضح ہو گئی۔ بچیوں نے حکم عدولی کب کی۔ پیغام ان تک پہنچا ہی نہیں تھا...... بے جی نے ہاتھ بڑھایا بچیاں خوفزدہ تھیں ہچکچائیں۔

”اِدھر آ گئے ہو...... ادھر میرے پاس آؤ۔“ بے جی نے فرحت کی کلائی خود ہی پکڑ لی۔ اپنے دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں پھر گال بھی خشک کیے۔ کسے دوپٹے کو دھیرے سے اتار کر جھاڑ کر پھیلایا۔ چپکے الجھے بالوں کو انگلیوں سے سہلایا جو پسینے سے لتھڑے تھے۔ فرحت نا سمجھی کے عالم میں بے حد سراسیمہ ہو کر انہیں تک رہی تھی۔

”سوہنیا، بیبیاں، بیٹیاں اسی طرح رہتی ہیں، ایسے لپیٹتی ہیں دوپٹا، سر پر دھرا، شانے پر ہلکی چُنٹ دے کر

ٹھہرایا اور سینے سے ہو کر پیٹ سے گزار کر ڈھیلا ڈھیلا دوسرا پلو دوسرے شانے سے گزار کر پیچھے پھینک دیا۔ یہاں سے لے کر یہاں تک شانے سے پیٹ تک اب تے یاد رہے گا ناں...... میری چنگیاں بیٹیاں......“ تینوں کو ایک ساتھ چپکا لیا۔ چھوٹے ہاتھوں کے بوسے لیے...... ”تختی زیادہ زور سے لگ گئی۔“ فرحت کی ران پر ہتھیلی مسلی۔

☆☆☆

زندگی کی روٹین میں شامل ہو کر فرحت کو کبھی احساس نہ ہوا، غلطی کیا تھی تصحیح کا کیا مطلب ہوا، ایک عادت بن گئی، فطرت کی طرح شامل ہو گئی...... فرحت نے بہت مگن زندگی گزاری...... اسکول کالج نرسنگ اسکول اسی دوران تایازاد حسین سے شادی، دونوں ہم پیشہ تھے نرسنگ اس کا شوق تھا دو سال بعد جڑواں بیٹے اس نے بے حد رواں مصروف دن بتائے تھے۔ ہم بچپن میں نا سمجھی کے دور میں بہت سی کہانیاں پڑھتے ہیں۔ بہت سے ڈرامے فلمیں دیکھتے ہیں۔ ٹائم پاس کے طور...... اس وقت ان کی خاک سمجھ نہیں لگتی۔ سالوں بعد جب ہم خرد کا دامن تھام چکے ہوتے ہیں۔ عقل کی راہ سے گزر چکے ہوتے ہیں۔ تب ان چیزوں کو دوبارہ پڑھتے ہیں یا دیکھتے ہیں تو ان کے نئے معنی کھلتے ہیں بھید سمجھ آجاتے ہیں۔ فرحت کو بائیس تئیس برس کے بعد اندر کی بات پتا لگی بہت اندر کی اور اگر آج یہ ڈسکشن نہ ہوتی تو شاید وہ ساری زندگی لاعلم رہتی جبکہ وہ ایک بیٹی کو جنم دینے جا رہی تھی شاید تب

اور ادھر ابھی اور نور پر ان کے مسائل اور...... اور اور ان کے حل...... اتنے مشکل عقل و خرد سے دور۔ کیا ہوش مندی کیا انسانیت کیا سلوشن کیا حل......؟

”مائی گاڈ......“ فرحت نے تھوک نگل کر خشک حلق کو تر کیا۔ ”تت...... بت...... تم نے سنا نور پر یہ کیا کہہ رہی ہے۔ آر یو...... ابھی تم کیا کہہ رہی ہو سوچا بھی کیسے، یہ تو میرے پاس I have no words میں...... تم......“ فرحت شاید پاگل ہو رہی تھی۔ ”دد، دا...... درد ہو گا اسے...... دو...... داغ پڑ جائے گا ابھی۔“ اس نے گردن گھما کر لینی اور سونی کو دیکھا وہ اب ایک ہی رسی کو آمنے سامنے کود رہی تھیں۔ میڈونا کا girl gone wild اونچی آواز میں ایک لے پر گا رہی تھیں۔ ”جل جائے گا گرم لکڑی سے...... تم سمجھاؤ اسے نور پر ایسا مت کرنا......؟“ اس نے نور پر کی ٹھوڑی چھو کر التجا کی۔

”she is right یہی سب سے اچھا حل ہوگا۔“ نور پر کی آواز میں ٹھہراؤ تھا اور نگاہیں غیر مرئی لہروں پر وہ جیسے وہاں نہیں تھی۔

”آ...... آر یو میڈ...... آر یو کریزی...... بکومت...... ادھر دیکھو کیا کہہ رہی ہو تم؟ فرحت کو جھٹکا لگا۔

”I have another solution میرے پاس بھی کچھ ہے ابھی تمہاری طرح اس جیسا اس سے ملتا جلتا اور اتنا ہی ایفیکٹو......“ نور پر کی آواز جیسے بہت زور اور مشکل سے نکل رہی تھی۔ فرحت کو ہائی پاور کا جھٹکا لگا۔

”ننھی بچیاں انہیں کیا ریزن دو گی، کیسے سمجھاؤ گی انہیں کیا وضاحت دو گی درد ہو گا جل جائے گا، داغ پڑے گا......“ فرحت نے جھرجھری لی وہ جیسے خود کو ان کی جگہ سوچ رہی تھی اور درد سہہ رہی تھی۔

”یہ داغ اس داغ سے اچھے ہوں گے جو نہیں دنیا لگا دیتی ہے۔“

”تت...... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“ فرحت سناٹے میں رہ گئی۔

”میرے پاس بھی ایک بہت پرانا آزمودہ ٹوٹکا ہے، میرا دھیان بار بار ادھر گیا لیکن میں نے اگنور کیا پر اب...... اب نہیں۔“ نور پر نے قطعیت سے کہا۔

”تم بولو نور پر مجھ کو بھی بتاؤ بولو۔“ ابھی بہت دیر بعد بولی تھی۔

”ہمارے یہاں آئی مین میری دادی سے پہلے زمانے میں...... بالغ ہوتی بچیوں کے جسموں آئی مین سینے پر پوری کے سائز کی کچی پکی روٹی بنا کر کپڑا رکھ کے سینک دیا جاتا جسٹ لائک ٹکور کی طرح...... اس طرح کرنے سے جسم کی تیزی سے ہوتی نشوونما دھیمی پڑ جاتی ہے۔ بچیاں فوری نوٹس میں نہیں آتیں، وہ اپنا بچپن زیادہ جی لیتی ہیں۔ جلدی بڑی نظر نہیں آتیں۔“ نور پر جیسے بہت طویل میدان میں بھاگ کر لوٹی تھی وہ بات مکمل کر کے اب سر

جھکا کر بیٹھی تھی...... شاید مزید نہ بولنے کے لیے۔

''ویری ایزی، ویری گڈ نوپر......'' امبی کی شانت آواز ابھری۔''یہ زیادہ اچھا ہے، آئی لائک دس بٹ آر یو شیور رزلٹ ہنڈرڈ پرسنٹ ہوئے گا ناں؟'' فرحت کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں اس کے کھلے ہونٹوں پر بڑی دو انگلیاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ اس کے وجود میں بیٹی پل رہی تھی اس کے پاس دو دل تھے اور دونوں خوف سے دھڑک رہے تھے، لرز رہے تھے۔ مائیں اولاد کو سرد و گرم سے بچاتی ہیں، ڈھال ہوتی ہیں۔ وہ بچے کی حفاظت کے لیے آخری حد تک جا سکتی ہیں۔ کسی بھی حد تک...... کسی بھی حد تک......؟ حد کا تعین کس کتاب میں ہوگا؟

''ایزی بے بی۔'' امبی نے اسے پچکارا۔''تم کیوں ٹائرڈ ہوتا؟ ام اپنا بے بی کے لیے بوہت اچھا سوچتا جیسے۔''

''یہ...... یہ صحیح نہیں ہے امبی...... تم غلط کرو گی نوپر دس از ناٹ فیئر۔'' اس نے باری باری دونوں کی سمت چہرے گھمائے۔

''تو ہے کوئی حل تمہارے پاس؟'' نوپر نے اسے لاجواب کرنے کی کوشش کی۔ ''میں شرما کو نہیں چھوڑ سکتی میں سونی کو ہاسٹل بھی بھیجنا نہیں چاہتی مجھے اس سے بے حد پیار ہے، میں اسے ہر پل اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں اور شرما کو چھوڑو...... اسکول میں سیکس پڑھایا جائے گا بیڈ بوائز بلکہ بیڈ گرلز سب یہاں ڈھیروں ہیں، میں واپس نہیں جا سکتی میں اسے گھر مندر جیسے پوتر ماحول میں پالنا چاہتی پر یہ کیسے ممکن...... پتا ہے میں نے کیا سوچا ہے دو تین سال گزریں گے میں اسے سب کچھ خود کھول کھول کر بتادوں گی تا کہ وہ دھوکا نہیں کھائے کسی بھی طرح لُٹ نہ جائے پر ابھی وہ بہت چھوٹی ہے میرے پاس؟'' نوپر کے پاس الفاظ کم پڑ گئے اس کے منہ سے کف نکل رہا تھا۔ وہ جیسے نڈھال ہوگئی۔

''یہ رائٹ بولتا ابھی جلدی کا تو ایسا سلوشن لیکن ایدر کا ماحول بوہت خراب...... ویری ٹف ہوتا جیسے بے بی گرل کا کیئر...... کل کو تم بھی بے بی گرل لاتی...... تو یاد رکھو تم بھی ایسا ہی سوچو...... لائک می...... لائک نوپر۔''

فرحت کے حلق سے آواز نکلنی مشکل تھی۔ وہ دھیرے دھیرے نفی میں سر ہلا رہی تھی اگر زبان سے بولتی تو شاید پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی اس نے بوتل منہ سے لگائی آنسو ڈھلک آئے تھے۔

''ایسے بی ہیو کا کیا مین فرحت؟'' نوپر کا موڈ بگڑا۔ ''کیا تم دس بارہ سال بعد اپنی بے بی کے لیے ایسے فکرمند نہیں ہوگی ہنہ؟'' اس نے فرحت کا سراپا جانچا۔

''نو...... نو...... نیور۔'' فرحت نے قطعیت اور یقین سے انکار کیا اس نے ضبطِ گریہ کے لیے اپنے پورے جسم کی قوت مجتمع کی تھی۔

''میرے پاس بہت ایزی سلوشن ہے۔'' امبی اور نوپر کی آنکھیں چمکیں۔

''ہماری دو سال کی دوستی میں...... اہم ہے تینوں کا مذہب بالکل الگ اور ہم نے کبھی اسے ڈسکس بھی نہیں کیا، ضرورت بھی کیا تھی۔ میں تبلیغ نہیں کرتی لیکن ہمیں اس مسئلے کا حل چودہ سو سال پہلے اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لو، کے انداز میں بتا دیا گیا میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔ جانے دو...... میں یہ نہیں کہوں گی کہ ہمارے یہاں مرد گندی نظریں نہیں ڈالتے، ہمارے یہاں سوتیلے باپ بیٹیوں سے بے ایمانی کا رشتہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بچوں، بچیوں کے ساتھ ہمارے ہاں بھی ہر قسم کی زیادتیاں ہو جاتی ہیں۔ برے لوگ ہمارے ہاں بھی ہوتے ہیں۔ گھروں میں گلیوں میں، راستوں میں، بازاروں میں، اسکول میں ...... بلکہ مسجد میں بھی برے لوگ ہو سکتے ہیں مسجد کا دروازہ ہر ایک کے لیے ہمیشہ کھلا ہوتا ہے۔ شیطان بھی اس سے گزر کر اندر باہر آسانی سے آتا جاتا ہے۔ شیطان وہاں جا کر کسی کے اوپر بھی سواری کر لیتا ہے، اس نے روزِ اول اسی کی قسم کھائی تھی پر چھوڑو...... تم لوگ نہیں سمجھو گی لوگ ہمارے ہاں بھی دودھ کے دُھلے نہیں۔ انفرادی اور اجتماعی زیادتیاں بھی ہوتی ہیں بچے بھی اغوا ہوتے ہیں۔ انہیں پامال بھی کیا جاتا ہے مار دیا جاتا ہے۔ دنیا کے تمام گندے بے ہودہ کام ہم سے بھی سرزد ہوتے ہیں پر ہم ان کا اہتمام نہیں کرتے یعنی وہ دوسروں کی عبرت کے واسطے اللہ نے

لکھ دیے ہوتے ہیں قسمت میں اس لیے پیش بندیوں کے باوجود ہو جاتے ہیں۔ میں کیسے سمجھاؤں مجھ میں وہ ہنر کہاں...... لیکن پلیز میں تمہیں یا تمہارے مذہب یا رسم و روایات کو قطعاً غلط نہیں کہہ رہی۔ ہماری دوستی ان چیزوں سے ہٹ کر ہے لیکن میں کچھ...'' فرحت نے سر جھکا اس کے پاس موزوں الفاظ کی شدید قلت تھی۔''تم نے اپنے طریقے بتائے بنا مسائل کا حل...... پر میں اپنے حساب سے کہوں گی۔ تم فقط جملہ سمجھ کر سن لو میں کسی بھی چیز کا پرچار نہیں کر رہی لیکن میرے ان جملوں میں میرا طریقہ چھپا ہے عمل کرنا نہ کرنا تمہارے اوپر ہے بولو ہمارے PROPHET (PBUH) سے یعنی۔'' فرحت بہت مشکل میں پڑ چکی تھی۔ محمد ﷺ کا نام سنتے ہی نوپر کی آنکھیں مسکرائیں اور ماتھے پر تیوریاں آرکی تھیں۔ ''ہمارے ہاں وومن کو عورت کہتے ہیں، عورت کا مطلب، چھپی ہوئی چیز وہ جتنی زیادہ دِکھے گی اتنا پرابلم ہوگا ہمارا...... religion عورت کو بند نہیں کرتا بٹ وہ اسے وے آف لائف دیتا ہے بہت آسان...... پلیز نوپر ون منٹ......!'' نوپر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا فرحت نے اس سے وقت مانگ لیا۔

''وہ (محمد ﷺ) کہتے ہیں عورت چھپا کر رکھنے کی چیز ہے۔ اسلام سے پہلے arabic women دوپٹا سر پر ڈال کر پیچھے پھینک دیتی تھیں۔ انہوں نے کہا دوپٹے کو سینے پر ڈال لو۔ گردن چھپاؤ، بازو اور پیٹ اور کولہے اور خوشبوئیں استعمال کر کے باہر مت جاؤ اور......''

''پلیز فرحت اسٹاپ اٹ...... بس۔'' نوپر کی برداشت ختم ہوگئی تھی۔ اس کا حتمی انداز فرحت کی زبان لڑکھڑا گئی۔

''تم میری پوری بات تو سن لیتیں میں تو......''

''میرا خیال ہے اب اس بارے میں مزید بات نہیں ہوگی۔ مسلم کے ہاں ان سب کے باوجود سب کچھ ہوتا ہے۔'' نوپر چبا چبا کر بولی۔

''میں نے تو پہلے ہی کہا کہ دنیا کی تمام برائیاں ہمارے ہاں بھی ہیں۔ تمام برے کام ہم سے بھی ہوتے ہیں۔ شیطان کا شکار تو کوئی بھی......''

''جانے دو فرحت کوئی اور بات کرو۔ مجھے جو بہتر لگے گا میں کروں گی اور امبی کو جو...... وہ، وہ کرے گی۔''

''ون منٹ نوپر، فرحت کو اپنی بات کرنے دو میں اسے سننا چاہتی ہوں...... پلیز فرحت سلوشن دو تمہارا طریقہ بتاؤ...... ایزی یا مشکل۔'' امبی ہمہ تن گوش تھی نوپر کے خفا اور کچھ جارحانہ تیور اچنبھے کا باعث تھے اس کے لیے...... مگر اسے فرحت کو سننا اچھا لگ رہا تھا۔

''کوئی طریقہ نہیں۔'' فرحت نے جیسے ہار مان لی۔

''نو بے بی کہو تم......'' امبی نے اپنا سیاہ موٹا ہاتھ فرحت کے شانے پر رکھا۔ اس کی بڑی آنکھوں میں نرمی اور بڑھاوا تھا۔ سیاہ ہونٹوں پر حقیقی سی مسکراہٹ۔

''کیا بولوں اب؟'' فرحت نڈھال ہوگئی تھی۔ آج کے انکشافات نے اسے توڑ دیا تھا۔ دنیا کیا ہے اور دنیا میں کیا، کیا ہو رہا ہے۔ صحیح کے نام پہ غلط پتا نہیں آسان راہوں کو چھوڑ کر کانٹوں پر چلنے والے لوگ جانتے بوجھتے، امبی نے اس کا بازو ہلا کر اسے چونکایا۔ فرحت کے ہونٹوں پر پژمردہ سی مسکراہٹ آگئی۔

''ماننا نہ ماننا سمجھنا نہ سمجھنا تم لوگوں کی اپنی مرضی...... لینی کی اور سونی کی یہ ڈریسنگ یہ اچھل کود بلکہ یہاں نظر آتی تمام عورتیں بچیاں گرلز سب...... یہ دعوتِ عام دیتے لباس......'' نوپر یک دم اٹھ کھڑی ہوئی اس کے چہرے پر تنفر تھا۔

''بیٹھو ادھر۔'' امبی نے اس کا ہاتھ کھینچ اپنے پہلو میں گرایا۔ وہ بیٹھی یوں کہ جیسے موقع ملتے ہی بھاگے گی۔ فرحت کے لیے الفاظ کا چناؤ بہت مشکل تھا۔ امبی نے نوپر کی عصبیت کو جان لیا تھا پر فرحت کو بھی سن لینا چاہتی تھی۔

وہ باتونی یا حاضر جواب بھی نہیں تھی۔ اس نے جو راستہ اختیار کرنا چاہا تھا نہ جانے کیوں نوپر اس پر یک دم بگڑ گئی تھی، یہاں امریکا میں مذہب ویری پرسنل شے کی طرح تھا۔ جس کا جدھر سینگ سمائے گھس جائے۔

''دیکھو امبی!'' اس نے قصداً اپنا مخاطب امبی کو بنایا۔''ہمارے مذہب میں ہر......''

''مذہب کا پرچار مت کرو......'' نوپر کی آواز اونچی اور انداز جارحانہ تھا۔ فرحت ڈر سی گئی۔

"میں دیکھوں گی اگر بھگوان نہ کرے کل کو تم میری جیسی سچویشن میں آجاؤ تو اپنی اس بے بی کی سیفٹی کیسے کروگی؟ اس وقت تمہارا مذہب اور تمہارا......"

"پلیز نوپر......" نوپر کے جملے کے اختتام سے پہلے فرحت نے جان لیا وہ کیا کہنا چاہتی تھی تڑپ کر ہاتھ اٹھا کے اسے وہیں روک دیا۔

"تم اب مزید کچھ مت کہنا، میں بھی کچھ نہیں بول رہی... اسٹاپ تم نے اپنے حساب سے بات کی میں اپنے بیک گراؤنڈ کے حوالے سے بولوں گی انسان جو دیکھتا کرتا ہے اسی کو بیان کرتا ہے، دراصل......" وہ دوبارہ شروع ہوئی لیکن اس بار نوپر کا مارے باندھا سا انداز اور آنکھوں سے چھلکتا استہزا... اور حقارت...... وہ اس بار چپ ہوئی تھی دوبارہ نہ بولنے کے لیے......

"میرے خیال میں تم لوگوں کے اپنے طریقے زیادہ مناسب ہیں تم ان ہی کے بارے میں سوچو۔" اس نے سر جھٹک کر جیسے ہر شے پر لعنت بھیجی، وہ دری پر پڑے سامان میں سے اپنی چیزیں اٹھانے لگی تھی۔ امی اس کی خفگی سمجھ گئی۔ نوپر نے جان چھوٹنے والے انداز میں سر جھٹکا۔ وہ بہت اچھی دوست تھی۔ بہت اچھی انسان بھی مگر اس کی شخصیت میں انتہا پسندی کا بھی ایک حصہ تھا۔ فرحت کا دل بھر آرہا تھا۔ وہ بہت خوشی سے دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے آئی تھی لیکن اب بوجھل دل کے ساتھ جارہی تھی۔ کاش وہ انہیں قائل کرسکتی۔ نوپر اس کی بات تو سن لیتی۔ اتنی قوتِ برداشت تو ہونی چاہیے کے ایک دوسرے کو سن سکیں۔ اختلافِ رائے تو حق ہوتا ہے۔

"دفع، لعنت ہو!" اس نے خود کو درشتی سے لتاڑا۔ وہ بائے کہہ کر بچوں کو پکارنے والی تھی جب نگاہیں بھٹک کر ایک بار پھر لینی اور سونی پر ٹھہر گئیں۔ اس نے تصور کی آنکھ سے امی کو دیکھا جو گرم دہکتے ڈنڈے سے لینی کو داغ رہی ہے، لینی تڑپ رہی ہے اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا ہے وہ ایڑیاں رگڑ رہی ہے۔ اسے بڑی بڑی ہرنی آنکھوں والی سونی کمار دکھائی دی جو خوف زدہ نگاہوں سے ہراساں اپنی ماں کو دیکھ رہی ہے۔ ماں کیا کررہی ہے، کیوں کررہی ہے اس کے معصوم ذہن کے سوالات؟ اس کے ہونٹ ساکت اور سہمی آنکھیں...... نوپر کھڑی ہوچکی تھی وہ انگلیوں سے اپنے بال سنوار رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خفگی تھی۔ جان چھوٹ جانے کی طمانیت کے ساتھ...... فرحت کے ہونٹ پھڑ پھڑا گئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سرخ ہاتھوں پیروں والی سبز و سرخ چوڑیوں سے سجی شوخ کپڑوں میں ملبوس گوری چٹی بے جی آکھڑی ہوئی تھیں۔ فرحت کے دماغ میں کلک ہوا۔

"ارے...... نوپر...... نوپر سنو۔" وہ اونچی آواز میں بولی۔

"سنو ایک بات...... قسمت میں برائی نہ لکھ دی ہو؟ اللہ رحم لیکن میرے ساتھ ایسا ویسا کچھ نہیں ہوگا...... کیونکہ...... امی sit here اِدھر سنو میری بات...... میری بے جی تھیں میری دادی...... مطلب میرے فادر کی ممی...... ان کے پاس ایک نسخہ تھا۔"

"بیٹھو نوپر سن کر جانا۔" نوپر ڈھیٹ بنی کھڑی تھی۔ امی نے اپنی پاٹ دار آواز لگائی اور اسے اپنے برابر گرانے کے انداز میں بٹھالیا۔

سمجھانے کے لیے اس کے پاس الفاظ کی کمی تھی۔ مثالیں سننے کو سامع تیار نہیں تھے لیکن اس بار اسے ایک واقعہ سنانا تھا۔ کسی بھی کمی اور اضافے کے بغیر...... اسے بس راوی کی طرح بیان کرنا تھا۔

اس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ آنکھوں میں چمک اور لہجہ پُریقین...... اسے بائیس برس پہلے کا وہ ایک دن من و عن بیان کرنا تھا اور یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ نہ تو سنانے میں اور نہ عمل کرنے میں۔ فرحت کی آنکھوں میں چمک تھی۔ اس نے آج دیکھی جانے والی اور سنی جانی والی باتوں کو سوچا۔

خیالات منتشر تھے مگر ایک واضح یقین...... جو دل کو دل ہی دے رہا تھا۔ قسمت میں برائی...... آزمائش نہ لکھ دی گئی ہو......؟ (خدانخواستہ) ورنہ میرے ساتھ...... یعنی...... میری بچی کے ساتھ کبھی برا نہیں ہوگا۔

فرحت کو خود پر...... اپنے معاشرے، اپنی تربیت اور اپنے مذہب کی تعلیمات پر آنکھ بند کر کے یقین تھا۔

●●

عیدآئی ہے

زاہدہ پروین



عید کے پُرکیف اور یادگار لمحات جاری و ساری تھے۔ گلی کوچوں، بازاروں اور گھروں کے اندر تک ایک چہل پہل اور سرخوشی و سرشاری کا سماں تھا۔ چھوٹے بڑے سب خوش و خرم تھے۔

اچانک تایا ابا کی آواز سنائی دی۔

"بیٹی! حافظ غلام غوث آئے ہیں جلدی سے شیر خرما بھجواؤ۔"

"ائے ہے...... آج عید کے دن وہ کہاں سے

آ گئے؟ خیریت تو ہے؟''

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔'' تایا ابا نے تائی اماں کی بات کا جواب دیا۔

''اللہ نے اُن کو مرتبہ عطا فرمایا ہے، ماشاء اللہ مہینے بھر سے ہماری جامع مسجد میں وہی تو نمازِ تراویح پڑھا رہے تھے۔ ابھی میں انہیں عید گاہ سے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔''

ان کی بات سنتے سنتے میں باورچی خانے میں آ گئی۔ شیر خرما اور دیگر لوازمات ٹرے میں سجا کر باہر بھجوائے اور خود اوپر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دل و دماغ پیچھے کی طرف لوٹ گئے تھے۔

☆☆☆

ایک لڑکی...... بچپن اور لڑکپن کے حسین سنگم پر کھڑی...... ایک انجان، بے خبر اور معصوم سی لڑکی۔

وہ لڑکی کسی نہ کسی بہانے ہر عید کے دن ہر صورت چھم سے میرے تصور میں ضرور اترتی ہے۔

اس واقعے کو گزرے کتنی ہی رُتیں بیت گئی ہیں مگر وہ مجھے ہر عید پر ضرور یاد آتی ہے، لوگ اس پر عجیب عجیب تہمتیں لگاتے مگر میں کسی کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھ سکتی کیونکہ میں جانتی ہوں اس وقت میری بات کا اعتبار کوئی نہ کرتا لوگوں کو جو کچھ بظاہر دکھائی دیا تھا وہ سب مجھ تنہا کے دلائل پر غالب آنے کو کافی تھا اس وقت کس کو غرض پڑی تھی کہ گہرائی میں اترتا۔

جبکہ اگلے روز...... کچھ اسی نوعیت کی سرخی جمی تھی۔

''چودہ سالہ لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ فرار، خالی مکان میں دو سالہ بھائی اکیلا روتا ہوا پایا گیا۔''

روز بروز گزرے واقعے پر وقت کی اُڑتی ہوئی دھول جمتی چلی گئی، لوگ اس قصے کو بھول ہی گئے لیکن ہر سال عید کے دن وہ لڑکی میرے آس پاس ضرور منڈلانے لگتی۔

☆☆☆

ثریا اپنے نمازی، پرہیز گار اور بے حد چاہنے والے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ چونکہ واحد اولاد تھی اس لیے جتنے ناز نخرے اٹھائے جاتے کم تھے، ایسے حالات میں مغرور اور خود سر ہو جانا بھی قدرتی امر مگر یہاں معاملہ قطعی برعکس تھا۔ والدین کی محبت، شفقت اور عنایات تو ثریا کو خوب ملی تھیں مگر تربیت نہ جانے کس انداز میں ہوئی تھی کہ ماں، باپ کا پرتو اس کی شخصیت میں نہیں جھلکتا تھا۔

باپ حافظِ قرآن تھے، ماں تہجد گزار و پرہیز گار...... دونوں ہی عبادت گزار میاں، بیوی ہر ممکن حد تک خلافِ شرع کوئی کام نہ کرتے۔ اپنے مذہب اسلام سے دیوانہ وار الفت رکھنے والے۔

ان حالات میں چاہیے تو یہ تھا کہ ان دونوں کی بیٹی ان سے بھی بڑھ چڑھ کر لائق نکلتی لیکن یہاں چراغ تلے اندھیرا نظر آ رہا تھا، ثریا کیا تھی کہ جیسے اولیا کے گھر شیطان پیدا ہو گیا تھا۔

محلے بھر کی لڑکیاں بالیاں ثریا کی والدہ عطیہ بیگم سے قرآن پاک پڑھنے آتی تھیں۔ اِدھر دوپہر کے سائے ڈھلے، گھر گھر سے ایک ایک دو، دو بچیاں سلیقے سے دوپٹا اوڑھے، قرینے سے سپارہ سینے سے لگائے ان کے آنگن میں جمع ہونے لگتیں۔ عطیہ بیگم نہایت خندہ پیشانی سے سب میں مشغول ہو جاتیں۔ قاعدے کے مطابق ثریا پانچ برس کی ہوئی تو عطیہ بیگم نے اسے بھی پڑھنے کے لیے بٹھا لیا لیکن عجب سانحہ ہوا۔

غیروں کی بچیاں تو اُن سے فیض اٹھا رہی تھیں مگر اپنی پیٹ جائی کا پڑھنے کے نام سے دم نکلتا تھا۔ عجیب رنگ ڈھنگ پائے تھے اس نے...... سارا سارا دن گڑیوں کے گھر بنانے، بگاڑنے میں گزار دیتی کھیل کود میں جس درجہ خوش رہتی، تعلیم سے اسی قدر بدکتی تھی۔

ڈانٹ ڈپٹ، پیار محبت ہزاروں جتن کر کے عطیہ بیگم نے بہ مشکل اسے قرآن حکیم ختم کروایا۔ بس ایک مرتبہ پڑھنے کے بعد اس نے دوبارہ ماں کا کلیجا ٹھنڈا نہ کیا۔

یوں تو وہ ماں باپ دونوں کا دل سے احترام کرتی تھی۔ عمر اور وقت کے ساتھ ساتھ گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ صفائی ستھرائی، پکانے ریندھنے میں بھی ماہر ہوتی جا رہی تھی۔ بس عیب تھا تو یہ کہ پڑھنے لکھنے میں دیدہ نہ جمتا تھا اور نہ ایک جگہ ٹک کر بیٹھ سکتی تھی۔ ہر لمحہ پاؤں میں بلی بندھی رہتی۔ ابھی یہاں ہے تو ابھی وہاں۔ بلا کی شوخ فطرتاً چلبلی اور حاضر جواب تھی۔

گو اکلوتی بیٹی تھی مگر عطیہ بیگم کو ایک عادت بہت کھلتی تھی اور وہ تھی اس کی بات بے بات قہقہہ بازی...... ابھی بات سامنے والے کے منہ میں ہی ہوگی کہ اِدھر ثریا کا بلند و بانگ ٹھٹھا حلق سے آزاد بھی ہو چکتا۔ خبر نہیں کیسی ڈھیٹ مٹی سے تخلیق کی گئی تھی کہ ہزار روک ٹوک کے باوجود اس کی فطرت سے یہ ادا نہ خارج ہوئی تھی۔

بیک نظر تو دیکھنے والے یقین ہی نہیں کر پاتے تھے کہ یہ ہنس مکھ، شوخ و شریر اور پھلجڑی سی لڑکی دراصل حافظ صاحب اور عطیہ بیگم جیسے سنجیدہ مزاج اور رکھ رکھاؤ والے والدین کی بیٹی ہو سکتی ہے۔ اس کے ہلکے پھلکے وجود میں تو گویا قہقہوں، مسکراہٹوں، ہنگاموں اور...... بے موقع شور غل کا ایک عظیم ذخیرہ تھا جو وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔

اس کو قدرت نے بنایا بھی بہت فرصت کے اوقات میں تھا اتنے نک سک سے درست دنیا میں کم کم صورتیں ہوں گی۔ پہلی نظر میں میدہ سا شہابی چمچماتا ہوا رنگ ہی دیکھنے والے کو لے ڈوبتا تھا۔ سونے پر سہاگا پٹر پٹر باتیں کرنے کا انداز، پھلجڑیاں سی چھوڑتی ہنسی...... جیسے کوری صراحی ننھے منے قہقہے لگا رہی ہو، بات بے بات شوخ شوخ کھٹے میٹھے جملوں کے تیر سامنے والے کا دل ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے تھے۔

چودہ برس کی عمر میں وہ غضب کی اٹھان تھی کہ دیکھنے والوں کے کلیجے دہل جاتے تھے۔ گورے گورے گداز پیروں اور چمکتی دمکتی ایڑیوں والی ثریا جب کام کاج کرتی آنگن میں اِدھر اُدھر دھم دھماتی ہوئی پھر رہی ہوتی اور ایسے میں اتفاقاً حافظ صاحب کی نگاہ پڑ جاتی تو وہ بے چینی سے نظر پھیر لیتے۔

مائیں تو بیٹیوں کو جنم دیتے ہی ان کے مستقبل کے لیے متفکر ہو جایا کرتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ جب یہ فکر باپ کے دماغ میں ڈیرے جماتی ہے تو پھر کوئی نہ کوئی فیصلہ کروا کر ہی دم لیتی ہے۔ یہی کچھ اس گھر میں بھی ہوا۔

''بیٹیاں اوّل دن سے پرایا دھن ہوتی ہیں، تم بھی اب رخصتی کی تیاری کرو، میں نے ایک معقول اور بہت مناسب بر تلاش کر لیا ہے۔'' ایک روز انہوں نے بیوی کے ہاتھ پر چند نوٹ رکھ کر کہا۔ انہوں نے اس سے آگے مزید کوئی تفصیل بتائی اور نہ ہی عطیہ بیگم نے بال کی کھال نکالی۔ نہ کرید کرید کر پوچھا نہ واویلا مچایا۔

زیادہ دن نہیں بیتے تھے کہ ثریا کا وقت و حالات کے مطابق جہیز بن کر تیار ہو گیا۔ حافظ صاحب اور عطیہ بیگم دونوں ہی شرع کے سختی سے پابند تھے۔ ہر بات اور ہر واقعے پر شاکر و صابر رہنے والے۔

چودھواں ختم کر کے پندرھویں سال میں قدم رکھنے والی ثریا بے چاری کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ اس کا تو نئے نئے کپڑوں اور گہنے زیور سجانے اور آرزو رکھنے والا دل آنے والی خوشیوں کے خیال سے بلّیوں اچھل رہا تھا۔ ارمانوں نے اچھل کود مچا رکھی تھی۔

محلے بھر کی لڑکیوں کو اپنے بیاہ کی خبر خود اسی نے لہک مہک کر سنائی تھی۔ اتنی نٹ کھٹ اور کھلنڈری بھی نہ ہو کوئی لڑکی...... مگر اس کے بھیجے میں عقل نام کی کوئی شے تھی ہی نہیں...... ان دنوں یوں خوش خوش اور مگن مگن پھرتی گویا ہفت اقلیم مل گئی ہو۔

عطیہ بیگم بے چاری اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر کڑھتیں اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔ کیا کیا جتن نہ کیے تھے انہوں نے بیٹی کو باشعور بنانے

کے مگر اس معاملے میں وہ کم نصیب تھیں پھر آس پاس رہنے والوں نے دیکھا نہ ڈھولک بجی نہ دھوم دھڑ کا ہوا نہ انواع و اقسام کے کھانے پکوائے گئے نہ پچاسوں مہمان مدعو کیے گئے۔ بس اِک ذرا عورتوں کو جمع کر کے ثریا کو مہندی لگادی گئی۔

اگلے روز...... نہایت خاموشی کے ساتھ مختصر لوگوں پر مشتمل ایک گروہ، جسے بارات کہنا اچھا نہیں لگ رہا تھا، حافظ صاحب کی ڈیوڑھی میں اُترا۔ جن کے ہمراہ باجا گاجا تو دور کی بات نہ بڑھیا چڑھاوا تھا نہ شاندار بری...... اور پھر دولھا کو دیکھ کر تو سبھی حافظ صاحب کی سادہ لوحی، شریف نفسی اور قناعت پسندی پر اش اش کر اٹھے۔

نیچے سفید کُرتے، ٹخنوں اٹھی شلوار، سر پر صافہ، یہ لمبی سیاہ داڑھی اور نورانی چہرے والے دولھا کو دیکھ کر دل آپ ہی آپ احترام کی طرف مائل ہوجاتا تھا۔ جس کسی نے انہیں دیکھا، حافظ صاحب کے حُسنِ انتخاب کی داد دی۔

حافظ صاحب نے بریانی اور زردے کی کل دو دیگیں اتروائی تھیں۔ بارات کے آتے ہی محلے کے چند افراد کی موجودگی میں سوا بتیس روپے حق مہر کے عوض ثریا کا نکاح قاری غلام غوث سے پڑھوا دیا گیا، جس کے فوراً بعد سب کو کھانا کھلوایا گیا اور اس طرح دس بجے آنے والی بارات ساڑھے بارہ بجے دلہن لے کر رخصت بھی ہوگئی۔

☆☆☆

اپنی سسرال میں ثریا کو ایک بالکل ہی نئے قسم کے ماحول سے سابقہ پڑا۔ میکے میں تو اس نے والدین کے سوا کوئی دوسرا رشتے دار نہیں دیکھا تھا جبکہ قاری غلام غوث کے مشترکہ فیملی سسٹم نے اسے حیرت زدہ کر ڈالا۔

ایک بے حد وسیع و عریض احاطہ تھا۔ جس میں کئی رشتے دار مل جل کر رہ رہے تھے۔ قاری غلام غوث کے تین عدد ماموں، دو شادی شدہ پھوپیاں اور دور و نزدیک کے کئی عزیز الگ الگ رہ رہے تھے جبکہ خود اس کی سسرال میں بھی خوب بھیڑ بھاڑ تھی۔

قاری غلام غوث کے تین بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ والدین حیات تھے۔ دو بڑے بھائی شادی شدہ اور تقریباً درجن بھر بچوں کے والدین تھے اور مزے کی بات یہ کہ ایک ہی گھر میں باہم جُڑ کر رہتے تھے۔ والدین سب پر مطلق العنان حکمران کی طرح حکومت کرتے تھے۔ ہر ماہ سب بیٹے بکمالِ سعادت مندی سے اپنی آمدنیوں کا بڑا حصہ ان کی ہتھیلی پر دھر دیتے اور بے فکر ہوجاتے مگر قابلِ تعریف پہلو یہ تھا کہ اتنے افراد کے بیک وقت ایک جگہ رہنے کے باوجود کسی طرح کی گڑ بڑ نظر آتی تھی اور نہ ہی اونچ نیچ دکھائی دیتی تھی۔

گھر کیا تھا، اچھا خاصا گہما گہمی سے پُر ایک بارونق بازار تھا۔ جس میں وقت اور حالات کے مطابق ہر روز اور ہر وقت نئے نئے چہروں کا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ کیونکہ ایک ہی احاطے کا رہنا تھا اس لیے ابھی چچی چلی آرہی ہیں تو ابھی خالہ بیٹھی ہیں، اسی طرح ماموں زاد، پھوپی زاد، چچا زاد، خالہ زاد بہن بھائیوں کی بھی بھرمار تھی۔

چنانچہ جس دن ثریا یہاں بیاہ کر آئی تو ایک دوسرا ہی رنگ دیکھنے میں آیا جس نے دلہن کے ہوش اُڑا دیے۔

ثریا کے اپنے میکے میں تو شور شرابا ہوا تھا نہ جمگھٹا لگا تھا۔ بڑی سادگی اور خاموشی سے رخصتی ہوگئی تھی مگر...... اب سسرال میں ایک زبردست ہنگامہ برپا تھا۔ ہر سائز اور ہر ڈیزائن کے چھوٹے بڑے ان کے آنگن میں جمع تھے۔ جلد از جلد اور پہلی نظر میں ہی دلہن کا تفصیلی معائنہ کرنے کو ہر کوئی اپنا حق سمجھ رہا تھا۔ چونکہ حافظ صاحب نے گنتی کے باراتی بلوائے تھے، اس لیے سب کے سب رشتے اپنے اپنے ارمان دلوں میں دبائے یہیں بیٹھے دولھا، دلہن کا انتظار

کر رہے تھے۔

دلہن کو کمرے میں بٹھاتے ہی صحن میں بکھرے اجلے اجلے لباسوں میں ملبوس لڑکے لڑکیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لہٰذا بڑوں کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود سب نے دلہن کے کمرے پر دھاوا بول دیا۔ انسانوں کا زبردست ریلا آیا اور سمندر کی سرکش موجوں کی طرح کمرے کے ہر کونے اور ہر گوشے میں پھیل گیا۔

چند لمحوں کے لیے جیسے یہ کمرا کل کائنات سے کٹ کر رہ گیا۔ فضا سُریلے قہقہوں، ملی جلی آوازوں اور ہنسی کے شور سے گونج رہی تھی۔ ان ہنگامہ خیز اور پُرشور گھڑیوں میں جبکہ ہر کوئی وقتی طور پر دلہن کو بھول کر اپنے دفاع میں مصروف تھا، دلہن غریب پر ایک نرالی ہی افتاد ٹوٹ پڑی۔

کسی شریر اور چنچل ہستی نے ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر دلہن کا گھونگٹ الٹ دیا۔

ثریا نے کسمسا کر پہلو بدلا۔

اب جو ثریا کی سی بالی عمر کے بجائے کوئی پختہ عمر یا سنجیدہ مزاج لڑکی ہوتی تو بجائے مدِ مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے اپنے دوپٹے اور گھونگٹ کو درست کرتی لیکن وہ ٹھہری ثریا...... جو سامنے والے کی بات ابھی منہ میں ہی ہوتی کہ ایک عدد قہقہہ دے مارتی تھی اس کے منہ پر۔

اس نے جھٹ سے پلکیں اٹھائیں اور ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھنے لگی۔ وقت، وقت کی بات ہے، پہلی ہی نظر میں دلِ معصوم پر ایک خاص اثر ہوا۔ دیکھنے والے کا انداز اتنا دلکش، والہانہ اور متاثر کُن تھا کہ ثریا کے اندر ہر طرف ہلچل مچ گئی۔

دو گہری گہری حساس نگاہیں اس کے پورے وجود کے گرد حصار باندھے ہوئے تھیں۔ یہ حقیقت تھی کہ ثریا نے زندگی میں پہلی بار دو نامحرم مگر مہربان آنکھیں اپنے اس قدر قریب دیکھی تھیں۔ شادی کے

تذکرے سے آج تک اس کے تصور میں جگمگا اٹھنے والے دولھا کے چہرے پر یہ مردانہ چہرہ بالکل فٹ آرہا تھا۔

پھر جیسے ان جام لنڈھاتی، پُرشوق اور وارفتگی سے تکتی نگاہوں کو ہوش آگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شور مچاتے کھلکھلاتے چہروں میں کھوگئیں۔ بس...... وہ پہلی نظر ہی ثریا کے لیے حاصلِ زیست بن گئی۔

☆☆☆

بظاہر تو وہ قاری غلام غوث کی دلہن بن کر اس آنگن میں اتری تھی...... مگر درحقیقت اس کا دھیان دن رات کے ہر پہر ان پُراثر آنکھوں میں پڑا رہتا۔ نگاہیں ہر روز اسی کو ڈھونڈتیں۔ روح اسی کو پکارتی۔ دل کو وہی بھا گیا تھا۔ بے ایمان دل کا کیا علاج تھا بھلا؟

پرویز نے بھی غضب کر ڈالا تھا، دن بھر میں آنے بہانے ایک دو چکر اس گھر کے ضرور ہی لگا جاتا۔ گو وہ غلام غوث کا سگا پھوپی زاد تھا اور حیرت انگیز پہلو یہ کہ خود بھی شادی شدہ اور بچوں کا باپ تھا۔ اس کی بدنیتی کو کیا کہا جائے کہ جو ثریا کو پہلی نظر دیکھتے ہی چاروں ہاتھوں پیروں سے اسی پر ریجھ گیا تھا۔

سسرال میں چند دن گزارنے کے دوران ہی ثریا کو پرویز کے کوائف معلوم ہوگئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ پرویز کو دیکھنے کے بعد نہ اپنے دل و دماغ پر کنٹرول رکھ سکتی تھی اور نہ ہی اسے خوفِ خدا ستاتا تھا کہ ایک شریف النفس شخص کی بیوی ہو کر کسی دوسرے کی چاہ میں مری جارہی تھی۔

☆☆☆

غلام غوث بذاتِ خود انتہائی خود دار اور نیک طبیعت انسان تھے بلکہ بہت ہی قناعت پسند اور صابر بھی تھے۔ ایک مقامی مدرسے میں اس زمانے میں چند سو کی ملازمت ملی ہوئی تھی اسی میں مگن تھے کہ والدین کو شادی کی سوجھی۔ بات کہیں سے کہیں پہنچی، قسمت کا لکھا ثریا کے ہاں جا کر پورا ہوا۔ وہ پہلی نظر میں ہی اپنے سسر صاحب کو پسند آگئے تھے، یوں یہ نکاح ہوگیا۔

اپنی بیوی ثریا سے انہیں بے حد انسیت اور لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ کچھ قدرت نے ثریا کو اس درجہ بھولا چہرہ اور حسین اداؤں سے نوازا تھا کہ انہیں کبھی حقیقت کا معمولی اندازہ تو درکنار، ذرا سا شبہ بھی نہ ہوسکا۔ یوں بھی بھرا پُرا آباد گھر تھا۔ عزیز رشتے داروں کا دن رات آنا رہتا تھا، ایسے میں پرویز کی نظروں اور ثریا کے کرتوتوں کو کوئی نہ بھانپ سکا۔ ویسے بھی تعلق نظر بازی تک محدود تھا...... یا پھر کبھی کبھار گھر کے کسی کونے کھدرے میں چند معنی خیز جملوں کا موقع مل جاتا۔

شادی کے دوسرے برس من موہنی سی شگفتہ نے جنم لیا۔

دوسرا بیٹا گود میں تھا کہ قاری غلام غوث کو دوسرے شہر میں ایک گورنمنٹ ادارے سے ملازمت کی آفر ہوئی۔ تنخواہ نہایت معقول اور کام ان کے حسبِ منشا تھا۔ والدین کی اجازت پر ملازمت تو کرلی مگر بیوی بچوں کے بِنا ایک پل بھی گزارنا مشکل ہوگیا۔ اس موقع پر والد نے ان کی بھرپور طرفداری کی اور بہو کو بھی ساتھ لے جانے کی ہدایت کردی۔ بلکہ سونے پر سہاگا یہ کیا کہ کمالِ فیاضی سے وہیں ایک چھوٹا سا مکان خرید کر دے دیا۔

باپ کا یہ اقدام قاری غلام غوث کے لیے بہت بڑا انعام تھا۔ وہ اپنی اس حوصلہ افزائی اور مشکل کشائی پر پھولے نہ سمائے اور ضعیف والدین کے ہاتھ چوم لیے۔ جنہوں نے بیک وقت ان کے بہت سے مسائل پل بھر میں حل کر ڈالے تھے۔ سب سے اہم بات یہ کہ اپنی خاندانی روایات کو پسِ پشت ڈال کر انہیں دوسرے شہر منتقل ہونے کی اجازت دے دی تھی۔

جہاں غلام غوث کے مارے خوشی کے پاؤں زمین پر نہ ٹک رہے تھے وہیں ثریا کے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ مارے پریشانی اور ہول کے اس کی راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ دو بچوں کی ماں بن جانے کے باوجود وہ پرویز سے بچھڑ جانے کے خیال سے ہی لرز گئی۔ خوفِ خدا تو اس کے دل سے اٹھ ہی چکا تھا۔ غیر کے لیے آہیں بھر رہی تھی۔ جدائی کے غم سے کلیجا پھٹا جارہا تھا۔ کونے کونے منہ چھپائے روتی پھر رہی تھی۔ گو کہ اس وقت اس کا تعلق فقط نظر بازی تک محدود تھا تاہم اتنے برسوں میں رفتہ رفتہ عادی ہوچکے تھے۔ اس میں قصوروار تو ثریا بھی تھی مگر پرویز نیت کا ثابت ہوتا تو کم از کم یوں گھر اتری بھاوج کو غلط راہ نہ دکھاتا۔ ثریا کی معصومیت، ناتجربہ کاری اور کم عمری پرویز کے سے منجھے ہوئے تجربہ کار وزمانہ شناس مرد کے لیے انعام تھی جس نے اسے بیک نظر تاڑ لیا تھا پھر اس کی یہ حرکت ہی کتنی غلیظ اور بے باک تھی کہ اس نے گھر اتری نئی نویلی دلہن کا گھونگٹ لمحوں کا فائدہ اٹھا کر الٹ ڈالا تھا۔ کسی دوسرے کی امانت کا لحاظ کیا تھا نہ ضمیر جیسی کوئی چیز تھی اس کے پاس۔

دراصل گھر بھرا پُرا تھا، پرویز کو کبھی کُھل کھیلنے کا موقع نہ ملا۔ ان خیانت زدہ آلودہ دنوں میں کوئی دن بھی تو ایسا نہ آیا، جب دونوں میں سے کسی ایک کے دل میں بھی اپنے ناپاک رویّے کا احساس جاگا ہو...... ایک احاطے میں رہتے ہوئے پرویز کو یہاں آنے جانے پر کوئی روک ٹوک تو تھی نہیں۔ اس کے اپنے ماموں کا گھر تھا چنانچہ ان دونوں کے دلوں کا چور پوری رازداری اور چابکدستی کے ساتھ روپوش رہا۔

ثریا اور پرویز کے درمیان ایک خاموش سمجھوتا طے پاچکا تھا چنانچہ جب اندرونی طور پر حالات ایسا رخ اختیار کر چکے تو ثریا کا حال کیوں نہ مندا ہوتا۔ بجائے اس کے کہ وہ عام شادی شدہ عورتوں کی طرح سسرال سے علیحدگی اور ایک علیحدہ گھر میں خودمختارانہ زندگی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتے پا کر خوش ہوتی، الٹا ناآسودہ اور غیر مطمئن ہوئی جارہی تھی۔ منتشر خیالات نے اس کو ادھ موا کر ڈالا۔ ہاں البتہ پرویز بالکل چپ تھا۔ اس نے کسی ردِعمل کا اظہار ضروری نہیں سمجھا تھا۔ جانے کیوں......؟ جس دن ان لوگوں کو رخصت ہونا تھا، خاندان بھر کے مردوں، عورتوں سے گھر اٹا پڑا تھا۔ ہر کوئی دعا دینے آیا تھا حتیٰ کہ پرویز کی بیوی بھی موجود تھی۔ اگر نہ تھا تو فقط پرویز ہی غیر موجود تھا، ثریا گھبرا گھبرا کر ہر سمت تکتی رہی۔

اتنے دنوں کے آنکھ مٹکے اور ایک دوسرے کو تاکنے جھانکنے کا جو حوصلہ ثریا کو ملا تھا، اس نے چلتے چلاتے پرویز کے خلاف اس کے دل میں شک و شبہے اور بدگمانی کا بیج بو دیا۔

یوں قاری غلام غوث اور ثریا اپنوں سے بچھڑ کر، نئے شہر، نئے محلے اور نئے گھر میں منتقل ہوگئے۔ اس وقت ان کی پہلوٹھی کی بیٹی شگفتہ کوئی ہوگی چھ سات برس کی۔

بس یہاں سے ثریا کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

☆☆☆

سوئے اتفاق وہ ہماری تائی اماں کی پرانی محلے دار نکلی آئی۔ ایک زمانے میں تائی اماں اور ثریا کے والدین ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جس کا ذکر میں نے اس قصے کی ابتدا میں کیا ہے، یعنی ثریا کے لڑکپن، شرارتوں سے بھرے بچپن اور زندگی کے شوخ و چنچل ایام کا۔

اس کی والدہ عطیہ بیگم اور تائی اماں کی بہت اچھی صاحب سلامت تھی۔ تائی اماں کی بڑی بیٹی ندرت آپا، عطیہ بیگم سے قرآن پاک پڑھنے جایا کرتی تھیں۔ جب ثریا اپنی افتادِ طبع کی بنا پر کبھی ماں کی حسبِ منشا کوئی کام نہ کرسکتی تھی۔ ثریا کی شادی کے تقریباً سال بعد تائی اماں ہمارے شہر میں اٹھ آئیں اور یہیں رہنے لگیں۔

لہٰذا اس کے بچپن کے حالات میں نے تائی

اماں سے ہی سنے۔ انہوں نے ثریا کو فوراً پہچان لیا تھا اور ندرت آپا سے تو وہ وفورِ محبت سے لپٹ گئی تھی ۔ ندرت آپا جب بھی سسرال سے آتیں، گھنٹوں ثریا کے گھر گھسی رہتیں۔ ثریا کا الہڑ پن اب تک جوں کا توں قائم تھا۔ باتوں باتوں میں ایک دن ندرت آپا نے اس کی داستانِ عشق مجھے سنا ڈالی اور یوں...... بات ہم تینوں کے درمیان گھوم گئی۔

ثریا جب سسرال سے چلی تو دل پہ منوں بوجھ تھا۔ پرویز کی بے موقع بے نیازی اور بے پروائی نے دل توڑ دیا تھا۔ اس نے گھبرا کر سب حکایت ندرت آپا کو کہہ سنائی۔ بات مجھ تک آئی لیکن اس نے جی کا غبار نکال لیا۔ یہاں نیا گھر نئی ذمّے داریاں، وہاں مشترکہ فیملی سسٹم رائج تھا مگر یہاں سب کچھ اسی کو سنبھالنا تھا۔ بہرحال بنیادی طور پر ایک عورت ہی تو تھی۔ بالآخر تمام فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہوگئی۔

پرویز کا بخشا ہوا زخم شاید مندمل ہونے لگا تھا اور شاید وہ اسے بحالتِ مجبوری بھول ہی جاتی کہ اچانک وہ آگیا۔

بے حد بادلوں بھری دوپہر تھی۔ سورج سیاہ گھٹاؤں کے اندر ہی اندر کہیں سفر کر رہا تھا۔ اس لیے وقت کا درست اندازہ نہ ہو پا رہا تھا۔

قاری غلام غوث کام پہ جا چکے تھے۔ شگفتہ برآمدے میں گڑیوں کا گھر سجائے بیٹھی تھی، منا سو رہا تھا۔ ہر طرف سکوت کا عالم تھا۔ ثریا نہا کر غسل خانے سے نکلی تھی کہ دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا...... اور پرویز اس کے روبرو کھڑا تھا۔

دو گہری گہری نگاہیں اس کے پورے وجود میں سرسرا گئیں۔ ثریا کی برداشت ختم ہوگئی اور وہ ننھے بچوں کی طرح ہمک کر اس کے شانے سے جا لگی۔

میں کھڑکی میں کھڑی کانپ اٹھی۔ اس کمزور فطرت عورت کی بزدلی اور دیدہ دلیری پر میری آنکھیں جھک گئیں۔ میرے سامنے قاری غلام غوث کا سراپا گھوم گیا اور لاشعوری طور پر میں پرویز سے ان کا موازنہ کرنے لگی۔ دراصل وہ راہ سے بھٹکی...... بدنیت عورت تھی۔

پنگوڑے میں منا جاگ اٹھا تھا۔ اس نے روتا ہوا منا شگفتہ کی گود میں ٹھونسا چند روپے دیے اور گلی میں نکال دیا۔

بادل زوروں میں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ پھر جو موسلا دھار بارش برسی ہے کہ الاماں۔

پھر دن پہ دن گزرے...... شروع میں پرویز کبھی کبھار اور پھر اکثر آنے لگا۔ پھر تو یہ چکر سا چل نکلا۔ گناہوں کی دلدل میں گلے گلے پھنس کر دونوں دین و دنیا کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ بے خبر غلام غوث کا یہ معمول تھا کہ صبح سویرے ناشتا کر کے چلے جاتے۔ دوپہر کا کھانا وہیں مقرر تھا۔ بڑھتے بچوں اور وقت کی ضروریات کے تحت شام کو اُدھر سے ہی ٹیوشنز پر نکل جاتے۔ سارے دن کے تھکے ماندے اور قرأت سکھاتے سکھاتے عشا کی نماز پڑھ کر ہی گھر میں گھستے۔ علاوہ ایک جمعے کی چھٹی کے کوئی دوسری فرصت کیا ملتی، یہ چھٹی بھی اکثر کسی مصروفیت کی نذر ہو جاتی...... پھر بھلا پرویز کو کیا پڑی تھی کہ کبھی کسی جمعے کے دن آ دھمکتا۔

وقت نے کس کی سنی؟ کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ ثریا کی بڑی لڑکی شگفتہ تیرہ چودہ برس کی ہوگئی مگر ماں کی آنکھوں پر بندھی پٹی نہ کھلی بلکہ اب تو اس نے دوسرا ہی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ جس روز پرویز کو آنا ہوتا وہ پہلے سے پکا انتظام رکھتی۔ شگفتہ کے پیچھے چھوٹے بہن بھائی لگا کر اڑوس پڑوس میں بھیج کر چھٹکارا حاصل کر لیتی۔ بچوں میں اِدھر اُدھر گھومنے کی عادت پختہ ہوگئی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بچپن اور لڑکپن کے دوراہے پر کھڑی انجان اور معصوم شگفتہ کو میں نے بارہا گلی کوچوں میں بھٹکتے پایا۔ کبھی چھوٹے بھائی کو گود میں

لٹکائے گلی کے نکڑ پر کھڑی ہے، کبھی آنے ٹکے کی چیز پر پھیری والے سے جھگڑ رہی ہے۔

دھیرے دھیرے غیر محسوس انداز میں اس کی مصروفیات فقط ایک گھر تک محدود ہو کر رہ گئیں اور یہ تھا قریشی صاحب کا گھر۔ ننھے بھائی کو لیے وہ ساری ساری دوپہر اُن کے ہاں گھسی رہتی۔ کبھی ان کے بچوں کو بہلا رہی ہے کبھی ان کا سودا سلف لا دیا کبھی ترکاری خرید کر دے رہی ہے غرضیکہ وہ مصروف رہنے لگی تھی۔

لیکن...... خبر نہیں کیوں مجھے اس کی مصروفیت کی آڑ میں کوئی دوسری دلچسپی نظر آتی تھی۔ میں سوچا کرتی۔ ''جانے ماں کی حقیقی پیار و توجہ کو ترسی ہوئی یہ لڑکی کسی نئی راہ کو چل نکلے!'' اب سوچتی ہوں کاش میں ان دنوں ہمت سے کام لے کر اپنے شبہے کی تصدیق کر لیتی۔

اس برس رمضان المبارک کا مہینہ اپنی خیر و برکت کے سائے میں ہم گنہگار خلقت کو لینے آیا تو شگفتہ کے روز و شب اسی طرح بسر ہو رہے تھے۔ دوڑ یہاں جانا دوڑ وہاں جانا۔ عام بچیوں کی طرح وہ بھی بصد شوق روزے رکھ رہی تھی اور اِدھر رمضان المبارک کا مہینہ ہونے کے باوجود میں پرویز کو برابر ان کے گھر آتا جاتا دیکھ رہی تھی۔ اس کا معمول نہ ٹوٹا تھا۔ آفرین تھی ثریا کی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری کو۔

ایک، ایک کر کے روزے تمام ہوئے اور ایک شام ایسی بھی آئی جب چاروں اطراف سے ''عید کا چاند ہوگیا، عید کا چاند ہوگیا...... عید آگئی...... عید آگئی......'' کا شور مچ گیا۔ چھوٹے بڑے خوشی سے ناچ اٹھے۔ اللہ نے ایسی ہی خوبی اور خیر و برکت رکھی ہے مسلمانوں کے تہوار میں۔

لیکن یہی عید آگے چل کر عمر بھر کے لیے میرے دماغ سے چپک کر رہ گئی۔ شاید دن کے دو ڈھائی بجے ہوں گے۔ ہمارے گھر میں افرادِ خانہ ہی کتنے تھے جو گہما گہمی یا عید کی بے شمار رونقیں ہوتیں، نہ زیادہ کام نہ کاج نہ ہنگامے...... میں نے اوپر جاتے ہوئے جھانک کر نیچے دیکھا۔ گلی سونی سی لگی لیکن اس سنسان گلی کے نکڑ پر شگفتہ چھوٹے بھائی کو کندھے سے لگائے جا رہی تھی۔ اس کی عید کی لال چنریا ہوا کے دوش پر اڑی جا رہی تھی۔ وہ نارنجی رنگ کا ریشمی جوڑا پہنے تھی۔

''قریشی صاحب تو فیملی سمیت اپنے کسی عزیز کے چالیسویں میں کل ہی گاؤں گئے ہیں، ظاہر ہے اس وقت گھر میں بیرونی بیٹھک میں رہنے والے ان کے کرائے دار کے سوا کون ہوگا؟'' لیٹتے لیٹتے اچانک مجھے یاد آیا۔ فوراً ہی میری چھٹی حس بیدار ہوگئی...... مگر بُرا ہو نیند کا جو تکیے پر سر رکھتے ہی مہربان ہوگئی تھی۔

کچی نیند سے بیدار ہوئی تو گلی بھانت بھانت کی بولیوں اور بلند و بانگ لہجوں سے گونج رہی تھی۔ سب اپنی، اپنی ہانک رہے تھے۔ اپنے، اپنے اندازے بیان کر رہے تھے۔ کوئی آنکھوں دیکھی سنا رہا تھا تو کوئی کانوں سنی۔ اگلے دن کے اخبار میں ایک چھوٹی سی سرخی لگی تھی آخری صفحے پر......

''چودہ سالہ لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ فرار...... خالی گھر میں دو سالہ بھائی روتا ہوا پایا گیا۔''

اتفاق ہے کہ اس عید پر بھی شام کے وقت سیاہ بادلوں کے دَل کے دَل پرے باندھے اڑے چلے آ رہے تھے اور آج اتنے برس بعد کی عید پر بھی سیاہ گھٹائیں امنڈی پڑ رہی ہیں۔ کوئی پل جاتا ہے کہ موسلا دھار بارش برسنے کو ہے، کُل عالم جل تھل ہو جانے کو ہے۔

اس عید پر بھی شگفتہ کے فرار کے بعد بادل دھما دھم برسے تھے اور کھل کے مینہ پڑا تھا۔

ایک بیسوا ماں کے کالے کرتوتوں پر پردہ اس عید پر بھی پڑا رہا تھا اور آج اس عید تک پڑا ہوا ہے۔ معلوم نہیں وہ بھی اندر سے شرمسار ہے یا نہیں۔

بارش کی آواز گھروں میں خوشبو بن کر در آتی ہے......

شائستہ زریں

تہوار کے لغوی معنی ہیں ''خوشی کا دن'' اور ساون میں جس طرح خوشی کا اظہار اور اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس اہتمام کی بدولت ساون خود بخود ایک تہوار کی شکل اختیار کر گیا۔ ساون کی خوشی کا احساس اوائل بچپن ہی سے ہمارے اندر پنپ رہا ہوتا ہے جو وقت میں اضافے کے ساتھ تناور درخت کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ شادی سے پہلے الھڑ پنے سے ساون منانے والی لڑکیاں شادی کے بعد ذمے دار خاتونِ خانہ بن کر بھی ساون سے لطف اندوز ہوتی ہیں لیکن میکے کی یادوں کے سنگ سنگ...... تب میکے کے ساون کی ایک نہیں کئی باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ جب برسات اپنے جوبن پر ہو تو تمام اپنوں کا ساتھ بہت اچھا لگتا ہے۔ جو شعر گوئی کی فطری صلاحیت رکھتے ہیں ساون کی پہلی بوند ہی ان کے شعری تخلیق کے عمل کو حرکت میں لے آتی ہے ایسے میں شعروں کا نزول ہونے لگتا ہے۔

اسی سوچ کے پیشِ نظر ہم نے چند شاعرات سے معلوم کیا کہ......

سوال نمبر ۱: کیا ساون ایک تہوار کی حیثیت رکھتا ہے؟

سوال نمبر ۲: سسرال کے ساون میں میکے کے ساون کی یاد کیوں ستاتی ہے؟ آپ کو کون سی خاص بات یاد آتی ہے؟

سوال نمبر ۳: تیز برستی بارش میں کس کو اپنے گھر میں دیکھنا چاہتی ہیں اور کس کے پاس جانے کو دل چاہتا ہے؟

سوال نمبر ۴: ساون کے موسم اور شاعری کے موسم میں کیا تعلق محسوس کرتی ہیں؟

سوال نمبر ۵: بارش کے حوالے سے آپ کا کلام جو خود آپ کو بے حد پسند ہے نذرِ قارئین کیجیے۔

تو عزیز قارئین! آپ بھی پڑھیں ہماری شاعرات کیا کہتی ہیں۔

وضاحت نسیم

۱: ساون تہوار کی حیثیت تو نہیں رکھتا لیکن سب ایک ساتھ اس موسم میں خوش نظر آتے ہیں تو لگتا ہے کہ تہوار آیا ہے ساون میں روح کی تسکین کا بہت سامان ہوتا ہے۔ جب فطرت اتنی رنگین مزاج ہے تو انسان کے رنگین مزاج ہونے میں کیا دیر لگتی ہے۔

۲: اپنے ماں باپ، بہن بھائی، عزیز و اقارب، جن سے بچپن کا ناتا ہوا ان سے قلبی تعلق کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ یہی رشتے دل میں گھر کیے رہتے ہیں۔ پانی کی طرح اپنی جگہ بنائے رکھتے ہیں۔ خوشگوار موسم میں ایسے ہی قریبی لوگ یاد آتے ہیں جو بس خوش ہوتے ہیں اور خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ میکے کی یہی باتیں ساون میں دل تڑپاتی ہیں۔

۳: آم لدے ہرڈالی



وضاحت نسیم

کوئل بولے کوکو
ملنے آجا تو

۴: ساون کے موسم میں بڑے پیارے پیارے اشعار اور اچھے، اچھے گیت یاد آنے لگتے ہیں میرے خیال میں جنھیں شاعری سے شغف نہ ہو وہ بھی ایسے موسم میں ساون کے گیتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

۵: ساون کے حوالے سے میری برسوں پرانی نظم جو اس دور کی کالج کی لڑکیوں کے لیے پیش ہے۔

برکھا برسی آنگن اتری ایک البیلی شام
ایسی شام کے آتے ہی یاد آئے ایک نام
کتنے پیارے پَون جھکورے کتنے پیارے گیت
ان گیتوں کو سنتے ہی یاد آ جاتے ہیں میت
ساون کی پُرکیف فضائیں جب جب رنگ لٹائیں
ایسے میں کچھ بیتی باتیں یاد آ کر رہ جائیں
پچھلے موسم اور اب کے موسم کے الگ مزاج
پچھلے موسم پاس تھا کوئی لیکن دور ہے آج
سنا ہے وقت بدل جاتا ہے بھر جاتے ہیں گھاؤ
شاید اگلے ساون میں تم اتنے یاد نہ آؤ

نوشین گیلانی

۱: برصغیر کی روایت کے مطابق تو ساون کی حیثیت ایک تہوار کی سی ہے۔ گیتوں اور پکوانوں سے سجا تہوار۔

۲: یہ سچ ہے کہ سسرال کے ساون میں میکے کی یاد بہت ستاتی ہے۔ لیکن کسی ایک خاص بات کا بتانا تو ممکن نہیں۔ مجھے تو دادی جان کے پاس بیٹھ کر گرم گرم پکوڑے کھانا اور ان سے صوفی شاعر حضرت میاں بخش کے دوہے سننا، امی جان کا مسکراتے ہوئے جناب امیر خسرو کے بیت سنانا...... کہ میری امی جان فارسی زبان و ادب میں بہت مہارت رکھتی تھیں...... پھر بہن بھائیوں کی نادانیاں اور قہقہے اور ابو جان کا قسم، قسم کے آم خرید کے لانا یا سب کو دریائے ستلج پر پکنک کے لیے لے جانا، کیا کیا یاد آجاتا ہے ساون کے ساتھ۔

۳:: تیز برستی بارش میں اپنے میاں سعید خان کو گھر میں، دیکھنا چاہتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ وہ کام پر نہیں جائیں اور بہت سے احباب کو دعوت دی



نوشین گیلانی

جائے پھر میٹھے اور چٹپٹے پکوان ہوں اور ساون کے گیت اور کہیں جانا چاہوں تو ساحلِ سمندر پر کہ مجھے سطحِ سمندر پر بارش کے قطروں کا رقص دیکھتے رہنا بہت بھلا لگتا ہے۔

۴: ساون کے موسم اور شاعری میں بہت گہرا تعلق ہے۔ ساون کے سارے رنگ شاعری کی پوشاک بن جاتے ہیں جسے جناب امیر خسرو نے بیان کیا ہے کہ......

اماں میرے باوا کو بھیجوری کہ ساون آیا

۵: ساون کے حوالے سے میری پسندیدہ نظم ”ایک ریشمی لمحہ“ پیش ہے۔

بارشوں کے موسم میں
رات کی ہتھیلی پر
ایک ریشمی لمحہ
چاند بن کر اترا ہے

شبہ طراز

معاشرتی اعتبار سے تو ہاں...... کیونکہ تہوار دراصل اس موقع کو کہتے ہیں جس میں لوگوں کی زیادہ تر تعداد کچھ مخصوص افعال انجام دیتی ہو۔ تہذیبی روایات میں ساون کی حیثیت پنجاب کے علاقے میں خاص طور پر ایک تہوار کی ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس علاقے میں مخصوص مہینوں میں بارشیں ہوتی ہیں، ان بارشوں سے پہلے کھیتوں کی کٹائی، چھتوں کی لپائی وغیرہ خصوصی طور پر کروائی جاتی ہے۔ ساون انتہائی گرمی کے جانے اور سردیوں کے آنے کی نوید ہوتا ہے، تیز دھوپ کے بعد گھٹا میں تیز رنگوں کے کپڑے پہننے کو جی چاہتا ہے، پہلے تو واقعی گھروں میں صحن اور صحن میں درخت ہوتے تھے جن میں جھولے پڑے ہوتے تھے۔ اب لوگ ساون میں پارکوں میں جا کر جھولے جھولتے ہیں۔ گرمی کا زور ٹوٹتا ہے تو کچن بھی سج جاتے ہیں۔ اس طرح بارشوں کا یہ خوب صورت مہینہ ایک تہوار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

۲۔ صاف سی بات ہے سسرال میں لڑکی پر ذمے داریوں کا بوجھ ہوتا ہے، سسرال میں شادی شدہ لڑکی کچن میں ہوتی ہے چاہے وہ خود پکوان بنا رہی ہو یا ساس کا ہاتھ بٹا رہی ہو اور شادی سے پہلے اپنے گھر میں لڑکی جھولے پر ہوتی ہے بے فکری کے ساتھ۔ مجھے جو بات یاد آتی ہے وہ یہ ہے کہ ساون



شبہ طراز

کے مہینے میں، بارش والے دن کالج یا اسکول سے چھٹی نہیں کرتے تھے کیونکہ کالج یا اسکول میں ٹیچرز سے بہ آسانی چھٹی مل جاتی تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ کھیل کود اور باتیں کرنا، لمبے رستوں سے گھر واپس آنا، بارش میں بے دھڑک بھیگنا اور پھر ہلکا بخار ہونا بہت یاد آتا ہے۔

۳۔ یہ سوال غیر شادی شدہ خواتین سے ہی ہونا چاہیے، کم از کم میں تو یہ چاہتی ہوں گھر میں کوئی نہ ہو تاکہ میں اپنی مرضی سے جب تک دل چاہے بارش کو دیکھوں، سنوں، محسوس کروں۔ پھوار میں

بھیگوں، کاغذ کی کشتیاں بنا کر پانی میں چھوڑوں۔ سچ سچ یہی دل چاہتا ہے اور کسی کے پاس جانے کو دل نہیں چاہتا بلکہ لمبی ڈرائیو پر جانے کو دل چاہتا ہے۔ شوہر سے تو اس سلسلے میں زیادہ تر ڈانٹ پڑتی ہے البتہ جب اکیلی ہوتی ہوں تو اکیلے ضرور جاتی ہوں۔

۴:: بہت گہرا تعلق ہے دونوں میں۔ دونوں موسم اداس کرتے ہیں، دونوں موسم رومینٹک ہوتے ہیں، دونوں موسم خوب صورت یادوں کے جھولے میں بٹھاتے ہیں، دونوں موسموں میں مٹی کی خوشبو ہوتی ہے، دونوں موسموں میں لفظوں کے جگنو رات کی تاریکی میں جھلملاتے ہیں اور دونوں موسم خاموشی گنگناتے ہیں۔ گویا دونوں موسموں کا چولی دامن اور جنم جنم کا تعلق ہے۔

۵: میری ایک نظم ”بارش سے ذرا پہلے“ نذرِ قارئین ہے۔

ساون کی پڑیں بوندیں
یادوں کے گھروندے میں
اِک وصل کا لمحہ تھا
جو ٹوٹ کے روتا ہے
ساون کے مہینے میں
ایسا بھی تو ہوتا ہے......!

ڈاکٹر نگہت نسیم

۱:: قسم سے جی یہی چاہتا ہے کہ انڈین پنجاب کی طرح ساون بھی کوئی تہوار ہو جائے تاکہ کسی کو ڈیوٹی نہ کرنی پڑے اور نہ ہی کسی کا لاکھوں کا ساون جائے، پر ہمارے یہاں کا ساون تہوار جیسا ہے؟ اب جیسا بھی ہے مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے کہ ہمارے لیے یہ علامتی موسم ہے۔ زمین اور انسان کے اندر کے حبس کے ختم ہونے کا اعلان کرتا ہوا، زمینِ وصل کے موسم بدلنے کا ایک خوب صورت سا استعارہ بنتا



ڈاکٹر نگہت نسیم

ہے تو کہیں کسانوں کے لیے رزق کی بشارت لے کر اترتا ہے۔ یہی ساون کہیں یادوں کا کہرام ہے تو کہیں باتوں کا ہجوم بھی طرح طرح کے پکوان بنانے کا بہانہ ہو جاتا ہے۔ مل بیٹھ کر خوش ہونے کا رواج جیسا۔ ساون...... سوچو تو کیا کچھ نہیں ہے اس موسم میں۔

۲: بہت فرق ہے، عمر کا فرق، احساس کا فرق، انسانوں کا فرق، جگہ کا فرق۔ مجھے جو سب سے زیادہ بات یاد آتی ہے وہ ہے اپنی امی جی کا باورچی خانے میں بیٹھ کر ہم سب کے لیے پکوڑے، سموسے تلنا اور خاص طور پر ”پوڑے“ بنانا اور اس کے ساتھ کئی اور لوازمات...... پھر ہماری مرحومہ چچی خالدہ اور چچی راحت کا بچوں کے ساتھ ہمارے گھر یعنی ”کاشانہ اشرفی“ میں آ جانا۔ میں نے تو اپنی ماں کو ایسے موسموں میں سب سے زیادہ خوش دیکھا ہے۔ امی جی کو مل جل کر ایک عام سے پل کو خاص بنانے کا ہنر آتا ہے اور اسے عمر اور ہمت کے ساتھ نبھاتی بھی رہتی ہیں، ایسا دن سسرال میں کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی اپنے بچوں کو دے پا رہی

ہوں۔ ان جادوئی لمحات کی کمی بارش کی ہر بوند کے ساتھ جُڑی ہوئی ہے۔

۳: مجھے ایسا ہی ایک شعر یاد آگیا جواب میں۔

اب کے ساون میں اس سے ملنے کو جی چاہتا ہے
جس نے میری ہنسی کو میرے ہونٹوں پر مسحور کیا

۴: ساون کا بنیادی عنصر بارش ہے، شاعری میں بارش کو کئی جہتوں میں استعارہ بنایا گیا ہے۔ خوشی، ہجر، فراق، آنسو محبت، یاد ہر رنگ میں بارش کا استعارہ بہت اچھا لگتا ہے، سچ پوچھیے تو بارش اور احساس ایک جیسے لگتے ہیں۔ سو ساون احساسات کا موسم ہے۔

۵: اس حوالے سے مجھے اپنی نظم ”محبت کا فلسفہ“ بے حد پسند ہے

محبت جب پاس ہوتی ہے
بارشوں جیسی برستی ہے
محبت جب پاس نہیں ہوتی
بارشوں جیسی کر جاتی ہے



حمیرا راحت

حمیرا راحت

۱۔ کراچی میں تو میں سمجھتی ہوں کہ ساون ایک بھونچال کی حیثیت رکھتا ہے۔ گئے زمانے میں کبھی جب لوگوں کے پاس بہت فرصتیں تھیں تب یقیناً ساون ایک تہوار کی حیثیت رکھتا ہوگا، اس وقت لوگ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بھی سینے سے لگاتے تھے، ساون آتے ہی کڑاہی چڑھ جاتی تھی، بہویں میکے جانے کو تیار ہو جایا کرتی تھیں۔

اماں میرے باوا کو بھیجو ری کہ ساون آیا

کی صدائیں گونجا کرتی تھیں لیکن اب ہماری زندگی میں ان موسمی خوشیوں کا عمل دخل ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس کے لیے علامہ اقبال نے خبردار کر دیا تھا کہ......

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت

سو اس مشینی زندگی میں ساون کا حسن بھی ٹی وی اسکرین پر نظر آتی پانی سے لبالب بھری سڑکوں، ٹپکتی ہوئی چھتوں، ٹریفک جام، لائٹ کی عدم دستیابی نے کہیں چھپا دیا ہے اور ہم ہیں کہ اسے ڈھونڈنے کی زحمت بھی نہیں کرتے۔

۲۔ سسرال اور میکے کے ساون میں وہی فرق ہے جو ایک لڑکی اور عورت میں ہوتا ہے۔ میکے کا ساون شریر، نٹ کھٹ اور چُلبلا ہوتا ہے۔ امی چیختی رہیں پر سنتا کون ہے، وہ چھت پر جا کر نہانا، جھولے کی لمبی لمبی پینگیں لینا اور ابا سے آموں کی فرمائش کرنا۔ سسرال کا ساون تھوڑا سنجیدہ اور اگر میاں کو بارش پسند نہ ہو تو تھوڑا رنجیدہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس ساون میں بارش کی پہلی بوند اپنے ساتھ کچھ فکریں بھی لاتی ہے بچوں کو بارش سے بچانا ہے بیمار نہ ہو جائیں، چھت سے کپڑے اتار کر لانا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ مجھے اپنے میکے کی سب سے خاص بات اپنی ماں کی ڈانٹ یاد آتی ہے جو اب مجھے کبھی سننے کو نہیں ملے گی۔ وہ مجھے بارش میں بھیگنے پر ہمیشہ ڈانٹا کرتی

تھیں اور سب سے آخر میں ان کا مخصوص جملہ کہ ”ابھی تو ہماری باتیں بری لگ رہی ہیں مگر جب ہم نہ ہوں گے تو یاد آئیں گی“ واقعی اماں...... بہت یاد آتی ہیں۔

۳۔ تیز برستی بارش میں، صرف اپنی ”تنہائی“ کو اپنے پاس دیکھنا چاہتی ہوں تاکہ میں اور وہ اِک دوسرے کو اپنا حال سنا سکیں۔ جب سے میکا ختم ہوا ہے کسی کے پاس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہی دل چاہتا ہے کہ میں ہوں کوئی اچھی سی کتاب ہو، کافی کا ایک کپ اور جگجیت سنگھ کی آواز...... اور برستی ہوئی بارش......

۴۔ ساون کے موسم میں عموماً کچھ نہ کچھ عطا ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں تو یہی سمجھتی ہوں اور میرا تجربہ بھی یہی ہے کہ شاعری اور ساون کا بڑا گہرا تعلق ہے۔

۵۔ کچھ اشعار ہیں بارش کے حوالے سے۔

میرے آنگن میں لمحہ بھر ٹھہری تھی بارش
میں نے تیرا نام لیا تو چونک پڑی بارش
پیار بھرا اِک رشتہ ہے برسات کے موسم سے
ساون لگتا ہے ماں جایا...... بھولی بارش
چاند ستارے موسم سارے تیری قسمت میں
میرے مقدر میں لکھی تھی اشکوں کی بارش
دل کے شہر میں جانے کب سے دھوپ کا موسم ہے
کیسی ہوائیں، کیسی گھٹائیں اور کیسی بارش

عنبرین حسیب عنبر

۱: تہوار کی حیثیت تو نہیں رکھتا لیکن خوشی کا سامان ضرور ہے لیکن جب بھی بارش ہوتی ہے یہ دعا دل سے ضرور نکلتی ہے کہ یہ سب کے لیے ابرِ رحمت ثابت ہو کسی کے لیے زحمت کا سامان نہ بنے کیونکہ ہمارے یہاں کے شہری نظام سے بارش زحمت بن جاتی ہے عموماً بارش میں لوگوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ

دیکھا ہی نہیں کہ گھر کی ٹپکنے لگی ہے چھت



عنبرین حسیب عنبر

برسا جو ابر جھومنے گانے میں لگ گئے

۲:: اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ

اپنے گھر کی سنگھاسن کی لاکھ بنے رانی کوئی
دل میں بابل کے آنگن کی یادیں شور مچاتی ہیں

اس مضبوط رشتے کی وجہ سے زندگی کے ہر موقع پر میکا ضرور یاد آتا ہے اور ساون میں یوں بھی یاد آتا ہے کہ ہم اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ مل کر بارش کا جس طرح لطف اٹھاتے تھے وہ آج بھی سنہری یادوں کا حصہ ہے۔

۳: تیز برستی بارش میں ہم صرف اور صرف بجلی کو اپنے گھر دیکھنا چاہتے ہیں (جو اس سہانے سے جانے کیوں روٹھ جاتی ہے) اور اسے یہ پیغام بھی دینا چاہتے ہیں کہ

تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے
یہ مانا کہ موسم جواں ہے حسیں ہے

اپنی سب سے چھوٹی بہن کے پاس جانا چاہتے ہیں کیونکہ بارش میں اس کی خوشی دیدنی ہوتی ہے اور ہم سب اس کے ساتھ مل کر آج بھی اپنے بچپن میں لوٹ جاتے ہیں۔

۴: ظاہر ہے کہ موسم کا اثر تخلیقی صلاحیت پر بھی ہوتا ہے لہٰذا جب ساون کی رم جھم ہو رہی ہو تو عموماً اشعار کی رم جھم بھی شروع ہو جاتی ہے۔

۵: مولا اب کے ساون رُت میں

پیار کی برکھا برسا دینا
جس کی رِم جھم، رم جھم دُھن میں
دھرتی پیار کے گیت بنائے
جس کا پانی اتنا برسے
دل کی ہر رنجش دُھل جائے
جس کی سوندھی سوندھی خوشبو
سب کے تن من میں بس جائے
نفرت کا ہر کالا بادل
پیار کی کرنوں میں ڈھل جائے

شگفتہ شفیق

۱: ساون میرا پسندیدہ ترین موسم ہے۔ کالی گھٹائیں چھائیں اور رم جھم پھوار ہو تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے، میں تو دل سے ساون کی راہ تکتی ہوں اور جب ساون آجاتا ہے تو اس کا اہتمام بھی بڑھ چڑھ کر کرتی ہوں ایسا جیسے کسی تہوار کا تو میرے لیے ساون تہوار کی حیثیت ہی رکھتا ہے۔ جس میں میں بلاوجہ ہی خوش خوش رہتی ہوں۔

۲: میکا۔ میکا تو صرف ماں باپ ہی سے مشروط ہے۔ ماں باپ کے بِنا مجھے میکے کا کوئی تصور نہیں آتا اور ماں باپ کے ساتھ میکے کے ساون کی خاص بات جو یاد آتی ہے وہ ہے بے فکری اور موجیں وہ ہلّا گلّا اپنے بچپن میں امی کے بنائے ہوئے لذیذ پکوان آج بھی یاد ہیں۔

۳: میں اپنے من پسند دوستوں کو اپنے گھر میں دیکھنا پسند کروں گی اور ان ہی کے گھر جانا پسند کروں گی کہ ان کے ساتھ زندگی حسین ترین لگتی ہے۔



شگفتہ شفیق

۴: جب کالی گھٹائیں جھوم جھوم کے آئیں اور فضا میں موتی برسانے لگیں تو بات بے بات نظموں اور اشعار کا نزول ہونے لگتا ہے نہ صرف شاعری بلکہ گھومنا پھرنا، ہنسنا مسکرانا لکھنا لکھانا، ملنا جلنا لانگ ڈرائیو پر جانا، تیز آواز میں گانے بجانا ہر شے میں تعلق سا بن جاتا ہے۔

۵: رم جھم بارش

رم جھم بارش کے موتی
کیا کیا یاد دلاتے ہیں
تیز بوچھاڑ اور بہتی ناؤ
دل پہ تھا جب نہ کوئی گھاؤ
سادہ سا وہ چھوٹا آنگن
آنگن میں تھیں ڈھیر سی سکھیاں
سکھیوں کی وہ شوخ ہنسی تو
آج بھی دل کو بھاتی ہے
میری سہیلیوں رم جھم بارش
تمہاری یاد دلاتی ہے

☆☆☆

میری سہیلی

غزالہ نگار اورکزئی

لبنیٰ عروج کی پہلی برسی کے موقع پر خصوصی مضمون

جون 1996ء کے اواخر کی ایک گرم سہ پہر، نیول کالونی کراچی کے ایک بنگلے کی گھنٹی بجاتے میں نے ایک لمحے کو سوچا۔ ”پتا نہیں وہ گھر میں ہوگی بھی یا نہیں۔ مجھے کسی طرح پہلے سے اطلاع کر دینی چاہیے تھی۔“ لیکن یہ سیل فون کا زمانہ نہیں تھا اور اپنی سرکاری مصروفیات میں مجھے کم ہی معلوم ہوتا تھا کہ ذاتی نوعیت کی ملاقاتیں کر سکوں گی یا نہیں اور وہ بھی جبکہ کراچی میں میرا قیام صرف تین چار دن کا تھا۔ ایک نو دس سالہ بچے نے گیٹ کھولا۔ ”بیٹا لبنیٰ عروج سے ملنا ہے۔ کیا وہ یہیں رہتی ہیں؟“ جواب اثبات میں ملا۔ بچہ اندر غائب ہو گیا، میں گھوم کر گرد و نواح کا جائزہ لینے لگی جس آفیسرز میس میں مجھے ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

”آپ کو کس سے ملنا ہے؟“ پیچھے سے ایک نسوانی آواز آئی، میں گھومی میری ہی ہم عمر ایک خاتون میرے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھیں۔ ”مجھے لبنیٰ عروج سے ملنا ہے۔ اگر وہ آپ ہی ہیں تو؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”جی میں ہی لبنیٰ عروج ہوں۔“ وہ قدرے حیرانی سے بولیں۔

”اور آپ......؟“

”میں غزالہ نگار اورکزئی ہوں۔“ میں نے شوخی سے کہا۔ ”دیکھا آ پہنچی ناں!“ لبنیٰ کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ لپک کر میرے گلے لگ گئی، اس غیر متوقع ملاقات تک ہماری دوستی کو غالباً پندرہ سال تو ہو ہی چکے تھے۔ ہمارا تعارف نویدہ تارڑ نے کروایا تھا۔ جو ان دنوں ڈائجسٹوں کی دنیا کا ایک جانا پہچانا نام تھیں اور اس زمانے میں...... جب بیشتر ڈائجسٹ کی مدیران لکھنے والوں کو ایک دوسرے کا ایڈریس دینے کی قائل نہ تھیں...... کسی طرح ہم لوگوں کا ایک چھوٹا موٹا نیٹ ورک بن ہی گیا تھا۔ جس کا زیادہ کریڈٹ نویدہ تارڑ کو ہی جاتا تھا۔ ہم لوگوں کی آپس میں گرما گرم خط کتابت شروع ہو گئی۔ کہانیوں پہ تبادلۂ خیال کیا جاتا۔ اپنی کہانیوں پہ رائے زنی کی جاتی۔ ڈائجسٹوں کی معاوضہ پالیسی خصوصیت سے زیرِ بحث آتی کیونکہ اس زمانے میں کم از کم مجھے تو کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا اور جن کو ملتا تھا وہ اونٹ کے منہ میں زیرے کے مصداق ہوا کرتا تھا۔ نویدہ کو خصوصیت سے اس بات سے سخت تاپ چڑھتی تھی کہ میں خود منہ پھاڑ کر اپنی اچھی خاصی مقبول کہانیوں کا معاوضہ طلب کرنے کی ہمت نہ پاتی تھی۔ بہر حال انہی دنوں نویدہ کی شادی اپنے کزن سے طے ہو گئی۔ شادی تک تیاریوں کا احوال بھی خطوط میں شامل رہا۔ نویدہ نے اپنی ایک دلہناپے کی تصویر بھیجی۔ یہ بڑا انقلابی قدم تھا۔ ان دنوں لڑکیاں بالیاں کہاں قلمی دوستوں کو اپنی تصویریں بھیجا کرتی تھیں لیکن ایک دوسرے پر اعتماد بھی تھا پھر لبنیٰ کی منگنی ہوئی اور پھر شادی لیکن پھر بھی کسی تصویر کا تبادلہ نہیں ہوا۔ مجھے یاد نہیں کہ بعد کے سالوں میں بھی لبنیٰ نے مجھے بچوں کی بھی تصویریں کبھی بھیجی ہوں لیکن ان کی پیدائش، ان کی تعلیم، ان کی پرورش کا تذکرہ خطوں میں اکثر شامل ہوا کرتا تھا۔ ایک بہت اچھی قلمکار، کچھ عرصے کے لیے قلم ایک طرف رکھ کر، بیوی اور ماں کا کردار نبھانے میں مکمل مصروف ہو چکی تھی تو اس سہ پہر جب ہم دونوں بے حد گرمجوشی سے گلے ملے تو ہماری پہلی بالمشافہ ملاقات تھی۔

گھر میں مہمانوں کی بھرمار کے باوجود اُس کی خوشی صاف ظاہر تھی۔ اس نے فوراً پُرتکلف چائے کا اہتمام کروادیا۔ دو تین گھنٹے کی گپ شپ کے بعد میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔

"لو، ظفر کو ملے بغیر جاؤ گی؟" اُس نے فوراً اعتراض کیا۔ میں پھر بیٹھ گئی، قریب ہی تو ہے ہم چھوڑ آئیں گے۔" اس نے تسلی دی، رات کا کھانا ظفر بھائی سے ملاقات کے بعد کھایا گیا۔ بہت پُرتکلف اور بہت مزیدار۔ اس پر بھی لبنیٰ کو تسلی نہ ہوئی۔ کہنے لگی۔ "پورے چاند کی رات ہے چلو تمہیں سمندر پہ لے چلیں۔"

سب مہمان ظفر بھائی کی گاڑی میں ٹھنس ٹھنسا کے چاندنی رات میں سمندر کے کنارے پہنچے۔ وہاں ساحل پہ بنی چھوٹی سی دیوار پہ بیٹھ کے شوریدہ لہروں کا نظارہ کرتے، میں نے اور لبنیٰ نے بہت باتیں کیں، وہ باتیں جو اس سے پہلے ہم صرف خطوں میں ایک دوسرے کو لکھا کرتے تھے۔ ان دنوں اُس کا لکھنا ذرا کم ہوگیا تھا اور میں بھی وہ آخری افسانہ لکھ چکی تھی۔ جس کے بعد میں نے ڈائجسٹوں کے لیے کچھ نہیں لکھا۔ دوسری سہیلیوں کا تذکرہ ہوا...... جو ہمارے نیٹ ورک میں شامل تھیں۔

اُس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ جانے سے پہلے میں اس کے لیڈیز کلب کی تقریب میں ضرور شرکت کروں۔

وہ دوستوں کی خوشیوں میں بہت خوش اور ان کی کسی بھی چھوٹی موٹی کامیابی پہ بھی بہت خوش ہونے والوں میں سے تھی۔ اللہ اس کی روح کو غریقِ رحمت کرے۔ ایسے دریادل لوگ اب نایاب ہوئے جاتے ہیں۔

مجھے اسی شام اسلام آباد کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میں نے اُسے اور افسر سلطانہ کو اپنی امریکا روانگی کے بارے میں بھی بتادیا۔ تین ہفتے بعد مجھے امریکا روانہ ہونا تھا۔ وہ بہت افسردہ ہوئی۔ "اتنے عرصے بعد تو ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ اب تمہیں ملنے امریکا کون آئے گا؟" اس وقت تو میں نے بات ہنسی میں اُڑا دی تھی۔

"لو، کوئی میں دنیا سے اٹھ رہی ہوں، واپس نہیں آؤں گی کیا؟" لیکن مجھے معلوم نہیں تھا مجھ سے پہلے وہ خود دنیا سے رخصت ہوجائے گی۔ میں واپس آؤں گی لیکن مجھے پتا ہی نہیں چلے گا وہ کیسی جنگ لڑ رہی ہے۔

لبنیٰ سے میری دوستی ہوئی تو وہ سرگودھا میں رہنے والی الہڑ دوشیزہ تھی ہماری دوستی کے ابتدائی سالوں میں اس کی شادی ہوئی۔ محمد اطیب پیدا ہوئے، منیٰ آئیں پھر اسامہ آئے کاش میرے پاس وہ سارے خطوط یہاں موجود ہوتے جو اس نے سرگودھا، کراچی سے لکھے تھے اور پشاور میں اب بھی میرے ٹرنکوں میں سنبھال کر رکھے ہیں لیکن وہ لڑکی جو میرے کمرے میں کھڑی میرا سامان بندھوا رہی تھی یوں چل پڑی کہ مڑ کے نہ دیکھا۔ میرے امریکا آنے کے بعد بھی اس کے چند ایک خط آئے پھر ظفر بھائی کا تبادلہ اسلام آباد ہوگیا اور اُسے غالباً یاد نہ رہا کہ مجھے تازہ ایڈریس بھجوا دیتی۔ میں خود بھی زندگی کرنے کی جدوجہد میں، پڑھائی میں اور پھر پڑھانے میں یوں مصروف ہوئی کہ خط کتابت بھی قصّہ پارینہ ہوگئی۔ دل میں کہیں یہ خیال تھا اس کے سرگودھا کے دونوں ایڈریس موجود ہیں، ذرا زندگی کے دھندوں سے فرصت ملے گی تو اس کی خبر لوں گی چھوٹی سی یہ دنیا، چھوٹا سا پاکستان کیسے ممکن ہے پھر نہ ملیں۔ تب تک پاکستان میں ای میل کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ سیل فون صرف دولتمندوں کی دسترس میں تھے اور فیس بک کا تو وجود ہی نہیں تھا ورنہ جہاں اب تیس پینتیس سال کے بچھڑے لوگ مل رہے ہیں لبنیٰ کیسے نہ ملتی۔

پھر پاکستان میں ای میل، سیل فون، فیس بک نہ صرف عام ہوئیں بلکہ معمولِ زندگی بن گئیں اور پچھلے سال فیس بک ہی کے ایک گروپ میں کسی نے یہ خبر لگائی کہ لبنیٰ عروج کا انتقال ہوگیا۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ فوراً دفتر سے باہر نکل کر انجم کو فون کیا۔ منحوس خبر کی تصدیق ہوگئی۔ میں نے چکراتے ہوئے سر کو تھام کے انجم سے ظفر بھائی کا نمبر لیا۔ کئی بار فون کیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ دوبارہ انجم کو فون کیا۔ نمبر کی تصدیق کروائی۔ انجم نے بڑی تسلی دی۔ "شاید وہ لوگ ابھی سرگودھا میں ہوں تم کچھ دن ٹھہر کے فون کر لینا۔"

بس پھر میں ٹھہر ہی گئی۔ تعزیت کرنا اور وہ بھی ایسے پیارے دوستوں کی دنیا کا مشکل ترین کام ہے، میں تو اس کے لیے چند لائن بھی نہ لکھ سکی۔ جن کا انجم سے وعدہ تھا۔ لکھنے بیٹھتی تو لبنیٰ سامنے آن بیٹھتی۔ یقین آتے، آتے ہی آتا ہے کہ اب وہ اپنے رب کے پاس ہے اور بہت آرام سے ہے لیکن اس کا خیال، اس کا حسن میرے ذہن سے دور نہیں ہوا۔

بعد میں ظفر بھائی کے، اطیب اور اسامہ کے دلخراش مضامین لبنیٰ عروج نمبر میں پڑھے، دل تھام کر رہ گئی۔ کہیں سے اُڑتی اڑتی بھی خبر مل جاتی کہ وہ کن حالوں میں ہے تو لپک کے اسے مل آتی۔ دائمی ملاقات تک کے لیے اللہ کے سپرد کر دیتی۔

پچھلے سال جون ہی میں چھ سال بعد میرا وطن جانا ہوا تھا۔ اسلام آباد کے بھی دو تین چکر لگے اگرچہ میں بہت کم وقت کے لیے پاکستان گئی تھی پھر بھی کون جانے میں اس گلی، اس سڑک پہ اس عمارت کے پاس سے گزری تھی۔ جس میں میری پیاری سہیلی اپنی زندگی کی آخری جنگ لڑ رہی تھی۔ شاید اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تھا کہ میں اپنی ہنستی کھیلتی، صحت مند اور خوش باش لبنیٰ کی جگہ ایک بیمار اور دل شکستہ دوست کو دیکھتی۔

اس نے جتنا وقت اچھی صحت کے ساتھ گزارا... بھرپور گزارا، خوب لکھا اور اچھا لکھا۔ شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی اسے اپنے خاندان کا بے مثل تعاون حاصل تھا۔ ظفر بھائی سے شادی ہوئی تو وہ وکالت کرتے تھے، لبنیٰ نے اپنے ایک ہنستے مسکراتے خط میں لکھا۔ "بھئی میں نے تو ان کو پہلی ملاقات ہی میں بتادیا تھا کہ مجھے فوجی پسند ہیں"۔ ظفر بھائی نے نیوی جوائن کر لی۔ یونیفارم پہن لیا۔ اپنے بچوں کے لیے اس کے جو، جو خواب تھے اللہ تعالیٰ نے پورے کیے۔ زندگی کا ہر کردار اُس نے پوری دیانت داری اور ایمانداری سے نبھایا اور میں دور بیٹھے اس کی گواہ...... پرانی ڈائری اٹھا کے دیکھتی ہوں تو اس میں محمدی کالونی سرگودھا سے پھر نیول کالونی تک کے سارے ایڈریس موجود ہیں اور اب تو بس ایک ہی پتا رہ گیا ہے اللہ تعالیٰ کا۔ کیا ہوا جو وہ اطیب، اسامہ کی دلہنوں کا استقبال کرنے، منیٰ کو رخصت کرنے خود موجود نہ ہوگی اس کی دعائیں زندگی بھر ان بچوں کا اور ظفر بھائی کا احاطہ کیے رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ اس نقصانِ عظیم پر صبر کرنے کا اجر اس کی روح کو اگلے جہان میں آرام و سکون سے اور شادکام رکھے اور اس کی قبر کو اس پر کشادہ اور پُرنور کردے، آمین۔

☆☆☆

غور فرمائیں

☆ خاموشی ایسا درخت ہے جس پر کڑوا پھل نہیں لگتا۔

☆ حسد...... ایسی دیمک ہے جو انسان کو اندر اور باہر دونوں سے ختم کر دیتی ہے۔

☆ سچائی...... ایسی دوا ہے جس کی لذت کڑوی مگر تاثیر شہد سے زیادہ شیریں ہوتی ہے۔

☆ ذہانت...... ایسا نادر پودا ہے جو محنت کے بغیر نہیں لگتا اور نہ ہی پھل دیتا ہے۔

☆ خوش اخلاقی...... ایسی خوشبو ہے جو میلوں دور سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

☆ نفس...... وہ بے لگام گھوڑا ہے جس پر انسان قابو پالے تو دنیا اس کے قدموں میں ہوتی ہے۔

مرسلہ: نفیسہ آرا، دبئی

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا

☆ سب سے بڑی بہادری صبر کرنا ہے۔
☆ سب سے بڑی بلا ناامیدی ہے۔
☆ سب سے بڑی تفریح مصروفیت ہے۔
☆ سب سے بڑا استاد تجربہ ہے۔
☆ سب سے بڑا فائدہ نیک و صالح اولاد ہے۔
☆ سب سے بڑا تحفہ درگزر کرنا ہے۔
☆ سب سے بڑا سرمایہ خوداعتمادی ہے۔
☆ سب سے بڑا راز موت ہے۔
☆ سب سے بڑی دولت اچھا دوست ہے۔

مرسلہ: ڈاکٹر نفیسہ نہال، لاہور



بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ وبرکاتہ

☆ حمد وستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود وسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ آپ یقیناً اپنے قیمتی ملبوسات حفاظت سے رکھتی ہیں کہ کہیں وہ خراب نہ ہو جائیں۔ اپنی جیولری بینک کے لاکر میں رکھتی ہیں کہ کہیں وہ چوری نہ ہو جائے۔ اسی طرح اپنے پیسے اپنی الماری میں پرس کی زپ والی جیب میں رکھتی ہیں کہ کہیں وہ بے دھیانی میں نکالنے میں گر نہ جائیں مگر اپنے عزیزوں، اپنے دوستوں کے رازوں کی حفاظت نہیں کرتیں جن کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ آپ وہ انتہائی دھڑلے سے دوسرے کی ذاتی باتوں، کسی کے سکھ دکھ جو کسی نے آپ سے کہے تھے وہ آپ کے لبوں سے اس طرح نکلتے ہیں کہ ڈھول بجا کر اعلان کرنے کی رسم رہ جاتی ہے اور باہمی تعلقات میں بھروسے کو توڑنے کی ابتدا ان ہی باتوں سے ہوا کرتی ہے۔ آپ نے اکثر لوگوں کے منہ سے سنا ہوگا کہ ہمارا کوئی دوست ہی نہیں بنتا، ہمارے رشتے دار ہم سے ملتے ہی نہیں تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اور آج ہم سب کو اپنے، اپنے گریبان میں خود جھانکنا ہے کہ ہم سے کیا، کیا کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں اور اپنی غلطی سدھارنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے ناں تو پھر اس چھوٹی سی نیکی کی جانب قدم ابھی فوراً بڑھادیں...... ہے ناں!

☆ ہم اپنے قارئین پاکیزہ کے بے حد مشکور ہیں جو ہماری شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار ایمنہ عندلیب، سلانوالی کے لیے خصوصی دعائیں کر رہے ہیں اور یہ ان کی دعاؤں کا ہی اعجاز ہے کہ وہ قدرے بہتر ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس بے حد محبت کرنے والی لڑکی کو صحت وزندگی سے نوازے، آمین۔ آئیں اس سے قبل کہ بہنوں کی محفل میں کھٹے میٹھے اور تیکھے خطوط پڑھیں پہلے ایک بار درود ابراہیمیؑ پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں، آیتِ کریمہ یہ ہے۔

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین o

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ ہماری پیاری مصنفہ سدرۃ المنتہیٰ کی پہلی کتاب محبت کی شام شائع ہوگئی ہے۔ جس میں ان کے گیارہ افسانے وناولٹ شامل ہیں۔ سدرۃ المنتہیٰ اردو اور سندھی دونوں زبانوں میں لکھتی ہیں اور محبت کے حوالے سے ان کی تحریریں، امید، زندگی، سچائی اور نیکی کا پیغام دیتی ہیں۔ اس ضخیم کتاب کی قیمت صرف 200 روپے ہے جس کا انتساب اپنے والدین کے نام کیا ہے۔ اس کتاب کو منگوانے کے لیے آپ رابطہ کیجیے۔ خزینہ علم وادب، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون نمبر 042.37314169

☆ پاکیزہ میں قسط وار شائع ہونے والا ہمارا ناول کانچ سی لڑکی کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔ جس کا انتساب پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار مس ایمنہ عندلیب، سلانوالی کے نام ہے۔ اس کتاب کی قیمت صرف 250 روپے ہے۔ کتاب منگوانے کے لیے رابطہ کیجیے القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار، لاہور۔ فون نمبر 042-37652546

☆ نئی شاعرات اور شاعروں کا شعری انتخاب غزالہ جلیل راؤ نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ جس کا نام ہے بچھڑنے سے ذرا پہلے اس مجموعے میں بیشتر وہ نام بھی موجود ہیں جو پاکیزہ میں باقاعدگی سے یا بے قاعدگی سے لکھتی ہیں۔

کتاب کی قیمت صرف 220 روپے ہے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ بارگاہِ غزل پبلی کیشنز، پی او بکس نمبر 7 جی پی او اوکاڑہ۔ فون نمبر 0346-7414220۔

☆ دردانہ نوشین خان ایک معروف نثر نگار ہی نہیں بلکہ ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں۔ دردانہ کے ہاں حقیقی منظر نگاری ہے اور انسانی رویوں پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ایک اچھی شاعرہ کا وجود نہ صرف ابھرتا ہوا نظر آرہا ہے بلکہ چھاتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ کتاب کا انتساب اپنے شریکِ حیات ارشد حفیظ مخدوم کے نام ہے۔ قیمت صرف 160 روپے ہے اور منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ بیکن بکس، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون نمبر 042-37320030۔

☆ معروف مصنفہ رفاقت جاوید کی تیسری کتاب ان دنوں زیر طبع ہے۔ جسے معروف پبلی کیشنز محمد علی قریشی بڑے اہتمام سے شائع کر رہے ہیں جسے آپ القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ، لاہور سے حاصل کر سکتے ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار شائستہ اعجاز کے والد وزیر اللہ خاں ان دنوں بسترِ علالت پر ہیں ان کی کامل صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ ہماری پیاری سی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار فائزہ شہزاد، پشاور تا حال بسترِ علالت پر ہے۔ اس کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔ فائزہ کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے۔ کہ وہ ایک اور پیاری سی نواسی کی نانی بن گئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مریم، لاہور گزشتہ دنوں لاہور سے ٹورنٹو شفٹ ہوگئی ہیں۔ (ڈھیر ساری دعائیں)

☆ معروف شاعرہ فریدہ جاوید فری، لاہور کو اپنے شعری مجموعے پر ایک تقریب میں ایوارڈ سے نوازا گیا۔ (مبارک باد) فریدہ جاوید فری کا عنقریب تیسرا مجموعۂ کلام کتابی صورت میں آنے والا ہے۔ (ماشاء اللہ)

☆ معروف شاعرہ شگفتہ شفیق اپنا تیسرا مجموعۂ کلام آجانے کے بعد بہت جلد کینیڈا جانے والی ہیں، جہاں ان کے اعزاز میں کئی تقاریب ہوں گی۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری فرح ناز، لاہور کی منگنی ہوگئی ہے۔ (مبارک باد)

☆ معروف صحافی اور مصنفہ شائستہ زریں کی کتاب جو میلاد کے بارے میں ہے۔ بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار پروین یوسف، ہالینڈ کی بیٹی ڈاکٹر اسما عروج کی شادی احد خان کے ساتھ گزشتہ دنوں ہوئی۔ (بے حد مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ڈاکٹر شہلا عامر ملائشیا میں چھٹیاں گزار کے واپس پاکستان آچکی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار تسنیم ماہ پارہ، کراچی دوسری مرتبہ نانی بن گئی ہیں۔ ان کی بیٹی کے ہاں ایک پیارا سا بیٹا ہوا ہے (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ سے وابستہ نزہت اصغر کی بیٹی ام البنین عباس نے میٹرک میں اے ون گریڈ حاصل کیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار شائلہ سہیل جاوید کی پیاری سی بیٹی سارہ سہیل نے میٹرک میں اے ون گریڈ حاصل کیا۔ (مبارک باد)

☆ دبئی میں مقیم ہونہار طالبہ ڈولی مسرت نے اپنے اسکول میں آل راؤنڈر طالبہ کا ایوارڈ حاصل کیا۔ (مبارک باد)

☆ ہماری پیاری مصنفہ رضوانہ پرنس ان دنوں ٹی وی کے لیے ڈرامے لکھنے میں بے حد مصروف ہیں۔ (مبارک باد)

☆ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں پاکیزہ کی بہت سی بہنیں اعتکاف میں بیٹھیں جن میں عطیہ عمر، کراچی۔ انیلا ناہید، لیہ۔ صدف بخاری، کراچی اور ناہید، واہ کینٹ شامل ہیں۔ (مبارکاں)

انتقالِ پُرملال

☆ ہماری پیاری مصنفہ عتیقہ محمد بیگ کی والدہ گزشتہ دنوں چل بسیں۔

☆ ہماری پیاری مصنفہ بشریٰ مسرور کی بہن انتقال کر گئیں۔

☆ ہماری پیاری شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار شائلہ سہیل جاوید، کراچی کے ماموں انتقال کر گئے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری پروین یوسف، ہالینڈ کے والد چل بسے۔
نوٹ۔ تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کریں اور صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

✍ امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ ''میں پاکیزہ پڑھنے والی ہر بہن کی مشکور ہوں جو میرے لیے دعائیں کررہی ہیں۔ انشاء اللہ آپ سب کی دعاؤں کے طفیل میں اپنی بیماری کو شکست دے دوں گی۔ میں اپنی ہر بہن کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ آپ سب کو صحت اور زندگی کے ساتھ خوشیاں، کامیابیاں اور کامرانیاں عطا فرمائے۔ انجم باجی میری اپنی بہن ہیں اور وہ میری ایسی بہن ہیں جن کے دل میں اور زبان پر میرے لیے محبت ہی محبت ہے۔ اللہ میری باجی کو سلامت رکھنا، آمین۔'' (پیاری امینہ جلدی سے اپنی فارم میں آجاؤ۔ تمہارے پرانے لکھے ہوئے مراسلات بس تھوڑے سے رہ گئے ہیں)

✍ مسز عظمیٰ خورشید، لاہور سے۔ ''میری بیٹی مریم کینیڈا چلی گئی ہے اس لیے دل بہت اداس ہے مگر یہ اداسی پاکیزہ پڑھ کر دور کی۔ بہنوں کی محفل کم لگی مگر بہت اچھی ہے اور اس محفل کا کسی سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ جلترنگ کے سارے خاکے بے حد پسند آئے۔ میرا پسندیدہ ناول عنیزہ سید کا ہے جو بے حد شان سے آگے بڑھ رہا ہے۔ دیگر ناولز بھی ٹھیک جارہے ہیں۔ میرا پسندیدہ افسانہ شیریں حیدر کا رہا۔ تمہارا ناولٹ یقین اس دفعہ بھی سچی کہانی ہی لگی۔ اندازِ تحریر بے حد اچھا رہا۔ ہاں ٹائٹل کی لڑکی موٹی ہونے کے باوجود اچھی لگی۔'' (شکریہ اور ہاں اداس مت ہو مریم خوش ہے تم بھی خوش رہو)

☒ عتیقہ محمد بیگ، سیالکوٹ۔ پیاری بیٹی مجھے تمہاری والدہ کے انتقال کا بے حد غم ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور تمہیں صبرِ جمیل...... یہ وقت کسی بھی بیٹی کے لیے بہت کڑا ہوتا ہے۔ میں عتیقہ کی تمام سہیلیوں سے استدعا کروں گی کہ وہ ایسے وقت میں عتیقہ کو تنہا نہ چھوڑیں بلکہ اس سے مسلسل رابطے میں رہیں۔

☒ پروین وحید، پنجاب۔ عطیہ عمر کا انٹرویو پسند کرنے کا شکریہ۔ اس انٹرویو کے ساتھ عطیہ کی تصاویر اس وجہ سے نہیں لگائی گئیں کہ وہ ایک باپردہ خاتون ہیں اور انٹرویو میں اصل اہمیت خیالات وافکار کی ہوا کرتی ہے۔ تصاویر کی نہیں اور یوں بھی عطیہ کی تصویر تو ان کے جوابات کے ہر جملے سے جھلک رہی تھی۔ کیا وہ آپ کو دکھائی نہیں دی۔ حیرت ہے۔

☒ صبا نور، لیہ۔ اگست کا شمارہ پسند کرنے کا شکریہ۔ عظمیٰ آفاق ان دنوں اپنے بھائی کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ وہ اپنا کوئی افسانہ یا سفرنامہ ہمیں لکھ کر دیں گی تو ہم اسے ضرور لگائیں گے اور کوئی حکم؟

✍ پروین یوسف، ہالینڈ سے۔ ''پاکیزہ پڑھتے ہوئے ایک عمر ہوچکی ہے۔ 1982ء میں ہالینڈ آئی تھی اور اس سے بہت پہلے سے پاکیزہ کی قاری ہوں۔ آپ کی آمد سے پاکیزہ میں نت نئی ـ۔ دلچسپ اور مفید تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ مئی کے شمارے میں تین پہر کا جیون پڑھ کر اپنی بیماری کی یاد پھر تازہ ہوگئی۔ ہمیں یہ دعا ہمیشہ کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آزمائشوں سے بچائے۔ پاکیزہ بہت اچھا جارہا ہے۔'' (پیاری بہن پروین اس محفل میں خوش آمدید۔ اس سے قبل آپ کا خط نہیں ملا۔ آپ ہمیں بذریعہ فیکس اپنی آرا بھیج سکتی ہیں۔ ہاں اگر آپ اپنی بیٹی ڈاکٹر اسما کی شادی کا احوال ان کی شادی کی تصویر کے ساتھ بھیجنا چاہتی ہیں تو بھیج سکتی ہیں)

✍ رئیسہ خانم، لاہور سے۔ ''پہلی مرتبہ مخاطب ہوں۔ رفعت سراج کی فین ہوں ان کا ناول بہت پسند آرہا ہے۔ گزشتہ ماہ آپ کے افسانے نے جان نکال کر رکھ دی تھی اور اس ماہ آپ کے ناولٹ نے مسکرانے پر مجبور کردیا۔ ایسے بے ایمان لڑکے تو ہوتے ہی تھے مگر اب بے ایمان بیویاں بھی نظر آنے لگی ہیں۔ شیریں حیدر کا افسانہ خصوصی طور پر پسند آیا۔ شیریں آپ بہت میٹھا لکھتی ہیں۔ دیگر افسانے بھی ٹھیک تھے۔ عنیزہ سید کا ناول بھی بہت اچھا جارہا ہے۔ مجھے بھی فہرست میں کارٹون نما تصویریں اچھی نہیں لگ رہی ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ آپ مصنفات کی تحریریں لگادیں۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

✍ انیلا ناہید، لیہ سے۔ ''عید نمبر کا ٹائٹل بہت خوب صورت لگا۔ شائستہ زریں کا سروے بھی بہت اچھا لگا۔ شیریں حیدر کا افسانہ بہت اچھا لگا۔ انجم باجی، پچھلے مہینے آپ نے ہمیں رُلایا اور اس ماہ آپ کے افسانے نے مسکرانے پر مجبور کردیا۔ آپ کے طرزِ تحریر کے بارے میں عطیہ عمر کی رائے سے میں سو فی صد متفق ہوں کہ وہ شگفتہ، رواں اور دلچسپ ہے۔ عطیہ عمر میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان کا انٹرویو مجھے تشنہ اس لحاظ سے لگا کہ ان کی تصویریں نہیں تھیں دوسرے انہوں نے ذاتیات کے

بارے میں کم بتایا۔ ہم ان کی فیملی کے بارے میں مزید جاننا چاہ رہے تھے۔ رضوانہ پرنس کے انٹرویو اور افسانے ہم پڑھنا چاہتے ہیں۔ رضوانہ اب کس کا انٹرویو کررہی ہیں آپ؟'' (یہ تو آپ کو رضوانہ ہی بتائیں گی)

✍ یاسمین گل، لاہور سے۔ ''میں آپ کے رسالے کی 30 سال پرانی قاری ہوں بلکہ یوں کہیں خاموش قاری۔ کئی سال پہلے ماں کے نام سے ایک نظم لکھی تھی جسے آپ نے شائع کرکے مان بڑھایا تھا۔ آج مدتوں بعد پھر جرأت کی ہے اسی اپنے پن کے ساتھ کہ آپ ضرور حوصلہ افزائی کریں گی۔ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوں۔ میرے لیے دعا ضرور کیجیے گا۔'' (پیاری یاسمین موت کا ذائقہ ہر نفس نے چکھنا ہے۔ کوئی جلدی کوئی دیر سے۔ آپ اپنے آپ کو سنبھالیں لکھنے پڑھنے میں دل لگائیں۔ اس محفل میں بھی باقاعدگی سے شرکت کیجیے)

✍ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ''پاکیزہ دلہن نمبر کا سرورق دیکھا تو ہمیں اپنی دلہن بنی تصویر یاد آگئی۔ آپ کا اداریہ مجھے کچھ کہنا ہے، میں آپ نے رمضان المبارک کے تقدس میں موتیوں کی مالا پیش کی۔ افسانوں میں آپ کا متاعِ جاں، عبدالستار کی شادی، امانت، شامِ شہر یاراں، منتظرِ بہار، بیٹیاں بوجھ نہیں، گمشدہ جنت اور دردِ بیکراں پسند آئے۔ قمر علی عباسی کی وفات پر ہم یہی کہیں گے کہ نیلوفر باجی اللہ تعالیٰ آپ کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ قمر بھائی کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔'' (آمین)

✍ فریدہ افتخار، پشاور سے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے بہت کچھ کہہ دیا۔ پروردگار ہم سب کو اس مبارک ماہ سے پورا پورا فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور امتِ مسلمہ سے، پاکستان کے رہنے والوں سے ان کی ساری مصیبتیں، پریشانیاں، غمگین لمحات، حادثے دور فرمائے، آمین۔ دعا ہے کہ ہمارے ملک کو امن والا ملک بنائے، آمین۔ روحانی مشوروں نے دل لوٹ لیا۔ ہمیں ان مشوروں پر عمل کرنے کی ہمت عطا فرمائے، آمین۔ متاعِ جاں پڑھ کر دل دہل گیا۔ بڑی دیر تک اس کہانی کے لرزہ خیز انجام سے لرزہ براندام رہی۔ باری کا بخار اچھا لگا ہماری بجلی کو بھی باری کا بخار ہے آوت ہے جاوت ہے۔ عبدالستار کی شادی خانہ آبادی مزے کی کہانی تھی۔ امانت میں بلی تھیلے سے باہر آہی گئی کہ اصیل خان اور ڈاکٹر مہر جان کے رشتے کا پتا چل گیا۔ اس بار بہنوں کی محفل اور جلترنگ سکڑی ہوئی ملی کیا اس کی وجہ آپ کی سچ پر مبنی کہانی تو نہیں؟ خالدہ نسیم کی منزل تھی جن کی اور بے حد پسند آئی کیا خالدہ نسیم، وحیدہ نسیم (مرحومہ) کی صاحبزادی ہیں (جی نہیں یہ جنرل نسیم کی اہلیہ ہیں) نیلوفر عباسی کے شوہر قمر علی عباسی صاحب کے انتقال پر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور نیلوفر عباسی کو صبر واستقامت دے جو اس غم کو سہار سکیں۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

✍ ظلِ شاہین، رحیم یار خان سے۔ ''بہنوں کی محفل پڑھی اور پھر جناب محترم قمر علی عباسی صاحب کی وفات کی خبر پڑھ کر ایک شاک سا لگا۔ نیلوفر آپا اور محترم انکل تو ہماری پاکیزہ فیملی کا ایک حصہ بن چکے تھے بلکہ تقریباً ہر سال ان کا یہاں پاکستان آنا ان کی کتابوں کی تقریبِ رونمائی اور ان کے اعزاز میں آپ لوگ جو تقاریب منعقد کرتے تھے تو اس لحاظ سے یہ کپل ہماری پاکیزہ فیملی کے لیے وی آئی پی کا درجہ رکھتا تھا...... مجھے ذاتی طور پر محترم قمر عباسی صاحب کی وفات کا بہت دکھ ہوا، اللہ پاک ان کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ان کی مغفرت کرے، آمین اور نیلوفر آپا کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ سرورق پری گرین پیراہن میں ملبوس دلہن بہت پیاری لگ رہی ہے۔ گزشتہ دو تین ماہ سے ٹائٹل پر کلر اسکیم کا انتخاب عمدہ ہوتا ہے۔ رمضان المبارک کے حوالے سے اداریہ بہترین ہے۔ صائمہ اکرم کا منی ناول پڑھا تبصرہ محفوظ ہے۔ دو اکیلی لڑکیاں دیارِ غیر سے تن تنہا یہاں وارد ہوئیں اور حد درجہ بولڈ بھی کچھ ہضم نہیں ہوا۔ ویسے صائمہ کی تحریریں جاندار ہوتی ہیں اور عمیق مشاہدے کی عکاسی کرتی ہیں۔ افسانے عبدالستار کی شادی اور بیٹیاں بوجھ نہیں پڑھے اور اچھے لگے جبکہ آپ کا متاعِ جاں پڑھ کر دل دہل گیا اور شدید دکھ اور بے بسی کی کیفیت مجھ پر چھائی رہی بلکہ میں نے یہ افسانہ کیا سچا واقعہ اپنی والدہ کو بھی سنایا۔ مستقل سلسلے اچھے ہیں، روحانی مشورے اے ون رہا جبکہ پاکیزہ ڈائری بھی اس بار اچھی لگی۔ میرا انتخاب کی کمی محسوس ہوئی مگر اس کی جگہ ہم نے شادی مبارک پڑھ کر آپ کے فیملی فنکشن کو انجوائے کیا۔ آپ کے اور آپ کی فیملی کے بارے میں پڑھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ جلترنگ میں جدید شادی کارڈ پڑھ کر بے اختیار مسکرانے کو جی چاہا۔ ویسے جلترنگ کا اندازِ تحریر زندگی کی علامت ہے۔ میں اکثر گنگناتی ہوں تو بند کردیجیے اس کی جگہ کسی ایک شاعر کا کلام شائع کردیا کریں تو اچھا ہے اور ایک چھوٹی سی رائے اور کہ جہاں پاکیزہ کے افسانوں اور دیگر سلسلوں کی فہرست ہوتی ہے ان صفحات پر یہ تصاویر مت لگایا کریں یہ کچھ عجیب سا تاثر دیتی

ہیں۔" (تبصرے کا شکریہ)

سعدیہ مریم سعدی، گولارچی سے۔ "میری دوستوں نے مجھ پر اتنی لعنتیں بھیجی ہیں کہ بس اس لیے آپ کو کہانیاں بھیج دی ہیں۔ پڑھنے کے بعد نا قابلِ اشاعت میں نام لکھ دیجیے گا تاکہ دوستوں کی ٹوں ٹوں چوں چوں سے جان چھوٹ جائے جو مجھے پتا نہیں کتنا وڈا رائٹر سمجھ بیٹھی ہیں ایک سو چالیس دفعہ سمجھایا ہے ان کو بھئی، ابھی ہمیں لکھنے کی ج سے الف بے بھی نہیں آتی، یہ تو اپنا شوق ہے جو اونگیاں بونگیاں مارنے پر مجبور کرتا ہے۔ اب ان دوستوں کی لعنتوں سے بچنے کے لیے آنٹی آپ کو بور کر رہی ہوں۔ سن لو انیلا، نائلہ، کرن، ثریا تم نے بھی کہنا ہوتا ہے لکھ کر کیا کرو گی جب بھیج نہیں رہی، لو دیکھ لو۔ پے گئی ٹھنڈ، مل گیا سکون۔ بھیج دی ہیں تحریریں اب جلدی سے آنٹی کا ہاتھ ردی کی ٹوکری کی جانب بڑھ رہا ہوگا اور میں اختتام کرتی ہوں تاکہ آئندہ بھی منہ دکھانے سوری شرکت کرنے کے قابل رہ سکوں۔" (ان میں سے ایک کہانی بہت ہی اچھی ہے، شائع ہوجائے گی)

ارم کمال، فیصل آباد سے۔ "دلہن نمبر سجا سنورا ملا۔ ٹائٹل گرل غضب کی تھی۔ اداریہ موقع کے حساب سے پُراثر تھا۔ سب سے پہلے قمر علی عباسی کی وفات کا بے حد افسوس ہوا۔ اللہ کی رضا میں ہی ہماری رضا ہے، میری طرف سے نیلوفر عباسی کو تعزیت کا پیغام دے دیں۔ سلسلے وار ناول امانت کی کہانی اب کھل کے واضح ہوتی جارہی ہے اور اسی حساب سے ہماری دلچسپی کا گراف بھی بڑھ رہا ہے۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل بھی ٹاپ پر جارہا ہے البتہ شامِ شہر یاراں بہت ہی الجھا ہوا ہے متاثر نہیں کر رہا۔ دیگر کہانیوں میں باری کا بخار، بیٹیاں بوجھ نہیں، چنگاری میں دبی خواہش اور دردِ بیکراں بے حد عمدہ اور دلگداز تحریریں تھیں۔ منزل تھی جن کی اور ناول زبردست تھا۔ بہنوں کی محفل میرا موسٹ فیورٹ ہے، یہ سارا باجی آپ کی محبت کا کمال ہے کہ یہ محبتیں ہمیشہ قائم و دائم رہیں، آمین۔ اس دفعہ بہنوں کی محفل میں ڈاکٹر ممتاز ضیا کی کمی بے حد محسوس ہوئی۔ شائستہ زریں کا سروِ گلشن رہے تیرا آباد میں دلہنوں کے جوابات اور ٹپس پڑھ کر بہت انجوائے کیا۔" (شکریہ)

☆ ایشل شادیان، گولارچی سے۔ "کرن شاہ اور سعدیہ مریم مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ لوگوں نے بھی قلم اٹھانے کی جسارت کرہی لی۔ میں بھی آپ دونوں کو ویلکم کرتی ہوں۔ آپ لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے۔

تم ہمت دامنِ رکھنا تھامے
تو مل ہی جائے گا مقامِ بلندی"

(آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

جبیں ہاشمی، بھیرہ سے۔ "متاعِ جاں افسانہ سحر انگیز تھا۔ آپ کا ناول ہو یا افسانہ ہمارے دل کو جکڑ لیتا ہے۔ اس لیے لکھتی رہا کریں۔ جلترنگ میں تو ایک الگ ہی انداز ہوتا ہے آپ کا۔ پڑھ کر بندہ ایک دم فریش، فریش ہوجاتا ہے۔ رفعت سراج کا امانت اس سلسلے وار ناول کی کیا ہی بات ہے۔ اس ناول کو ہم کافی حد تک سمجھ گئے ہیں مگر وقت سے پہلے اپنے لگائے گئے اندازوں کو ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ پاکیزہ کے تمام سلسلے اچھے ہیں۔ تمام رائٹرز اپنی مثال آپ ہیں۔ عنیزہ سید کا سلسلے وار ناول شامِ شہر یاراں بہترین ناول ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ پاکیزہ ڈائری میں طلعت اسلام خان، اُمِ ایمان، تسنیم رضا کے مراسلات پسند آئے۔ بہنوں کی محفل میں شگفتہ شفیق، فرحت احمد، بشریٰ سہیل کے تبصرے کرنے کا انداز پسند آیا۔ بنیش ندیم اور فہد طلال کو اللہ پاک ڈھیروں خوشیوں سے نوازے، آمین۔ مکمل ناول منزل تھی جن کی اور ویل ڈن خالدہ نسیم صاحبہ آپ کی تحریر زبردست ہے اور جناب عقیلہ حق صاحبہ آپ کی تحریر بیٹیاں بوجھ نہیں ہم آپ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ آپ کی تحریر سبق آموز ہوتی ہے، لکھتی رہا کریں۔" (تبصرے کا شکریہ)

گیتی آرا، کراچی سے۔ "قمر علی عباسی کی وفات کا جان کر بہت دکھ ہوا لیکن ساتھ ہی ان کی عظیم شخصیت کے بارے میں تفصیل جان کر خوشی بھی ہوئی کہ ہمارے ملک میں بھی ایسے گوہرِ نایاب پائے جاتے ہیں۔ رفعت سراج کا ناول امانت بڑی دلچسپی لیے آگے بڑھ رہا ہے، رابی کی کراچی موجودگی نے کہانی کو ایک اور دلچسپ موڑ دے دیا ہے اور پڑھنے والے کو آگے جانے کے لیے بے تاب و بے چین کر کے رکھ دیا ہے اور باری تھی اس ماہ کی بہترین کہانی اور افسانے متاعِ جاں کی جو کراچی اور ملک کے موجودہ حالات پر لکھی ایک پُراثر تحریر تھی جس کے اینڈ نے ہمیں چونکانے کے ساتھ ساتھ رنجیدہ بھی کر دیا۔ نصرت جبیں کی عبدالستار کی شادی کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑ سکی۔ غزالہ فرخ کی باری کا بخار اس ماہ کی گھریلو مسائل پر لکھی دوسری

بہترین کہانی تھی۔ غزالہ فرخ نے جس خوب صورتی سے گھر کے چھوٹے چھوٹے مسائل، الجھنوں کو یکجان کر کے کاغذ پر بکھیرا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ فرح طاہر کی چنگاری میں دبی خواہش معاشرتی مسائل، گھریلو الجھنوں پر لکھی ایک سبق آموز تحریر تھی۔ نگہت اعظمی کی دردِ بیکراں بھی کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑ سکی۔ شادی مبارک میں بنیش نذیر اور فہد طلال کی شادی کا حال احوال بھی دلچسپ رہا۔ دلہن صفحے پر ہر دلہن اپنی مثال آپ نظر آرہی تھی۔ پاکیزہ ڈائری اور سندیسے ہمیشہ کی طرح دلچسپ اور مزے دار رہے اور اب باری تھی اپنے پسندیدہ صفحے جلترنگ کی جس کے خاکے شادی کے کارڈ نے مسکرانے پر مجبور کر دیا اور دیر تک مسکرانے پر یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تاں کہ انجم باجی کا خاکہ ہو اور کوئی مسکرائے، ہنسے بنا نہ رہ سکے اور اب اپنا ایک اور پسندیدہ صفحہ روحانی مشورے جس میں احادیث کی باتیں گھنٹوں دل کو منور کرتی ہیں ساتھ ہی ہماری دینی معلومات میں بہت اضافہ بھی کرتی ہیں۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

عاشقہ مسعود، فیصل آباد سے۔ "سب سے پہلے تو آپ کی بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے میرا ذکر بھی رائٹرز کے ساتھ کر دیا۔ اللہ اتنی عزت افزائی میری جیسی نو آموز کو کب راس آئے گی۔ یقیناً ہاضمہ ہی خراب ہوجائے گا۔ کہاں ہم اور کہاں یہ مقام۔ اب ہوائیوں کہ ہم نے خود کو سچ مچ شہزادی سمجھ لیا ہے۔ اب دماغ میں جو کیڑا گھس آیا ہے وہ تھوڑا تنگ تو کرے گا ہی۔ آہستہ آہستہ ہی دماغ مقام پر آئے گا اور یوں ہم نے کوئی پچاس کے قریب کہانیاں لکھ ڈالیں۔ اگر ہم آپ کے شہر میں ہوتے تو صبح صبح آپ کے لان میں کیلوں کا لفافہ لے کر جاوید چوہدری کی طرح بیٹھ جاتے اور شام کو چپ چاپ کیلے کھا کر گھر چلے جاتے لیکن دور ہونے کے باعث یہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اب ہم یوں کریں گے کہ ہر ماہ آپ کو دو افسانے کم از کم ضرور بھجوایا کریں گے (جی ضرور لیکن کیلے اکیلے مت کھانا مجھے بھی شامل کرنا) اور شمارے پر تبصرہ نہیں کروں گی کیونکہ آپ کی محنت منہ سے بولتی ہے۔ البتہ آپ کی متاعِ جاں بہت پُراثر اور کراچی کے حالات کی سچی تصویر ہے۔ دلہن نمبر کے سوالات پر نظر نہیں پڑی ورنہ اپنی شادی کا حال ضرور لکھتی۔ میری شادی پورے پاکستان میں اپنی نوعیت کی منفرد شادی تھی۔" (آپ اپنی شادی کا احوال ضرور لکھ کر بھیجیں۔ ہم کسی بھی شمارے میں لگا دیں گے)

بشریٰ گوندل، کوٹ مومن سے۔ "کافی عرصے کے بعد خط کے ذریعے آپ سے مخاطب ہوں ورنہ فون پر تو اکثر بات ہوجاتی ہے۔ جولائی کا دلہن نمبر میرے ہاتھ میں ہے ٹائٹل بہت فریش اور خوب صورت ہے اور تمام سلسلے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ بہت سے ڈائجسٹوں میں وقتاً فوقتاً جگہ پاتے ہیں لیکن پاکیزہ نے ہمارا اور ہم نے پاکیزہ کا ساتھ نہیں چھوڑا یہ اعلیٰ ظرفی ہے پاکیزہ کی کہ ہم جیسے لوٹ کے آنے والوں کو خوش دلی سے ویلکم کہتا ہے اور کسی موقع پر بھی آپ نے ہمیں بھی فراموش نہیں کیا۔ ان دنوں میں بہت ہی مصروف رہی ہوں نند اور دیور کی شادیوں کے سلسلے میں لیکن ان مصروف ترین لمحات میں پاکیزہ سے غافل نہیں ہوں۔" (گڑیا، پاکیزہ آپ کا اپنا پرچا ہے تو میں آپ کو کیسے فراموش کرسکتی ہوں)

صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ سے۔ "بہنوں کی محفل میں آپ نے ایک قاری بہن کے فون کا ذکر کیا جب ہم نے افسانہ پڑھا تو یقین کریں بہت دکھ ہوا۔ ہم اپنے ملک میں محفوظ نہیں ہیں ہماری عزت، جان و مال کچھ بھی محفوظ نہیں ہے۔ متاعِ جاں پڑھ کر روح تڑپ گئی ہے واقعی ہمارے حالات ایسے ہوگئے ہیں کہیں بھی کچھ بھی ہوسکتا ہے ہر دم جان بس سولی پر لٹکی رہتی ہے۔ خالدہ نسیم کا منزل تھی جن کی اور بہت اچھا لگا ایک شعر پر پوری زندگی محیط تھی۔ نگہت اعظمی نے بھی دردِ بیکراں اچھے موضوع پر لکھا۔ فرح طاہر قریشی کی چنگاری میں دبی خواہش بھی اچھا تھا۔ آج کل کے حالات کے مصداق۔ غزالہ فرخ کا باری کا بخار مزے کا تھا۔ جلترنگ میں برگر اور جوس والا کارڈ کا انویٹیشن مزے کا گرمی کے حساب سے سنگل بلاوا۔ ویسے اگر اس پر عمل کرلیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" (ہاں ہر ایک کا ٹائم بھی بچے گا)

شبنم کنول، حافظ آباد سے۔ "آپ خطوں کے جواب بڑے اچھے انداز سے دیتی ہیں۔ آپ کے بولنے کا انداز مجھے بہت پسند ہے۔ آپی میرا ابھی کوئی خط شامل کردیں مجھے بھی شکریہ کا موقع دیں۔ کافی عرصے سے آپ کو خط لکھنے کے بارے میں سوچ رہی تھی لیکن ہمت نہیں ہوتی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ کو اپنی ذاتی شاعری لکھ کر بھیج رہی ہوں میں نے پہلے بھی اپنی شاعری لکھ کر بھیجی تھی لیکن شائع نہیں ہوئی میں رائٹر بننا چاہتی ہوں آپ ضرور بتائیے گا کہ میں نے کیسا لکھا ہے آپی مجھے بھی تھوڑی سی جگہ دے دیجیے کوئی گستاخی ہوجائے تو معاف کردیجیے گا اللہ آپ کو تا قیامت خوش رکھے۔" (گڑیا آپ مطالعہ زیادہ سے زیادہ کریں۔ ہم آپ کی حوصلہ افزائی ضرور کریں گے)

﴿ فضہ بتول، بہارہ کہو سے۔ ”باقاعدگی سے آپ کا رسالہ دیکھ رہی ہوں۔ مجھے اس کے ٹائٹل بہت متاثر کرتے ہیں۔ آپ نے جو انٹرویو کے سلسلے شروع کیے ہیں وہ بہت پسند آرہے ہیں۔ اس میں آپ تمام رائٹرز کے انٹرویو ضرور لگائیں۔ کچھ ماہ پہلے رفعت سراج کا بہت اچھا انٹرویو پڑھنے کو ملا اور اسی طرح حسینہ معین کا بھی بہت تفصیلی تھا اور رفعت سراج کا جو ناول چل رہا ہے وہ آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اب ہمیں تجسس ہو رہا ہے کہ آگے کیا ہوگا۔ آپ کا پورا رسالہ ہمیں اچھا لگتا ہے۔“ (شکریہ)

﴿ ڈاکٹر کومل عبدالستار، جام شورو سے۔ ”دوپٹا اوڑھے دلہن قابلِ برداشت تھی اور خوب صورت لگتی اگر وزن صائمہ چوہدری فلموں والی کو مات نہ دے رہا ہوتا۔ سب سے پہلے بہنوں کی محفل میں لینڈ کیا کتنی معصوم معصوم ہوتی جارہی ہے یہ محفل۔ کہاں ہے وہ ڈھول والی سرکار اور فائزہ کے تبصرے، رفعت سراج کی کہانی اب تھوڑی اوپن ہوئی ہے۔ قیصرہ حیات کی کہانی اب اینڈ تک اقساط پر چل رہی ہے۔ آزر کا انجام ہوا مگر یمنیٰ کا ہیرو سے ملنا باقی ہے۔ غزالہ عزیز کا موضوع پرانا پر طرزِ تحریر اچھا تھا۔ عنیزہ سید کا شامِ شہریاراں اُف اتنی ساری کہانیاں اور پھر بھی کوئی تشنگی باقی نہیں۔ اس بار کہانی کافی تیزی سے آگے بڑھی۔ انجم انصار کے افسانے میں اس بار جلترنگ کا رنگ نمایاں تھا، بہت خوب صورت مزہ آگیا۔ شیریں حیدر کا ٹاپک اور اینڈ دونوں ہی اچھے تھے پر پتا نہیں کیوں ان کا طرزِ تحریر کافی بولڈ ہو جاتا ہے۔ عالیہ حرا کافی عرصے کے بعد نظر آئیں اور بہت ہی خوب صورت تحریر تھی۔ اللہ زورِ قلم کرے اور زیادہ۔ گمشدہ جنت، ناول کا نام ہی اچھا ہے اور پھر صائمہ اکرم کا طرزِ تحریر اسٹوری تھوڑی سی سلو ہے۔ نوشین طاہر، چاند اور محبت میں اک پرانے موضوع کے ساتھ نظر آئیں اللہ سب کو مکافاتِ عمل سے محفوظ رکھے اور اک ہی جملے نے پورے افسانے کا مزہ دوبالا کر دیا۔ جو تمہارا نہیں وہ پھر کہیں بھی چلا جائے کسی کا بھی ہو جائے اچھا ہی ہے، بے وفا کے ملنے سے نہ ملنا بہتر۔ عطیہ عمر سے ملاقات اچھی رہی۔ صائمہ اکرم، انجم آنٹی، عمیرہ احمد اور عظمیٰ آفاق سے بھی ملاقات کروادیں۔“ (ہم سے تو آپ ملتی ہی رہتی ہیں۔ پہلے اپنی رائٹرز سے ملاقات ہو جائے)

﴿ تمثیلہ زاہد، کراچی سے۔ ”عطیہ عمر کا انٹرویو سادگی سے مزین تھا۔ عنیزہ سید کا شامِ شہریاراں کی قسط نمبر پانچ پڑھتے ہوئے مجھے وہی دلچسپی محسوس ہوئی جو پہلی قسط میں ہوئی۔ حلالہ کے موضوع کو بنیاد بنا کر لکھا جانے والا شیریں حیدر کا افسانہ بہت خوب صورت تھا۔ شیریں حیدر آپ کی تحریریں لاجواب اور ایک پیغام کے ساتھ ہوتی ہیں۔ باقی تمام افسانے اچھے تھے۔ ابھی ناولٹ نہیں پڑھے۔ انجم آنٹی، قمر علی عباسی صاحب کے انتقال کا بہت افسوس ہوا۔ سویرا فلک کی والدہ کے انتقال پر اللہ ان کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین اور امینہ عندلیب اور ان سب کے لیے بہت دعائیں جو بسترِ علالت پر ہیں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

﴿ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ”ٹائٹل پسند آیا واہ انجم جی دل خوش کر دیا میری غزل شائع کر کے مگر میرے تبصرے کا کیا ہوا۔ میں نے تبصرہ کیا تھا اس مرتبہ تمام افسانے بے حد اچھے تھے کچھ سو سو تھے مگر ایک مکمل ناول پڑھ کر بے حد رونا آیا دل دکھ گیا واقعی جو لڑکیاں خود اپنی شادی کا فیصلہ کرتی ہیں وہ صحیح نہیں ہوتیں مجھے خود غرض لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں مگر ناہید فاطمہ نے دھند کے اس پار لکھ کر کمال کر دیا ویلڈن ناہید جی میں نے آپ کو ایوارڈ دیا۔ قبول فرمائیے مجھے نوشین پر بہت ترس آیا۔ عالیہ حرا اور شیریں حیدر نے بھی خوب لکھا۔ فصیحہ آصف اور نسیم نیازی کے تبصرے خوب تھے۔ اللہ تعالیٰ امینہ جی کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ عطیہ عمر کا انٹرویو بے حد اچھا لگا۔ سروئی ناز بے حد پیاری سی ہیں تصویر بے حد پیاری لگی۔ آپ نے ہمیں عام سی بندی کو شہزادی کا لقب دے کر ہمارا مان بڑھا دیا۔ آپ تو ہم سب کی پھر ملکہ ہوئیں کیا کمال کا ناولٹ لکھا ہے آپ نے مزہ آگیا پڑھ کر۔ ہم بھی آج کل بہت بیمار ہیں ایک تو ہارٹ کا مسئلہ دوسرا یون کی بیماری ہے بس پاکیزہ اور آپ کی محبت سے خوش ہو جاتے ہیں بس آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ (اللہ آپ کو کلی صحت اور زندگی دے۔ پاکیزہ بہنیں آپ کی صحت کے لیے ضرور دعا کریں گی)

﴿ صدیقہ خان، آزاد کشمیر سے۔ ”خوب صورت رنگوں سے سجا اگست کا ٹائٹل دل کو بہت بھایا۔ ہمیشہ کی طرح انجم آنی کی خوب صورت باتیں سننے کے بعد دین کی باتوں سے مستفید ہوئے پھر سیدھے پہنچے اپنے پسندیدہ ناول امانت کی جانب۔ رفعت جی پلیز شبینہ اور رابی کے ساتھ کچھ برا مت کیجیے گا اور انسپکٹر وارث کو بیچ میں سے جلدی سے ہٹائیے۔ عنیزہ سید کا سلسلے وار ناول شامِ شہریاراں بہت اچھا لگا ہے فی الحال نو کمنٹس۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل قیصرہ حیات کے ناول میں حمنہ کی

ڈیتھ کا واقعہ ابھی تک ذہن سے نہیں نکلا۔ نہایت ہی اچھی کہانی ہے۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

﴿ بنتِ عزیز الرحمن، راول پنڈی سے۔ ”تازہ شمارہ ملا اس میں آپ کا لکھا ہوا واقعہ پڑھا دل کا جو حال ہوا وہ میں لفظوں میں بتانے سے قاصر ہوں۔ اللہ تعالیٰ سب بہنوں کو اپنی امان میں رکھے اور ہر بری گھڑی سے بچائے۔ آج کل کے حالات دیکھ کر دل پریشان رہتا ہے۔ بداعمالیاں بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ جس انداز سے آپ نے واقعہ تحریر کیا ہے وہ آپ کے ہی قلم کا حق ہے۔ دعا کرتی ہوں ایسے واقعات نہ ہوں۔ اللہ ہم سب پر رحم کرے ہمارے گناہ معاف کرے۔“ (بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے)

﴿ یاسمین کنول، پسرور سے۔ ”اداریہ سے لے کر روحانی مشوروں تک پاکیزہ اے ون رہا۔ سرورق بڑا دلکش لگا دلہن کا انداز بڑا دلنشین تھا۔ افسانوں میں متاعِ جاں بہترین افسانہ رہا۔ آج کل کے عدم تحفظ کے حالات کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ یہاں کسی کی عزت محفوظ نہیں شہلا کا ایثار ناقابلِ فراموش رہا۔ لگتا ہے حقیقت سے کافی گہرا تعلق ہے اس افسانے کا۔ (جی ہاں) صائمہ اکرم کی گمشدہ جنت پسند آئی۔ امانت اور شامِ شہریاراں بڑے اچھے موڑ پر ہیں۔ قمر علی عباسی کی وفات پر بے حد دکھ ہوا۔ ادبی دنیا ایک عظیم سفرنامہ نگار سے محروم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نیلوفر عباسی کو یہ صدمہ سہنے کی توفیق بخشے اور مرحوم کے درجات بلند فرمائے، آمین ثم آمین۔ اس حوالے سے آپ کا مضمون اس دور کا ابنِ بطوطہ بے حد اچھا لگا۔“ (شکریہ)

﴿ تمنا مشعل، پنجاب سے۔ ”اس ماہ شمارہ خاصی تاخیر سے ملا۔ ٹائٹل پر براجمان کیوٹ سی دلہن کسی سوچ میں گم نظر آئی۔ بے تابی سے صفحات پلٹے تو ایک شاکڈ نیوز منتظر تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ قمر علی عباسی صاحب ہمیں چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ ویسے آنٹی اس دفعہ جلترنگ کا آخری خاکہ بہت ہی مزیدار تھا پڑھ کر طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی اور آپ کی تحریر متاعِ جاں پڑھ کر تو میں سن سی ہو کر رہ گئی۔ صائمہ اکرم نے اپنے مخصوص انداز کو کچھ سنجیدگی اور کچھ بزلہ سنجی سے لکھا۔ ویری ویلڈن صائمہ جی آپ کی گمشدہ جنت سطر سطر مسحور کن اور شاندار لگی۔ مجھے اینڈ جاننے کی جلدی تھی مگر باقی آئندہ پڑھ کر مزہ کرکرا ہو گیا۔ نکہت اعظمی کی دردِ بیکراں واقعی درد بھری داستان تھی اچھی لگی۔ عقیلہ حق کی بیٹیاں بوجھ نہیں سبق آموز تھی اور رفعت سراج کی امانت میں شکر ہے ایک نیا موڑ تو آیا۔ قیصرہ حیات پلیز ردا اور یمنیٰ کو مشکلات سے نکالیں بہت ستالیا آپ نے انہیں۔ سکینہ فرخ کی منتظرِ بہار نے تو بہت کچھ یاد دلایا بہر حال اچھی تحریر تھی۔ آنٹی یہ عشق و محبت میں نارسائی کے کانٹے کیوں اُگتے ہیں۔ جنہیں ہم اپنی جان سے بڑھ کر چاہیں انہیں پانا اتنا مشکل کیوں ہوتا ہے؟“ (عشق و محبت خاصے مشکل کام جو ہیں)

﴿ سنبل ملک، فیروز والہ سے۔ ”بات ہو جائے امانت کی آنٹی رفعت سراج آپ کا قلم فراٹے سے چل رہا ہے۔ اصیل خان کی جذباتی باتیں، والہانہ پن مہر جان سے جذباتی و قلبی تعلق پھر صابرہ اور برہان کو اتنے اچھے طریقے سے ہر کردار کو فٹ کرنا سیلوٹ پیش کرتی ہوں آنٹی رفعت یہ آپ کا کام ہے پھر منظر نگاری یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قاری خود ان جگہوں پر موجود ہے۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل بہت ہی عمدہ طرزِ تحریر مگر آزر کو سزا ضرور ملنی چاہیے۔ میں نے اپنے بھائی کی شادی کا احوال بھیجا تھا وہ بھی آپ نے شائع نہیں کیا۔ پاکیزہ ڈائری عظمیٰ آفاق سعید کا انتخاب اچھا لگا۔ جلترنگ، سندیسے سب ہی اچھے تھے۔ ویسے ڈائجسٹ پڑھ کر آپ کو ہمارے خطوط کا انتظار رہتا ہے جو تبصرہ کی صورت میں آپ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اسی طرح ہمارے خط اگر شامل ہوں تو یہ ہمارے لیے بھی آکسیجن کا کام کرتے ہیں۔“ (تبصرے کا شکریہ)

﴿ زمر نعیم، ویرکالہ ٹھنڈا پانی سے۔ ”یہ میرا کسی بھی رسالے میں پہلا خط ہے۔ امید ہے آپ پزیرائی کریں گی۔ مجھے پاکیزہ بہت بھایا ہے۔ میں پاکیزہ سے واقعی متاثر ہوں۔ میں جون 2004ء سے رسالے پڑھ رہی ہوں۔ کہانیاں لکھنے کا شوق تھا لیکن بھیجنے سے ڈر لگتا تھا کہ کیا پتا وہاں تک پہنچتی بھی ہیں یا نہیں اور اگر پہنچیں گی بھی تو شائع کوئی نہیں کرے گا۔ اب میں نے آپ سے امید باندھی ہے تو پلیز...... میں نے اپنی لکھی ہوئی تین تحریریں آپ کو ارسال کر دی ہیں اپنے میگزین کے ذریعے مجھے جواب ضرور دیجیے گا۔ مجھے عنیزہ سید کا شامِ شہریاراں بہت پسند ہے۔ کہیں دیپ جلے بھی قیصرہ حیات کا مزیدار ناولٹ ہے۔ صائمہ اکرم کو سلام پلیز میری تحریروں کو شائع کر کے شکریے کا موقع دیں۔“ (اس محفل میں خوش آمدید، گڑیا! آپ کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی)

﴿ نجمہ جبیں علیزئی، ڈی آئی خان سے۔ ”دلہن نمبر کے ساتھ دلہن سے سجا سرورق دل کو مسحور کر گیا۔ آپ کا مجھے کچھ کہنا ہمیشہ ہم سب کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کاش اس سوچ پر عمل بھی کر سکیں۔ دین کی باتیں ہمیں آگہی کا درس دیتی ہیں اور اب

اپنے فیورٹ ناول امانت کی بات کروں یہ بتادوں رفعت کہ تمہاری تحریر ہمیشہ ہر دور ہر روپ میں پسند آئی ہے۔ جانے کیوں کچھ قاری بہنیں امانت سے ناخوش دکھائی دیتی ہیں۔ تازہ قسط میں کئی موڑ اہم لگے۔ مہر جان کا صحت یاب ہوکر واپس گھر آنا بے چاری رابی کی واپسی پر عتاب نازل کرنا۔ جانے یہ عتاب کس روپ میں ہوگا۔ ویسے آپس کی بات ہے رفعت، اصیل خان کے بارے میں مجھے جانے کیوں یقین تھا کہ موصوف کا اصل کچھ اور ہے۔ اس طرح عاقبت نا اندیش جابر علی کا جابر باپ کے بھیس میں کم عمر بیٹی پر ستم ڈھانا، دیکھیے آگے کیا، کیا ہوتا ہے۔ اللہ آپ کے قلم کو مزید طاقت دے۔ (آمین) افسانوں میں باری کا بخار، بیٹیاں بوجھ نہیں، دردِ بیکراں درحقیقت میری آنکھیں بھگو گئے۔ قیصرہ حیات کا سلسلہ وار ناولٹ کہیں دیپ جلے کہیں دل قدرے سست روی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ شمیلہ کا بہو کے روپ میں مکروہ کردار انتہائی نفرت انگیز ہے۔ اللہ اسے ہدایت دے۔ صائمہ اکرم کی گمشدہ جنت اور مکمل ناول منزل تھی جن کی اور دونوں تحریریں بہت پسند آئیں۔ اور بطورِ خاص آپ کے فکر انگیز افسانے متاعِ جاں نے مجھے ذاتی طور پر بہت متاثر کیا۔ اس ظالم معاشرے میں جوان بچیوں کی عزت و جان بچانے کے لیے ایک ماں کی قربانی اس کا اپنا آپ داؤ پر لگانا بہت بڑا المیہ لگا۔" (تبصرے کا شکریہ، دیگر باتوں کے لیے آپ مجھے فون کرلیں)۔

٭ رمنا شاہ، ورجینیا سے۔ "آپ کا سالگرہ نمبر دو پڑھ کر رہا نہیں گیا اور سب کام چھوڑ کر میں لکھنے بیٹھ گئی۔ سالگرہ نمبر ایک تو ہمیں ملا ہی نہیں۔ ویسے یہ ریکارڈ ہے کہ اپریل کا شمارہ کبھی نہیں ملتا میرے پاس بہت سالوں کے پاکیزہ شمارے ہیں سنبھال کر رکھتی ہو مگر خیر اتنا زبردست شمارہ نکالنے پر مبارک باد۔ اتنا خوب صورت اور منفرد اسٹائل صرف اور صرف آپ کا ہی ہوسکتا ہے۔ آپ نے محل اور شہزادیوں کا زبردست نقشہ پیش کیا، اپنے آپ پر غصہ آیا کہ اگر حاضر ہوتی رہتی تو ہمارا ابھی تعارف ہوتا خیر کوئی بات نہیں۔ ساجدہ حبیب کا انٹرویو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ کیا زبردست لکھتی ہیں ویسی ہی زبردست باتیں ہیں۔ افسانوں میں سارے ہی اچھے ہیں کس کس کی تعریف کروں مگر آگہی کا ایک پل، ماں کی دعا، احسان تیرا دل کو چھو لینے والی تحریریں تھیں۔ بہت سبق آموز اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر پکا ایمان لانے کی ترغیب۔ بے شک وہی ہے اصل مالک اور گناہ بخشنے والا انسان کی حیثیت کچھ نہیں۔ عنیزہ سید کا ناول پسند آرہا ہے۔ رفعت سراج بھی اچھا لکھ رہی ہیں لیکن کچھ چیزوں سے اختلاف ہے بہرحال دیکھتے ہیں ضروری نہیں کہ ہم رائٹر کی ہر بات سے متفق ہوں آگے چل کر کہانی کیا موڑ لیتی ہے۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل کو اب اینڈ ہونا چاہیے۔ ساس بہو کا مسئلہ بڑھتے بڑھتے ایسے لگ رہا ہے کوئی جاسوسی کہانی پڑھ رہے ہوں۔ آپ کے جلترنگ کی کیا بات ہے سب سے پہلے پڑھتی ہوں اور مسکراتی ہوں شکریہ کہ آپ ہم کو مسکراہٹ دیتی ہیں اور وہ بھی فری۔ کیا مجھے اپریل کا شمارہ مل سکتا ہے؟ اور کیا اگر میں سالانہ لگوالوں تو ہر شمارہ مجھے میل میں آجایا کرے گا؟" (جی ہاں رسالے میں دیے گئے اشتہار سے معلومات حاصل کرسکتی ہیں۔ آپ پے آرڈر یا ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے پیسے بھجوادیں رسالہ آپ کو گھر پر ملنے لگے گا)

٭ سامعہ تبسم، ملتان سے۔ "سب سے پہلے دین کی باتیں اور سیدنا احمدؐ کے بارے میں پڑھا اور اس کے بعد اپنے من پسند سلسلے بہنوں کی محفل میں چلے گئے۔ واہ جی واہ کیا خوب صورت محفل سجی ہے ہر طرف شہزادیاں ہی شہزادیاں لیکن مہارانیاں نہیں ہیں، اس کی وجہ؟ شہزادیوں کے لیے اتنی محبت، پزیرائی اور حوصلہ افزائی دل خوش ہوگیا۔ شہزادیوں کے بارے میں آپ کے تبصرے مزہ دے گئے۔ بہنوں کی محفل میں ایسے بیٹھے کہ ہر بات بھول گئے بلکہ یقین کریں کچن میں جانا ہی بھول گئے۔ کچن میں ہم نے سالن بنانا ہوتا ہے باقی سارا کام ملازموں کے ذمے ہوتا ہے مگر شہزادیوں نے تو ساری سُدھ بدھ بُھلادی۔ آپی جان سلسلے وار دونوں ناول رفعت سراج صاحبہ کا امانت اور عنیزہ سید کا شامِ شہر یاراں ابھی تک کچھ خاص مزہ نہیں دے رہے۔ آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔" (تبصرے کا شکریہ)

٭ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ سے۔ "انجم آپی میرے بیٹے نے چھ روز سے کچھ نہیں کھایا اور تین دن بے ہوش رہا سب کہتے ہیں اسے نظر لگ گئی ہے۔ سب اسکول کے اساتذہ نے اس کی بہت تعریفیں کیں بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ جس کی مہربانی سے میرا بیٹا ٹھیک ہوگیا ابھی بیٹا ٹھیک ہی ہوا تھا کہ میرے شوہر بیمار ہوگئے اور تاحال بیمار ہیں پلیز تمام قارئین بہنیں اور آپی آپ بھی دعا کریں کہ وہ ٹھیک ہوجائیں۔ اوپر سے میرے شوہر کی کزن کا نوجوان بیٹا جو کہ پاک آرمی میں تھا شہید ہوگیا۔ چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ بہت ہی ہنس مکھ اور اچھا بچہ تھا۔ یہ سانحہ خون کے آنسو رُلا گیا۔ یقین ہی نہیں آتا یوں لگتا ہے کہ کہیں

سے اچانک ہنستے ہوئے آکر کہے گا کہ لو میں تو ابھی زندہ ہوں اور زندہ ہی تو ہے کہ شہید کب مرا کرتے ہیں۔ ہمارے گاؤں کا پہلا شہید۔ اس... ٹینشن زدہ ماحول میں پاکیزہ ملا بہت دھڑکتے دل کے ساتھ پاکیزہ کھولا اور سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھی کہ محفل ہی سے بہنوں کا احوال حال معلوم ہوتا ہے۔ انجم آپی آپ کو سب ایسے ہی تو گریٹ نہیں کہتے۔ ہر ہر بہن کا بہت محبت سے تذکرہ تھینک یو نہیں کہوں گی کہ شکریہ تو غیروں کا کیا جاتا ہے کہ آپ نے مجھے بھی یاد رکھا اور اتنے اچھے لفظوں میں اس پریشانی میں اپنے بارے میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی ورنہ تو میں سمجھ رہی تھی آپ مجھے بھول گئی ہیں۔ ساجدہ کا انٹرویو بہت اچھا لگا۔ آپ کی تصویر دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ عذرا آپی تو نوجوان لڑکی لگتی ہیں، باربی ڈول۔ نزہت اصغر کو میرا سلام کہیے گا۔" (تبصرے کا شکریہ، نزہت اصغر وعلیکم السلام کہہ رہی ہیں)

٭ انجم مشیر، کراچی سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے واہ واہ کیا خوب کہا۔ دیکھیے تقریر کی خوبی کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ انجم بہت زبردست' انسان اپنی سوچ سے ہی زندگی کو خوشگوار بناتا ہے سب سے پہلے ناہید سلطانہ اختر نے زندگی کو انجام اچھا دیا مگر جلدی جلدی۔ رفعت سراج ابھی تک تو مرحلہ تعارف ہی کا لگتا ہے شاید یہ ہی بھول بھلیاں امانت کا حسن ہیں انداز زبردست ہے۔ عقیلہ حق کی ایک خواہشِ لاحاصل لوگوں کو پرکھنے کا ایک اور در کھول گئی کہ سب کچھ مایا ہے۔ حدیثِ دل نے دل کا بوجھ بڑھا دیا۔ ہارے بھی تو بازی مات نہیں آنکھ بند کرکے بے تکی روایات پر چلنے والوں کے لیے بہترین سبق، نصیحت اور آج کچھ جانِ جاں کا بھی حساب ہوجائے کچھ فسانہ کچھ حقیقت ایسی لڑکیاں حقیقی زندگی میں کم ہوتی ہیں جو ایک سایے کو سب کچھ مان کر دنیا تیاگ دیں۔" (تبصرے کا شکریہ)

٭ فائزہ فاروق سحر، لاہور سے۔ "پیاری آپی آپ نے کہا ہے کہ میں ہر کہانی نہیں پڑھتی اس لیے تبصرہ صرف اور صرف جلترنگ پر کرتی ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں میں پاکیزہ کی ہر سطر پچھلے تیس سالوں سے پڑھ رہی ہوں جب میں دس سال کی تھی حتیٰ کہ ہومیو کلینک کے صفحات بھی۔ کہانیوں پر تبصرہ اس لیے نہیں کرتی یا کم کرتی ہوں کہ میں جو بھی لائن سوچتی ہوں وہ کسی نہ کسی بہن کے خط میں ضرور ہوتی ہے اب میں کیا تبصرہ کروں۔ آپ کی چوائس اتنی اچھی ہے کہ کوئی تحریر غیر معیاری نہیں ہوسکتی۔ ہر کہانی اچھی ہوتی ہے۔ خاص طور پر جو آپ کے ناول ہیں سب کے سب میرے پاس محفوظ ہیں۔ آپ کی تحریر بہت مزہ دیتی ہے۔ باقی سب مصنفات بھی ایسا لکھتی ہیں کہ ہاتھ چوم لوں۔ کبھی کبھی کوئی کہانی دلچسپ نہیں لگتی۔ ایک ناول بھی چڑیا والا مجھے اچھا نہیں لگا۔ اس میں بہت انگلش تھی بلکہ مس یوز تھی جہاں اچھے خاصے اردو کے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہو ہمیں کم ہی انگلش اردو مکس کرنی چاہیے۔ میں اردو ادب کی طالبہ رہی ہوں۔ مجھے اپنے وطن سے اور اردو زبان سے بہت محبت ہے۔" (پیاری گڑیا! اب تم بھی اپنی اداؤں پر غور کرلو۔ تم نے بھی اپنے خط میں انگریزی کے لفظ لکھے تو ہیں ناں)

٭ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ "سب سے پہلے متاعِ جاں پڑھا۔ یہ اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ تبصرہ کرتے ہوئے بھی دل رو رہا ہے۔ اللہ ہم سب پر رحم کرے۔ امانت میں اصیل خان اور ڈاکٹر صاحبہ کی اسٹوری شروع ہوگئی ہے۔ رفعت کا ہر ناول تجسس سے بھرپور ہوتا ہے۔ قیصرہ حیات کا ناولٹ اختتام کی جانب خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ نصرت جبیں کا موضوع پرانا مگر انجام اچھا تھا۔ باری کا بخار اور بیٹیاں بوجھ نہیں بھی اچھے افسانے تھے۔ سکینہ فرخ نے بہت عمدگی سے لکھا ہے چنگاری بھی بس ٹھیک ہی تھا۔ نگہت اعظمی کا افسانہ ماں کی فریاد سے بھرپور کہانی رہی اور بہت اچھی ترجمانی کی۔ خالدہ نسیم کا مکمل ناول بھی ٹھیک ہی رہا۔ صائمہ اکرم کا منی ناول بہت اچھا رہا۔ صائمہ اب بہت اچھا لکھنے لگی ہیں۔ نیلوفر عباسی کا میرے ہر قدم کا ساتھی بہت اچھا مضمون تھا۔ تمام دلہنیں بہت پیاری تھیں۔ تمہاری بھتیجی بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔ انجم تم نے اپنی امی کے بارے میں بہت اچھے الفاظ لکھے ہیں یہ ماں ہی ہوتی ہے جو منہ میں نوالے ڈالتی ہے۔ جلترنگ میں دکھ سکھ بہت اچھا لگا۔ ہاں شادی کے جدید کارڈ بھی زبردست تھے۔ عظمیٰ کی ڈائری زبردست ہوتی ہے۔ اللہ اس کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔ ماہ اگست کے پاکیزہ میں آج میں سب سے پہلے روحانی مشوروں کی بات کروں گی۔ ہر ماہ ہی بہت کچھ لکھا ہوتا ہے جس کو پڑھ کر ہم مستفید ہوتے ہیں مگر اس ماہ میں آیئے دعا مانگیں اور شکر ادا کرنے کی دعائیں پڑھ کر بے ساختہ منہ سے جزاک اللہ نکلا۔ دونوں ناول خرگوش کی چال چل رہے ہیں مگر اس ماہ عنیزہ سید کا ناول بازی لے گیا۔ قیصرہ حیات کا ناولٹ بھی بہت دلچسپ ہوگیا ہے۔ صائمہ اکرم ہلکے پھلکے انداز میں لکھ رہی ہیں مگر پلیز یہ زیادہ طویل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ طوالت تحریر کا حسن ضائع کردیتی ہے۔ افسانے بھی اچھے تھے انجم ہم مان گئے تم کو۔ یقین پڑھ کر شوبز کے حالات سے بھی باخبر ہوئے مگر ناولٹ کا انجام

واقعی چونکا دینے والا تھا۔ مکمل ناول دھند کے اس پار ناہید فاطمہ نے بہت ہی اچھا لکھا، مبارک باد۔ عطیہ عمر سے ملاقات اچھی رہی۔ عطیہ عمر واقعی سلجھی ہوئی خاتون نظر آئیں۔ شیریں حیدر کے افسانے کا انجام بھی اچھا تھا۔ شیریں حیدر نے کافی عرصے کے بعد انٹری دی۔ عالیہ حرا کے ناولٹ میں بھی گھریلو سیاست نظر آئی۔ بہنوں کی محفل چھوٹی لگی۔" (جی ہاں خطوط بچ گئے تھے اور تبصرے کا شکریہ)

☆ شیریں ظفر، ملتان سے۔ "پاکیزہ 12 یا 13 سال کی عمر سے پڑھ رہی ہوں۔ مئی کے شمارے میں اور اپریل کے شمارے میں بھی شہزادیوں اور پریوں کی محفلوں نے تو مجھے کوہِ قاف کی سیر کروادی اور انجم باجی آپ تو تبصرہ نگار شہزادیوں سے خوفزدہ تھیں کہ کہیں آپ کسی کو بھول گئیں اور وہ آپ سے ناراض ہوگئیں تو کیا ہوگا جبکہ میں یہ سوچتی اور خوش ہوتی رہی کہ یہ وہ واحد ڈائجسٹ ہے جو کہ اتنی بڑی تعداد میں مصنفات اور قارئین اور تبصرہ نگاروں کو یاد رکھے ہوئے ہے بلکہ شہزادیاں بنا کر آپ نے پاکیزہ کی محفل کو چار چاند لگا دیے۔ یعنی ہم جیسے بھی کبھی شہزادی کہلائے جائیں گے۔ انیقہ انا، رخ چوہدری، آنٹی اقبال بانو، سیما مناف، شمیم فضل خالق اور فصیحہ آصف کے خط پڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے، اگر میرا خط نہ بھی چھپا ہو تو میرے خیالات کی ترجمانی اور دوسری بہت سی بہنیں کر رہی ہوتی ہیں دل کو اچھا لگتا ہے۔ آپ کے اور مسز عظمیٰ خورشید کے خیال سے میں بالکل متفق ہوں کہ ترک ڈرامے بالکل نہیں آنے چاہئیں۔ مئی کا سالگرہ نمبر 2 سپر ہٹ شمارہ تھا۔ کئی افسانوں نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ دردانہ کا تین پہر کا جیون، قانتہ رابعہ کا محبت تمام شد، رضوانہ پرنس کا اس شب کی سحر نہیں۔ سُپر کلاس افسانے...... افسانے کو افسانے کی اصل روح میں قید رکھا اور ہماری خوش قسمتی قیصرہ حیات اور عنیزہ سید کی تحریریں پسند آئی ہیں۔ اس ماہ کا ناولٹ یقین پڑھ کر بھی حقیقت کی عکاسی نظر آئی۔ قیصرہ حیات کا ناولٹ مجھے دل سے پسند آرہا ہے جن کو یہ ناول اچھا نہیں لگ رہا، میں ان سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اس ناول کے کردار ہر گھر میں موجود ہیں، یہ حقیقی ناول ہے خصوصاً شمیلہ کا کردار تو ہر دوسرے گھر میں ہوگا۔" (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے، شکریہ)

☆ فضیلہ اشتیاق فیضی، پنجاب سے۔ "ڈائجسٹ کی تعریف، کہانیوں کی تعریف یا اس کے قارئین اس کے اسلوب، اس کے شائع کرنے والے، اس ماہنامے کی ٹیم کے لیے میرے دل میں جو عقیدت، احترام اور اپنائیت ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ میرے پاس شاید وہ الفاظ نہیں پر آپ کو بتاؤں کہ میری طرح بہت سے لوگ جو دن بھر کھیتوں میں، دفتروں میں یا کہیں بھی بہت محنت کرتے ہیں پھر کوئی دوست غمخوار یا اپنا نہیں ہوتا جو ہم سے ہماری روز و شب کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور غم بانٹے تو پھر وہ لوگ ایسی کتابوں میں پناہ لیتے ہیں، عالمگیریت پر لکھی گئی ہے جس میں ایک طبقے، ایک کلاس یا ایک مخصوص نہیں بلکہ ہر فرد، ہر ذات ہر شخص کو لکھا گیا ہے۔ آفرین یہ کتاب یہ پاکیزہ شائع کرنے، ترتیب دینے اور ہم تک پہنچانے والوں پر آہ...... اللہ جی! آپ سب کو اس کا نیک اجر دے، آمین۔ (اس محفل میں خوش آمدید، اپنی تحریریں علیحدہ علیحدہ صفحات پر لکھیے)

☆ آریا یسمین، لاہور سے۔ "میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی شہزادیوں میں شامل کر کے بہت بڑا رتبہ عطا کیا، میرے دل سے آپ کے لیے جو دعا نکلی وہ یہ بھی کہ خدایا تو اس ہستی کو صحت، تندرستی والی، خوشیوں والی رحمتوں والی برکتوں والی اپنے فضلوں والی لمبی عمر عطا کر تو اور تیرے فرشتے اس کے ساتھ ہوں، آمین۔" (شکریہ)

☆ بہنوں کی محفل کے صفحات کا کوٹہ ختم ہوا۔ آیئے اب ہم سب مل کر دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم۔ میرے جسم کو شفا، دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یارب العالمین تو مجھ سے میری آل اولاد سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا اور دونوں جہانوں میں مجھے خیر عطا فرمانا۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے۔ میرا رب برکت اور بلندی والا ہے، آمین ثم آمین۔

یا مجیب یا مجیب یا مجیب

دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید



حمدِ باری تعالیٰ

اڑتے بادل، بہتے جھرنے
گرتی بوندیں تجھ سے ہیں
میرے مالک میرے اللہ
ساری دنیا تجھ سے ہے
تجھ کو سوچوں، تجھ کو چاہوں
تجھ ہی سے ہر آس لگاؤں
سب کو دینے والا تو ہی
میرا ایک سہارا تو ہی
ہر دعا تو پوری کرے گا
کچھ ابھی کچھ بعد میں دے گا
تیرا کرم ہو ہر پل مولا
یہی دعا ہے تجھ سے اللہ

کلام: عالیہ ضیاء، کراچی

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

ڈال ہم پر بھی کوئی نظرِ کرم تیرے ہیں
یا نبی ﷺ تیری قسم، تیری قسم، تیرے ہیں
اے نبی اُمّی لقب صاحبِ اقرا تو ہے
اے شہا دیکھ عرب اور عجم تیرے ہیں
تو ہے محبوبِ خدا سارے زمانے تیرے
یعنی جو کچھ بھی ہیں موجود عدم تیرے ہیں
تیری سیرت سے ہیں روشن میری آنکھوں کے چراغ
میرے دل پر جو ہوئے حرف رقم تیرے ہیں
منزلیں اُن کے قدم چومتی ہیں خود آکر
راہبر جن کو فقط نقشِ قدم تیرے ہیں
تو مجھے اپنا بنالے تو یہ تیرا ہے کرم
ورنہ کس منہ سے کہے کوئی کہ ہم تیرے ہیں
سعدؔ اقبال نے یہ کہہ کے قلم توڑ دیا
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

نعت: سعد اللہ شاہ
مرسلہ: یاسمین کنول، پسرور

امتحان

ایک مرتبہ ابلیس حضرت عیسیٰؑ کے پاس پہنچا اور کہا "تمہارا یہ عقیدہ ہے کہ تمہیں وہی پیش آئے گا جو خدا نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔"

آپؑ نے فرمایا۔ "بے شک!"

اس نے کہا۔ "اچھا اس پہاڑ سے خود کو گرا کر دیکھو کہ خدا نے تمہارے لیے سلامتی مقرر کردی ہے یا نہیں۔"

آپؑ نے فرمایا۔ "اے ملعون! یہ حق صرف خدا کو ہے کہ وہ اپنے بندوں کا امتحان لے، بندے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے مالکِ حقیقی کا امتحان لے۔"

از: ارم کمال، فیصل آباد

سخاوت

حاتم طائی کی بہن بھی بہت سخی تھی جو کچھ ہاتھ آتا، سب خرچ کردیتی تھی کچھ باقی نہ رہتا۔ اس کے بھائیوں نے ایک مرتبہ اسے ایک کوٹھری میں قید کردیا اور کھانے پینے کو بھی نہیں دیا۔ ایک آدھ دن کے بعد اسے یہ سمجھ کر رہا کردیا گیا کہ اب فقر اور بھوک کا اسے احساس ہوگیا ہوگا لہٰذا فضول خرچی نہیں کرے گی۔

اچھا ہونے کے بعد اس نے ایک سائلہ کو دیکھا اور اسے اپنا سارا مال دے دیا اور کہنے لگی۔

"میں نے جو تکلیفیں اٹھائی ہیں ان کے بعد میں کسی مصیبت زدہ کے لیے ہاتھ روک نہیں سکتی۔"

مرسلہ: سمر علی، گوجرانوالہ

بارش اور خواہش

بارشوں کے موسم میں بارشیں تو ہوتی ہیں

دل میں بھیگ جانے کی خواہشیں تو ہوتی ہے
وصل کے اجالوں میں اوڑھنی میں چھپ کر بھی
ہجر کے اندھیروں کی وحشتیں تو ہوتی ہیں
مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

وارنٹی

شوہر سے بیوی لڑ رہی تھی، شوہر نے تنگ آکر اپنی ساس کو ایس ایم ایس بھیجا۔ آپ کی پروڈکٹ میری ریکوائرمنٹ کے مطابق نہیں ہے اس کی پرفارمنس صحیح نہیں ہے۔ میں اسے لوٹا رہا ہوں اور تبدیلی کی ڈیمانڈ کرتا ہوں۔

اسمارٹ ساس نے ری پلائی کیا، وارنٹی ختم ہوگئی ہے، ری پلیس منٹ یا ری فنڈ کی کوئی پالیسی نہیں پلیز پروڈکٹ کی پرفارمنس کو بہتر کرنے کے لیے روز بالوں سے پکڑ کر دُھلائی کریں اور اب ویسے بھی کمپنی نیا سامان نہیں بنا رہی۔ شکریہ!

از: ایشل شادیان، گولارچی

کمی

مہمان ...... ''واہ بھئی ...... فرزانہ ماشاء اللہ تم نے کیا ترقی کی ہے۔ تمہارے گھر میں تو پہلے یہ کچھ نہیں تھا۔''

فرزانہ: مثلاً ...... کیا ......؟''

مہمان: '' یہ بڑا سا ریفریجریٹر، ائیر کنڈیشنر، رنگین ٹی وی، واشنگ مشین یہ نئے ماڈل کی فوڈ فیکٹری وغیرہ۔''

فرزانہ: ''بس ایک چیز کی کمی ہے۔''

مہمان: ''وہ کیا......؟''

فرزانہ: ''بجلی کی......''

از: ناہید بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس

وہ

مجھے اپنے دل میں سمانے تو دیتا
نظر سے نظر کو ملانے تو دیتا
خدایا یہ کیسا تھا انداز اس کا
وہ ظلم وستم مجھ پہ کرتے رہے ہیں
مگر میرے آنسو کو گرتے نہ دیکھا
محبت میں شاید بہت دور تھے ہم
وہ آنکھیں جھکائے ہوئے میں نے دیکھا
مجھے دیکھ کر وہ یوں نظریں چرائے
خدایا یہ کیسا تھا انداز اس کا
یہ دل خون دیتا اگر مانگتے وہ
مگر اس نے دیکھو وہ مانگا کسی سے
وہ نظریں چراتے اسے میں نے دیکھا
وہ جاتا رہا دوسروں کے ہی در پہ
مگر میرے گھر سے گزر کر تو جاتا
نگاہیں ملانا میرا کام شاید
نگاہیں چراتے اسے میں نے دیکھا
خدایا یہ کیسا تھا انداز اس کا
شاعرہ: آر یاسمین، لاہور

گلدان زندگی

زندگی کے گلدان میں ایسے پھول لگاؤ کہ جب بھی کِھلیں محبت کی خوشبو آئے۔ زندگی کے گلدانوں سے مراد ہمارے دل ہیں جس کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ دل بادشاہ ہے دل کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کبھی دل رک جائے تو اس کا نتیجہ موت ہوتا ہے۔ پھولوں کے مفہوم میں ایسے لوگ ہیں جو آپ کے دل میں دھڑکن کی طرح رہتے ہیں۔ جب بھی وہ آپ کے قریب ہوں آپ کو بے حد مسرت ہو، ان کی وجہ سے ہر طرف محبت بکھری ہو۔ جن کو کھونے کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے اپنے دلوں میں ایسے لوگوں کو جگہ دو جن کی وجہ سے آپ کی اور دوسرے لوگوں کی زندگیاں خوشی سے بھر جائیں کیونکہ دل ایک پاکیزہ جگہ ہے جہاں اللہ عزوجل کی پاکیزہ ہستی مبارکہ رہتی ہے۔

مرسلہ: فائزہ گل، بہاول نگر

کچھ کھٹا کچھ میٹھا

☆ غصے کا آنا کنوارے لڑکے کی نشانی ہے مگر غصے کو پی جانا شادی شدہ مرد کی نشانی ہے۔

☆ لڑکیاں شادی سے پہلے خواب بُنتی ہیں اور مرد شادی کے بعد......

☆ شوہر بالکل ائر کنڈیشنر کی طرح ہوتا ہے...... گھر کے باہر گرم اور شور کرتا ہوا لیکن گھر کے اندر...... خاموش، ٹھنڈا اور ریموٹ سے چلنے والا ہوتا ہے۔

☆ بعض شوہر گُسی لڑاکا ساس سے بھی زیادہ... بدمزاج ہوتے ہیں کہ ان کی بیویاں اپنی ساس نہ ہونے پر پریشان رہتی ہیں۔

از: نجمہ سلمٰی، کراچی

تم بولو تو سہی

تم کو ہم اپنا بنالیں گے تم بولو تو سہی
تم کو پلکوں پہ بٹھالیں گے تم بولو تو سہی
دل کی دھڑکن میں بسالیں گے تم بولو تو سہی
پیار ہم تم کو سکھا دیں گے تم بولو تو سہی
مہمان ہم دل میں بنالیں گے تم بولو تو سہی
پھول ہم سارے کِھلا دیں گے تم بولو تو سہی
چاند تاروں کو بلالیں گے تم بولو تو سہی
ناز ہم سارے اٹھالیں گے تم بولو تو سہی
از: مرسلہ: رفعت مبین رفی، کراچی

غزل

جب بھی گریہ شکار کرتا ہوں
تشنگی کو شعار کرتا ہوں
تم محبت میں زِچ کرو مجھ کو
میں انا کو بیدار کرتا ہوں
کوئی ایسے نہ مجھ کو سوچ سکا
جیسے خود سے میں پیار کرتا ہوں
میں تو خوابوں کے اِک سمندر پر
کشتیاں استوار کرتا ہوں
تیرے ظلم وستم کے بدلے میں
خامشی اختیار کرتا ہوں
تجھ سے نفرت کے ساتھ ساتھ رضا
پیار بھی بے شمار کرتا ہوں
شاعر: نعیم رضا بھٹی
مرسلہ: سیدہ ہما شاہ، ہارون آباد پنجاب

ذرا سا مذاق

سارہ! '' آج سے میرا تمہارا ہر رشتہ ختم تم میرے سارے گفٹ واپس کردو......اور میں تمہارے سارے گفٹ واپس کردیتی ہوں۔''

عدنان اطمینان سے...... '' ٹھیک ہے، چلو ایزی لوڈ سے اسٹارٹ کرتے ہیں۔''

سارہ! ''افوہ...... ذرا سا مذاق تم سے برداشت نہیں ہوتا......فوراً سنجیدہ ہوجاتے ہو۔''

از: صبا نور، لیہ

پاس ہو

چاہتوں کی پیاس ہو
جب تیرے ملن کی آس ہو
دیپ یوں جلائے جائیں
روشنی بھی پاس ہو
خواب کے مسافر کو
زندگی بھی راس ہو
پھولوں کی برسات ہو
کبھی نہ تو اداس ہو
چاندنی بھی گنگنائے
جب تو ہمارے پاس ہو
شاعرہ: صدف جاوید قریشی، ہری پور ہزارہ

گزری ہے

تیری نظر جو میرے دل کے پار گزری ہے
پھر اس کے بعد بہت بے قرار گزری ہے
نہ جانے کر گئی پرواز روح کس گل کی
نسیمِ صبح چمن سوگوار گزری ہے
زہے نصیب مراغم نہیں ہے کس کس کو

تڑپ کے شبنم گل اشکبار گزری ہے
الٰہی خیر، ہو اب میرے آشیانے کی
کسی کی برقِ نظر بار بار گزری ہے
تیرے بغیر ستارے تھے زخم دل جیسے
نہ جانے کیسے شبِ انتظار گزری ہے
شاعرہ: صوفیہ قمر، کراچی

اصل بات

میاں بیوی قدیم روایات کے موضوع پر بنائی گئی تصویروں کی نمائش پر گئے، ایک تصویر میں ایک حسین لڑکی جسم پر پتے باندھے کھڑی تھی۔ شوہر کافی دیر سے اس تصویر کو دیکھ رہا تھا آخر کار بیوی جل کے بولی۔ ''چلیں یا آندھی کا انتظار کرنا ہے۔''

از: شہلا، پنجاب

دل

دل اور آنکھوں میں کس قدر گہرا رشتہ ہے آنکھیں دل کی ترجمان ہوتی ہیں، دل پر چوٹ پڑے تو پیمانہ چھلک پڑتا ہے اگر دل میں جذبات موجود ہیں تو آنکھیں خوشی سے چمک اٹھتی ہیں، کرنیں پھوٹ پڑتی ہیں محبت سے خالی دل اس غار کے مانند ہے جس میں جانور بھی داخل ہونے سے خوف کھاتے ہیں۔

از: ارم کمال، فیصل آباد

ماہیا

دیکھ کے تیری ٹور وے ماہیا
ڈگ ڈگ پینڈے مور وے ماہیا
چمکے تیری چپ دا چانن
وچھلی پاوے شور وے ماہیا
ہو کے بھر دے ہجر ہنیرے
اِک لشکارا ہور وے ماہیا
فیر مرے سینے اگ لگے
فیر گھنا گھنگور وے ماہیا
توں نظریں آویں تے لگ دی
ہر شے نویں نکور وے ماہیا
کیوں ساتھاں تیرے سفنے
چار چو میرے چور وے ماہیا
ماہیا جیویں تیری مرضی
ساڈا کاہرا زور وے ماہیا
اج وی اسلم وے ہر ساہ دی
تیرے ہتھ وچ ڈور اے ماہیا
شاعرہ: اسلم کولسری

انتخاب: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

ملکہ ترنم نور جہاں کی سالگرہ پر لکھی گئی غزل

کیا بھیجوں

سوچتی ہوں تجھے اب کے برس کیا بھیجوں
جان بھیجوں تجھے یا دل کا دھڑکنا بھیجوں
مانگ لوں اپنے خدا سے کوئی لمحہ ایسا
جس پہ تو آکے ٹھہر جائے وہ رستہ بھیجوں
سخت سردی میں محبت کی سمو دوں گرمی
اور گرما میں خنک موسم آسا بھیجوں
چاندراتوں کا فسوں اب کے تیرے نام لکھوں
دن کی حدت کے لیے شجر گھنا سا بھیجوں
تشنگی اب کے برس تجھ سے بہت دور رہے
پیاس عمروں کی بجھا دے وہ مسیحا بھیجوں
بھیج دوں تجھ کو خدا کی یہ خدائی ساری
جو ہو خواہش تیرے من کی وہ تمنا بھیجوں
تو چلے تو چراغاں سا تیرے ساتھ چلے
دل سے جو نکلی دعا اس کا خزینہ بھیجوں
گر قدم تھک کے رکیں پیار کی آغوش میں لوں
نیند نہ آئے تو سپنا میں سلونا بھیجوں
میری خواہش کہ بہار آکے تیرے گھر میں رکے
اور برسات میں رم جھم کا سندیسہ بھیجوں
کاش ایسی بھی کرامت میرے بس میں ہو عالی
دور تک موسم گل نہ ہو اور تجھے غنچہ بھیجوں
شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد



جلترنگ

انجم انصار

پُر بہار باتیں

ساجدہ خالہ کی اگر عادت نہ پتا ہوتی تو شاید حیرت بھی نہ ہوتی...... وہ ہمیشہ کی کنجوس تو کیا مہا کنجوس تھیں۔ کسی سے بات تک اسی وقت کیا کرتی تھیں جب اُن کو اس سے کوئی کام ہو...... یہ صرف میرا ہی خیال نہیں تھا بلکہ خاندان بھر کی یہی رائے تھی۔ وہ عرصہ دراز سے لاہور میں رہتی تھیں اور بنا مطلب کے وہ کسی کو فون تک نہیں کیا کرتی تھیں۔ میاں ان کے اچھی پوسٹ پر فائز تھے مگر ان کے مزاج کی ازلی کنجوسی ان پر چھائی ہوئی تھی۔

ایک ایسی خاتون جو کسی کے ہاں فضول فون نہ کرتی ہوں انہوں نے ایک شب کراچی مجھے فون کر کے نہ صرف میری خیریت پوچھی بلکہ کافی دیر تک بات کی...... بات کرنے کے دوران میں مجھے خیال بھی ہوا کہ ان کی کال لمبی ہوگئی ہے اس لیے خدا حافظ کہنے کی پڑی پر بھی چڑھی...... مگر ان کی اور سناؤ...... کسی طرح ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس فون کو آئے چار روز بھی نہیں ہوئے تھے کہ پھر دوپہر میں ان کا فون آگیا۔

''شبانہ تم سو تو نہیں رہی تھیں؟''

''نہیں بھئی...... میں تو جاگ رہی تھی۔'' میں نے جمائی لے کر کہا۔

''اس وقت تم مجھے اتنی یاد آئیں میں نے سوچا کہ تمہیں فون کرلوں......'' اور پھر وہ بے تکی اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگیں۔

فون کال آدھے گھنٹے کی ہوگئی...... تو مجھے لگا شاید اُن کو کوئی ذہنی مرض لاحق ہوگیا ہے ان جیسی کنجوس خاتون ایسی دریا دلی پر کیوں آمادہ ہوگئی ہیں۔

حیدر آباد بڑی باجی...... اور ملتان چھوٹی آپا نے جب یہ بتایا کہ ساجدہ خالہ ان سب کو بھی اسی طرح فون کر رہی ہیں تو پکا یقین ہوگیا کہ ان کے دماغ پر یقیناً کسی وائرس نے بلکہ خطرناک وائرس نے حملہ کیا ہے، روزانہ فون کر رہی تھیں۔

میں تو چلو ان کی بھانجی ہوتی تھی...... اب وہ خاندان میں ان لوگوں کو بھی فون کر رہی تھیں جن سے ان کی رسمی سلام دعا تھی...... بلکہ ہر دفعہ فون کرتے ہوئے تمہید میں انہیں پانچ منٹ تک اپنا تعارف بھی کروانا پڑتا تھا۔

''ساجدہ خالہ کیا پاگل ہوگئی ہیں......؟'' ان کی نندوں کو تفصیلی خط لکھ کر پوچھا تو وہاں سے یہی جواب آیا: ''وہ کیا پاگل ہوں گی وہ تو لوگوں کو پاگل کرسکتی ہیں ہمارے بھائی کو پاگل کردیا...... سوائے ان کے کسی اپنے گھر والے کو پہچانتا تک نہیں ہے...... یا اپنی ساس کو سگی سمجھنے لگا ہے۔'' مگر ہم بہنوں کی یہ مستند رائے تھی...... کہ ان کے دماغ کو کوئی نہ کوئی زک ضرور پہنچی ہے۔

اب ساجدہ خالہ کا فون دن میں چار چار بار آنے لگا تھا۔ ''شبانہ ٹی وی کھولو...... میوزک کا مہا مقابلہ ہو رہا ہے...... اس میں پرفیکٹ برائٹ کی گلدیپ کے کلوز اپ دکھائے جا رہے ہیں۔''

''میں نے یہ پروگرام ہی نہیں دیکھے تو مجھے کیا معلوم......'' میں نے الجھ کر کہا۔

''اچھا میں تمہیں رات دس بجے یاد دلاؤں گی اکشرا ابھی تک اپنی سسرال نہیں گئی ہے ذرا سی بات کتنی بڑھ گئی ہے...... اس کا ہیرو وہ منحوس مجھے بہت برا لگ رہا ہے۔'' وہ اپنی کہے جاتیں...... اور ڈراموں کے اختتامی لمحات میں مجھے ان کا ہمنوا بن

جانا پڑتا...... اور بعد میں افسوس بھی ہوتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔
ساجدہ خالہ کے ایک دن جب دس فون آ گئے تو میرا حوصلہ جواب دے گیا۔
''خالہ کیا آپ خالو کی ساری تنخواہ ٹیلی فون کے بل پر لگا دیتی ہیں...... جو ہر وقت فون کرتی ہیں؟''
''ارے کیا پاگل سمجھ رکھا ہے؟ میں نے تو دو سو روپے والا پی ٹی سی ایل کا پیکیج لے لیا کہ دوسرے شہروں میں جتنی دل چاہے بات کرو۔'' تب وہ ہنس کر بولیں۔
''ظاہر ہے اگر بات نہیں کروں گی تب بھی مجھے دو سو روپے تو ضرور دینے ہوں گے ناں اس لیے میں تو مجبوری میں بات کرتی ہوں۔''
''نہیں خالہ یہ بات نہیں ہے......'' میں نے ہنس کر کہا۔
''پھر کیا بات ہے؟''
''پی ٹی سی ایل والوں نے شاید کوئی ایسا خفیہ انعام بھی رکھا ہوگا...... جو روزانہ دو سو روپے کی بات بلا وجہ بھی کرے تو وہ اسے دیا جائے گا اور آپ کو وہ انعام بھی ضرور حاصل کرنا ہوگا، چاہے وہ صابن کی تین ٹکیاں ہی کیوں نہ ہوں۔''
''خیر ایسی تو کوئی بات نہیں ہے...... ہم تو رشتے داری کو سمجھتے تھے اس لیے فون کر لیتے تھے...... ورنہ ہمارا کون سا دل چاہتا ہے کہ ایسے لوگوں کی شکل بھی دیکھیں جنہیں فون پر برداشت کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔''
تب مجھے تو ہنسی ہی آ گئی۔
''کسی کا فون اٹینڈ کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا...... ہمیں کوئی دو سو روپے مہینہ فری میں دے تو بھی یہ کام نہ کریں۔''
چھوٹی آپا نے ان سے فون پر یہاں تک کہہ دیا...... کہ ان دنوں ان کی دوستی ساجدہ خالہ کی نند سے زیادہ ہو رہی تھی اور وہ اپنے ایک بھائی کے لیے لڑکی بھی دیکھ رہی تھیں اور چھوٹی آپا پی ٹی سی ایل پیکیج لے کر انہیں روزانہ فون بھی کرتی تھیں ہماری آپا کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے ناں۔

بیکار باتیں

عفی بھابی کے سر میں سخت درد تھا، بخار بھی بار بار چڑھ رہا تھا۔ راشد بھائی ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے دوا لینے کے باوجود نہ سر کا درد ٹھیک ہو رہا تھا اور نہ ہی بخار کم ہو رہا تھا۔
دوسرے ڈاکٹر کو دکھایا تو طبیعت قدرے سنبھلی ضرور...... مگر بخار کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔
اگر بخار اتر بھی جاتا تو سر کا درد کسی صورت ختم نہیں ہو رہا تھا۔
''مجھے لگ رہا ہے میں مر رہی ہوں۔'' عفی نے رونا شروع کر دیا۔
''عورتوں کی عمریں زیادہ ہوتی ہیں، تم نہیں مرو گی......'' راشد بھائی نے تسلی دی۔
''میں کہہ رہی ہوں ناں...... میں مر رہی ہوں۔'' عفی بھابی کو غصہ آ گیا۔
''تم کہہ رہی ہو تو یقین کر لیتا ہوں، اچھا کب مرو گی......؟''
''جلد ہی......''
''یار تاریخ تو بتا دو......؟''
''سنو، دوسری شادی مت کرنا ورنہ بھوت بن کر ڈراؤں گی......''
''عفی...... میں تو پہلے ہی سے ڈر کر رہتا ہوں...... چلو آئندہ بھی سہی......''
''میں سچ کہہ رہی ہوں اگر دوسری شادی کی تو تمہارا سر توڑ دوں گی۔''
''چلو...... نئی دلہن کو تو کچھ نہیں کہو گی ناں...... میں شادی کے بعد ہیلمٹ پہن لیا کروں گا۔''
راشد بھائی اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے......
وہ بچوں کو جمع کر کے علیحدہ ہدایتیں دیتیں۔
''سوتیلی ماں...... بہت مارتی ہے اگر پاپا دوسری شادی کر کے لائیں تو تم لوگ اسے بھگا دینا......''
''ماما یہ ہاکی ٹھیک رہے گی یا ریکٹ......؟''
بچے ماں سے آ کر پوچھتے۔
تب عفی مزید دھوم دھام سے روتیں نہ میاں کو پروا ہے اور نہ بچوں کو...... بلکہ چھوٹے بیٹے نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ پاپا کی شادی میں وہ شہ بالا بنے گا اور خوب انجوائے کرے گا۔
پندرہ دن...... ہائے ہائے کے نعرے لگانے کے بعد خود ہی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔
سر کا درد ختم ہوا...... تو ڈپریشن کی وجہ سے جو ٹمپریچر بڑھ رہا تھا وہ بھی ختم ہوا۔
اور آخر...... بیماری کی وجہ بھی خود ہی سمجھ میں آ گئی۔
ان کی ایک سہیلی نے روزانہ کس کر اونچی سی پونی ٹیل باندھ کر سخت ہاتھوں سے چوٹی باندھ کر جو چٹلا ڈالنے کا طریقہ بتایا تھا اس نے ہی بالوں کو کھینچ کر سر میں درد کر دیا تھا، ڈھیلے بالوں کو کیچر کی مدد سے باندھا تو انہیں سکون سا مل گیا۔
''ہونہہ...... بال نہیں بڑھتے تو نہ بڑھیں...... اب میں انٹ شنٹ تیل ڈال کر بالوں کو اپنے مغز سے باندھنے سے تو رہی......'' مسکرا کر انہوں نے راشد بھائی سے کہا...... تو وہ ہنس کر بولے۔
''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے جو مرنے کا پروگرام بنایا تھا وہ ملتوی کر دیا۔''
''ہم...... تم پر مرتے ہیں...... کیا یہ کافی نہیں......'' عفی بھابی مسکرا کر کہہ رہی تھیں...... اور راشد بھائی قہقہے لگا رہے تھے اور اماں غصے سے کہہ رہی تھیں۔
بیکار کی باتیں کرنے میں نہ بہو کم ہے اور نہ بیٹا...... دونوں ہی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔''
☆☆☆

ذرا ہٹ کے

☆ بے شک یہ ہم ہی ہیں جو تمہیں قبر کا اندھیرا اور حشر کی گرمی یاد دلاتے ہیں ورنہ تو تم یہ بھول ہی چکے ہو۔
منجانب: کے، ای، ایس، سی
☆ خوب صورت لوگ لازمی نہیں کہ اچھے ہوں، ہاں اچھے لوگ ہمیشہ خوب صورت ہوتے ہیں کہ جیسے آپ...... میری مثال لے لیں۔
منجانب: ایک بے چاری بہو
☆ کسی عقل مند سے ایک گھنٹا گفتگو کرنا ساری رات کی کُتب بینی سے بہتر ہے...... لیکن ٹھہریں میں ابھی فارغ نہیں ہوں پھر کسی وقت بات کیجیے گا۔
منجانب: ایک خود پسند سہیلی
☆ اچھے لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں لہٰذا ان کی قدر کیجیے کوئی بات نہیں آپ کو میری اہمیت تھوڑے دن کے بعد ہو مگر ہو گی تو۔
منجانب: ایک بے چاری بیوی
مرسلہ: خیر النسا، راول پنڈی

امتحان

ایک خاتون کو گانے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن وہ ایک موسیقار کو آواز کا امتحان دینے کے لیے گئی جب موسیقار امتحان لے چکا تو خاتون نے پوچھا۔ ''میری آواز کسی کام آ سکتی ہے؟''
موسیقار نے جواب دیا۔ ''آپ کی آواز ہوائی حملے سے خبردار کرنے کا کام دے سکتی ہے۔''
مرسلہ: صدف نورین، لاہور

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی



☆فضہ بتول...... بہارہ کہو

ان شہر کے ہنگاموں سے فرصت نہیں ملتی
آؤں گا میں اِک روز مگر ضد نہ کیا کر
یہ درد نئی بات نہیں تم پہ جو گزرا
پہلے ہیں بہت اہلِ ہنر ضد نہ کیا کر

☆نگہت آصف...... اسلام آباد

وہ جس پہ عمر لگی ہے مجھے منانے میں
اسی کا ہاتھ ہے شامل مجھے مٹانے میں
ہر ایک موڑ پہ اس نے دغا دیا مجھ کو
میں جس کو اپنا سمجھتا رہا زمانے میں

☆زینب نقوی...... پنوں عاقل

برسات میں دیوار و در کی ساری تحریریں مٹیں
دھویا بہت مٹتا نہیں، تقدیر کا لکھا ہوا

☆غزالہ طارق...... سرگودھا

گئے دنوں میں جو تھا ذہن و جسم کی لذت
وہی وصال طبیعت کا جبر بننے لگا
بچھڑتے وقت دلوں کو اگرچہ دکھ تو ہوا
کھلی فضا میں مگر سانس لینا اچھا لگا

☆ڈاکٹر کومل عبدالستار...... جامشورو

غمِ زندگی تیری راہ میں
شبِ آرزو تیری چاہ میں
جو اجڑ گیا وہ بسا نہیں
جو بچھڑ گیا وہ ملا نہیں

☆شبنم کنول...... حافظ آباد

عید پہ آجانا اے صنم
عید پہ چہرہ دکھانا جانا اے صنم
لوگ آسمان پہ چاند دیکھیں گے
ہمیں دیدار اپنا کرا جانا اے صنم

☆عرشیہ جنید...... کراچی

میرے سینے میں کوئی سانس چھپا کرتی ہے
جیسے مزدور کو پردیس میں گھر یاد آئے

☆نگہت حسین...... راول پنڈی

اے آنکھ! اب تو خواب کی دنیا سے لوٹ آ
مژگاں کو کھول! شہر کو سیلاب لے گیا

☆عروبہ ناز...... کوٹلی

ہماری زندگی میں پھول بن کر کوئی آیا تھا
اسی کی یاد میں اب تک یہ تحریریں مہکتی ہیں

☆ممتاز خانم...... کراچی

ریت سے دریا اٹے ہیں خاک سے جھیلیں پٹیں
یہ پرندے خون میں شاید نہانے آئے ہیں

☆ایلیا عباس...... لاہور

عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے
میں چاہتا ہوں خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے

☆غزالہ شاہد...... کراچی

میں تمام تارے اٹھا اٹھا کے غریب لوگوں میں بانٹ دوں
کبھی ایک رات وہ آسماں کا نظام دیں مرے ہاتھ میں

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



رمضان اور عید کے پکوانوں سے لطف اندوز ہوتی بہنوں کے لیے مزید، مزیدار کھانے لیے حاضر ہیں۔ رمضان اور عید کی پُرتکلف ضیافتوں کے بعد اب آپ کا دل کچھ سادہ کھانوں کی طرف راغب ہو رہا ہوگا، ذہن کو لذت کے ساتھ سادگی سے بھی روشناس کروانے کے لیے چند پکوان حاضرِ خدمت ہیں۔

مزیدار بینگن

اجزا: گول بینگن، 1/2 کلو، ہلدی، دو چٹکی۔ نمک، سرخ مرچ، سیاہ مرچ، حسبِ ذائقہ۔ سفید زیرہ، پسا ہوا ایک چائے کا چمچ۔ پیاز، درمیانی ایک عدد (لچھے دار کاٹ لیں)۔ لہسن، چھ سے آٹھ جوے۔ تیل، دو کھانے کے چمچ۔ کڑی پتا، چند پتے۔ دہی، دو پیالی۔

ترکیب: بینگن کو سلائس کی طرح گول گول کاٹ لیں اور نمک ملے پانی میں ڈال دیں اور پندرہ منٹ بعد ہتھیلی پر رکھ کر پانی نکال لیں اور ہلکا سا فرائی کرلیں۔ ایک دیگچی میں پیاز کو گولڈن کر کے نکال لیں اور اسے لہسن اور دیگر مسالوں کے ساتھ پیس لیں پھر تیل میں کڑی پتا کڑکڑا کر ڈال دیں اور پانی کا چھینٹا ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ اب ایک کھلی ڈش میں دہی پھینٹ کر ڈال لیں۔ دہی میں حسب پسند نمک، کالی مرچ، پسا زیرہ ملا سکتے ہیں۔ ڈش میں دہی پھر بینگن ملا مسالا اور پھر دہی کی تہ جمائیں اوپر سے سجاوٹ کے لیے ہرا دھنیا اور ہری مرچ کاٹ کر ڈال دیں۔

مرسلہ: فضہ بتول، بہارہ کہو

ایرانی قورمہ

اجزا: گوشت، ایک کلو۔ لال مرچ، لمبی والی ثابت پانچ سے چھ عدد۔ ثابت کالی مرچ، 1/2 چائے کا چمچ۔ دارچینی دو انچ کا ٹکڑا۔ لونگ، پانچ سے چھ عدد۔ لیموں کا رس، تین کھانے کے چمچ۔ نمک حسبِ ذائقہ۔ پسی شکر، ایک چائے کا چمچ۔ تیل، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: گوشت کو لیموں کے رس میں اچھی طرح کانٹے سے گود لیں اور نمک لگا کر دو یا تین گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ ایک دیگچی میں تیل ہلکا گرم کریں پھر اس میں گوشت، تمام گرم مسالا اور شکر ڈال کر چڑھا دیں۔ پانی اتنا ملائیں کہ گوشت گل جائے اب ڈھکن بند کر کے ہلکی آنچ پر رکھ دیں اور گوشت گل جانے پر اتار لیں۔ شوربے والا بہترین قورمہ تیار ہے۔

مرسلہ: نگہت آصف، اسلام آباد

شیر خورمہ

اجزا: چھوارے، آدھا پاؤ۔ کھوپرا، آدھا پاؤ۔ کنڈینسڈ ملک، ایک چھوٹا ڈبا۔ کشمش، ایک چھٹانک۔ چھوٹی الائچی، چھ عدد۔ پستہ، پچاس گرام۔ بادام، پچاس گرام۔ سوئیاں، ایک پاؤ۔ دودھ، ڈیڑھ کلو۔ شکر، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: دودھ کو ہلکی آنچ پر دیر تک پکائیں

پھر اس میں کنڈینسڈ ملک اور چینی شامل کر کے پکائیں۔ ناریل اور چھوارے باریک کاٹ لیں۔ بادام اور پستے بھی کاٹ لیں۔ اب حسبِ منشا گھی لے کر اس میں بادام، چھوارے، پستہ، ناریل، تل کر نکال لیں۔ لونگ اور الائچی کے دانے ملا کر ہلکی آنچ پر سرخ کرلیں پھر سویاں اسی گھی میں تھوڑی سی بھونیں پھر دودھ میں ملا دیں۔ ہلکی آنچ پر تھوڑی دیر پکائیں اتنا پکائیں کہ سویاں اور دودھ یک جان ہوجائیں اور گاڑھا پن آجائے، اپنی مرضی کے مطابق جتنا گاڑھا کرنا چاہیں کرلیں...... مزیدار شیر خورمہ تیار ہے۔ ٹھنڈا کر کے کھائیں۔

مرسلہ: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

چکن پلاؤ

اجزا: باسمتی چاول، دو کپ۔ مرغی کا گوشت، (بغیر ہڈی کا) 600 گرام۔ پیاز، دو درمیانے سائز کی۔ ٹماٹر، تین درمیانے سائز کے۔ ادرک، پسی ہوئی دو کھانے کے چمچ۔ لہسن، پسا ہوا۔ دو کھانے کے چمچ۔ زیرہ، ایک چائے کا چمچ۔ لونگ، 6 سے 8 عدد۔ تیز پات کے پتے، دو عدد۔ لال مرچ، پسی ہوئی ایک چائے کا چمچ۔ چکن اسٹاک، ساڑھے تین کپ۔ دہی، نصف کپ۔

ترکیب: پیاز چھیل کر کاٹ لیں۔ ٹماٹر دھو کر کاٹ لیں۔ بغیر ہڈی کے چکن کو ڈیڑھ انچ کے سائز میں کاٹ لیں۔ چکن کو دہی، ادرک، لہسن پیسٹ اور نمک میں ایک گھنٹے تک ڈبو کر رکھیں۔ چاول کو صاف کر کے اور دھو کر ایک گھنٹے تک بھگو دیں پھر پانی نکال کر الگ رکھ دیں۔ موٹے پیندے کے پین میں گھی گرم کریں زیرہ ڈالیں اور دس سیکنڈ تک بھونیں۔ لونگ، چھوٹی الائچی، دار چینی اور تیز پات کے پتے ڈالیں اور دوبارہ دس سیکنڈ تک بھونیں۔ کٹی ہوئی پیاز ڈالیں اور تیز تیز بھونیں یہاں تک کہ رنگ سنہری ہوجائے۔ کٹے ہوئے ٹماٹر ڈالیں اور دہی، ادرک، لہسن اور نمک میں ڈالے ہوئے چکن کو تیز تیز بھونیں۔ یہاں تک کہ آدھا پک جائے اب چکن اسٹاک ڈالیں اور ابالیں۔ چاول کو ہلائیں اور ابالیں پھر آنچ کم کریں۔ پکائیں یہاں تک کہ پانی کی سطح چاول کی سطح کے برابر آجائے۔ چاولوں کو ڈھکنے سے ڈھانپ دیں اور کم آنچ پر ہی بیس منٹ تک پکائیں یا اس وقت تک کہ چاول اور چکن پوری طرح پک جائیں۔ ڈھکنا اتاریں اور ہلکا سا چمچ ماریں تاکہ چاول کے دانے الگ رہیں اور وہ آپس میں جڑ نہ جائیں۔ رائتے اور کھیرے کے ساتھ پیش کریں۔

نوٹ: آپ ہڈیوں سمیت بھی چکن کا پلاؤ تیار کرسکتے ہیں۔

مرسلہ: صبا صدیق، کراچی

انڈوں کا حلوہ

اشیا: انڈے، چھ عدد۔ گھی، چھ چمچ۔ چینی، ڈیڑھ پاؤ یا حسبِ ذائقہ۔ بالائی، ایک پیالی۔ بادام، ایک پیالی۔ پستہ، چار چمچ۔ گری، دو چمچ۔ سبز الائچی، چار عدد۔ کیوڑہ، کھانے کا ایک چمچ۔

ترکیب: انڈوں کو اچھی طرح پھینٹ لیں۔ بالائی بھی پھینٹ لیں۔ پھر چینی کو انڈوں اور بالائی میں ملا کر اچھی طرح مکس کریں کہ چینی اس میں گھل جائے۔ اب کھلے منہ کے پتیلے میں گھی گرم کریں اور اس میں الائچی ڈال کر تل لیں، پھینٹے ہوئے انڈے کترے ہوئے بادام، پستہ گری بھی اس میں ڈال دیں۔ آنچ ہلکی رکھیں اور چمچ چلاتے رہیں۔ جب گاڑھا ہو کر جذب ہوجائے بالائی کا دودھ خشک ہوجائے اور حلوہ گھی چھوڑ دے تو کیوڑہ ڈال کر اتار لیں چند منٹ کے لیے ڈھانپ کر رکھ دیں آخر میں ڈش میں نکال کر بادام اور پستے اوپر چھڑک دیں۔

مرسلہ: اقرا کلثوم، سمبڑیال

☆☆☆



عمیرہ احمد، ساجدہ حبیب اور عنیزہ سید کے نام

جو گرتا ہے گلوں پر میرا لہو
تو ہوتے ہیں سعدی یہ باوضو
احساس کی شدت شامل ہو جب
بڑھ جاتی ہے الفاظ کی آبرو

شاعرہ: سعدیہ مریم سعدی، گولارچی

آئی ایم دا بیسٹ

میں ثابت کرسکتی ہوں کہ
میں کافی کو کافی کپ میں ڈال سکتی ہوں
کیا تم ورلڈ کو ورلڈ کپ میں ڈال سکتے ہو؟
ہاہاہا......
او کے ونس مور......
میں اپنے نمبر پر 100 کا لوڈ کرواسکتی ہوں
کیا تم میرے نمبر پر 100 کا لوڈ کرواسکتے ہو؟
ہاہاہا...... او کے، او کے اگین
ونس مور......
میں اپنا ایڈریس تمہارے موبائل پر بھیج سکتی ہوں
کیا تم اپنا موبائل میرے ایڈریس پر بھیج سکتے ہو؟
نہیں ناں......!
کہا تھا ناں!
آئی ایم دا بیسٹ

از: ایشل شادیان، گولارچی

چاند

ماں نے اپنے نوجوان بیٹے کو آواز دی۔
”بیٹا! نیچے آجاؤ اتنی رات گئے چھت پر کیا کررہے ہو تم۔“
”امی چاند دیکھ رہا ہوں۔“ بیٹے نے جواب دیا۔
”بیٹا بہت دیر ہوگئی ہے تم بھی نیچے آجاؤ اور چاند سے بھی کہو اپنے گھر جائے...... اس کی ماں بھی پریشان ہوگی۔“

از: صبا نور، لیہ

اکھتر واں موقع

ایک خوب صورت لڑکی نے سخت لہجے میں اپنے عاشق سے کہا۔ ”میں تم سے ستر مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ میں تم سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔“
عاشق نے آہ بھر کر کہا۔ ”آہ میری تو زندگی برباد ہوگئی، کتنی مشکل سے میں نے پانچ لاکھ شادی کے لیے جمع کیے تھے۔“
”سنو ڈیئر!“ لڑکی نے نرمی سے کہا۔ ”کیا تم مجھے اکھترواں موقع نہیں دو گے۔“

از: ارم کمال، فیصل آباد

ایسا ہو نہیں سکتا

وہ
اور مجھے یاد کرے......؟
تم بھی ناں قاصد
کمال کرتے ہو

از: شجاع، تلہ گنگ



ادارہ

صبر کرنے کا فائدہ

قرآن کریم کے چودھویں پارے میں سورۂ نحل آیت نمبر ۹۶ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

مَا عِنۡدَکُمۡ یَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰہِ بَاقٍ

ترجمہ: جو کچھ تمہارے پاس ہے ختم ہونے والا ہے اور جو خدا کے پاس ہے باقی رہنے والا ہے۔

یاد رکھیے! مصیبت اور تکلیف کا صدمہ تو ہمیشہ باقی نہ رہے گا۔ ہاں! اس پر صبر کے نکلے ہوئے الفاظ حیاتِ جاودانی اختیار کرلیں گے اور قیامت کے دن اللہ پاک شمار کرا کرا کے، ایک نیکی کا کئی کئی بار بدلہ عطا فرمائے گا۔

یہ صرف ذہن بنانے کی بات ہے اگر ہم اپنا ذہن اس طرح بنالیں کہ جو کچھ غم یا خوشی آئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذکر کے ساتھ اس وقت کو رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق گزار دیں تو ان فانی حالات میں سے ایسے باقی رہنے والے ذخائر ہم اللہ کے پاس بھیج دیں گے جو ہمیشہ کے لیے اس کے پاس ہمارے حساب میں جمع ہوجائیں گے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ ہمیں کسی نے گالی دی یا کوئی نقصان پہنچایا تو نہ وہ گالی ہمیشہ باقی رہے گی اور نہ نقصان ہمیشہ قائم رہے گا اور گالی تو محض بدزبانی کا اظہار ہے، اس سے تو ہمارا کچھ بھی نہیں بگڑتا بلکہ ایسی بے بنیاد چیز پر یعنی گالی کے بدلے ہم نے اگر ایک گالی دے دی تو اس کی اور ہماری دونوں کی بدزبانی کا گناہ دونوں پر باقی رہ جائے گا اور ہمیں قیامت کے دن خسارہ پہنچ جائے گا لیکن اگر ہم اس گالی کو برداشت کر گئے اور جواباً اسے کہہ دیا کہ اللہ تبارک تعالیٰ تمہیں نیک ہدایت دے تو یہ دعائیہ جملے ہمارے واسطے سرمایۂ آخرت اور اس کے واسطے ذریعۂ ہدایت بن جائیں گے۔ اسی طرح کسی نقصان کے تاثرات تو تھوڑی دیر میں ختم ہوجائیں گے لیکن باقی رہنے والی وہ نیکیاں یا برائیاں ہوں گی جن کو ہم نے اپنے دل اور زبان سے ادا کر کے پایا۔

بزرگانِ دین کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی خوشی یا صدمہ آتا تو نوافل پڑھتے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے اور یہی چیز اللہ تعالیٰ کے پاس باقی رہنے والی ہے۔

اب اگر ہمیں اس کا یقین ہوجائے کہ گالی سن کر یا نقصان اٹھا کر جو ذرا سی دیر میں ختم ہوجانے والا ہے، ہمارے صبر کرنے سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اتنا بڑا بدلہ ملنے والا ہے تو ہم بڑے سے بڑے نقصان پر بھی اس کا شکر ادا کریں اور صابر ہوجائیں۔

اس کی مثال اس طرح ہے کہ دنیا کا کوئی بڑا حاکم ہمیں بلائے اور ہمارے لیے سامان آراستہ ہو، اراکینِ حکومت ہمیں لینے کے لیے باادب حاضر ہوں اور راستے میں کوئی شخص ہمیں گالی دے دے تو بدلہ لینا تو کیا! ہم اس کی گالی کو شمار بھی نہیں کریں گے۔ چونکہ ہمارے سامنے وہ عزت اور مرتبہ ہے کہ اگر ہم اس وقت اس گالی دینے والے کی طرف توجہ بھی کریں گے تو ہمارا قیمتی وقت ضائع ہوجائے گا اور توجہ دوسری طرف ہوجائے گی۔ اس پر نہ تو ہم منہ

بنائیں گے اور نہ غصہ ہوں گے، نہ اس کی گالی کا کوئی خیال دل میں لائیں گے، اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کریں گے بلکہ اپنے چہرے پر اور بھی مسکراہٹ اور تشکر کا اظہار پیدا کریں گے کہ سامنے عظیم ہستی ہمارے استقبال میں ہے۔

بالکل اسی طرح خبردار کیا جارہا ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہونے والا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔

آفات اور بلیات سے حفاظت کی دعا

جو شخص صبح شام درجِ ذیل کلمات دس مرتبہ پڑھے گا اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے لیے دس نیکیاں لکھ دے گا اور دس گناہ نامۂ اعمال سے مٹا دے گا اور اسے دس غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا اور اس دن اور اس رات میں شیطانی آفات و مکروہات سے محفوظ رہے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ روزانہ اپنی حیثیت کے موافق صدقہ وخیرات کا بھی اہتمام رکھیں۔ اگر آپ کے ماتحت کچھ لوگ کام کرتے ہیں تو ان کی بھی جائز ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے علاوہ تنخواہ کے بھی ان پر احسان کرتے رہیں۔ ان کی دلی دعاؤں کی برکت سے آپ اور آپ کے گھر والے ہر طرح کی بلاؤں سے محفوظ رہیں گے۔ وہ کلمات یہ ہیں۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ۝

(دس مرتبہ پڑھیں)

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کے لیے ملک ہے اور اسی کے لیے حمد ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آفات اور بلیات سے حفاظت کی ایک بہترین تدبیر یہ ہے کہ کسی کا دل نہیں دکھائے، اپنی طرف سے ہر ایک کو راحت پہنچانے کی کوشش کرے، اگر اپنی طرف سے کسی کو تکلیف پہنچ چکی ہو تو اس سے معافی مانگ لے۔

انجام کی بہتری کی خصوصی دعا

جب کوئی نیا کام شروع کیا جائے یا کسی نئی جگہ میں داخل ہوں تو انجام کی بہتری کے لیے یہ دعا قرآن کریم نے سکھلائی ہے۔

رَبِّ اَدۡخِلۡنِىۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِىۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّىۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِيۡرًا۝

ترجمہ: اے میرے پروردگار! مجھے سچائی کے ساتھ داخل کر اور سچائی کے ساتھ نکال اور میرے لیے خاص اپنے پاس سے مدد کرنے والی طاقت عطا فرما۔

ہجرتِ مدینہ کے وقت حق تعالیٰ شانہ نے رسول اللہ ﷺ کو اس دعا کی تلقین فرمائی کہ مکہ سے نکلنا اور پھر مدینہ پہنچنا، دونوں خیر و خوبی اور عافیت کے ساتھ ہوں۔

اسی دعا کا ثمر تھا کہ ہجرت کے وقت تعاقب کرنے والے کفار کی زد سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اکرم کو ہر قدم پر بچایا اور مدینہ طیبہ کو ظاہراً وباطناً آپ ﷺ اور سب مسلمانوں کے لیے سازگار بنا دیا، اسی لیے بعض علما نے یہ فرمایا: یہ دعا ہر مسلمان کو اپنے تمام مقاصد کے شروع میں یاد رکھنی چاہیے۔

☆☆☆

شوابے ہومیو کلینک

SCHWABE

From Nature. For Health.



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں' پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

یادداشت میں اضافہ کے لیے

فرزانہ... ساہیوال

سوال: میں انٹر کی طالبہ ہوں' عمر 18 سال۔ مجھے پڑھا ہوا یاد نہیں رہتا۔ پیپر والے دن تو گھبراہٹ

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

اکتوبر 2013

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

میں سب بھول جاتی ہوں۔ ماہنامہ پاکیزہ میں کریٹکس (Cratex) کے بارے میں پڑھا مہربانی فرما کر میری راہنمائی فرمائیں۔

۱) اس دوا کے کوئی منفی اثرات تو نہیں ؟

۲) ماہواری کے دنوں میں استعمال کرسکتی ہوں؟

۳) ماہواری پر تو کوئی منفی اثر نہیں ہوگا؟

۴) کریٹکس کب سے شروع کروں اور کب تک کھاؤں؟

۵) اس کی دوا قیمت؟

جواب: بی بی فرزانہ، دماغی صلاحیت بڑھانے کے لیے کریٹکس ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ایک بے مثال دوا ہے۔ اس کے اب تک کوئی منفی اثرات مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ ماہواری کے دنوں میں بھی اس کو لیا جاسکتا ہے اس سے ماہواری میں کوئی خراب اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ قوت اور توانائی برقرار رہتی ہے۔ اس کو کم از کم ایک ماہ تک استعمال

کریں۔ ایک ڈبے کی قیمت 415 روپے ہے جس میں 20 گولیاں ہوتی ہے۔ صبح اور شام ایک ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ نگلیں۔ اس کے علاوہ Anacardium 30 شوابے جرمنی کے 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

★...★...★...★

ایام وقت سے پہلے

نافعہ علی... حیدر آباد

سوال: میں کافی عرصہ سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں۔ ہومیو کلینک سے بھی کافی استفادہ حاصل کیا ہے۔ میں آپ کے پاس ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ پچھلے ماہ جون میں سکھر گئی تھی تو راستے میں مجھے تکلیف ہوگئی۔ گرمی بھی شدید تھی۔ جیسے ہی میں گھر آئی تو مجھے مینسز شروع ہوگئے۔ حالانکہ 10 دن پہلے ہی مینسز بند ہوئے تھے۔ وہ دن اور آج کا دن ہے۔ ہر ماہ 10 دن پہلے ہی سے مینسز شروع ہوجاتے ہیں۔ یعنی کہ مہینے کے بعد نہیں آتے 20 دن کے بعد آجاتے ہیں۔ جس کی وجہ بہت کمزوری ہوگئی ہے اور خون کی بھی کمی ہوگئی ہے۔ میرے خیال میں خون پتلا ہوگیا ہے۔ اس وجہ سے جلدی آجاتے ہیں۔ اگر گرمی میں کہیں چلی جاؤں تو بھی وقت سے پہلے شروع ہوجاتے ہیں۔ میری عمر 40 سال ہے۔ میرے 5 بچے ہیں، چھوٹی بیٹی سوا سال کی ہے۔ اس کو فیڈ بھی کرواتی ہوں۔ براہ مہربانی آپ کوئی ایسی دوا بتائیں جس سے میرے مینسز ٹائم پر آئیں۔ وقت سے پہلے نہ آئیں اور کمزوری بھی دور ہوجائے۔

جواب: محترمہ آپ اپنا الٹراساؤنڈ کراکر رپورٹ ضرور بھیجیں۔ نیز ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Pulsatilla 30 اور Calc Carb 30 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ تھوڑے پانی کے ساتھ لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

★...★...★...★

آنکھوں کی کمزوری

والدہ رافعہ عمر... لاہور

سوال: میری بیٹی رافعہ ساڑھے چھ سال کی ہے اس کو عرصہ ڈھائی سال سے عینک لگی ہے۔ اس کے سر میں شدید درد ہوتا تھا اور متلی کی کیفیت ہوتی تھی۔ بائیں آنکھ کو ٹیڑھا کرکے دیکھتی تھی۔ اب یہ صورتِ حال ہے کہ ہر چھ ماہ بعد نظر چیک کروانے پر پہلے سے کمزور ہی نکلتی ہے اس کے علاوہ وہ ہر بات کی ٹینشن لیتی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو خود پہ سوار کرلیتی ہے۔ حد سے زیادہ حساس ہے براہ کرم ایسی اچھی دوا تجویز کریں جو نہ صرف نظر کو ٹھہرنے میں مدد دے بلکہ improve بھی کرے شکریہ۔

جواب: والدہ رافعہ صاحبہ آپ نے تفصیل... بالکل نہیں لکھی کہ اب سر درد کا کیسا ہوتا ہے یا بالکل ختم ہوگیا ہے۔ اس کے لیے کیا علاج کیا۔ آنکھ کی پوزیشن کیا ہے نمبر کتنا تھا اور اب کتنا ہے۔ آپ کے گھر میں ایک دوسرے سے تعلقات کیسے ہیں۔ ابھی کا وزن اور خوراک کیسی ہے۔ مکمل تفصیلات لکھیے گا۔

★...★...★...★

سروائیکل کا مسئلہ

مسز فرقان... ماڈل ٹاؤن لاہور

سوال: میری عمر 45 سال ہے۔ میرا مسئلہ یہ

ہے کہ میرے ہاتھ اکثر سن ہوجاتے۔ بازو موڑ کر سونے سے زیادہ ہوتے ہیں۔ بازو سیدھا رکھوں تو بہتر رہتا ہے اسی وجہ سے رات کو بار بار آنکھ کھل جاتی ہے۔ کافی علاج کرایا ہے اب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کا حل سرجری ہے جو کہ میں کروانا نہیں چاہتی۔ برائے مہربانی ہومیو پیتھی میں اگر کوئی اس کا علاج ہے تو مجھے ضرور بتائیں اور دوا تجویز کریں، بہت مشکور ہوں گی۔

جواب: محترمہ آپ کو اپنی رپورٹس بھی بھیجنی چاہیے تھیں تاکہ ہم اپنے طور پر اس کو جانچ سکیں۔ لہٰذا پہلی فرصت میں رپورٹس بھیج دیں۔ ساتھ خون کا ٹیسٹ HbA1C بھی کرائیں۔ ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Rhustox30 اور Calccarb30 کے 10،10 قطرے 1/4 کپ پانی میں دن میں 4 مرتبہ استعمال کریں۔

★...★...★...★

پولی پس، ڈی این ایس

رخسانہ... فیصل سیالکوٹ

سوال: ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عرصہ دس سال سے الرجی ہے۔ پہلے پہل مجھے زکام لگا اور ناک بند ہوگئی۔ میں نے بہت علاج کروایا۔ ایکسرے بھی کروائے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ناک میں بائیں طرف ہڈی بڑھی ہوئی ہے۔ میں نے آپریشن نہیں کروایا لیکن ڈاکٹری، حکیموں کا اور ہومیو علاج کروایا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ مجھے سردی گرمی زکام نزلہ رہتا ہے کوئی دن ایسا نہیں جو مجھے ریشہ نہ آیا ہو۔ اب جب الرجی کا دورہ ہوتا ہے تو ناک کے اندر والے سوراخ یعنی جو منہ کی طرف ہیں ان میں جلن ہوتی ہے۔ چھینکیں آتی ہیں۔ ناک فوراً بند ہوجاتی ہے۔ جلن اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ جیسے آگ لگی ہو یا مرچیں لگ جائیں۔ ریشہ اتنا ہوتا ہے کہ قطرے گرتے ہیں۔ جب سو کر اٹھتی ہوں تو سر کے سائڈ اور پیچھے کی طرف درد ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے سر میں روڑے ہوں۔ سجدے میں جاتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ ماتھا کھنچ رہا ہو اور چکر آتے ہیں۔ ریشہ گلے میں گرتا ہے تو کھانسی آتی ہے لیکن کھانسی کچھ دن کے بعد ختم ہوجاتی۔

نوٹ: ریشہ بعض اوقات گٹھلیوں کی طرح ہو کر منہ کے راستے نکلتا ہے۔ کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے دماغ پگھل کر نکل رہا ہو۔ کبھی سبز اور کبھی سفید ہوتا ہے۔ لیکن ریشہ ختم نہیں ہوتا۔ اب تو ناک بھی زیادہ بند ہونے لگی ہے۔ روزانہ گولی کھاتی ہوں لیکن الرجی اس کے باوجود بھی ہوتی ہے۔ میں نے ہر قسم کی گولیاں، ناک بند ہونے کے اسپرے، قطرے سب استعمال کر لیے ہیں لیکن آرام نہیں آیا۔ اب سب کہتے ہیں کہ اسلام آباد جاؤ۔ میری عمر 46 سال۔ قد 4.5 فٹ۔ وزن بہت زیادہ ہوگیا ہے اور روز بروز بڑھ رہا ہے۔ مجھے ہائی بلڈ پریشر ہے جو کہ موروثی ہے۔ تقریباً 160/95 تو رہتا ہے۔ میں گولی روزانہ کھاتی ہوں۔ میں ٹیچر ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ گرد مٹی سے بچو لیکن یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ ہمارے اسکول میں بہت گرد ہے۔ ناک پر کپڑا رکھنے کے باوجود بھی اثر ہوتا ہے۔ ریشہ اتنا آتا ہے کہ اکثر سر اور چہرے کی ہڈیوں میں درد رہتا ہے۔ دوائیاں بہت زیادہ استعمال کرتی ہوں۔ مجبوری ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں جو میں گولی

نہ کھاؤں۔ پنڈلیوں اور گھٹنوں میں درد رہتا ہے، ٹانگوں پر زور دے کر ٹیکسی پر یا اوپر، نیچے نہیں چڑھ سکتی۔ ڈاکٹر صاحب میں نے بڑی امید سے یہ خط لکھا ہے۔ میں اب دوائیاں کھا کھا کر تھک گئی ہوں۔ مہربانی کر کے ایسی دوائی دیں تاکہ میں بھی نارمل زندگی گزار سکوں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں بڑی لیٹ خط لکھ رہی ہوں لیکن مجھے امید ہے آپ جواب ضرور دیں گے۔ شکریہ۔

جواب: بی بی رخسانہ، آپ کو کرانک Sinusitis DNS. اور Polyps ہیں اس کے لیے خود کو دھول مٹی سے بچائیں۔ اس کے لیے ماسک کا استعمال کریں۔ نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر اس کو ناک میں اوپر چڑھائیں صبح اور شام ساتھ میں ڈاکٹر ولمار شوابے کی Marum Varum 30 کے 5 قطرے 3 مرتبہ۔ Glonine 30 اور Calc carb30 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

چہل قدمی کی عادت ڈالیں۔ کھانے میں مرغی، نمک اور ٹھنڈی کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں۔

★...★...★

چہرے پر بال

مس ایف اے... کراچی

سوال: میری عمر 24 سال ہے اور کچھ دنوں میں میری شادی ہونے والی ہے۔ میرا مسئلہ ایک تو یہ ہے کہ میرے چہرے پر بال ہیں تھریڈنگ کرا کرا کے تنگ آگئی ہوں۔ دوسرا مسئلہ میری رانوں پر نشان ہیں، میں چاہتی ہوں کہ میرے یہ مسائل جلد از جلد حل ہوجائیں تاکہ میرے اندر خود اعتمادی پیدا ہو۔ میں آپ کو پھر بتادوں کہ میری شادی جلدی ہونے والی ہے اس لیے برائے مہربانی میرے مسئلے پر فوری توجہ دیں اور کوئی اچھا نسخہ تجویز کریں۔

جواب: بی بی ہارمونز کی خرابی کی وجہ سے بھی ایسا ہوتا ہے۔ اپنے ماہانہ نظام کے متعلق بھی لکھیں۔ آپ نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وزن آپ کا کتنا ہے اور رانوں پر جو نشان پڑے ہیں وہ کب سے ہیں، کیسے ہیں، پہلے کے مقابلے میں اب ان کا سائز، کلر وغیرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر ولمار شوابے Oleumjec30 جرمنی کی 5،5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ، Graphites 30 اور Pulsatilla 30 کے بھی 5،5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد تفصیلی خط لکھ کر اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔

★...★...★

ماہواری کا زیادہ ہونا

ن ن... لاہور

سوال: جناب ڈاکٹر صاحب 2 ماہ کا مجھے حمل تھا جو کہ ضائع ہوگیا یعنی کہ (ابارشن) اس واقعہ کو تقریباً 12 سال ہوگئے ہیں۔ اس وقت میرا خون بہت زیادہ ضائع ہوا لیکن پھر بھی محلے کی دائی نے میرا چھوٹا آپریشن کردیا۔

پہلے میں نے خیال نہیں کیا اپنی صحت کا، اب تقریباً 7 - 6 سال ہوگئے ہیں مجھے خون بہت

زیادہ آتا ہے۔ صبح اور دوپہر کو سو کر اٹھتی ہوں تو طاقت نہیں ہوتی۔ آدھا گھنٹا پڑی رہتی ہوں پھر اٹھتی ہوں، اگر فوراً اٹھوں تو دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے، لیکوریا کی تکلیف جب ہوتی ہے تو پیشاب زیادہ آتا ہے۔ میرے ہاتھوں کے ناخنوں پر لکیریں بھی ہیں پہلے نہیں تھیں۔

جواب: صحیح علاج کے لیے صحیح تشخیص ضروری ہے اور صحیح تشخیص کے لیے مرض کی علامات و کیفیات، معائنہ، متعلقہ رپورٹس کا ہونا ضروری ہے، الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹس کا ذکر تو آپ نے کیا ہے لیکن وہ بھیجنا بھول گئیں بہرحال ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کر کے تازہ الٹرا ساؤنڈ اور کیفیات لکھ کر بھیجیں Bovista30, اور sabina6 5,5 قطرے دن میں 3 مرتبہ ایک گھونٹ پانی میں لیں۔ Thlaspi BursaQ, AlfalfaQ دن میں 3 بار 5 قطرے ایک گھونٹ پانی کے ساتھ لیں۔

★...★...★

ڈپریشن

اختری بیگم... راولپنڈی

سوال: محترم ڈاکٹر صاحب میرا بیٹا زمان عمر 22 سال غیر شادی شدہ ہے، میٹرک پاس اور کوئی روزگار نہیں۔ آج سے ایک سال پہلے بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ روزگار نہ ہونے کی وجہ سے ٹینشن کا شکار ہوا ہے اور اب چھوٹی چھوٹی باتوں کی ٹینشن لیتا ہے اس وجہ سے کافی ڈپریشن کا شکار ہے، کبھی روتا ہے اور کبھی ہنستا ہے، کبھی گالیاں بھی بکنے لگتا ہے۔ سر میں سخت درد بھی ہوتا ہے نیند بہت کم آتی ہے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے کافی کمزور ہے، یادداشت بھی بری طرح سے متاثر ہوئی ہے۔ بچپن سے اسے شدید قبض رہتا ہے۔ ڈاکٹر سے علاج یعنی ایلوپیتھی علاج کروا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میرا ایک ہی بیٹا ہے اور میں بیوہ ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ آپ میرے بیٹے کا ٹھیک علاج تجویز کریں گے۔ اور ہاں کبھی کبھی وہ کہتا ہے دل چاہتا ہے کہ میں خودکشی کرلوں یا کسی کو ماردوں۔

جواب: آپ اور اپنے بیٹے کو جو جوان ہے سمجھیں ؟اور سمجھائیں کہ ہم اللہ کو کیوں یاد نہیں کرتے۔ دو رکعت صلوٰۃ الحاجات پڑھ کر دعا کریں۔ صبح فجر کے بعد سورۂ یٰسین اور مغرب کے بعد سورۃ الواقعہ کی تلاوت کریں۔ نماز کی سختی سے پابندی کریں ہر چیز کا مالک اللہ ہے اور کوئی کام اس کی رضا کے بغیر نہیں ہوتا.... بڑا کام کرنے کے بجائے کوئی چھوٹا موٹا کام کریں۔ گھر میں رہ کر جب کھائے پیے گا تو قبض ہوگا اور بدبودار ریاح بھی، بلڈ پریشر چیک کرائیں، ناک کا معائنہ کرائیں۔ اس کو نزلہ ہوتا ہے؟ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات حسبِ ہدایات استعمال کریں۔ 15 دن کے بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ Stramonium30Belladona30 , اور Carboveg 30 کے 5,5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ اور LAIKAN کی ایک گولی دن میں 2 مرتبہ تھوڑے پانی کے ساتھ لیں۔

☆......☆......☆